

آنحضورؐ

(ابتداء سے ۲۰۰۰ء تک)

وہاب اشرفی

جلد اوّل

ایک مشعلِ پیشگاہِ اوس و ملی

پاکستان میں اس کتاب کے جملہ حقوق ڈاکٹر جمیل چالبی کے پاس محفوظ ہیں
کوئی بھی ادارہ ان کی مرضی کے بغیر اس کتاب کو شائع نہ کرے۔

TAREEKH-E-ADAB-E-URDU

by
Wahab Ashrafi

Year of Edition 2007
ISBN 81-8223-226-0
(Three Vol. Set)
Price Rs. 1500.00
Price. USD \$ 60

تاریخ ادب اردو (ابتداء سے ۲۰۰۰ء تک)

وہاب اشرفی

۲۰۰۷ء

۱۵۰۰ روپے — USD 60 \$ (تین جلدوں پر مشتمل)

گیارہ

عمیف آفسیہ پرنٹرز، دہلی۔

نام کتاب

صفحات

موضوعات

قیمت

تعداد

مطبع

تاریخ ادب اردو

ابتداء سے ۲۰۰۰ء تک

(جلد اول)

وہاب اشرفی

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162, 23214465 Fax: 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

فہرست

- ☆ احوال واقعی: یہ تاریخ ادب اردو کیوں؟ ۲۳ تا ۱۷ دہاب اشرفی
- ☆ اردو کے لسانی مباحث: عمومی جائزہ ۲۹ تا ۲۵
- ☆ ابتداء سے سترہویں صدی عیسوی کا ادب ۶۲ تا ۳۱
- شہلی ہند میں اردو کی ابتداء ۳۳

ڈاکٹر جمیل جالبی

کے نام

- ☆ خواجہ مسعود سعد سلمان ۳۲۲ • خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ۳۵ • ابوالفرید الدین گنج شکر ۳۶
- ☆ شیخ شرف الدین بریلوی قندھار ۳۸ • امیر خسرو ۳۸ • شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ۲۳
- ☆ کبیر ۲۵ • عبدالرحیم خاں خاں ۳۹ • حضرت لوش گنج بخش ۵۰ • افضل پانی پتی ۵۲
- ☆ فضل علی فضل ۶۰ • پنڈت چند بھان برہمن ۶۱
- ☆ وکشیات اور اردو ادب ۶۵ تا ۶۳
- ☆ گجری ادب ۷۳ تا ۷۱
- ☆ بیاد الدین باجن ۶۷ • قاضی محمود ریائی ۶۹ • شاہ علی محمد جوجم دہلی ۷۱ • خوب محمد چشتی ۷۱
- ☆ بکمنی ادب ۸۷ تا ۸۷
- ☆ غزدرین نظامی ۷۵ • خواجہ بندہ نواز گیسو سوات ۷۷ • لفظی ۸۰ • مشتاق ۸۱
- ☆ میراں جی شمس الدشاق ۸۱ • فیروز شاہ بکمنی ۸۳ • شاہ اشرف جلالی ۸۶
- ☆ عادل شاہی ادب ۸۸ تا ۱۰۸
- ☆ برہان الدین جامی ۸۹ • ابن الدین اعلیٰ ۹۲ • عبدال ۹۵ • حسن شوقی ۹۶
- ☆ عادل شاہ شاہی ۱۰۱ • صنعتی ۱۰۳ • مکتبی اور تہم ۱۰۵
- ☆ قطب شاہی ادب ۱۰۹ تا ۱۳۳
- ☆ محمد علی قطب شاہ ۱۱۰ • ملا جلی ۱۱۳ • غریبی ۱۲۰ • احمد گجراتی ۱۲۳
- ☆ ابن لکھنوی ۱۲۷ • شعبی ۱۲۹ • ابوالحسن شاہ ۱۳۱

ہزار شکر کہ دیدم بکام خویش باز
ترا بکام خود و باتو خویش را دمساز
(حافظ)

☆ دو ادبی داستان

۱۳۶ ج ۱۳۳

☆ اٹھارہویں صدی عیسوی کا ادب

۱۳۷ ج ۱۳۳

□ اٹھارہویں صدی کا سیاسی بحران

☆ ایہام گوئی کی روایت

۱۳۳ ج ۱۷۲

• شاہجہاد مبارک آباد • ۱۳۶ • شاکر علی • ۱۵۰ • قلیہ الدین حاتم ۱۵۳

• سراج الدین علی خاں آرزو • ۱۵۷ • شجرف الدین مضمون • ۱۶۰

• مصطفیٰ خاں بکرنگ • ۱۶۲ • عبدالوہاب بکرو • ۱۶۳ • صدر الدین خاں غازی دہلوی • ۱۶۵

• سید عبدالولی عزات • ۱۶۸ • محمد حسن دہلوی • ۱۶۸ • شاہ ولی اللہ شتیاق • ۱۶۹ • میر محمد بہار • ۱۷۱

☆ ایہام گوئی کے خلاف ردِ عمل

۱۷۲ ج ۱۸۸

• نظیر جان جاناں • ۱۷۲ • شاد آیت اللہ جوہری • ۱۷۵ • انعام اللہ خاں نقیہ • ۱۷۷

• میر میراٹنی تپاں • ۱۷۹ • آفتاب محمد بخش • ۱۸۱ • میر اشرف علی خاں • ۱۸۲

• قائم چاند پوری • ۱۸۳ • فتح محمد علی حزیں • ۱۸۷

☆ زبلی، ولی اور سراج

۱۸۹ ج ۲۰۳

• جعفر زبلی • ۱۹۰ • ولی دکنی • ۱۹۳ • سراج اورنگ آبادی • ۱۹۹

☆ سودا، میر اور دوسرے شعراء

۲۰۵ ج ۲۷۶

• مرزا فتح سودا • ۲۰۷ • میر سوز • ۲۱۸ • خواجہ میر درد • ۲۲۰ • میر تقی میر • ۲۲۲

• میر حسن • ۲۲۷ • امیر اثر • ۲۳۱ • مرزا جعفر علی حسرت • ۲۳۲ • نظیر اکبر آبادی • ۲۳۷

• غلام برہانی مصطفیٰ • ۲۵۲ • بختیاری عزت • ۲۵۶ • انصاف خاں الہ • ۲۶۰ • راجہ عظیم آبادی • ۲۶۳

• مرزا فتح علی دکنی • ۲۶۷ • شیخ انعام بخش تاج • ۲۶۹ • سعادت یار خاں دکنی • ۲۷۲

☆ انیسویں صدی عیسوی کا ادب

۲۷۷ ج ۲۸۶

□ انیسویں صدی کا سیاسی نظریہ

☆ غالب، ذوق، ظفر اور دیگر شعراء

۲۸۷ ج ۲۸۱

• مرزا غالب • ۲۸۹ • شیخ محمد اعجاز ذوق • ۳۰۲ • بہادر شاہ ظفر • ۳۰۷ • شاہد نصیر • ۳۱۰

• خواجہ حیدر علی آتش • ۳۱۲ • مرزا شوق کھنوی • ۳۱۶ • نواب سید محمد خاں دکنہ • ۳۲۶

• سلیم حسن خاں مومن • ۳۲۲ • امیر کھنوی • ۳۲۸ • فقیر محمد خاں کوٹا • ۳۳۰

• مصطفیٰ خاں شینو • ۳۳۲ • چندتاریخ حکیم • ۳۳۳ • حیرت علی آبادی • ۳۳۸

• محمد ناکھدی • ۳۵۱ • میر میری بخروج • ۳۵۲ • عبدالحمید پٹیل • ۳۵۵ • داغ دہلوی • ۳۵۷

• امیر اللہ سلیم • ۳۶۱ • سفیر نگاری • ۳۶۲ • صوفی سنیری • ۳۶۶ • اکبر داتا پوری • ۳۶۸

• شاد عظیم آبادی • ۳۷۰ • اکبر الہ آبادی • ۳۷۹ • عبدالغفور سندھ • ۳۸۲ • خواجہ محمد زید پوری • ۳۸۹

• اسد علی خاں قلندر • ۳۹۱ • میر وزیر علی بہار • ۳۹۵ • نظم علیا بلوچی • ۳۹۳ • فضل حق آرزو • ۳۹۶

• ریاض خیر آبادی • ۳۹۹ • مظفر خیر آبادی • ۴۰۳ • مرزا محمد خاں بقی • ۴۰۵

• غلام امام شہید • ۴۰۶ • علی اسد رشک • ۴۰۷ • عبدالغفور شہباز • ۴۰۸ • تنویر دہلوی • ۴۱۳

• شوق نبوی • ۴۱۵ • سرور جهان آبادی • ۴۱۹ • علی نقی حق کھنوی • ۴۲۳ • ساکن دہلوی • ۴۲۵

• لطیف انکم پوری • ۴۲۷ • جلیلہ خاں بخش • ۴۲۸ • قولہاں نقیب • ۴۳۱ • بہارک عظیم آبادی • ۴۳۳

• مولانا مظفر علی خاں • ۴۳۴ • آرزو کھنوی • ۴۳۶ • شوق غلام پوری • ۴۳۸

☆ مرثیہ اور مرثیہ گو شعراء

۴۴۲ ج ۴۴۲

• میر تقی حسن علی • ۴۴۲ • میر مظفر حسین خیر • ۴۴۵ • میرزا جعفر علی تصنیف • ۴۴۶

• محمد غفر علی بکیر • ۴۴۸ • میر بہار علی انیس • ۴۴۹ • مرزا سلامت علی دکنہ • ۴۵۲

• میر عشق • ۴۵۷ • یارے صاحب رشید • ۴۵۹ • بہار صمیم آبادی • ۴۶۰

☆ فورٹ ولیم کالج

۴۴۳ ج ۴۸۶

• ڈاکٹر جان گل کرست • ۴۶۳ • میراں دہلوی • ۴۶۸ • میر بہار علی صوفی • ۴۷۳

• شیر علی انیسویں • ۴۷۴ • حیدر بخش حیدری • ۴۷۵ • کاظم علی جاناں • ۴۷۶ • مظفر علی دلا • ۴۷۷

• اللولائی • ۴۷۸ • نہال چھلا دہلوی • ۴۷۸ • شجرف الدین • ۴۷۹ • بختیاری جاناں • ۴۸۰

• مرزا علی لطیف • ۴۸۱ • محمد اکرم علی • ۴۸۲ • مرزا جان بخش • ۴۸۳ • مولوی امانت اللہ شیدا • ۴۸۳

• حمید الدین بہاری • ۴۸۵ • مرزا محمد فطرت • ۴۸۵ • چارلی چمن مٹرا • ۴۸۵

☆ سرسید اور ان کا عہد

۴۸۷ ج ۵۲۵

• سرسید احمد خاں • ۴۸۷ • خواجہ غلام غوث بے خیر • ۴۹۳ • محمد صمیم آرزو • ۴۹۵

• ذیل علی احمد • ۵۰۰ • خواجہ الطاف حسین حالی • ۵۰۳ • نواب محمد علی ملک • ۵۱۱

• عبدالحمید سالک • ۵۱۲ • دکنہ ملک • ۵۱۳ • مولوی چراغ علی • ۵۱۵ • مولانا امام آرزو • ۵۱۷

• وحید الدین سلیم • ۵۲۰ • عبدالقادر بوردی • ۵۲۲ • مہدی قادری • ۵۲۳

☆ دلی کالج

۵۲۶ ج ۵۳۵

• باہر رام چندر • ۵۲۸ • مولوی اکاٹھ • ۵۳۱ • مولوی ملک علی • ۵۳۳

☆ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں تحقیق و تنقید ۵۵۵ تا ۵۳۷
 • مولوی عبدالحق ۵۳۹ • نصیر حسین نہال ۵۳۱ • حافظ محمود شیرانی ۵۳۲
 • نسیم الدین ٹنڈی ۵۳۷ • حامد حسن قادری ۵۳۹ • ابو الکلام آزاد ۵۵۲

☆ انیسویں اور بیسویں صدی کے ممتاز ڈرامہ نگار ۵۵۳ تا ۵۵۷
 • امانت کھوسو ۵۵۹ • مداری لال ۵۶۳ • آغا شہزاد کشمیری ۵۶۲ • حاجہ مسبین ۵۶۷
 • امتیاز علی تاج ۵۶۸ • محمد حبیب ۵۷۰ • ابراہیم حیات ۵۷۳ • اخلاق اثر ۵۷۳

☆ انیسویں اور بیسویں صدی میں طنز و مزاح ۶۳۰ تا ۵۷۷
 • رحیب علی بیگ سرور ۵۷۷ • انجم بانجوری ۵۸۳ • مرزا فرحت اللہ بیگ ۵۸۶
 • رشید احمد مدنی ۵۸۹ • عظیم بیگ چغتائی ۵۹۲ • علامہ مری ۵۹۵ • پطرس بخاری ۵۹۶
 • شوکت خانوی ۵۹۱ • کنیا لال کپور ۶۰۱ • رضا خانوی داسی ۶۰۳ • فرحت کاکوری ۶۰۸
 • گلرؤ نسوی ۶۱۰ • حسین عظیم آبادی ۶۱۲ • شکیل الرحمن ۶۱۳ • یوسف ناعم ۶۱۵
 • مشتاق احمد چغتائی ۶۱۲ • دلاور بک ۶۱۲ • کرل بک خاں ۶۱۳ • شہید فرحت ۶۲۵
 • احمد جمال پاشا ۶۲۶ • بختی مسین ۶۲۸

☆ انیسویں صدی کے اواخر میں اردو فکشن: داستان، ناول اور افسانہ ۶۵۶ تا ۶۳۷
 • چند متن ناتھ سرشار ۶۳۹ • فقی جاد حسین ۶۳۲ • مرزا محمد بانجوری رسوا ۶۳۳
 • محمد سرور حسین ۶۳۵ • عبد الحلیم شرر ۶۳۶ • راشد انجری ۶۳۸ • خواجہ حسن نظامی ۶۵۰
 • نیاز فتح پوری ۶۵۲ • انجم اعظم ۶۵۳ • لی۔ ایچ۔ اکبر آبادی ۶۵۵

☆ بیسویں صدی عیسوی کا ادب ۶۶۳ تا ۶۵۷
 □ بیسویں صدی کا سیاسی مضمون

☆ حلقہ اثر باب فزوق اور اس کے اہم فنکار ۶۶۳ تا ۶۹۸
 • نظام مصطفیٰ صوفی جسم ۶۶۷ • صدیق حسین خالد ۶۶۸ • محمد دین تاثیر ۶۷۰
 • انام داؤد ۶۷۳ • میراجی ۶۷۸ • حفیظ بوشید پوری ۶۸۲ • یوسف ظفر ۶۸۸
 • قیوم نظر ۶۹۱ • گلور جانورہری ۶۹۳ • عمار صدیقی ۶۹۵

☆ ترقی پسند ادب اور اس کے شعرا و ادباء ۷۰۸ تا ۶۹۹
 ☆ ترقی پسند شعری ۸۳۵ تا ۷۰۸

• علامہ محمد الدین ۷۰۰ • پرویز شاہدی ۷۳۵ • فیض احمد فیض ۷۳۸ • اسرار الحق مجاز ۷۴۶
 • مصین الحسن بدین ۷۵۳ • علی سردار جعفری ۷۵۵ • دہلی جونیوری ۷۷۰ • احسان دانش ۷۷۱
 • جاں نثار اختر ۷۷۳ • غلام ربانی طاہر ۷۷۶ • اختر ایمان ۷۷۹ • مجروح سلطان پوری ۷۸۵
 • علی جواری دینی ۷۹۷ • کمالی امجدی ۷۹۹ • یحییٰ ناظم آزاد ۸۰۳ • فیض شعلانی ۸۰۶
 • ساحر لدھیانوی ۸۱۱ • سلام بھٹی شہری ۸۱۷ • منظر شہاب ۸۱۹ • انیس احمد زوریاں ۸۲۲

☆ ترقی پسند فکشن ۸۲۷ تا ۸۹۹

• پریم چند ۸۲۹ • سورش ۸۳۶ • اعظم کرچوی ۸۳۷ • علی عباس حسینی ۸۳۸ • جلالہ ۸۳۹
 • ذاکر رشید جہاں ۸۴۵ • راج کمار سنگھ ۸۴۹ • اوچر ناتھ سنگھ ۸۵۰ • احمد علی ۸۵۳
 • حیات اللہ انصاری ۸۵۶ • سکیل عظیم آبادی ۸۵۸ • سعادت حسن منٹو ۸۶۳ • کرشن چندر ۸۷۱
 • راجندر سنگھ بیدی ۸۷۹ • عصمت چغتائی ۸۸۷ • احمد ندیم کاکا ۸۹۱ • رضیہ بانجوری ۸۹۶
 (نوٹ: یہ سلسلہ دوسری لہر میں الگ ذہن کے فکشن نگاروں کے ساتھ جاری ہے)

☆ بیسویں صدی میں اردو تحقیق و تنقید: ترقی پسند اور دوسرے ۹۰۱ تا ۸۵۱

• بھٹوں گوہر کپوری ۹۰۳ • آل احمد سرور ۹۰۷ • اختر حسین رائے پوری ۹۱۳
 • احتشام حسین ۹۱۶ • عزیز احمد ۹۲۲ • ممتاز حسین ۹۲۵ • شبلی نعمانی ۹۳۰
 • عبدالجبار دیوبادی ۹۳۵ • مسعود حسن رضوی دریب ۹۳۸ • غلام رسول میر ۹۳۱
 • قاضی عبدالغفور ۹۳۲ • راجہ پونکین ۹۳۶ • سید اجاز حسین ۹۳۸ • نجیب الرحمن بکری ۹۵۰
 • یوسف حسین خاں ۹۵۱ • گنی الدین قادری زور ۹۵۳ • امتیاز علی عرشی ۹۵۴
 • خواجہ نظام السیدین ۹۵۷ • شوکت بھڑوانی ۹۵۹ • سید عبداللہ ۹۶۰ • اکرام نام ۹۶۳
 • عظیم الدین احمد ۹۶۳ • شاہد احمد بلوی ۹۶۶ • وقار عظیم ۹۶۸ • اختر اورینڈی ۹۷۰
 • نور الحسن ہاشمی ۹۷۳ • سید حسن ۹۷۳ • مصین الدین بدایونی ۹۷۵ • صابر الدین عبدالرحمن ۹۷۷
 • احسن فاروقی ۹۷۸ • سید حسن ۹۷۹ • شاد بھٹو ۹۸۱ • خواجہ احمد فاروقی ۹۸۳
 • عبداللطیف اعظمی ۹۸۳ • صدر الدین خٹناکشی ۹۸۶ • مسعود حسین خاں ۹۹۸
 • خورشید اسلام ۹۹۰ • عبادت بریلوی ۹۹۲ • پرویز دشت ۹۹۳ • محمد حسن مسکری ۹۹۳
 • وزیر آغا ۹۹۷ • بلال الزماں ۱۰۰۰ • گیان چند بھٹن ۱۰۰۲ • فخر احمد طلوی ۱۰۰۳
 • راج بہادر گور ۱۰۰۶ • محمد طفیل ۱۰۰۷ • اجپری شمل ۱۰۰۹ • شبیہ الحسن فاضل ۱۰۱۰
 • مختار الدین احمد آردو ۱۰۱۱ • کمال داس گپتا رشتہ ۱۰۱۳ • طاہر انصاری ۱۰۱۵
 • مسیح الزماں ۱۰۱۷ • اسلوب احمد انصاری ۱۰۱۸ • فہیمہ تقی ۱۰۲۰ • شجاع حسین ۱۰۲۲

• انور سیدی ۱۰۳۳ • دارت ملوی ۱۰۳۶ • دلیچہ داس ۱۰۳۰ • سید محمد عقیل رضوی ۱۰۳۱ •
 • جمیل جالبی ۱۰۳۳ • عبدالغفار کلعل ۱۰۳۷ • اکبر حیدری ۱۰۳۷ • مفتی نجم ۱۰۳۹ •
 • محمود النبی ۱۰۵۰ • عبدالقوی سنوی ۱۰۵۱ • شافعی رحمانی بھٹا چاریہ ۱۰۵۲ • نظیر صدیقی ۱۰۵۳ •
 • نادم ٹٹنی ۱۰۵۷ • کلعل الرحمن ۱۰۶۰ • گوپی چند نارنگ ۱۰۶۲ • قمر بخش ۱۰۶۷ •
 • حامدی کاشمیری ۱۰۷۲ • سیح الحق ۱۰۷۵ • اسلم پرویز ۱۰۷۷ • فصیح شہر ۱۰۷۷ •
 • نور الحسن نقوی ۱۰۷۸ • قادر احمد فاروقی ۱۰۷۹ • سلیم اختر ۱۰۸۲ • عابد رضا بیدار ۱۰۸۳ •
 • سیدہ منظر ۱۰۸۵ • ضیف کیفی ۱۰۸۹ • شمس الرحمن فاروقی ۱۰۸۹ • شفیق خواجہ ۱۰۹۱ •
 • نظام صدیقی ۱۰۹۰ • شادب دودلوی ۱۰۹۳ • عظیم الشان صدیقی ۱۰۹۵ • خلیق انجم ۱۰۹۷ •
 • مظفر اقبال ۱۰۹۸ • یوسف سرست ۱۰۹۹ • کرامت علی کرامت ۱۱۰۰ • عبدالغنی ۱۱۰۱ •
 • انصار اللہ فخر ۱۱۰۳ • فضیل احمد بھٹری ۱۱۰۳ • ابراہیم سحر ۱۱۰۵ • عابد پشاور ۱۱۰۷ •
 • نور رحمانی ۱۱۰۷ • عثمان بشتی ۱۱۰۸ • نجم الدین ۱۱۱۰ • شمس الدین ۱۱۱۲ • امیر اللہ خاں شاہین ۱۱۱۳ •
 • شمیم علی ۱۱۱۳ • جعفر رضا ۱۱۱۵ • احمد شاہ ۱۱۱۷ • عجم کاشمیری ۱۱۱۸ • داؤد نجم ۱۱۲۰ •
 • حاجی بکامی ۱۱۲۱ • قتیل اللہ ۱۱۲۳ • اکبر علی خاں عرش زادہ ۱۱۲۶ • عبدالوہاب ۱۱۲۶ •
 • قیس علی عالم ۱۱۲۸ • سلیم بیانی ۱۱۳۸ • قمر اعظم بانی ۱۱۳۹ • مرزا خلیل اللہ بیک ۱۱۴۰ •
 • قدوس جاوید ۱۱۳۲ • مائر عاشق بیک گالوی ۱۱۳۳ • قاضی افضال حسین ۱۱۳۴ •
 • مرزا عبد بیک ۱۱۳۶ • منصور عالم ۱۱۳۷ • ابوالکلام قاسمی ۱۱۳۹ • مولانا ابوالکلام قاسمی شمس ۱۱۴۰ •
 • تقی عابدی ۱۱۴۱ • منظر اعجاز ۱۱۴۲ • سفیر انوار ایم ۱۱۴۳ • علی احمد قاسمی ۱۱۴۴ • اعجاز علی ارشد ۱۱۴۵ •
 • سید محمد اشرف ۱۱۴۶ • ارتضیٰ کریم ۱۱۴۷ • شمس بدایونی ۱۱۴۸ • شہاب غفر عطسی ۱۱۴۹ •

میسویں صدی میں اردو نگار:

۱۱۵۷ تا ۱۱۷۳

رومان پسند، ترقی پسند، جدیدیت پسند اور مابعد جدیدیت پسند

• سجاد حیدر بلوچ ۱۱۵۹ • سلطان حیدر جوش ۱۱۶۲ • قاضی عبدالغفار ۱۱۶۲ • نادر جادوید ۱۱۶۹ •
 • ممتاز مفتی ۱۱۶۸ • نظام عباس ۱۱۷۱ • حسن عظیم آبادی ۱۱۷۲ • صالحہ عابد حسین ۱۱۷۶ •
 • سادک کھوسو ۱۱۷۸ • الیاس اسلام پوری ۱۱۷۹ • خواجہ احمد عباس ۱۱۸۰ • جمیل احمد کنہ جادویدی ۱۱۸۳ •
 • سید انور ۱۱۸۳ • کلعل اختر ۱۱۸۶ • قدرت اللہ شہاب ۱۱۸۸ • شمس مظفر پوری ۱۱۹۰ •
 • محمود بانی ۱۱۹۳ • سیدہ عائشہ ۱۱۹۳ • غلام الشکین نقوی ۱۱۹۵ • شوکت صدیقی ۱۱۹۷ •
 • رام لعل ۱۱۹۸ • مجلس احمدی ۱۲۰۳ • اسلم عرفی ۱۲۰۳ • ممتاز شیریں ۱۲۰۴ • انور عظیم ۱۲۰۷ •
 • ابراہیم طیس ۱۲۱۰ • انتظار حسین ۱۲۱۲ • اشفاق احمد ۱۲۱۷ • جگر محمد پال ۱۲۱۸ •

• غیاث احمد گدی ۱۲۳۳ • بانو قدسیہ ۱۲۳۸ • باجرہ سرور ۱۲۴۱ • اقبال حسین ۱۲۴۲ •
 • شفیق شہیدی ۱۲۴۳ • کوزلین ۱۲۴۶ • ذکی انور ۱۲۴۷ • نذیر کٹر در کرم ۱۲۵۰ •
 • انجمدار اثر ۱۲۵۱ • صمیم شاہد ۱۲۵۲ • احمد یوسف ۱۲۵۳ • سرحد پور کاش ۱۲۵۶ •
 • کلام حیدری ۱۲۵۹ • سید صدیقی ۱۲۶۳ • سنیہ پال آنند ۱۲۶۳ • عابد جمیل ۱۲۶۵ •
 • قاضی عبدالستار ۱۲۶۶ • شہزاد مظفر ۱۲۶۹ • محمود واجد ۱۲۷۱ • انور سجاد ۱۲۷۳ •
 • شمیم بیکل ۱۲۷۵ • اقبال مجید ۱۲۷۶ • گلزار ۱۲۷۸ • بلراج سنہا ۱۲۸۱ • شفیق جاوید ۱۲۸۳ •
 • احمد بخش ۱۲۸۸ • الیاس احمد گدی ۱۲۹۲ • گیان سنگھ شاطر ۱۲۹۵ • بیلا بی بانو ۱۲۹۷ •
 • قیس عظیم ۱۳۰۱ • قمر مسعود ۱۳۰۲ • نقیاد ۱۳۰۵ • رشید امجد ۱۳۰۶ • خالدہ اختر ۱۳۰۷ •
 • مستنصر حسین تارڑ ۱۳۰۸ • حبیب حق ۱۳۰۹ • شبر نام ۱۳۱۰ • ظفر ابوبکری ۱۳۱۱ •
 • مظفر کاشمی ۱۳۱۲ • سلام بن رزاقی ۱۳۱۵ • انور خاں ۱۳۱۷ • اختر یوسف ۱۳۱۹ •
 • شہاب الدین ۱۳۲۱ • آشا ابوالحسن ۱۳۲۲ • ظہور الدین ۱۳۲۳ • علی حیدر ملک ۱۳۲۴ •
 • ذکیہ شہیدی ۱۳۲۵ • شام بارک پوری ۱۳۲۶ • شفیق ۱۳۲۷ • انیس رفیع ۱۳۲۹ •
 • جاوید حسین ۱۳۳۱ • حمید سہروردی ۱۳۳۳ • رضوان احمد ۱۳۳۴ • قمر جہاں ۱۳۳۵ •
 • بیک احساس ۱۳۳۵ • عید قر ۱۳۳۷ • شہکشاں انجم ۱۳۳۸ • مرزا اعجاز بیک ۱۳۳۸ •
 • سلیم خٹراو ۱۳۴۰ • حسین الحق ۱۳۴۳ • قرآن سن ۱۳۴۷ • شوکت حیات ۱۳۴۸ •
 • شکیل احمد ۱۳۵۱ • محمد مظہر الزماں خاں ۱۳۵۶ • مشتاق احمد نوری ۱۳۵۷ • نثار عظیم ۱۳۵۸ •
 • عبدالصمد ۱۳۵۸ • علی نام ۱۳۶۱ • عفتقر ۱۳۶۳ • نجم الحسن رضوی ۱۳۶۴ • ساجد رشید ۱۳۶۵ •
 • شرف عالمہ دوتی ۱۳۶۷ • نظام آغا ۱۳۷۰ • اکبر کنول ۱۳۷۳ •

میسویں صدی میں اردو شعاعی: متشوع ذہن و فکر کے فنکار

۱۸۰۸ تا ۱۳۷۵

• علامہ اقبال ۱۳۷۷ • مولانا محمد علی جوہر ۱۳۸۷ • قاضی بدایونی ۱۳۹۲ • نوح تاروی ۱۳۹۵ •
 • بیس سنہاروی ۱۳۹۷ • سید ابوبکر آبادی ۱۳۹۸ • عرش آبادی ۱۴۰۲ • عظیم الدین احمد ۱۴۰۳ •
 • حسرت موہانی ۱۴۰۶ • رضا علی دشت ۱۴۱۱ • برج نائن پکچسٹ ۱۴۱۵ • شوق قدوسی ۱۴۲۱ •
 • عزیز بکھوی ۱۴۲۳ • جگر موہانی ۱۴۲۵ • عبدالمنان بیول ۱۴۲۷ • میرزا یاسین گاندہ پکچری ۱۴۲۸ •
 • اختر گوڈوی ۱۴۳۷ • جوش ملیح آبادی ۱۴۴۰ • اقبال سبیل ۱۴۴۱ • جعفر علی خاں اختر بکھوی ۱۴۴۲ •
 • ہفت برج موہن دت تریہ بکلی ۱۴۴۶ • گوگ پندہ خروم ۱۴۴۹ • عفتقر اللہ خاں ۱۴۵۳ •
 • سرکار ی ۱۴۵۲ • قنیا بکھوی ۱۴۵۹ • جگر مراد آبادی ۱۴۶۱ • عذیب شاہدانی ۱۴۶۶ •
 • مسلم عظیم آبادی ۱۴۶۸ • زار عظیم آبادی ۱۴۷۰ • تاقب عظیم آبادی ۱۴۷۱ •

- بیت سعیدی ۱۳۸۳ • چذت ہری چند اختر ۱۳۸۷ • جمیل مظہری ۱۳۸۹ • اختر شیرانی ۱۳۹۳
 • سامر نظامی ۱۳۹۸ • عبد المجید شمس ۱۵۰۰ • عطا کا کوئی ۱۵۰۱ • مظفر حسین ۱۵۰۲
 • مراد علی بیگ ۱۵۰۶ • مولیٰ علی مل ۱۵۰۹ • (جلی) رضوی ۱۵۱۲ • ریش صدیقی ۱۵۱۳
 • شکیل جٹانی ۱۵۱۶ • فہیم کر پانی ۱۵۱۸ • انوس ہسرای ۱۵۲۰ • واقف عظیم آبادی ۱۵۲۲
 • مجید احمد ۱۵۲۵ • بخت ارغاشی ۱۵۲۷ • خورشید احمد جانی ۱۵۲۸ • اختر قادری ۱۵۳۰
 • قلیل بدایونی ۱۵۳۳ • شمس نواب دانش ۱۵۳۶ • رحیم آبادی ۱۵۳۷ • سیدی احمد ارشد شاہ ۱۵۳۹
 • مظفر حیدری ۱۵۴۰ • یازید ۱۵۴۱ • سلیمان باریب ۱۵۴۲ • احسان درہنگوی ۱۵۴۶
 • نظام الدین فیض ۱۵۴۷ • دکانگ پوری ۱۵۴۹ • نیب الرحمن ۱۵۵۱ • حسن عظیم ۱۵۵۲
 • قیوم اختر ۱۵۵۸ • ناصر کالی ۱۵۵۹ • وقت سروش ۱۵۶۳ • گلزار بلوخی ۱۵۶۷ • عظیم حاج ۱۵۶۹
 • جمیل الدین علی عالی ۱۵۷۳ • اداس بھٹری ۱۵۷۷ • جیلانی کامران ۱۵۸۰ • کمال احمد صدیقی ۱۵۸۳
 • ری مصحوم رضا ۱۵۸۵ • زلیخا کارشار ۱۵۸۶ • (ن) انشاء ۱۵۸۸ • محمد بلوخی ۱۵۹۳
 • سلیم احمد ۱۵۹۷ • قاضی سلیم ۱۶۰۰ • ناظر الحسنی ۱۶۰۳ • مظہر ایم ۱۶۰۴ • حرمت الکریم ۱۶۰۸
 • بیکل آسای ۱۶۱۱ • کنور ہندو سنگھ بیدی ۱۶۱۱ • بلراج کول ۱۶۱۲ • حبیب جالب ۱۶۱۵
 • منیر یازی ۱۶۲۰ • مینتی مٹی ۱۶۲۲ • ارشد کا کوئی ۱۶۲۵ • فرحت قادری ۱۶۲۸
 • پرکاش بھگتی ۱۶۳۰ • شفیق طاہر شمری ۱۶۳۳ • انجریائی ۱۶۳۵ • جماعت علی شاعر ۱۶۳۶
 • فتح اللہ بیدی ۱۶۳۲ • مدح ترنن باز ۱۶۳۳ • شمس عارف بہار آبادی ۱۶۳۶ • صدیقی بھگتی ۱۶۳۸
 • اختر خان نظامی ۱۶۵۱ • ہانی ۱۶۵۲ • مصور بھڑی ۱۶۵۹ • عاشور کالی ۱۶۵۹ • ہانی انصاری ۱۶۶۱
 • دیاب دانش ۱۶۶۳ • اختر ۱۶۶۵ • شاکر ۱۶۶۵ • ہوک محمد پوری ۱۶۶۷ • صابر آبادی ۱۶۷۵
 • ممتاز احمد ۱۶۷۵ • حسن احسان ۱۶۷۷ • جون ایلیا ۱۶۷۹ • کنور سعیدی ۱۶۸۲ • شہاب بھٹری ۱۶۸۶
 • بشیر ۱۶۹۰ • وحید اختر ۱۶۹۳ • فقیر گوکھیری ۱۶۹۶ • بھگت ۱۶۹۸ • شہر یار ۱۷۰۰
 • سانی فاروقی ۱۷۰۵ • مظفر علی ۱۷۰۸ • زہر رضوی ۱۷۱۱ • اعجاز افضل ۱۷۱۵ • زہر نگار ۱۷۱۹
 • کنور بھید ۱۷۲۱ • وکیل اختر ۱۷۲۲ • قیصر شمس ۱۷۲۳ • فقیر میدی ۱۷۲۴ • غلام حسن رانی ۱۷۲۸
 • طاہر رضوی برق ۱۷۲۹ • ارواں بھگتی ۱۷۳۲ • سیدولی شاہین ۱۷۳۳ • ظہیر صدیقی ۱۷۳۸
 • مظہر بھگتی ۱۷۴۱ • فقیر غزالی ۱۷۴۳ • زیب نوری ۱۷۴۴ • عطاء علی ۱۷۴۵ • عرفان بھگتی ۱۷۴۸
 • سید احمد شمس ۱۷۵۲ • ظہیر غازی پوری ۱۷۵۵ • سلطان اختر ۱۷۵۷ • انیس ناگی ۱۷۶۱
 • انکار جالب ۱۷۶۳ • شاہد احمد شیب ۱۷۶۳ • فلیب ایاز ۱۷۶۶ • حسن نواب ۱۷۶۷
 • عظیم بھگتی ۱۷۶۸ • لطف الرحمن ۱۷۶۹ • حنیف زین ۱۷۷۱ • شاہدانی ۱۷۷۲ • شمس بھگتی ۱۷۷۵
 • صادق ۱۷۷۶ • انکار عارف ۱۷۷۸ • اظہر بھگتی ۱۷۸۲ • بھیدہ دانش ۱۷۸۳ • امیر آغا قزلباش ۱۷۸۸
 • مبارک احمد ۱۷۸۹ • انکار امام صدیقی ۱۷۹۱ • شمس کاف نظام ۱۷۹۲ • شجاع خاور ۱۷۹۳

- ۱۸۸۹ء کے آس پاس اور اس کے بعد کا منظر نامہ ۱۸۰۹ء تا ۱۹۱۲ء
 (ذیل کے تمام لوگ مابعد جدید دور کے حامی نہیں بلکہ بھی ان میں اکثر ۱۹۰۸ء کے آس پاس
 نمایاں ہوئے ہیں۔ جس فنکار کا جو خطہ نظر رہا ہے وہ اس کی بحث میں داخل ہے۔)
 • عبدالنار طرزی ۱۸۱۳ • بلخ انوار احمد ۱۸۱۶ • نور صدیقی ۱۸۱۷ • اکرام باگ ۱۸۱۸
 • عبداللہ سار ۱۸۱۹ • سجاد ۱۸۲۰ • امیر کھٹک ۱۸۲۱ • شاہد عظیم ۱۸۲۲ • شہباز ندیم خاکی ۱۸۲۵
 • مختار ۱۸۲۵ • صلاح الدین پوری ۱۸۲۷ • فرحت احساس ۱۸۳۰ • فہیم طارق ۱۸۳۱
 • انجم بھگتی ۱۸۳۲ • امیر اکرام بھگتی ۱۸۳۳ • طارق چھتری ۱۸۳۵ • سید احمد بھگتی ۱۸۳۷
 • فہیم بھگتی ۱۸۳۷ • راشد جمال فاروقی ۱۸۳۹ • منصور عمر ۱۸۴۰ • اقبال حسن آزاد ۱۸۴۱
 • متاب حیدر نقوی ۱۸۴۲ • اسد بھگتی ۱۸۴۳ • راشد طراز ۱۸۴۵ • ارشد بھگتی ۱۸۴۷
 • رکش الدین بھگتی ۱۸۴۹ • شہنازی ۱۸۵۰ • عقیل بھگتی ۱۸۵۲ • ظفر جمیل ۱۸۵۳ • خورشید اکبر ۱۸۵۳
 • عالم خورشید ۱۸۵۸ • ظفر کالی ۱۸۶۱ • شافع قدوائی ۱۸۶۱ • قاسم خورشید ۱۸۶۲
 • کنگھاس پوری ۱۸۶۳ • ملک آزادہ جلی ۱۸۶۵ • فاروقی اختر ۱۸۶۶ • شمس رمزی ۱۸۶۷
 • قلیل بھگتی ۱۸۶۸ • امام عظیم ۱۸۶۹ • عمران عظیم ۱۸۷۱ • عطاء جلی ۱۸۷۲ • جمال الدینی ۱۸۷۳
 • سلیم انصاری ۱۸۷۷ • زمر ریاض ۱۸۷۸ • مولا علی ۱۸۸۰ • امجد اشرف ۱۸۸۰
 • سرور ساجد ۱۸۸۲ • ریاض لطیف ۱۸۸۳ • کوثر طہری ۱۸۸۴ • فہیم احمد شمس ۱۸۸۵
 • حسن رضا رضوی ۱۸۸۵ • معذرا نام بھگتی ۱۸۸۷ • غزال عظیم ۱۸۸۸ • حقانی نظامی ۱۸۸۸
 • نعمان شوق ۱۸۸۹ • عالم شہزاد بھگتی ۱۸۹۰ • سراج بھگتی ۱۸۹۰ • مشتاق احمد ۱۸۹۵
 • رسول سانی ۱۸۹۶ • مشتاق صدف ۱۸۹۷ • نوشاد احمد کریمی ۱۸۹۹ • ظہیر رحمتی ۱۹۰۰
 • طارق متین ۱۹۰۱ • سرور الدینی ۱۹۰۳ • خالد عبادی ۱۹۰۵ • راشد انور راشد ۱۹۰۶
 • شکیل اعظمی ۱۹۰۸ • عادل حیات ۱۹۰۹ • انوری عظیم ۱۹۱۰

۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۳ء

۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۵ء

- ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۳ء
 • لاڈلے صاحب چٹاپ ۱۹۱۷ • امیر حسنی کنوری ۱۹۱۹ • نشر و ادبی ۱۹۲۰
 • الطہر پوری ۱۹۲۲ • حسن امام ورد ۱۹۲۳ • محمد شفی رضوی ۱۹۲۵ • رشید حسن خان ۱۹۲۶
 • طاہر شفی ۱۹۲۸ • احمد مشتاقی ۱۹۳۱ • ظفر اقبال ۱۹۳۵ • امین اشرف ۱۹۳۹ • محمد سالم ۱۹۳۱
 • حنیف نقوی ۱۹۳۳ • صدیق الرحمن قدوائی ۱۹۳۳ • شمیم کمالی ۱۹۳۵ • محمد رضا آزاد ۱۹۳۷
 • قاضی عیوب الرحمن بھگتی ۱۹۳۸ • عبدالقیوم بھگتی ۱۹۳۹ • جمشید قر ۱۹۵۰ • جمیل اختر ۱۹۵۱
 • انحلا نامہ (جلد اول، جلد دوم، جلد سوم) ۱۹۵۳ء تا ۱۹۶۵ء
 • اشاریہ اشخاص (جلد اول، جلد دوم، جلد سوم) ۱۹۶۷ء تا ۲۰۵۶ء

احوال واقعی: یہ تاریخ ادبِ اردو کیوں؟

اردو ادب کی مکمل تاریخ کی اشاعت کا مسئلہ شاید اب سلجھ سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ چھوٹی بڑی ادبی تاریخ کی کتابیں مسلسل شائع ہو رہی ہیں جن میں بعض علاقوں پر خصوصی توجہ کی گئی ہے۔ یہ صورت اس لئے بھی ابھری ہے کہ علاقائی سطح کا ادبی تحقیقی سرمایہ قابل لحاظ حد تک سامنے آ گیا ہے۔ گویا اب اردو ادب کی مکمل تاریخ کی طرف بڑھتے ہوئے قدم کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن جو چیز صرف نظر کی جارہی ہے وہ تاریخ نگاری کا نیا تصور ہے جو پرانے طریق کار کو یکسر ختم تو نہیں کرتا لیکن اس کے ابھار کی وجہ سے پرگیری نظر رکھنے پر زور دیتا نظر آتا ہے۔ یہ درست بھی ہے اس لئے ادب یا ادبی کہ کہ ہم تمام علوم سے اپنا رشتہ نہیں توڑ سکتے دراصل کسی ادبی تخلیق کی بحث میں خالق کے کتنے جہات کی کاٹ مانی، وقتی ہے یا ہر کتنی ہے اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ پھر وہ جس سماجی نظام، ثقافتی سطح، نفسیاتی تہذیب، زمان، سیاسی ماحول، علاقائی اور ملکی پھر عالمی ماحول میں جیتا ہوتا ہے وہ انداز کسی نہ کسی سطح پر اس کی نگار کا حصہ ہے ہی۔ لہذا جدید و قدیم ثقافت اور فکر سے اس کا رشتہ ٹوٹے ہوتا ہے۔ اس کے داخلی و خارجی احوال کی کیا ہی کسی لحاظ سے اکبری نہیں ہوتی، جو بھی نہیں سکتی۔ اب ادبی تاریخ لکھنے والا بھی ان نکات کو یکسر روٹھیں کر سکتا ہے اس لئے کہ ایک ادبی تاریخ نویس بھی اپنے زمانے میں قیام ہوتا ہی ہے۔ ماضی کی بھی قیود یہ کرتا ہے۔ گویا وہ ایک زمانے سے دوسرے زمانے کا سیدھی گھبر میں سفر نہیں کرتا بلکہ زمانوں کے درمیان کے ساتھ ادبی منزل کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ یعنی اب ادبی تاریخ لکھنے والوں کے سامنے بھی نئے

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن در آ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدنی در دل کشا بہ چمن در آ
(بیدل)

جاسکتی ہے۔ اگر یہ تصویر بھی قائم رہے تو نئے مطالبات کی کچھ شکوک کے خالے ہماری ادبی تاریخ کے جزو ہو سکتے ہیں۔

اردو کی ادبی تاریخ کے دیکھنا چاہئے مطالبات بھی ہیں جن کی طرف توجہ نہیں کی گئی تو تاریخ نویسی کام کی نہیں رہتی۔

اگر موقف یہ رہے کہ آسانی سے جو مادہ حاصل ہو جائے وہ کافی ہے۔ اس میں مطلب دیاس کی چھان پھانک کے لئے صحت

مطلوب ہے، اگر ایسے معاملات میں ہی مورخ الجھ جائے تو پھر کام آگے کیسے بڑھے گا یہ بات اہم سمجھیں تباہات،

اطلاعات، دست فریب کاری، بیانات میں غلو، غلو کو او کی حوالہ دے کر حقیقی انکشافات سے بے خبری وغیرہ کسی بھی تاریخ کو

واقف ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں۔ ہمیں احساس ہونا چاہئے کہ گزشتہ پچاس برسوں میں نئی تحقیقات کا ایک پیش بہا

خزانہ اکٹھا ہو گیا ہے۔ تذکرہوں کے اظہار کی صحیح کا کام سراجیاس پانہا ہے۔ بعض اہم شاعروں کی زندگی کے احوال اور

خود ان کے کلام کے بہت سے صحیح مسائل مل ہو چکے ہیں اور بعض مل ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر آج کا ادبی مورخ ان

سے صرف نظر کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ ایک دشواری ضرور ہے کہ ایک محقق دوسرے محقق کے کام کو مبرا کہہ سکتا ہے یا نہیں نظر آتا

ہے کہ اس کے پاس اپنے ذرائع ہوتے ہیں، اب تاریخ لکھنے والے کا کام ہے کہ وہ اپنی بصیرت، قوت تحلیل اور علمی ڈھن کو

کام میں لانے اور کسی آخری فیصلے پر پہنچ جائے یا پھر بصورت دیگر متنازع امور کو اس طرح پیش کرے کہ پڑھنے والا اپنی

بصیرت کا محرک رکھ سکے اور کسی نتیجے پر سرگرم ہو سکے۔ تحلیل جالی کے یہاں یہ شعور بہت اہم موجود ہے، کیا ان چند چیزیں اور

سیدھا شعری تاریخوں میں بھی یہ کیفیت نمایاں ہے۔ قسم کا شمیری کے یہاں عقلی اور تجرباتی قوت کا احساس ہوتا ہے۔

اس کا یہ مفہوم نہیں کہ پہلے جو تاریخیں قلمبندی کی ہیں دوسرے سے ایسے "شعور" سے پرکھ جائیں۔ اور اصل قصہ شعور کو زیادہ

محرک اور فعال رکھنے کا ہے، اور ایک ہی تاریخ ہیئت کے لئے کافی دشواری ہو سکتی ہے، جواز مذکور دھوکے کی علامت ہوگی۔

ادبی تاریخ نویسی کے باب میں یہ بحث بھی چلی آتی ہے کہ سوانح کے بھی حالات کیا ہوں، کسی ادیب یا شاعر کی

زندگی کے حقائق، اس کی تعلیمات یا آثار شاعری کی تنظیم میں کس حد تک معاون ہو سکتے ہیں، یہ بھی ایک مسئلہ ہے۔ اب تو

مختلف کی موت کا اعلان ہو گیا ہے تو پھر سوانح کی ضرورت کیا ہے؟ میں نے گہری مباحث میں فی الحال پڑنا نہیں چاہتا

لیکن اگر کسی شاعر یا ادیب کی زندگی اس کی تنظیم میں معاون نہ بھی ہو تب بھی اس کی زندگی کے حقائق سے غافل رہنے کا

جواز نہیں پیدا ہوتا۔ ایک معنوی سی مثال دینی جاسکتی ہے کہ غالب تو طرح طرح کے "عیوب" میں مبتلا تھے لیکن ان

کی شاعری؟ گویا یہی صورت میں زندگی کے احوال اور بھی اہم ہو جاتے ہیں۔ اور اصل گفتگو قاسب کی ہونی

چاہئے کہ زندگی کے حقائق اسے خوں نہ ہو جائیں اور فکر پر گفتگو سرسری ہو جائے۔ سوانح اور غزلیوں کے مباحث میں

خوشگوار ہمہ آہنگی اور قاسب کا پناہ حسن ہے جسے ضائع نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے اردو ادب کی تاریخ لکھنے والا ہوتا ہے کہ سوانحی

اخبارات کا حصول بھی آسان نہیں، ہمارے یہاں اب تک ادبی و شعریاں یا معتقد معاون کتابیں بے حد کمیاب ہیں، ان

کا کچھ حصول آج بھی کار مشکل ہے۔ حالانکہ یہ کہہ کر یہاں نقل اور موت کے دن تاریخ کی تلاش میں آج بھی ہفت خواں

دوسرے لوگوں نے شدت سے اس کی کا احساس کیا تھا ہے اپنے خود پران ادب کے جاں نثروں نے جہل بھی کی لیکن بخیر

کام اکمل ہے۔ ادبی تاریخ لکھنے والوں کا اس باب میں اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہئے، ذرا سی غفلت ہوئی اور سارا

کیا دھار جارت ہوا، اس کی ایک جہت مثال میں گزرا چہر تاریخ اردو ادب کا پھل پھلک ہے، جس کی جھلک انعام کا

پیش رو ثابت ہوئی اور وہ بھی سوانحی معاملات میں، حالانکہ آج بھی اس میں بعضوں کی تحریریں کی اہم نکات سے آگاہ کرتی

ہیں۔ گویا سوانحی امور کچھ زیادہ بے کسی کا جتے ہیں، جس کا احساس ہر ادبی تاریخ لکھنے والے کو ہونا چاہئے۔ مجھے بھی ہوا ہے۔

ایک اور مسئلہ جو ادبی مورخ کے سامنے ہوتا ہے وہ تذکرہ کاروں کے ذرا احتیاط سے متعلق ہے، جہاں وہیں لکھنے والے

تذکرہ کاروں اور رسالوں کے ادراک کی ذمہ داری ہے۔ ایک مسئلہ تو ان اہم اور نامور شاعروں اور ادیبوں کا ہے جو زمانے کی گرد

سے پرے ہو چکے ہیں اور اپنے اپنے دور میں اپنے مخصوص جہاں اور انداز کی وجہ سے ادبی تاریخ کا ٹوٹ حصہ ہیں، لیکن مسئلہ

کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ بعضوں پر سے اچانک گرد و غبار جھڑ جاتے ہیں اور کسی محقق، ادیب، دانشور یا نقاد کی فکر میں

لگا ہیں انہیں نئی زندگی دینی ہیں اور وہ بھی تاریخ کا درجہ بننے کا جواز بن جاتے ہیں۔ مورخ کو ایسے فراموش شدہ ناموں

کی تجدید سے خاکہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ انہیں اپنے وقتوں پر رکھنا چاہئے کہ کہاں تک یہ آثار و آثار اس ادب

ہے کہ اس پر توجہ کی جائے۔ خود ادبی تاریخ کے مورخ کو اپنے خود پر بعض فراموش شدہ دیگر اہم تذکرہ کاروں کی تلاش کرنی

چاہئے جو وقت اور حالات کی حتم طریق، کئی تعصب وغیرہ کے شکار رہے ہیں اور ادب کی تاریخ سے ذات بہرہ ور دے

گئے ہیں۔ اگر کوئی مورخ ایسی چھان پھانک کرنا ہے اور اس کے پاس تجدید حیات کے لئے جہاز و درمل موجود ہے تو اسے

امت کرنی چاہئے اور ایسے تذکرہ کاروں کو آگے بڑھ کر نکلانا چاہئے۔ ادبیات کی تاریخ میں ایسی مثالیں بڑی ہیں کہ

مورخ کا ذاتی تعصب رنگ لایا ہے اور اگر انقدر شخصیت اس کے معاملہ تحریر سے باہر دیتی ہے۔ ایک کھانسی مثال مومن

کے بارے میں دینی جاتی رہی ہے کہ کس طرح محمد حسین آزاد کی "آب حیات" کا پہلا ایڈیشن مومن کے ذکر سے غالی

رہا۔ پھر علینا ہے، اداؤں کے تحت بعد میں انہیں شریک کرنا پڑا، محمد نسیم آزاد بھی انہیں، شعر و ادب کے اداکار اور ایسے عمل سے

گزر رہے ہیں۔ اردو شاعری پر ایک "نظر" از: علیم الدین احمد پر ایک نظر ڈالئے، شاد و علیم آبادی کی کہیں نہیں ملیں گے۔

لیکن جب ایک اہم اور سب سے علیم الدین احمد کو شاد و علیم آبادی کے درجہ ان کو ایف کرنے کا کام مرحمت کیا تو اب

موجود کی نگاہ میں شاد اور غالب کے ساتھ غزل گوئی میں شہیت جاتے ہیں۔ یہ ہی علیم شاد و علیم آبادی کی نہیں علیم الدین

احمد کی ہے جنہوں نے غایت تعصب سے کام لینے ہوئے شاد کو نظر انداز کیا، پھر اپنے گناہ کی پاداش بھی خود ہی کی یعنی ان

کاروان مرتب کیا، وہاں تفصیل میں چاہا ہے سوجہ۔ اس لئے کہ بہت سے تذکرہ واقعات سامنے لانے پڑیں گے۔

ادبی مورخ کی اپنی پسند یا پند اپنی جگہ لیکن عاقلی تعصب بھی کسی کے یہاں لگنے کی چانس رہا ہے۔ اپنے

خانے کے ہر کہہ و کہہ کو اشتداد بخفا، انہیں پائس پر چڑھانا اور دوسرے جانوروں کے ہزار تذکرہ کاروں کے بارے میں بے

مروت ہونا عام ہی بات ہے۔ یہاں سے دو مثالیں دیتا ہوں۔ اداکار ام اثر کی "کاشف الحقائق" حالی کی "مقدمہ شعر و

شاعری کے آس پاس شائع ہوئی۔ "کاشف الحقائق" کا کیوں بڑا اقتباس میں بعض عالمی ادیبوں اور شاعروں سے بھی روشناس کرانے کی سعی ملتی ہے۔ شعر و شاعری کے مباحث اپنی جگہ پر لیکن کیا کیجئے کہ ایک عرصے تک یہ کتاب سرخانے میں پڑی رہی، کچھ لوگوں نے توجہ بھی کی تو غایت و دہر سرسری، صد تو یہ ہے کہ عظیم الدین احمد نے "اردو تنقید پر ایک نظر" میں امداد امام اثر کا نام تک نہیں لیا، یہاں تو علاؤ الدین صاحب کا سوال نہیں تھا پھر بھی ایسا ہوا۔ دوسری جلدوں کے کتبے والوں نے امداد امام اثر کے ساتھ زیادتی کی بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اردو تنقید کے ساتھ علم کیا۔ خیر ہے "کاشف الحقائق" اب زندہ اور تابندہ تنقیدی کتاب ہے۔ راقم الحروف نے محتاط کتاب کے باب میں جو کام کیا اس کا اظہار یہاں مقصود نہیں۔ بلکہ واضح کرنا ہے کہ ادبی سہ لکھائیاں کیسے کیسے رنگ اختیار کرتی ہیں؟ اب دیکھئے کہ ابھی بھی انجم مانپوری ادبی تاریخ کے صفحات سے غائب ہیں۔ مگر مزاج کی انگ سے تاریخیں مرتب کی گئی ہیں لیکن اس نام سے دامن کشاں گزرتا زمانے کی ریت بن گئی۔ ہمارے یہاں مگر مزاج کتبے والوں نے کئی اہم کردار تخلیق کئے ہیں جو بظاہر پر تحقیقی مطالعے میں رہے ہیں۔ لیکن عظیم الدین کا قائل مگر فنکار قہر گماں میں ہے، میرے خیال میں "میر گز" جیسا جاہلادان کردار بہت کم مزاج نگاروں کے یہاں ہے، لیکن ادبی مورخ "میر گز کی گواہی" "کسائے کی غم" اور کئی شاہکار فن پارے سے بے خبر ہے یا اطلاق ہے۔ لکھنؤ کی کتاب کیا جائے؟

ان مسائل سے الگ ایک اہم مسئلہ معاصرین کو تاریخ میں شامل کرنے یا نہ کرنے سے متعلق ہے۔ اگرچہ تاریخی کتابیں ایک منزل پر آ کر رک جاتی ہیں اور معاصرین سے ایک طرح کی حد قائل قائم کر لی جاتی ہے۔ اس کی کئی وجوہیں ہوتی ہیں، ادبی مورخ یہ موقف اختیار کر سکتا ہے کہ معاصرین ابھی اپنے کام میں لگے ہیں، ان کے بارے میں ادبی تاریخ میں جگہ متعین کرنا دشوار ہے، نئی تحریریں ان کی زندہ رہ سکیں گی، یہ ایک اہم پہلو ہے اور بحث کا ایک دروازہ بھی۔ جو مرنے والے ان پر لکھا بھی آسان نہیں اس لئے کہ جو اس دنیا سے رخصت ہوئے ہر حال میں قائل احترام میں۔ ایسے میں ان پر کھلی کر بحث کرنا آسان نہیں، پھر ایک الجھن یہ بھی ہے کہ کسے شریک کیا جائے اور کسے روک دیا جائے۔ لہذا چھوٹی چھوٹی بعض تاریخوں میں چند جملے کسی معاصر نگار کے بارے میں مل جاتے ہیں۔ لیکن سنجیدگی سے لکھی جانے والی تصنیفی تاریخیں ایسے جو سہم سے گریز کرتی ہیں۔ میں مغرب کے حوالے سے یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ وہاں کی ادبی تاریخیں بعد ۱۹۵۰ date ہوئی ہیں۔ مغربی ادبی مورخ کسی بھی فنکار کے بارے میں چاہے وہ اس کا معاصرین کیوں نہ ہو ایک واسطے قائم کر لیتا ہے۔ اردو انتخاب اس کے صواب و بے پر منحصر ہوتا ہے۔ لیکن اردو میں ایسے نگار ہرے سے بچنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ میرے خیال میں اس رجحان کو بدلنا چاہیے۔ جن معاصرین کے نام کسی تحقیقی ادبی تاریخ میں نہیں آسکیں گے ان کی طرف سے حقارت آسکتی ہیں۔ جس کے لئے تیار رہنا چاہئے، اردو ادبی تاریخ معاصرین کے حوالے کے بغیر ہمیشہ مکمل رہے گی۔ اگرچہ نگار بھی عارضی طور پر "مورخ ادب اردو" کا جواز دینا سمجھو تو کوئی نقصان نہیں۔ اگر ان میں

اردو ادب کی تاریخ نیک اور سیکے میں ہمیشہ گرفتار رہی ہے، وہ ادبی اسکول یا دبستانوں کا معاملہ ہے۔ بعض تسلیم شدہ دبستان مثلاً ادبی یا لکھنؤ کے بارے میں شاید اختلافی پہلو بہت کم ہو سکتے ہیں لیکن رام پور کا دبستان، ادبستان عظیم آباد اور فیسے کہتے ہی دبستانوں کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ بھلا بھولی جواز دہی صاحب کا کہنا نہیں ہے "ادارلی اسکول" لکھ کر لکھو اور ادبی کے دبستانوں کا تہبہ پاک کرنا چاہا ہے۔ مجھے دبستانوں سے بچ نہیں ہے، لیکن کوئی ضروری نہیں کہ کسی فنکار کو کسی اسکول سے وابستہ کر کے ہی مانگوئی جائے۔ دراصل وقت، حالات، کوائف، مسامحت اور پھل لین دین سے جلد تھوڑی رات پارہ پارہ ہو جاتے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ لکھنؤ کا ہر شاعر پیش و پشت کے ہی پائے انجی شاعری میں استہمال کرتا رہے۔ دراصل در حالات و سیلابات اپنے خاص اھل کی وجہ سے ایک اسکول یا نظریے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں لیکن ان کے خود خیال کو اہل سمجھنا کسی فنکار کی آخری ذمہ داری ہے۔ ادبی حروف ہے۔ ادبی حروف نظر سے دیکھ جائیں کہی جاسکتی ہیں لیکن جہد تحفظات کے ساتھ اور فنکاروں کی انگ انگ شکلوں کی شناخت کا سوال ہیستے کے لئے مضم ہو جائے گا۔ میں نے اپنے طور پر ان دبستانوں کا سرسری ذکر کیا ہے، لیکن ان میں اسیر نہیں رہا۔ باتیں آگے نکل گئیں تو دوسرے لئے فطری بھی ہیں اور میرے وقت کے مطابق بھی۔

مجھے احساس ہے کہ میری یہ تاریخ کبھی مکمل نہیں ہے، نہ مجھے اس کا دعویٰ ہے کہ میں نے جو کام کیا ہے وہ آخری سطح کا ہے۔ بہت سے پہلو ہیں جو شاید نشان زدہ ہو سکے ہوں۔ لیکن یہ بعض قابل کاٹھ شخصیتیں میری نگاہوں سے اوجھل رہی ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے بعض امور میں مغلطہ ہوا ہو۔ لیکن ایک بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنے طور پر اندراج کے معاملہ میں کسی قسم کے تعصب سے کام نہیں لیا ہے۔ عظیم آباد کے معاملے میں بھی نہیں۔ لیکن ہے چند نئے لوگوں کے ذکر سے بعض اردوؤں پر غل بڑ جائیں، لیکن میں ایسی صورتوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ میں مابعد جدید صورت و ائمہ سے متاثر ضرور ہوں لیکن تاریخ نویسی میں کوئی دائرہ مجھے گھیر نہیں سکا ہے۔ میں نے یہ کام چند کتبے ذہن سے کیا ہے، میری آرزو اتنا دلی ہے کہ حال کے ادب یا عصری ادب کی بھی پھر جو نہانہ گئی ہو۔ اگرچہ جوان ادیب بھی تاریخ میں جگہ پا جائیں تو نقصان کیا ہے؟ ضروری نہیں کہ ہر مورخ کسی شاعر یا ادیب یا کسی فنکار کی موت کا انتظار کرے، یا یہ دیکھے کہ اس کے دانت نوٹے ہیں یا نہیں یا آہ نکھیں متاثر ہوئی ہیں یا نہیں۔

اس تاریخ کی تکمیل میں میں نے شاید شدہ چھوٹی بڑی اردو کی ادبی تاریخوں پر نگاہ رکھی ہے اور ان سے استفادہ بھی کیا ہے۔ اس معاملے میں جہاں تک ممکن ہو گا ہے میں نے حلیجے میں یا بعض جگہ مشن میں تفصیل دے دی ہے۔ میری ذاتی لائبریری نے مجھے بہت سہارا دیا ہے۔ بعض اوقات یا احساس ہوتا تھا کہ کتب خانہ غیر ضروری کتابوں سے تنگ ہو گیا ہے لیکن بعض چھوٹی چھوٹی کتابیں تحقیق کے حوالے میں جلد دگر دہانت ہو گئیں۔

خیر سے خدا بخش اور فیض پبلک لائبریری اور گورنمنٹ اردو لائبریری میرے شہر ہی میں ہیں۔ ہر مشکل مرحلے

رہا اور وہ عجائبات مستعدی سے میری ضرورتیں پوری کرتے رہے۔ میں ان کا مجدد ممنون ہوں اور ان کی دینی عمر کے لئے دست بردار ہوں۔ اسی طرح گورنمنٹ اردو لائبریری کے لائبریریئن حسن احمد بھی مختلف ضروری کتابوں اور رسالوں سے میری خطبیں مل کرتے رہے۔ میں ان کا بھی سپاس گزار ہوں۔

میں نے بعض نکات کے باب میں کئی لوگوں کو خط لکھے۔ کسی نے جواب دیا، کسی نے خاموشی اختیار کی، ایسے خطوط زیادہ تر حالات زندگی کے حصول کے بارے میں تھے۔ لوگوں کا اس ضمن میں لاتعلقی ہونا حیرت کی بات تھی، اس لئے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے کوئی پراگندہ شروع کیا، وہ بالکل باہم خاموشی اور لاتعلقی کے درمیان کو متعلقہ اشخاص کی اذیت کھنے پر مجبور ہوں۔ بعض زندہ ادیبوں کا مداحی حصہ کمزور ہے تو اس کی بھی وجہ ہے جس کی مزید تفصیل میری ضروری ہے مگر میں اپنے تمام لوگوں کا ممنون ہوں جنہوں نے اس باب میں میرے ساتھ تعاون کیا ہے۔

میں نے اپنی حالیہ کتابوں کے ذب میں لکھا ہے کہ میں زیادہ تر مواد لکھتا ہوں۔ یہ صود ہے اس کتاب میں بھی رہی ہے۔ اس کتاب کے چالیس فیصد حصے Dictation عزیزیہ صوفیہ پرائیویٹ نے لیا، جنہوں نے کام بولا اور وہ بڑی یکسوئی سے مصروف کار رہا، جب ان کی طواری نہیں ہوتی تھی لیکن اسی دوران یہ خوشگوار واقعہ بھی ہوا کہ دورِ رشتہ اردو ادب سے بہت ہونگئیں۔ چندوں کے لئے کام ٹھپ رہا، پھر حسن احمد لائبریریئن، گورنمنٹ اردو لائبریری میری معاونت کے لئے سید پر ہو گئے۔ کتاب کا بقید Dictation انہوں نے لیا۔ میں ان کا تشکر ہوں۔

عزیزیہ ادبیات عالم کی متعدد جلدوں Dictation ڈاکٹر حسن رضا رضوی نے لیا تھا، لیکن جب وہ کچھ ہونے تو بعد مصروف ہو گئے، پھر کچھ دنوں کا کام بھی ان ہی کے سر پر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پڑھے گھر کی بلی بھی چر رہی ہوتی ہے۔ مجھے کچھ دنوں کی فکر تھی کہ یہ مرحلہ کیسے طے ہو۔ میری حیرت کی انتہاء نہ تھی جب محسن بنی کی چھوٹی بین مزین پیدائش شدہ رضوی (گڑیا) نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا، ماشاء اللہ عزیزیہ بالکل سانس میں اکبر اے بھی ہیں اور اردو سے توجہ دلنا خاص ہے۔ گورنمنٹ، یونیورسٹیوں میں Talent چھپا ہوا ہے، زیادہ تر ان کے اظہار و فروغ کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ میں نے دیکھا کہ یہ نرگس کی لڑکی الفاظ پر کس حد تک قدرت رکھتی ہے اور کتنی تیزی سے مشین (Key board) پر اس کی انگلیاں چلتی ہیں۔ اس طرح اس بچی کے سپارے میرا کام ایک منزل پر آ گیا۔ خداوند کریم اس کے مستقبل کو روشید و روشن بنا کر جائے آجین۔

میں نے ادباء، شعراء اور دوسرے فنکاروں کی ترتیب میں تاریخ عید الفیل لکھا ہے۔ یعنی کسی فنکار کی عظمت کا لحاظ کیے بغیر جگہ متعین کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے شہرت یا معیار کے اعتبار سے ترتیب کا کام سرانجام نہیں پایا۔ کبھی کبھی استثنائی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اسے نظر انداز کیا جائے۔

کسی ایک فنکار کو ایک ہی جگہ تھوڑا سا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اسے کہ کوئی ایسا بھی ہو جو مختلف جہتوں سے

احاطہ کئے گئے۔

میں نے اس تاریخ کی تکمیل میں عالم فاضل لوگوں کا سپارہ نہیں کیا ہے۔ ہر شخص کا Ego ہے، میں اس سے بچتا چاہتا تھا۔ رسالے اور کتابیں میری معاونت بھی نہیں کرتی ہیں۔ اگر یہ کام بطریق احسن انجام پایا ہے تو ان فنکاروں کتابوں کی دین ہے جن سے میں نے استفادہ کیا ہے۔

اس کتاب کی اشاعت میں ایچ کبشل پبلیشنگ (کس دہلی کے مالکان الحاج محمد یحییٰ خان اور ان کے صاحبزادے الحاج مصطفیٰ کمال پاشا نے خصوصی دلچسپی لی، میں ان کا ممنون اور تشکر ہوں، ساتھ ہی ساتھ محمد یحییٰ خان اور عزیز پاشا جین انجم کا بھی، جن کا تعلق اسی ادارے سے ہے۔

دبایب اشرافی



اُردو کے لسانی مباحث: عمومی جائزہ

ایک سوال اٹھایا جاتا رہا ہے کہ اردو ہندی یا ہندوستانی ہے کون سی زبان بولی مراد ہے۔ مگر یہ سن کے مطابق کھڑی بولی کی دو واضح شکلیں ہیں۔ ایک شکل اردو ہے اور دوسری ہندی۔ ظاہر ہے اردو زیادہ تر فارسی، عربی الفاظ سے مرکب ہے اور اس کا رسم الخط بھی فارسی ہے۔ جبکہ ہندی سنسکرت، آریہ زبان ہے اور ناگری رسم الخط پیش آگئی جاتی ہے۔ مگر یہ سن نے دونوں زبانوں کے لئے ”ہندوستانی“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ویسے انہوں نے بولیوں کی جس طرح تقسیم کی ہے وہی اس ہے۔ دراصل یہ چیز زبانیں ہیں۔ یہ نقشہ ملاحظہ ہو:-

مغربی ہندی

مشرقی ہندی

پنجابی گرجی اوجھی بھیلی

پنجابی گرجی اوجھی بھیلی

اردو ادب

بھاری

راجستانی

میتھلی سنسکرت

ڈاکٹر منشی کار چڑی گریہ میں کی اسکی جھیم کو کھٹا تصور نہیں کرتے۔ لیکن وہ ہندی کے تین روپ پر زور دیتے ہیں۔ یعنی اردو اور ہندی کے علاوہ بازوری ہندوستانی اس پر بھی دو قافیہ نہیں بلکہ آتش اس کی باغی ٹپکیں سامنے لاتے ہیں۔ یعنی اردو دوسری ہندی (یا انگریزی ہندی) ہندوستانی جس میں دونوں کے سادہ الفاظ مشترک ہیں اور تا کر ہندوستانی جو درجہ تکل کھٹا مانا جاتا اور لی کی علاقائی زبان ہے۔ ہندیات ہندی سے انگریزی میں اور ہندی کہتے ہیں یہ ملک کے عوام کی اسکی مستند ہوئی ہے جو بیادری نہیں کہی جاسکتی۔ جبکہ ڈاکٹر گرامر میں ہندی میں اردو کے علاوہ اردو ہندی اور اردو ہندی کو شامل کرتے ہیں اور جسے اعلیٰ ہندی کیا جاتا ہے۔ نیکی دلی سہارا پورہ وال آباد کے کچے علاقے کو ہندی کے صحیح علاقے تسلیم کرتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک جہاں کھڑی کی اہمیت ہے وہاں برج اور کوئی کی بھی ہے۔ شیامہندو اس بھی مگر برہمن اور ڈاکٹر چڑی کی کہہ دے کو تسلیم کرتے ہوئے مغربی کو ہندی مانتے ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ معمولی ہندی الفاظ حاصل آدلی کھڑی ہوئی ہے جس کا تعلق راجستھان، بہار، فیصل آباد، مدھیہ پردیش تک ہے۔

بعض ماہر لسانیات نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اردو یا ہندی کا رشتہ پنجابی سے ملتا ہے۔ بلکہ نے اس بات کی تردید کی ہے کہ پنجابی کا ذخیرہ ہندی اردو سے الگ مختلف ہے کہ ایک ہی طرح کی زبانیں انہیں سمجھنا دشوار ہے۔

گویا ہندی یا اردو کے تین مختلف نام سامنے آتے ہیں (۱) کھڑی بولی (۲) ہندی، مغربی ہندی اور مشرقی ہندی (۳) مغربی ہندی، مشرقی ہندی، بہاری اور راجستھانی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر پرکاش منس جتھتے ہیں:-

”ہم اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ برج بھاشا بولی ہندی بلکہ بہاری اور راجستھانی بولنے والوں نے بھی خود کو ہندی کو تسلیم کیا ہے۔ اس باب میں اگر قیادت ہے بھی تو اس کی آواز بہت مختلف ہے۔ اردو، بہار اور راجستھان میں مختلف گوشتیں اپنی خوشی سے اپنی زبان کو ہندی کہتی ہیں۔ وہاں کے لوگ اپنی تہذیبی اور علمی زبان کے طور پر ہندی کو ہی استعمال کرتے ہیں۔ ان زبانوں میں بالخصوص برج اور اردو کی زبانیات بالکل ہندی کی زبانیات ہیں۔ ہندی ادب سے برج اور اردو کی کوئی ایک کہنے کی کوشش گوشت کو انہیں سے جدا کرنے کے مترادف ہے۔ کھڑی بولی برج اور اردو کی ایک ہی ادبی سلسلہ ہے۔ اسی وجہ سے ہم اس مقالے میں کھڑی بولی، برج اور اردو ادب کو ہندی ادب کے ذیل میں شامل کر رہے ہیں۔“

یہاں ظہور کر اردو کے بعض نظریات کا جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک سوال تو یہ کہ ڈاکٹر اردو کا ہے جسے آج قدیم اردو پاؤر کرنے میں کوئی دشواری نہیں۔ ڈاکٹر جہادری اپنے ایک مضمون ”قدیم کوئی اور اردو کا قلمی مطالعہ“ میں دکن اور

اردو کے اختلافات کو سامنے لاتے ہوئے انہیں الگ الگ نہ نہیں قرار دیتے ہیں لیکن اس نظریے کو آج کوئی قبول نہیں کرتا۔ ان کے مقابلے میں ڈاکٹر مسعود حسین خان نے زبانوں کے ساتھ یہ قول کیا ہے کہ دونوں زبانیں غیائی طور پر ایک ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کوئی باہمی تعلق ہے اور اختلافات صرف سلاطین دہلی کے عہد کی اردو کے قدیم کے سوا اور کچھ نہیں۔ اردو کے قدیم ناموں میں دکنی تو ہے ہی کھڑی بھی ہے۔ جس کا تعلق کھڑان والا اور کجرات، پنجاب سے ہے۔ خوب محققین اور محرمین اپنی زبان کو کھڑی ہی کہتے ہیں لیکن ڈاکٹر نذر محمد رائی کوئی سے علیحدہ کر کے نظر آتے ہیں۔ لیکن آج اس بات کو کوئی نہیں مان سکتا۔ اس طرح ہریانائی کو بھی کوئی علیحدہ بولی قرار دے کر اردو سے الگ کرنا اور مست نہیں ہے۔ ہریانائی میں پنجابی کی آواز پر بھی ہیں۔

اردو کے آغاز کے جو نظریے پیش کیے گئے ہیں ان میں ایک بات مشترک ہے کہ اردو کھڑی بولی کا ایک پیچیدہ روپ ہے۔ یعنی اردو ہر طرح سے کھڑی بولی سے متعلق رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں مسعود نظریات سامنے آئے ہیں۔ میر اس نے اس کو اٹھارہ کیا ہے کہ جب شاہ جہاں آباد بسایا تو اسے اردو کے سبکی کا خطاب بھی دیا۔ ڈاکٹر مسعود جہادری کے حملے کے بعد اردو کی بنیاد تلاش کرتا ہے۔ گویا جب جہادری نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس وقت اردو کی بنیاد پڑی۔ سر سید نے اپنی کتاب ”آثار مصداقہ“ میں اس کا اظہار کیا ہے کہ شاہ جہاں نے ۱۶۲۸ء میں دلی آباد کی۔ اس وقت سے اردو زبان سامنے آئی اور ۱۶۸۸ء کے قریب اس میں شکر کی شریعہ ہوئی۔ امام بخش صہبائی نے اپنے رسالہ ”قواعد اردو“ میں غازی کے اظہار اور ہندی کے لفظوں کے استعمال اور تغیر تبدیل سے اردو کے وجود پر گفتگو کی ہے۔ سید سلیمان ندوی مسلمان دور قدیم ہندوستان کے سبب بول کے تجزیوں میں اردو کے وجود کی بات کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں بہت سے پہلے پہل بول مکان سے لے کر خط و کتابت میں اور پھر یہاں سے کجرات اور کالہا دار تک ایک سلسلہ قائم کرتے ہیں۔ جب کہ ہونہ سنے اردو کو بارہوی ہندی میں دلی کے نواح میں پورے اہمیت کیا ہے۔ یعنی بات محمد حسین آزاد نے کی ہے کہ اردو زبان برج بھاشا سے اٹھی ہے۔ مولانا خٹک اور بی بی جتھتے ہیں لیکن پروفیسر محمود شیرانی نے اپنے دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو کی سب سے قریب زبان پنجابی ہے جہاں سے اردو اٹھی جبکہ ڈاکٹر زور نے اردو کو پنجابی کی زبان کہا ہے۔ ڈاکٹر سید مسعود حسن خاں اردو کو کھڑی بولی مان کر اسے شوریہ یعنی اردو کھڑی سے قریب جتھتے ہیں۔ ان تمام مباحث پر روشنی ڈالنے ہوئے پرکاش منس نے یہ وضاحت کی ہے کہ اصل میں اردو یا ہندی دونوں کی تہ میں کھڑی بولی یا ہندوستانی پوشیدہ ہے۔ اس کے ارتقا کی تاریخ انہیں دکھائی جائے تو دونوں زبانوں کے اشیات میں سے ملے لیجئے ہوں گے۔ لیکن یہاں سو صرف نے ہندی یعنی ڈاکٹر محمد زور کی کچھ باتیں اس طرح نقل کی ہیں:-

”(الف) — تاریخی نقطہ نظر سے ادلی کھڑی بولی (ہندی) کی نسبت کھڑی بولی اردو کا اصل پہلے ہونے لگا تھا۔

(ب)۔ قدیم اور وسطیٰ عہد (ایضاً)۔ ۱۸ ویں صدی تک ان کی کثرت کی بولی کا؛ جو اپنا اس وقت تک کرچہ اس بولی کا استعمال ہندو کوئی اور ملک تک، عرب میں کوئی خاص نہ کرتے تھے یہ مسلمانوں کی بولی سمجھا جاتی تھی۔

(۲) — کھڑی پل ہندی کا رواج بختری باب میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا اور نظم میں انیسویں صدی میں۔

اس مسئلے کو سیاسی رنگ دینا بڑا غلط ہوگا۔ امرت دوائے نے اپنی کتاب *A House Divided* میں اس امر پر زور دیا ہے کہ اگر ملک کے اضلاع کے بعد مسلمانوں کو اپنی شناخت کا مسئلہ درپیش تھا، لہذا انہیں انہوں نے اردو زبان وضع کر لی۔ تو ایک سیاسی بیان ہے جس کی کوئی اثری اور سیاسی اہمیت نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ اگر ملک دیرپ کی وفات ۱۹۰۷ء میں ہوئی اور بعدِ پاکستان میں مغربی سلطنت کا زوال بھی تبھی سے شروع ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب لادکی کا بھی غوطا سامنے آیا اور اردو طاقت پھلانے لگی۔ اب اردو پسند اور شاعروں نے اردو کو بے ضابطہ علوم پر برتاؤ شروع کیا اس لئے کہ لادکی قبول زبان اب خوش نظر نہیں رہی تھی۔ لاکھتاوا چھرنے سے بات کھینچا ہے کہ۔

”سب سے اچھا کرب ہے کہ ذبحِ لسانی اخراج و جوش آجائے۔ مسلمانوں نے اپنی ترکی اور فارسی شریک کر دی اور ہندوؤں کی زبان اختیار کر لی۔“ ❖❖

[illegible]

”مجھے یہ سامنے میں کوئی عامل نہیں کہ غمزدگی ہوئی یا بدی نسبتاً ایک بچھری ہوئی چاند بہاں تھی۔ چرونی مسلمانوں کی سرپرستی اور نوک چنگ ستوارے کے بعد یہ اردو کے چروان بھٹن کی شکل اورا

ابتداء سے سترہویں صدی عیسوی کا ادب

شمالی ہند میں اردو کی ابتداء

شمالی ہند میں اردو کی ابتدا کی تلاش کا مسئلہ اتنا آسان نہیں کہ چند سطریں لکھ کر ہی حل ہو سکے۔ یہ زمانہ وہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے علاوہ مقامی برہمنوں، ایک خاص درجہ رکھنے والے لوگوں کی اقلیت تھی۔ انہیں کی اقلیت کی صورت سے اور کھڑکی بولنے کے حوالے سے اردو اور ہندی کی فنی تشکیکیں ملحوظ رہیں۔ لیکن زبان کے قدیم و معاصر ہونے کی جانتے تو ایسا محسوس ہو گا کہ ایسے الفاظ کی اکثریت ہے جن کا رشتہ چرچہ اردو سے اردو تک نہیں ملتا۔ جہاں اردو زبان کی تاسیس سے گفتگو کی گئی ہے وہاں مختلف نظریات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ لیکن قدیم زبان کھڑکی بولنے تک آتے آتے ایک واضح رخ ضرور اختیار کر لیتی ہے جسے ہم اپنی سہولت کے لئے بعد و ستانی کہہ سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد فارسی عربی زبانوں کا اختلاط ایک نسلی مل ہے جس سے کوئی اختلاف شاید ہی کر سکتا ہے۔ اب کھڑکی بولنے کا روپ بھی نیا ڈھنگ اختیار کر رہا تھا۔ نتیجے میں ہندو کی طبیعت پر ہوتی جس کا رشتہ بعد میں ان کے قائم ہوا جہاں ایک الگ نچ پر اردو زبان کی ارتقا پذیر ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ شعروادب بھی۔ نیز ایہ بات غلط نہیں ہے کہ موصوفی نے اپنے طور پر تخلیق اسلام کے لئے مقامی برہمنوں کو کسی نہ کسی طرح برتاؤ شروع کیا۔ ظاہر ہے ان کی اپنی زبان بھی تھی جس میں عربی الفاظ کی اکثریت رہی ہوگی۔ پھر فارسی کی فنی صورت بھی ابھری۔ نتیجے میں ایک مخلوط بولی جسے قدیم اردو بھی کہہ سکتے ہیں، ابھرتی تھی۔ فنی ہندو کے اتصال کی صورت کو جنم دینے والی اس طرح بیان کرتے ہیں :-

”فنی ہندو کے اتصال نے رفتہ رفتہ اس زبان کے کینڈے، رنگ و صفت اور ساخت و حرائج کو

”نک۔ محمد جانشین“ معریف ہے کہ یہ قول مولوی عبدالحق نے نقل کیا ہے۔

”تم گمان نہ کرو کہ شیخ اولیاء اللہ بڑا بے ہوشی و غفلت نہ رہا۔ اگر اولیاء اللہ از حد شیخ اولیاء اللہ قلب الاقطاب غریب

بزرگ معین الحق و ائمتہ و ائمہ بنی ہند کی سربراہین رہیں تو ان کی فرمودہ۔۔۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ ان کا ہاشم خاں نہیں کہ حضرت معین الدین جانشین احمدی زبان یعنی ہندی سے واقف ہوں گے۔ اور یہاں اقصیت ہی اس خیال کو مضبوط کرتی ہے کہ زبان کا ایسا استعمال ابتدائی ہندی کی نشوونما میں اہم ثابت ہو رہا تھا۔

بابا فرید الدین گنج شکر

(۱۱۷۳ء—۱۲۶۶ء)

غریب فرید الدین گنج شکر بابا فرید کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا پورا نام شیخ فرید الدین مسعود تھا۔ خواص و عوام میں گنج شکر یا شکر تاج کے لقب سے مشہور ہوئے۔ حضرت غریب نقیب الدین نظیر اکبر کی ”کے مرید بھی تھے اور غلبہ بھی۔ ان کا حلق غریب بزرگ یعنی حضرت معین الدین جانشین احمدی سے بھی تھا۔

غریب فرید الدین گنج شکر فرخ شاہ کالی کی نسل سے تھے۔ ان کے والد کا نام قاضی شعیب تھا جو چنگیزی نسل کے سب اپنے تین صاحبزادوں اور چھ حقیقتین کے ساتھ لاہور آ گئے تھے۔ پھر لاہور سے قصور آئے اور قصور سے تھان چلے گئے اور اسی کے فرائض میں سکونت الی میں آباد ہوئے۔

بابا فرید الدین گنج شکر کے والد جمال الدین بانسوی تھے۔ یہ بھی قاضی شعیب کے ساتھ تھان کے فرائض میں آباد ہوئے تھے۔ ان کی شادی سیوانا وجہ الدین مہار کی لڑکی سے ہوئی۔ انہیں کے بطن سے ۱۷۷۳ء میں فرید الدین گنج شکر پیدا ہوئے۔ مسعود کا حصول علم کا بڑا شوق تھا اور اس کے لئے روز روز کا سفر کیا۔ وطن اور بانسوی میں بھی اسی فرض سے ایک عرصے تک رہے۔ لیکن جب حضرت کی عمر ۵۹ سال کی ہوئی تو اجودھن یعنی پاک پٹن میں جو بخت کا علاقہ ہے، سکونت اختیار کر لیا۔ یہیں انہوں نے اسلام کی تحقیق و اشاعت کا کام سر انجام دیا۔ انہوں نے ۹۴۲ ہجری کی عمر میں ۱۲۶۶ء میں انتقال کیا۔

مختلف روایات سے یہ پتا چلتا ہے کہ بابا فرید کو سارے جی و دل شکر تھے۔ خود بخود ان کے اشعار بر محل پڑھتے تھے۔ گنج عبدالحق محدث دہلوی نے مسعود کی ایک فارسی رباعی نقل کی ہے۔ ان کے ہندی لفظ غلات دفتر سے لہو درو ہے۔ یہی جابجا ملتے ہیں۔ اسی قیاد پر سید سلیمان ندوی اس نتیجے پر پہنچے کہ اردو کا سراغ حضرت فرید گنج شکر کے عہد سے ملتا ضرور ہوتا ہے۔ صورت و انداز جو بھی ہو حضرت کے حالات پر حق جو بھی کتابیں آئی ہیں ان میں ہندی اقوال اور لفظ غلات کی کمی نہیں ہے۔

بابا فرید کے شعری مذاق و حال بھی بعض کتابوں میں درج ہے۔ ان کی ہندی وانی مسلم ہے۔ اس میں کوئی کام

نہیں کی انہوں نے ہندی ہی ہے کہے ہوں گے۔ ”نیرا دلایا“ میں بھی ایک اور بار درج ہے۔

کھت تھیں کار دی ہکاں ست مٹاتے

بس کندھی مدھن گرہوریں سہاتے

دیئے بعض محققوں نے بابا فرید کے رچنے کے نمونے بھی دریافت کئے ہیں۔ ملاحظہ فرماتے ایک پانچ کے حوالے سے بابا فرید کے رچنے کا نمونہ پیش کیا ہے:

راستا دی ہے گویہ ہا ہا ہا ہا ہے گویہ

در دل بھی ضرب کند ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا

مولوی عبدالحق نے رچنے کی جرحاں دی ہے وہ یہ ہے:

دقت بحر دقت مہابت ہے

خیر دہان دقت کہ برکات ہے

یاد رہے کہ بابا فرید کا کام سکھوں کی مذہبی کتاب ”گرور گتھ“ میں بھی ہے۔ جس زمانے میں یہ کتاب مرتب ہوئی تھی تب سے آج تک جو بھی کام اس میں درج ہے، یعنی الحاقی اسور کی جب بھی بات آئے گی تو ”گرور گتھ“ کی اشاعت سے پہلے کی ہوگی۔ اتنی بات مان لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ بابا فرید ہندی جانتے تھے اور ہندی گو بھی تھے۔ لہذا انہوں نے تبلیغ و اشاعت کا جو بھی کام سر انجام دیا ہو گا اس میں ہندی حواجز کا دخل عمل ضرور ہو گا۔ بابا فرید کے کلام کا ایک نمونہ ملاحظہ ہوا۔

فرید ہے توں عقل لطیف ہیں، کاسے گھ نہ گھ

آپڑے گرہان میں سرخاں کر کے دیکھ

فرید کاسے مینڈے کپڑے کا مینڈا دیکھ

گھن ہل لہا میں بھراں لوک کھن دوکھن

لوک فرید لوک کھن کھن دیکھ

بہت لگ لگا نہ کرے تب لگ لوک پکار

فرید کن معلی صوف کن دل کاتی گزوات

بہر دے چاٹاں، دل اندھیری مات

لیکن ایسے تمام اشعار بچھڑ چکے کے دائرے میں رہے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ انہیں یکسر رد کر دیا جائے یا بغیر تحقیق کے قبول کر لیا جائے لیکن مشکل یہ ہے کہ تحقیق کی کوئی نئی سلسلی صورت اب تک سامنے نہیں آئی، لہذا ایسے اشعار کا ذکر تو ہونا ہی چاہئے۔

شیخ شرف الدین یحییٰ قلندر

(۱۳۲۳ء۔)

شیخ یحییٰ قلندر کے سلسلے میں زیادہ تفصیلات نہیں ملتی ہیں۔ جو صاحب تصنیف تو ہیں ہی لیکن ان کا تعلق قادری سے ہے۔ ان کی فارسی مشکو باں بھی اشاعت پر یہ ہو چکی ہیں اور درج ان بھی۔ لہذا یہ کیا جاتا مناسب ہے کہ وہ فیہ کی طور پر فارسی کے شاعر ہیں۔ لیکن ہندی یا ہندوی سے ان کی الجھن بھی عیاں ہوتی ہے۔ شاید جدید ہی ہو جو میں آگے لکھو آیا۔ مولوی جہد الحق نے ہی اپنی مشورہ کتاب میں ان کے سلسلے میں اس طرح لکھا ہے:-

”مبارک خاں نے ارادہ سفر کیا تو ان کی زبان مہرک سے یہ دیا نکالا:

بچن سکادے جا گیا گے اور یمن مر میں گئے روحے

بدھہ ایک ریز کو۔ بھور کدھی نہ ہوئے۔“

لیکن آج یہ کہنا بعد مشکل ہے کہ انھیں یہ الفاظ انہیں کے ہیں اور اگر انہیں کے ہیں تو پھر ہندی سے یا مقامی زبان سے ان کا تعلق ثابت ہوتا ہے۔

امیر خسرو

(1192-1275)

امیر خسرو ایک نائنہ و زگار شخصیت تھے۔ ان کے نام صاف احاطہ تحریر میں آنا ایک مشکل امر ہے۔ یہ برصغیر موصوف تھے۔ انہوں نے زندگی کی دیوار تک گھبراتوں کو جس طرح بننے کی کوشش کی، وہ اپنی حدوں میں بے حد اختیار کو بانوڑ تھی ہیں۔ لیکن امیر خسرو کے بارے میں بھول رہا ہوں گا ایک سلسلہ ہے۔ جد تو یہ ہے کہ ان کے والد کے نام ان کی جائے پیدائش اور ان کے قبیلے کے بارے میں سارے پورے خیالات باطل ہو رہے ہیں۔ پھر ان کے کام کی چھٹن بھنگ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نام سے منسوب مبارک کلام ان کا اپنا نہیں ہے۔

پہلے یہ کیا جاتا تھا کہ امیر خسرو کے والد امیر سیف الدین بھٹکوں کے ایک بھائی قبیلے کے سردار تھے اور اپنے وطن

نیش سے انھیں کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے تھے۔ امیر خسرو چٹاپی طبع اور ۱۲۵۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۵ء میں دہلی میں انتقال ہوا۔ لیکن اب ان میں اکثر باتوں کی تردید ہو چکی ہے۔ ممتاز حسین نے اپنی کتاب میں امیر خسرو دہلوی کے سوانحی امور سے بحث کی ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کئی باتیں جو ان کے بارے میں مشہور ہیں وہ درست نہیں۔ امیر خسرو کے والد کو نام سیف الدین خٹک اور ”کاجھن“ قبیلے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ نام کا ایک جزو ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:-

”جہاں کھن دوانا نام خسرو لکھتے وہاں اس کی رعایت سے اپنے والد کا نام جھن ہی لکھتے۔

(جس کے ایک بھائی معنی غلام کے ہیں) اور جہاں یہ کل نہیں ہوتا وہاں سیف خٹک یا جھن کھن

کر یاد کرتے ہیں۔“

ممتاز حسین یہ بھی کہتے ہیں کہ امیر خسرو کے نانا راجپوت اور نو مسلم تھے اور ان کی جائے پیدائش پٹی نہیں مل سکتی ہے۔ یہ سب امور خسرو کی مٹھوی ”غیدہ پیر“ سے ثابت ہے۔ خسرو نے اس مٹھوی میں اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر کیا ہے۔

امیر خسرو کے والد کی شادی عدا الملک کی دختر سے ہوئی تھی اور وہی امیر خسرو کی والدہ تھیں۔ ان کے والد ان کے عہد طفلی ہی میں مار ڈالے گئے اور یہ اپنے نانا کے ساتھ دہلی میں رہتے گئے۔

امیر خسرو نے متعدد بادشاہوں کو زمانہ دیکھا۔ مثلاً غیاث الدین بلبن، اقبال، جلال الدین فیروز، علاؤ الدین خلجی، شاپ الدین عمر، قطب الدین مبارک، نصیر الدین خسرو، غیاث الدین تغلق، جبرائیل تغلبر امر یہ ہے کہ امیر خسرو نے ان مختلف امراؤں و شہزادوں کے عہد میں اپنا سا بھلاں سے اضر بقی اسن رکھا، جبکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندو ہات پڑونک قتل کروئے جاتے تھے۔ اپنے میں خسرو کی زندگانی اور عہد میں اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی نمکٹ مٹی سے برجہد کے ٹکڑوں کو خوش رکھنے کی کوشش کی اور اپنے لئے جگہ بناتے رہے۔

امیر خسرو کی زبانیت، لطافت اور سپاسی شعور کی تعریف کرنی چاہئے اور یہ بھی کہ جسے باہمی اور پر فعل حالات میں وہ تصوف کی طرف بھی مائل رہتے اور اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں مسلسل حاضری دیتے رہے۔ بلکہ یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو گا کہ حکمرانوں کی صحبتوں کا کفارہ مرشد کے قدموں میں گر کر مارا کرتے۔ اس طرح وہ زیادہ تر میں سے انسانی پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

شاعر امیر خسرو کی اولین ترجیح تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاں خود میں انسانی انوکھ تھا جس اور ان کی تصانیف نفاذ سے ذاتی تھی ہے۔ لیکن جو امور مہالے سے خالی نہیں۔ یہ بات سچ ہے کہ امیر خسرو کوئی زبانوں پر دست نہیں، مثلاً عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت وغیرہ سے بھی ان کی اقلیت کو پتہ تھا۔ نیز کئی علاقائی زبانوں سے بھی۔ مٹھوی ”غیدہ پیر“ اس کی گواہ ہے کہ انہوں نے متعدد زبانوں کا ذکر کیا ہے جن سے گریز میں نے بھی استغناء کیا ہے۔

ایک انداز سے کے مطابق امیر خسرو کی زبان ہندی دہلی ہو گئی۔ ایک ہندی تعلق ان کے برج بھوشن لکھنے

اپنے ایک مضمون میں اس کا اظہار کیا ہے کہ خسرو کی ماں راجپوتی تھیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر وہ امیر غلام الملک کی دختر کیسے ہو سکتی ہیں۔ اس لئے کہ اکثر پرکاش مونس نے خسرو کی بائی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ راجپوتی ہو سکتی ہیں۔ اس ذکر سے مفہوم اس اتنا ہے کہ خسرو کی مادی اور مددِ ظہر سے یہ وہ راستہ آسانی تھی۔ اس تو وہ طارسی کے شاعر تھے لیکن ان کے ہندی کلام کا جو نمونہ ہے اس سے مفادِ زبان سے ان کے شغف کا اعتراف ہوتا ہے۔ ایک مشہور شعر جو خسرو کا کتابے و دلا و مکی کی ”سب دس“ میں ہے:

چکھا جو کر میں ڈلی ساقی تیرا جاؤ
میرے ملحق حتم کیا میرے لعلیں ہاؤ

لفظ کی ”بکھ کھائی“ میں بھی ایک دوبار خسرو کا ہے اور وہ اس طرح ہے:

گوری سوئے تاج پر کھ پر ڈوئے کیس

چل خسرو گھر اپنے دین بھی چو دین

اس سلسلے میں پرکاش مونس رقمطراز ہیں:-

”اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ وہاں لفظ ہی نے شامل کیا تھا یا کاتب لفظ طے۔ کہتے ہیں کہ جب حضرت غلام الدین اویا کا انتقال ہوا تو امیر خسرو یہاں گئے ہوئے تھے۔ مرشد کے وصال کی خبر مئی تو روئے پہنچے دلی پہنچے۔ مرشد کی قبر دیکھی تو یہیں وہ اپنا حصارِ بیہوش ہو گئے۔ یہ وہاں عام طور سے اس طرح ہوتا ہے:

گوری سوئی تاج پر اور کھ پر ڈوئے کیس

چل خسرو گھر اپنے سانچہ بھی چو دین

اس دوہے کی شانِ نزالِ دل میں ذرا شک پیدا کرتی ہے۔ مرشد کو صوفی میں بیجا شہر ماننے کی روایت تو ملتی ہے لیکن گوری یا محبوب کے روپ میں مرشد کو دیکھنے کی عقل نہیں ملتی۔ یہ صحیح ہے کہ سلطان الاشرف کا عرس آج بھی خسرو کے اسی دوہے سے شروع ہوتا ہے۔ اس سلسلے روایت کی بنا پر خسرو کے اس دوہے کو مستحکم دیکھنے کی کوئی وجہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ ”سب دس“ میں منقولہ دوہا بھی ہر حال مستحکم مانا جانا چاہئے۔“

لیکن کچھ چیزیں ایسی ہیں جو آسانی سے خسرو کی کہی جاسکتی ہیں۔ مثلاً:

گھر کے روئے داریں گل خیلے

ہر گھر کوئی کہ دی لہو دلی

نظر

دور گر پرے چو ماہ پارہ

کچھ گزریے ستارے پکارا

نقد دلی میں گرفت و بکست

پھر کچھ نہ گزرا نہ کچھ ستورا

میر کی ”کلمات الشعرا“ میں ہے اور امیر خسرو سے منسوب ہے۔

امیر خسرو کی ایک غزل بہت معروف ہے، جو ذیل میں درج کر رہا ہوں:

دھال مسکین کن تغافل و درائے غیاں ہائے بقیاس

چو تاب ہزاراں غلام اسے جاں نہ لہو گاہے لگائے چھتیاں

شیان اجڑاں دراز چوں زلف زمان و صلت چو عمر کویت

سکھیا پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کالوں اندھیری دجیاں

پاکایک از دل دو چشم ہاورد بعد فرہم ہرہ حسکلیاں

کسے پڑی ہے کہ جا سناوے پیارے تپ سے تارکی بقیاس

چو شمع سوزاں چو ذرہ جہراں بیٹھ گریاں بھق آں سے

نہ خیر غیاں نہ انگ چھیاں نہ آپ آدیں نہ بھیجے چچاں

بقن آں سے کہ دوڑ محشر بدادندار فریب خسرو

سجود من کی دودا ہے داکھوں جو جائے پاؤں پاک کے کھتیاں

اس غزل کے باب میں بھی شک و شبہ کی گنجائش ہے بلکہ بعض لوگ صاف طرہ سے کہتے ہیں کہ یہ امیر خسرو کی تصانیف میں ہے۔ لیکن اکثر پرکاش نے خسرو کے مزاج کو دیکھتے ہوئے اسے انہیں سے منسوب کرتی ہے۔ اس کے علاوہ مکی اور چیریں جو خسرو کے نام سے منسوب ہیں، شک کے دائرے میں ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی مشہور تخلص ”خلاق باری“ کو بھی مشہور سمجھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:-

”بہشتیت شاعر امیر خسرو کی قبولیت کی انتہا یہ ہے کہ زبانِ ذہم ہوں کر شعا و کد وعت

کا حصہ بن گئے جس کے نتیجہ میں ان سے بہت کچھ منسوب بھی کر دیا گیا۔ چنانچہ یہ شاعر کہ

نکمر ناس، غلیاں، این پوچھ پہیلیاں اور دوہے، ہشتیں، دھوکوٹے، سنے، گیت اور جو جو

..... جب کہ ان سے منسوب ہو کر وہ گیا جس کے تخیل میں اب خسرو و شادمان کے لئے
 اور وہ اور اپنی کواکب کرنے کے لئے لسانی، پیر تخیلی اور تہذیبی امور کی چھان بین تک لازم ہو گئی
 ہے۔ بعض کو داخلی شہادتوں کی بنا پر مسترد کیا گیا تو بعض کو خارجی اور لسانی حقائق کی بناء پر
 سائد اور قطعی قرار دیا گیا۔ بہر حال یہ سرور و تحقیق کا ہے لیکن واقعی کا یہ گیت.....
 ”کابے کو بیاہی و بیس بن یا علی مورے.....“ قریح بھی سن کو بھاتا ہے، خواہ تحقیق اس
 کے بارے میں کبھی کیوں نہ کہیں۔ یہی عالم ان کی پہیلیوں وغیرہ کا بھی ہے جنہیں آج
 بھی بچے جوڑے ہوئے ہیں۔

لیکن کوئی چند تاریخی اپنی کتاب ”امیر خسرو کا بعدی کام“ (نیشنل بک ڈسٹری بیوٹر) میں لکھتے ہیں:-

”امیر خسرو سے منسوب بعدی کام کو قلمی شغفوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) بعدی کے دو اعلیٰ یا سحر سے جرقاری سے چھوڑ ہو کر امیر خسرو کے فارسی کام میں آئے اور جو قلمی
 طور پر امیر خسرو کی تعریف ہیں اور ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا تر ہیں۔

(۲) امیر خسرو سے منسوب وہ بعدی کام جس کا اثر بعد میں آنے والے تذکرہ نویسوں، شاعروں
 یا مصنفین نے کیا ہے۔

(۳) امیر خسرو سے منسوب وہ بعدی کام جنہیں مختلف تاجذ سے منع کر کے مولانا غلامی عباہی
 جی یا کوئی نے الگ الگ موسم بہار خسروئی میں غلی کرنا سے شائع کیا تھا، جس میں پہیلیاں، کہے
 نکرناں، دوئے، اہل، و دے، گیت، دیہ و شال ہیں۔“

امیر خسرو کی مذہبی پریمارت کے سلسلے میں تمام محققین و ناقدین نے اتفاق کیا ہے۔ خلیل و ستار جیسی کی اجہ
 ہے۔ خیال کی ایجاد کا سہرا بھی انہیں کے سر ہے۔ اگر آراگ کہ موجود انہیں کو اکھیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کاموں میں
 مہجیت خاص و پائی ہوتی ہے، خصوصاً ان کے گیت، قصیدے، مہر و میں۔ شجاعت علی ستار علی نے ایک گیت ”میر و کھنہ“ ہے
 ۔ ”حضرت خرواہنک کیلئے جمال“۔ ”خسرو کی خلعت تیار ہے، لیکن یہ شک ظاہر کر جاتا ہے کہ یہ ان کا گیت ہے کہ
 نہیں۔ البتہ اس میں مہجیت و مہی پائی ہوتی ہے۔ بعض پہیلیاں خسرو سے منسوب ہیں لیکن اردو میں پہیلیوں کی روایت
 انہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں وثوق ہے کہ ان کی پہیلیاں خسرو کی ہے اور کون کسی دوسری۔ شجاعت
 علی ستار علی نے ان کی بہت ساری پہیلیاں ”خسرو اور ان کی شاعری“ میں جمع کر دی ہیں۔ لیکن ساری پہیلیاں خسرو سے
 نام سے منسوب کرنا عقاید درست نہیں۔

اور اعلیٰ خسرو کے نام سے منسوب بہت سارے کلام کو اس لئے مشتبہ سمجھا جاتا ہے کہ اس میں بڑی صاف زبان
 کا استعمال ہوا ہے جبکہ زائے کے لحاظ سے یہ صورت نکلا ہوئی چاہے قلمی۔ اردو شعری ادب میں خسرو کی ایک اہم جگہ
 ہے۔ ان کا قلمی بعدی مزاج سے بہت زیادہ واضح اور روشن ہے۔ ان کے کلام پر خصوصاً اردو میں، گیتوں اور قصروں پر
 برج بھاشا کا اثر پایا جاتا ہے۔ پہیلیوں اور کہہ کر تھوں میں جو زبان استعمال ہوئی ہے وہ عام بول چال کی زبان ہے۔ یعنی
 وہی زبان جو اس وقت دہلی میں بولی اور لکھی جاتی تھی۔

امیر خسرو سے منسوب بعض پہیلیوں میں حقوق احمق یا قبا کو کے لفظ آئے ہیں۔ لیکن یہ بات یہ ہے کہ ان
 کے زمانے میں محرقاً کو سلیم، بندوق، گولی وغیرہ تالیف تھیں۔ لہذا ایسی پہیلیاں یا کہہ کر تھیں یا خود وہ لکھتی ہیں یا
 ہو سکتا ہے کہ بعضوں نے یہ الفاظ بعد میں اپنی طرف سے تبدیل کر دیے ہوں یا ان کا یہ ہوں۔ خسرو کے کام کے مختلف
 دھاروں کی تعظیم کے لئے چند نمونے پیش ہیں:

سیام برن پیچ ہر کام سے مری دھرتی ہوئے

یہاں مری دو چوکت ہے ہلا بھٹے کوئے (پیرا)

اہل برن، آدھن تن، ایک چٹ دو دھیان

دیکھتے میں تو سادہ ہیں، ہمت کی پاپ کی کھان (پیرا)

ز ناری کی ہولی وٹھی

ایک قضاے ایک پیچا ہما

ہمارے مورے اکھ جگاوت

تجلی چوکت ہمارے پیوگی

اونچی اداری چک بھابھ

کھل مٹی اکیاں بھتی اند

مگری رچن مٹھیں ہر داکھا

بھور بھتی جب دیا اند

جب بولے تب لاگے مٹھی

پل خسرو کر کوچ لگاوت

بھجوت برہ کے انگ لگاوت

اے نکھی ساہن، نکھی جوگی

میں سولی سرے سر پر آئی

اے نکھی ساہن، نکھی چن

دنگ روپ سب دا کا چاکھا

اے نکھی ساہن، نکھی ہار

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری

(۱۳۶۲ء - ۱۳۸۰ء)

یہ چشمہ سلسلے کے اہم بزرگوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کا نام شیخ شرف الدین احمد تھا اور یحییٰ منیری کے بچے تھے۔ شعبان کی ۲۶ یا ۲۷ تاریخ کو ۶۶۱ھ مطابق ۱۲۶۲ء کو مصر میں پیدا ہوئے۔ جو چلنے کے قریب ایک علاقہ ہے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت گھر ہی پر ہوئی۔ اس کے بعد حضرت نجیب الدین فردوسی کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ حضرت شیخ کو سلسلہ نسب حضرت امام معصوم صوفی تک پہنچتا ہے۔ آپ کثیر تصانیف تھے۔ ”بزم صوفیہ“ کے مطابق تصانیف کی تعداد ۷۰۰ تک بتائی جاتی ہے۔ لیکن میرزا خیال یہ ہے کہ یہ سب محض رسالے ہوں گے۔ سب سے زیادہ مشہور ان کے کتبوبات کو حاصل ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ ان خطوط کی اہمیت اور نگ ذہب کی نگاہ میں بھی تھی۔ حضرت کے مکتوب ہر جگہ ملتے ہیں۔ ان کے مخطوطات میں ”معدن العانی“ بھی ہے۔ جو شائع ہو چکا ہے۔ دوسرے مخطوطات ”انوار الدینی“ کے نام سے زبردہ مباحث سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مخطوطات میں ایسے اقوال اور فقرے موجود ہیں جنہیں راجح سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مولانا نے اپنی کتاب ”بہارِ نبیر اردو شاعری“ میں اس کی وضاحت کی ہے کہ حضرت کی زبان اردو اور مگوئی کے ارقام سے مرتب ہوئی ہے۔

مولانا کی دلچسپی سماع سے بھی تھی جس کا ذکر جلال الدین مہدائے مہدائے ”بزم صوفیہ“ میں کیا ہے۔ آپ کے قاناتے سب سے سحر آمیز نقش اور مجلسِ قدیم اردو میں ملتے ہیں۔ ”تذکرہ“ (گما) کے ”بہارِ نبیر“ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک مضمون ان کے قاناتے اور بدی الفاظ کے حوالے سے قلمبند کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں کس طرح قدیم اردو سے دلچسپی تھی۔ ان کے بعض دور ہے بھی ملتے ہیں۔ ریختاں اور ان کی ایک مشہور مضمون ہے ”اردو بشر کے ارتقا میں ادب بہار کا حصہ“۔ یہ مضمون رسالہ ”تذکرہ“ کے ”بہارِ نبیر“ جولائی ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں ان کے بعض چٹکے جن کا تعلق فقیری سے ہے درج ہیں۔ یہ چٹکے معلوم ہیں۔ ہندوستان بھی ہیں، جن کا تعلق قدیم اردو یا ہندی سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ مخطوطات بھی ہیں۔ ذیل میں ان کے کلام کے نمونے درج کئے جاتے ہیں، جن سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ایک حیثیت شاعری بھی رہی ہے:

کالا ہنسا ترلا بے سلسلہ تیر جگہ پھارے بک برے نزل کرے سریر

دور رہے نہ بھر

کبیر

(۱۳۹۸ء - ۱۵۷۵ء)

ہندوستان کے قدیم ادبی رہنماؤں میں کبیر کی بصرفِ حیثیت مسلم ہے بلکہ منفرد بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کاشی کے نزدیک ہر تار میں نیر اور اس کی ہری بنا کر ایک پھلا جوتا روپیہ ہوا تھا۔ دونوں اسے کچھ کر سناڑ ہوئے اور چورس کے لئے اٹھائے۔ کاشی کا ایک محل کبیر جوتا کے نام سے مشہور ہے، کہا جاتا ہے کہ یہی مکان نیر کا ہے جو ذات کا جوتا تھا۔ آج کل اس مقام کو تیرو دھن کہتے ہیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ نیر نے قاضی کو بلایا کہ کوئی اسلامی نام رکھا جائے۔ چنانچہ اس نے قرآن سے نام نکالنے کی کوشش کی تو اس میں کبیر، کبیرا اور کبیر جیسے الفاظ ملے۔ پہلے کا نام کبیر رکھا گیا پھر بعد میں کبیر ہو گیا۔

کبیر کی پیدائش کب ہوئی اس سلسلے میں مختلف جرائد میں محققین کی جاتی رہی ہیں۔ لیکن زیادہ لوگوں کا اتفاق سبت ۱۳۵۵ بکری مطابق ۱۳۹۸ء پر ہے۔ کبیر کی پیدائش کے بارے میں کئی تحریریں نقل کیا ہیں سامنے آئی ہیں لیکن سب کی سب آخری معلوم ہوتی ہیں اس لئے کہ انہیں تمام کہاں کبیر کی موت کے بعد ہی رائج ہوئیں۔ کبیر جتنی کہ وہاں میں پدید ہے کہ نیر و ہور نہ کسی ختم میں مدون نامی مٹتی کے ہر باپ تھے۔ یہ لوگ محل کی قسم چھوڑ کر نئے ختم میں رہ گئے اور برہمنی ہو گئے۔ کبیر نے ان ہی کے گھر جنم لیا تھا۔ لیکن ایسا تمام باتیں کبیر میں آنے والی نہیں ہیں اور اتفاقاً ہی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کبیر کے اور طوالت میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ کچھ کھاتے پیتے نہیں تھے بلکہ بھی جسم بڑھاتا جاتا تھا۔ یہ بھی حیرت میں ڈالنے والی باتیں ہیں کہ بھولائے خاندان میں ہر ورش کے باوجود کبیر رام گوند، بیری وغیرہ کے نام پسند کرتے تھے۔

ان کی شادی کے سلسلے میں بعض محققین یہ کہتے ہیں کہ کبیر کی شادی ہوئی ان کی دونوں باپ نہیں ایک کا نام دھیان شے دھنیاں بھی کہتے ہیں اور دوسری اہلی۔

چند مہینوں کی اپنی کتاب ”کبیر صاحب“ میں لکھتے ہیں کہ:-

”مسلمان کبیر چھوڑ کر کاشیال ہے کہ کبیر شائع شی کے مرے تھے اور ہندو کہتے ہیں کہ شی خفی اور کبیر

سے خدائی مباحث ہوا کرتا تھا۔“

کبیر چھوڑ کر کاشیال کے لوگ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کبیر کے گرو سواہی رامانند نے اور وہ اپنے وقت کے بڑے اہم رہنما تھے۔ لیکن پارس ناتھ جی اری لکھتے ہیں کہ کبیر صاحب کی ذاتی ان کی اصلی ہانی معلوم ہوئی ہے۔ ان

کو لکھنے والا کاشی پارس ناتھ جی اری کی کتاب ”کبیر“ مترجم رام کے سوا کسی اور نہیں کہ اس کی دہلی

کی پائی میں کسی ایسے آدمی کا نام نہیں ملتا ہے ان کے دور کا ہو۔ اس کا گھٹن ایک چارپایا ہے جس میں مٹی سرور کی کسی جہا جہا کا ذکر آیا ہے۔

میری مٹی بگڑی جس نے رام ساج، کہہ دو گی، مٹی دیوے
مٹی دست نہیں نہیں ہانکھوں، یہ دکھ کا سون کہو دے
کچے کھیر سو مٹی سفور، مٹا رام رسول دے
"کھیر چٹاوی" مٹی پری اودھ لکھتے ہیں گی۔

"کھیر داس" نے جس جولایے خانوادے میں پرورش پائی تھی اس میں ایک طرف تو تاجہ جتھی بونگیوں کے اعتقادات تھے دوسری طرف وہ اسلام کے زیر اثر بھی تھا۔ میں نے اپنی کھیر داس کی کتاب میں اس جولایے قوم کی مادی صورت کا مفصل مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہاں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی بارہ چارہ بالہ اقوام اسلام کی ترویج کے قبل ازمنہ مادی (ذات) نے صفات کی مستعد تھیں تاجہ جتھی بونگیوں کے زیر اثر تھیں۔ ترویج اسلام سے انہیں ایک نئے مشغول مذہب کا سہارا ملا اور وہ رفتورفتہ مسلمان ہوئی گئیں اور کچھ بعد تک تاجہ فریقے کے اثر میں بھی رہیں۔ مٹا داس کے جس جولایے خاندان میں کھیر کی پرداخت ہوئی تھی، وہ مسلمان ہو چکا تھا۔ لیکن اس پر تاجہ جتھی بونگیوں کا اثر مادی تھا کہ کھیر کو بچپن ہی سے رنگین پنوں کی روحانی روایت کا سیر حاصل ہو گیا تھا۔ ان پر اسلام جیسے مشغول وقت سچا پڑ بڑبڑ کا بھی اثر پڑا جس سے ان کی شخصیت میں زبردست حرارت اور خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ اچار یہ دانا نند کے قریب میں آنے کے بعد انہیں رنگ کی روٹی خشکی اور بھنگی کے راستے کی لذت کا احساس ہوا، ان کے اعتقادات کی مثال ایک لکڑی شخص سے دی جاسکتی ہے جو رنگ کی زمین پر بھنگی کا جی پڑنے پر اپنی تھی۔

بغول بھڑت سو برال مٹی کھیر صاحب جیسا کہ وہ خود اقرار کرتے ہیں، ہجڑے لکھتے تھے۔ انہوں نے لوگوں کے دلوں کو فتح کران سے تھیر کر تھا۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے مریوں اور چیلوں نے ان کا کام ختم کیا اور ماب ان کے نام سے بہت سی تصانیف چھپ گئی ہیں۔ دستک صاحب نے ۸۲ کتابوں کی فہرست چھاپی ہے۔ اس میں مٹی اور پانی کئی کتابیں ہیں اور بعض کتابوں کے نام ایک سے زیادہ مرتب آگئے ہیں۔ "وجود حیا" تھوٹی اپنا ویسے کی "کھیر چٹاوی" میں ذیل کی کہیں کتابوں کی فہرست درج ہے:

[۱] کھیر داس [۲] گورو تھو کی گوشن [۳] کھیر پانچ [۴] مٹی [۵] مٹا رام ساگر

[۶] رانا نند کی گوشن [۷] شہد اول [۸] منگل [۹] ہنسٹ [۱۰] جولی [۱۱] رنجت [۱۲] جملان
[۱۳] گہرا [۱۴] جہا [۱۵] ماس [۱۶] مٹی [۱۷] جتھی [۱۸] الف [۱۹] ماس [۲۰] پرنی
[۲۱] ساگی [۲۲] بھنگ۔

کھیر کے پیغام پر ذرا غور کیجئے تو محسوس ہوگا کہ وہ سادہ، بونگی، چڑت، شیخ اور کاشنی سبھی کا ذائقہ اڑاتے ہیں۔ چڑت اور شیخ ان کے لئے کوئی اشیئت نہیں رکھتے اس لئے کہ دونوں ہی ظاہر ہیں جبکہ چڑت افاضی پر جوت کرتے ہوئے کھیر کو مستقل رکھتے ہیں اور ویسے ان کا مرکزی تصور عشق الہی ہے اور عشق الہی تک پہنچنے کے لئے وید، ستر، پران، والا، مہر، سہر، اتار، پور، وغیرہ کچھ بھی نہیں۔ نہ وہ کپاس کھا میت دیتے ہیں نہ خیر تو یا ترا کو۔ یہی وہ بھگتوں، مہاشیوں، ملاؤں، راجہ جوں اور برہمنوں وغیرہ سے عقیدت کا مظاہرہ کرتے ہیں ایسے لوگ بھی ان کی نگاہ میں سطحیت کا شکار ہیں وہ اللہ اور رام دونوں ہی کو اور سے سلام کرتے ہیں۔ گویا وہ مذہبی رسوم کو ہر طرح سے دور کر کے نظر آتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں عبودیت جو لعلی جبر کی کام ہے۔ اقوام ان کا نام سے باہر جس میں سوت کا خول جاتا رہتا ہے اور پانچ نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے کھیر ایک ایسے انقلابی مذہبی چٹوا ہیں جن کی تعلیمات کا ایک بڑا حصہ ہندوستان کی ثقافتی اور سماجی احوال کو ناف سے متاثر ہے۔ ان کا فلسفہ قدرے وسیع تھا، یہ لکھیں اس میں ان کی انفرادیت کی چھاپ ہے۔ انہوں نے طوقی نظام کی کٹھ چٹنی کی ہے اور ذات پات کے علم کو توڑنے کی سعی میں نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں کی مذہبی ظاہر اور باطن پر حملے کرتے ہیں اور ایک ایسا سماج چاہتے ہیں جس میں کسی قسم کا عہد بھاد یا تفریق نہ ہو۔ ان کے یہاں بہت دراصل ایک ایسا جذبہ ہے جو خدا سے ہم رشتہ کر دیتا ہے۔ جس میں کسی خارجی عمل کی کوئی ضرورت نہیں۔ سب سے بڑی ذات اللہ کی ہے اس کے خدا کو کوئی اور ذات نہیں ہے۔ اگر خراب کی وجہ سے عبادت کی جائے تو یہ بھی ملام ہے اس لئے کہ عبادت تو محبت کا دوسرا نام ہے۔ ایسے تمام تر انکار کی وجہ سے وہ ہندو اور مسلمان کی نظروں میں کانے کی طرح چھپے تھے ہیں۔ لیکن یہ جگہ ہے کہ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی فکر پر رکاوٹش کی اور اپنا غلط محبت اسی پس نظر میں مرعوب کیا۔

میں ذیل میں "کھیر چٹاوی" کے صرف پانچ بنڈاق کرتا ہوں۔ مٹی کے ساتھ جس طرح پری اور دے پیش کیا ہے۔

شیخ (چٹاوی)

ساج برابر ٹپ نہیں چھوڑا برابر پاپ

جاکے پردے ساٹھا ہے تار دے گورو آپ

(جگ کے برابر کوئی ریاست نہیں اور محبت میں کوئی گناہ نہیں۔ جس کے دل میں چٹاوی ہے وہ)

کے دل میں خورشید خدا ہو جو ہوتا ہے)

ہندی میں شعر کہا کرتے تھے۔ بہر حال، یہ تو بھی جانتے ہیں کہ خاتما ہاں ہندی کے شاعر ہیں۔ ”المسکب آصفیہ“ میں سید احمد دہلوی نے ان کے اشعار کی مثالیں پیش کی ہیں جو بدیعِ ذیلی ہیں۔ ظاہر ہے اس کا تعلق صاف طریقے پر قدیم اردو سے ہے، مگر اردو اور ہندی بھی بھادو نہیں تھا۔

رحمن دعا کا پریم کا مت توڑا چٹکائے

لوٹے سے پھر نہ دے، اے گاتھ پڑ جائے

انکے فکر نہ کیوں کر نہ چھانڑے ساتھ

ماتحت آگے سکو بیہوتے رجم دھو ہاتھ

مٹا کر گر پھر کر جاگک زسحر ہوئے

اب تو چھو رجم بل نکل پڑے لٹ ہوئے

مہرِ رحیم خاتما ہاں کی وفات کی تاریخ ۱۲۲۹ء ہے۔

حضرت نوشہرہ خٹک بخش

(۱۵۶۳ء - ۱۶۲۲ء)

ہادی محمد نوشہرہ خٹک صاحب خٹک بخش تو ان کا ذکر واجد ثلثا نے بھی کیا ہے۔ ان کا تعلق بغداد سے تھا، جہاں وہ پیدا ہوئے تھے اور اپنے اہل بیت کے اہم مسوئوں میں شمار ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بھاب کے سلسلے کے نوشاہیہ کے بھی باشندے ہیں جن کا دہانہ ”خٹک الاسرا“ نام سے مشہور ہے۔ معرفت و ریاضت سے متعلق اس کے تفصیلات زیر بحث رہے ہیں۔

نوشہرہ خٹک اپنی کتاب ”خٹک الاسرا“ کی ابتدا اردو ادب میں بحث کا موضوع رہے ہیں۔ مصنفین کا ایک سلسلہ شری سے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی سے ابتدا ایک صوفی شرافت حسین نوشہرہ خٹک ”خٹک الاسرا“ شائع کی، جب سے اس کتاب کے سلسلے میں اور خود خٹک بخش کے بارے میں عبارت کا سلسلہ جاری ہے۔ ”الکتاب خٹک خریف“ کے وہ ہیں جس کی جہتی دیکھی گئی ہے کہ اسے حالی محمد نوشہرہ خٹک تصنیف قرار دیا جائے۔ انھیں اس کے ذریعہ دیوان کی صفائی کی گئی کہ یہ گمان کرتا ہے کہ کسی مرید نے اپنے مرشد کے نام سے اس کی تصنیف کی ہے۔ ”مقامات جلیلیہ یادگار“ (۱۶۹۵ء) ”آداب الیقین“ (۱۶۱۴ء) ”ذکر و توشیح“ (۱۶۲۹ء) اور ”تھاغ قدسیہ“ (۱۶۷۷ء) میں حالی محمد نوشہرہ کی نفس تصنیف کا ذکر نہیں ملتا اور یہ کہ ان کی نوادہ دو سو برس بعد چھری کا زبان معلوم ہوتی ہے۔

خورشید احمد خٹک کے مقالہ نوشہرہ خٹک بخش میں بھی اس خیال کو رد کیا گیا ہے کہ یہ حضرت نوشہرہ خٹک کا ہی ہے۔ انہوں نے مزید اس امر کا اثبات کیا ہے کہ ۱۰۰۹ھ اشعار میں سے ساتھ سے زیادہ اشعار ”مکمل فقیر“ سے اخذ کئے گئے ہیں اور مطوی ”مکمل فقیر“ نظام کی الدین کی تصنیف ہے۔ لیکن ڈاکٹر گیان چند جی سے تسلیم نہیں کرتے ہیں۔

بہر حال صورت حال جو بھی ہو ”خٹک الاسرا“ کی اہمیت اپنی جگہ پر برقرار ہے اور اسے اردو کی ادبی تاریخ کے لئے ایک نئی صورت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رحیم کا شبیری لکھتے ہیں:-

”حضرت نوشہرہ خٹک بخش کے کام کی انسانی مہارت کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعد ہاں کے بھاب

میں انکی رواں اور صاف زبان کا کھلنا آگیا تھا۔ اس کام کے افعال اور بخار سے واضح طور پر

انیسویں صدی کے آغاز یا انھار سوئیں صدی کے آخری حصے کے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ اشعار

ملاحظہ ہوں:

بہت ریاضت محنت عامتہ دل حاضر مانگے ہر ساعت

فصل خدا کا از تو فیض جب سائگ کوں ہو رہے رفیق

تب پیچھے اس زاد سعادت علم سوانحی کرے مہارت

طاعت بڑی دیر فرما دے اپنا کیا کچھ کام نہ آت

داد و دو جو دوسے حکیم آپ وارو کیا کرے سقیم

جو توڑی ہلدیوں کے کام دین دنیا میں ہو رہی تمام

سب قرآن مجید میں آئے حق تعالیٰ نے آپ فرمائے

حضرت نوشہرہ خٹک بخش سے منسوب اردو کلام کی حقیقت دریافت کرنے کے لئے میں نے دوسرا کام اپنے دیرینہ دوست ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی خدمت میں ایک مریضہ سال کیا تھا۔ جس کے جواب میں ڈاکٹر دلو اور انھوں نے ایک مختصر مکتوب ارسال کیا تھا۔ اس مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خورشید احمد خٹک کی تحقیق کو رد کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک خورشید احمد خٹک ایک کم استعداد، ناقص معلومات رکھنے والا اور عقلی بصیرت سے عاری شخص تھے۔ جب کہ ڈاکٹر گیان چند نے خورشید احمد خٹک کے کام کو اردو تحقیق کی تاریخ کا ایک ذریعہ باب قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی اس بات کو لا شعوری طور پر اہل قول بھی کرتے ہیں کہ ”خٹک الاسرا“ کے دس اشعار ایسے ہیں جن کا انتساب حضرت نوشہرہ خٹک بخش کے علاوہ کسی سے نہیں کیا جاسکتا۔ اگر نوشہرہ صاحب نے دس شعر بھی

کہے ہوں تو "گج لاسرا" کو لے کر بھٹی اٹھیں دیا جاسکا۔"

واقع ہو کر ساری بحث اس بات پر غور کی ہے کہ "گج لاسرا" کی زبان بہت حد تک ہندی آمیز ہے اور ایک طرح سے قیرہ اور اثرات کی جو زبان دیکھی جاتی ہے اس کا مظاہرہ یہاں بھی ہے۔

افضل پانی پتی

(۱۶۱۵ء)

افضل پانی پتی اپنے عہد کا سب سے اہم شاعر ہے۔ اس کی تعریف "بکت کہانی" اور "ہاسکی روایت" میں ہے جو ایک "نویان" سے جاسکے پورے میں رہے اور "ہندو" کی حکیم کیفیت کے اظہار سے متعلق ہے۔ ہندو مت میں مختلف بیگنوں سے نقل کر رہے ہیں۔

یہاں ایک غور اتنی سکھوں سے ظاہر ہو کر چاروں ول بیان کر رہی ہے:

سب سکھوں بکت مہری کہانی
بھتی ہوں عشق کے غم میں روانی
نہ مجھ کو بھوکہ دل نہ تیرا رات
مرد کے درد میں سچہ پرانا
اسے یہ عشق ہے کیا کیا بل ہے
کہ جس کی آگ سے سب بک جلا ہے
اپنے ہی آگے بدھتے آگے دیکھتی ہے:

گن دھات رت کھرا ٹھک سب
نی دھم کہ ساخن گھر بھر کب
ہا نٹ ناٹھی کیسے رہوں رہی
تم ہو پر تم کیسے سبوں رہی

تمہیں کہہ چکے ہیں کیا ہے خوب کا حال خانی ہے۔

چ م تیر فتن آہ ہے
ب عشق ہا را شرارت ہے

کیا ہے میں پاس دھرائی
بھتی ہوں دیکھ کر اس کو روانی

دہی میں اور کر پاؤں پڑی جائے
پیانے کر کھلا لکھی گلے لائے

جب اسے ہجر کے طوٹنے کھات کے بعد حال میں ہوتا ہے تو وہ اپنی سکھوں کے سامنے اپنے عشق پر یوں زباں ہوتی ہے:

دہی اسے ہوا نہیں، یو عشق بازی
نہ جالو چوچ و طرخج بازی
دہی آساں نہ جالو عشق کرنا
تمہیں اس آگ میں ہرگز نہ جانا

ظاہر ہے کہ "بکت کہانی" میں اور زبان کی پوری کیفیت نمایاں ہے۔ اور الفاظ خوب خوب استعمال ہوئے ہیں۔ چند جگہ بھی گرامر کی کچھ صورت ملتی ہے۔ "بکت کہانی" کی بحث ختم کرتے ہوئے ڈاکٹر نیل جانی رقمطراز ہیں۔

"بکت کہانی" کے زبان و بیان میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہاں مختلف پالیوں کے اثرات نے مل جل کر اب اپنی ایک شکل جاتی ہے۔ جو شکل دکنی اور دے کے معیاری ادبی روپ سے زیادہ خوبصورت اور پرکشش ہے۔ فارسی، عربی اور ترکی زبانوں کے اثرات بھی ایک جان ہو کر زبان کے مزاج کا حصہ بن گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب "تندرہ" میں اورنگ زیب کا لکیر (مرے و بھار) کی فتوحات دکن کے ساتھ شمال اور جنوب مل کر ایک ہو جاتے ہیں تو دکن کی ادبی روایت زبان کے اسی معیار کو قبول کر کے پہلی بار دکن کی شاعری میں اپنے نقطہ عروج پر پہنچ جاتی ہے۔"

لیکن اس سے پہلے یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ افضل پانی پتی کی "بکت کہانی" اردو میں خاصا ناز کا باعث رہی ہے اور محققوں نے کئی حوالات کو ملے کچھ میں جوفہ بن کوئی طرح کے شکوک میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اس باب میں مختلف لوگوں کی کیا رائے ہے اس کی تفصیل انجمن کی زبانی آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں تاکہ پوری بات واضح ہو جائے۔

افضل پانی پتی کے بارے میں پروفیسر محمود شیرانی نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:-

"افضل پانی پتی ہندو مت کی صورت میں آرمست تھے۔ شعر ہندی و فارسی بیکایت خوب کہتے تھے۔ معلم پیش تھے کثیر و جم غفیر ان کے حلقہ درس میں حاضر رہتا تھا۔ گاؤں ایک ہندو

عورت پر عاشق ہو گئے اور بہتوں صفت حاصل کر فرما لیں گئے گئے۔ وہ حیدران کی گھروں سے ملحق ہو گئے۔ سولہ گوجہ بازار میں گھومنے لگے۔ ان کے رشتہ داروں نے سنا چا کہ اس بلائے میں کوہر معمر! میں کچھ نہیں۔ یہ عاشق طلب بھری دھن توئی کے سب اتنی مہارت نے نہیں کر سکا۔ آخر ایک رات غاسنی سے اس عورت کو گھر اور اندر کر دیا۔

سولہ سالے جب کئی دن تک اسے نہ دیکھا تو غصہ کیا اور معلوم ہونے پر خود بھی گھر پہنچ گئے۔ ایک دن دیکھتے ہیں کہ وہ ماہر و دمری حسینوں کے ساتھ میر کر رہی ہے۔ انہوں نے اس کے سامنے ہاتھ کر شعر پڑھا

خوشا رسوائی مال جا ہے
سر راجے وہ آپے دنگا ہے

وہ شعر قہ کیا خاک بھی ہوگی لیکن اس نے کئی سے کہا تھے سفید رازی کے باوجود شرم نہیں آتی کہ مجھ بھی جو ان عورت کے عشق کا سوا دھڑ نہیں دھکتا ہے۔

مولانا نے ایک ڈھونگ دیا۔ (راحمی تر شا کر زنا رچوں کر برہمنوں کے لباس میں ایک مدت کے مشد کا سر پہن کر گھبرا اور علوم بدعتی کی تحصیل کرنے لگا۔ اس پر بری بی وقت کے بعد انہیں مندر کا پیر دی (مشرک) مقرر کیا گیا۔ وہاں یہ مدت تھی کہ سال میں ایک بار خود جس اس مندر میں آکر خیرات دیتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ روز عرش کی زیادت کے لئے آکر تمام ہادی کہنے لگیں۔ جب وہ محبوب پاؤں چنے کے لئے نکلی تو سولہ سالے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے ملتا شروع کر دیا اور کہا کہ مجھے پہچانی ہو وہ عورت دیکھ کر حیران ہو گئی اور کہا کہ آپ نے مجھ بھی ناکس کے لئے اپنی انگلیوں اٹھا لیگیں۔ جو آپ کی رضا ہے وہی میری رضا ہے اس کے بعد وہ عورت مسلمان اور جاتی ہے اور سولہ سالے سے شادی کر لیتی ہے۔ بعد میں دونوں اپنے دیار کو واپس ہو جاتے ہیں عورت حیات دائم بسر کرتے ہیں۔

اس واقعے یا افسانے سے ڈاکٹر عظیم احمد علی (محقق نہیں کرتے ہیں۔ ان کے ذہن میں جو شکوک ابھرتے ہیں

ادائیں کے الفاظ میں ملتا ہے۔

”اصل کے اس افسانہ محبت کا قادی اس کی دلچسپیوں سے اظہار اندازی کے باوجود بعض ذیلی انجنتوں سے دوچار رہتا ہے۔ ترجمہ نگار نے ایک سے زیادہ مرتبہ افضل کو اشیئت المعمر اور

علت میری میں گرفتار کیا ہے۔ کیا اس زمانہ غریب افضل مجھ زندگی گزار رہے تھے؟ اس لئے کہ ان کے معاملات عشق میں کہیں ذہن اور زائد خانہاں کا ذکر نہیں ہے اور کیا اس عمر میں دو تمام ہنگامہ رانی ممکن تھی جو اس داستان میں باقی ہے۔ ان کے چہرہ عشق کے دالہ نہ ہیں اور ان کی کم پند اندیشی صرف قوی اور علت بھری سے کوئی مٹا بیٹ نہیں دیکھی۔ ظاہر یہ وہ جو ان عصر بعد عورت جسے افضل کی کوچہ گردی کے قہش نظر رسوائی و بدنامی سے بچانے کے لئے درتھ معمر! میں بھیجا گیا تھا اسے افضل کے ملاش محبوب میں روپوش ہو جانے کے باوجود اس ریا پر میں کیوں چھوڑا گیا؟ اور اس داستان میں اس کے مزیدوں اور زردیوں کیوں کاس کی شادی کر دینے کا خیال کیوں نہ آیا؟ جب کہ سندھوس میں جو ان لڑکیاں اسے دوسری تک نہیں بھیجتیں۔ یہ خاکے گھر کے مجمع میں افضل کو سندھ کا بڑا بہت ہوتے ہوئے ایک طرح جا کے لئے آئے۔ انی امور کا ہاتھ چڑھتے اور اس سے اظہار مدعا کرنے کی جرات کیسے ہوئی اور یہ بات بھی کیسے رہی جو غیر و غیرہ اس سے کبھی کبھی یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں یہ بات نہیں ہے کہ افضل کی اس پریم کہانی میں کچھ باتیں زیب داستان کے طور پر بھی شامل ہوں۔ مولانا نے اس قصے کے خاتمہ کا حوالہ بھی نہیں دیا اور خود افضل کا ماضی نہیں ہے۔

اس باب میں ڈاکٹر یو کاش مونس کا ادراک بیان ہے۔

”والہ کی اس داستان پر یقین کرنے سے پہلے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ داستان اس زمانے کی ہے جب کوئی بدعتی سے مسلمان کے ہاتھ کا پانی لی لیتا تھا تو وہ بیٹھ کے لئے برابر ہی سے خارج کر دیا جاتا تھا اور بچاؤ کا بیٹھ لکھتے تھے تو اس زمانے میں نقطہ عروج پہنچا ہوا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک بڑا مسلمان عظیم جو عربی قاری کا بیٹہ عالم ہو ایک ہندو کا سوا گھر کر مند رہیں۔ اور اس کے عادات و اطوار روز مرہ حیاور سے کبھی کبھی بھانڈا نہ پھرنے کے یہ عہد نہیں بلکہ مسلمان ہے پھر اس زمانے میں گھر ایسے تیرتھ کے کسی مندر کے پجاری کا ایک مسلمان کو چنا جائے کہ اس کے ساتھ کھانا چا اور ہند میں گرو کی وصیت کے مطابق پہلے کو پجاری چلا دیا جائے اور گوروں کا پجاری لی قدم ہوئی کرنا اس دھندلے خیالات ہیں کہ ان پر یقین کرنے کے لئے طبرانی صاحب کی یہ قہاریت درکار ہے۔

اس بارے میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ یو پی کے مندروں میں کوئی اور مشد نہیں ہوتے اور پجاری خانہاںوں کے سوا وہ شخصوں کی طرح مرنے والے کی مرضی یا وصیت کے مطابق

مقرر نہیں کئے جاتے۔ نہ بھاری کو کوئی ایسا معجزہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ پہلے میں آنے والا ہر شخص اس کی خدمت پہنچ کرے۔ بھاری تو ایک معمولی شخص ہوتا ہے۔ ملازم ہوتا ہے۔ محل میں تالار مندروں کے بھاریوں اور مصلوٹوں کے بیٹوں میں امتیاز نہ کر سکے اور اس طرف ان کی نظر گئی کہ مصلوٹ تو کیا سارے برج میں اس زمانے میں کسی بہت کم ملے ہوگا۔ کیوں کہ مصلوٹ تو مندروں کا شہر ہے۔ پھر یہ بھی واضح ہو کہ مندروں میں دست بوسی یا قدم بوسی کا رواج نہیں۔ مرید اور مستحق مسلم جو ادب و شہرت کے ساتھ جوستے تو دیکھتے تھے کہ میں لیکن ہندوؤں میں اہل دین کی جسمانی پاکیزگی ملے۔ مجبوراً مجاہد کا شعور ابھار رہا ہے کہ کوئی شخص کسی دینی عقیدے کے جسم کو ہاتھ لگانے کی بات بھی نہیں سوچ سکتا۔ انہیں اور سے ہی ڈر ہے کہ جاتی ہے۔

اصل میں قدم اور دستوں کے زیباں داستانوں میں مسلمان عاشقوں کے پیچھے ہندو عورتوں کی تہذیبی مذہب کی ایک مسلسل اور مستقل روایت چلی آتی ہے۔ میرامن کی بارگاہ میں غریب سنگ پرست کو نواز پرست کرکے کہ ملک دین پاؤں کی راہنمائی اور بعد میں سرائے کی شاہزادی صرف پانچ پانچ سطروں کا وہ قصہ کر مسلمان ہو جاتی ہیں۔ ان کو گولی چند رنگ نے ایسی سولہ مشقیوں کے نام کنائے ہیں جن میں ہندو عورتوں آفر میں مشرف بہ اسلام ہو جاتی ہیں۔ یہ نو قندیم زمانے کے قصوں اور داستانوں کی بات ہے، ازراہ سولہویں صدی میں خود حافظ شیرانی کی تاریخی واقعہ نگاری کا تصور دیکھئے۔ آپ شیخ متین لاہوری سنی ۱۳۲۸ ہجری کے بارے میں رقمطراز ہیں: ”آپ کی مجالس و محافل عشق کی شہرت سے جمع ہوتی تھی۔ ہندو بھارتوں کی تعداد میں وہاں میں کرہ حق جوش اسلام ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے پہلے ہندوؤں کو دعوت دی اور دوسرے جو میں پانچ سو ہندوؤں سے میں ایک ہزار ہندو مشرف بہ اسلام کئے۔“ حساب کا کتابہ تھا کہ چھ تھے جس میں دو ہزار پانچ تھے جس میں چار ہزار ہندوؤں کو دولت ایمان عطا کی جاتی چاہئے تھی اور اگر یوزپوس کا یہ پھر سال پھر چل جاتا تو تقسیم ملک کی ضرورت نہ ہوتی۔ ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ مندرجہ بالا اقتباس کسی نہ کسی در سال یا تین یا چھ سال کی روزانہ نہیں بلکہ ایک ہزار عرب یعنی پنجاب میں اردو سے چٹا کیا گیا ہے۔ جب شیرانی صاحب دوسروں سے غرض اسلام کی اس داستان پر یقین کرنے کی امید رکھتے ہیں تو پھر خردان کے لئے والہ کی بیان کردہ داستان کی محنت میں شک و شبہ کی کیا گنجائش تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس دل خوش کن داستان کے بعد افضل پانی جی کو ”بکت کہانی“ کا سیرا بنادیا اور شہادت میں ”بکت کہانی“ کا آخری شعر:

دہا دل دہا خوش حال کی دانش

پیش کر کے اپنی طرف سے یہ مذاق فرمایا کہ گو پال افضل کا اسی دو نام ہے جو انہوں نے مندر کے بھاری اپنے پرائیڈ کا تھکا ہوا لاکھ والہ کے لسانے میں دور تک اس کا ذکر نہیں۔

دائم الخرافات نے اپنے ایک مضمون ”بکت کہانی اور افضل“ (ہماری زبان، یکم جولائی ۱۹۷۱ء) میں جب یہ عرض کیا کہ ”الذکر داستان میں“ ”بکت کہانی“ کا اور ”بکت کہانی“ میں ”الذکر داستان کا کوئی اشارہ تک موجود نہیں ہے تو اس کے جواب میں ڈاکٹر کھیل نے فرمایا کہ ”یہ ممکن ہے کہ الہ کو تذکرہ لکھتے وقت ”بکت کہانی“ کے بارے میں کچھ مظلوم ہی نہ تھا۔“ میں تہایت لجاجت کے ساتھ یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ والہ کے تذکرہ لکھتے وقت نہیں بلکہ اس سے عیس برس پہلے سے ”بکت کہانی“ اس دور میں مشہور تھی کہ مصنفین اس کے تعلق میں پوری پوری کنایوں لکھ دیتے تھے۔ ”الذکر تذکرہ ریاض الشجر“ ۱۱۶۲ھ (۱۷۷۷ء) میں لکھا گیا۔ اس سال شاد آیت اللہ جوہری نے دو ہزار تین سو چار آیات پر محیط اپنی مشہور مثنوی ”گوہر جوہری“ ”بکت کہانی“ کو مسموئہ مان کر لکھی۔ ”گوہر جوہری“ کا بارہ ماہہ نکال چکا کہ کہہ رہے ہیں کہ وہ ”بکت کہانی“ کی نقل ہے۔

مثنوی کی دہیت نمبر ۱۹۹۰ میں تو شاد صاحب نے اس کے نام کے اجزا ابھی باغ سے ہیں:

زانی کہہ بکتھ میری کہانی
یا میں ہا کے تو میری زانی

اگر غور کیا جائے تو ان کلام کے مصداق یہ کہا جائے کہ پانی بیت کے شاعر کی تعریف بہار میں تو مشہور تھی لیکن ہر بات میں اس سے کوئی واقف نہ تھا تو اگر تم تعلیمی جوہر بکت کا سا کن تھا اور جس نے ”تذکرہ ریاض الشجر“ سے بھی تیس سال پہلے یعنی ۱۱۳۲ھ میں اپنا حیرانہ لکھا اس اعتراض کی بخند یہ کہ لئے کافی ہے۔ ترجمہ دے کے آخری اشعار میں غریب انہوں میں اسے افضل کی بکت کہانی کا بیان کیا گیا ہے اس کی تفصیل آگے بیان کی جا رہی ہے۔

ظاہر ہے کہ بکت کہانی والہ کی تصنیف ہوئی جن کی داستان بہت سے والہ داران حد تک واقف ہیں تو یہ مانگنا تھا کہ انہیں ”بکت کہانی“ کا علم نہ ہو اور وہ افضل پانی جی کے بیان میں اس کا ذکر نہ کرتے۔ رد و تحقیق کے واسطے یہ تاریخی غلطی جیسے ایک بدلتا دارغ کی صورت سے نمایاں رہے گی کہ کسی شہادت کے بغیر ”بکت کہانی“ کا مصنف ایک غیر متعلق شخصیت کو قرار دے دیا گیا اور ایک کے بعد دوسرا تحقیق بغیر کسی جانچ پڑتال کے اس مفروضے کو حقیقت سمجھ کر ویرانہ بنا دیا اور اس شخص میں جنہوں نے اس وقت پارے میں یا معروض کیا تھا کہ الہ نے جس افضل پانی جی کا ذکر کیا ہے اس

کے مطابق انہوں نے اردو شہزادوں کی طرف بھی توجہ کی۔ شاہجہان دہلی کے تذکرہ "ایکادین" میں ہے کہ بعد شاہجہان کی موت دلی دہلی کی اور چند روز میں دو ہندو شاہزادوں کی طرف رجحان رکھتے تھے اور مدد و ادب سے ان کی واسطی انوث تھی۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اردو کی ابتدائی نشوونما میں ہندوؤں کا بڑا حصہ ہوتا تھا اور بعد میں بھی یہ سلسلہ قائم رہا۔ یہ سمجھنا تو بالکل سائنسے چرہ مشا آئمہ تمام تھیں، لیکن چند بہانہ آفتاب دہائے دہواہندہ تھی وغیرہ۔

چند روز بعد دہلی کے حکمرانوں کے حالات کے بارے میں کچھ زیادہ واقفیت نہیں۔ بہر حال، ان کی ولایت کی تاریخ ۱۶۶۶ء بتائی جاتی ہے۔



دکنیات اور اردو ادب

یہ بات درست ہے کہ دکن میں اردو کی ابتدا پہلے پہل علاقائی حلقوں کی وجہ سے ہوئی لیکن اس کی ترقی اور فروغ اس وقت سے یا شاید اس سے پہلے شروع ہوا جب محمد بن قلیق نے دولت آباد میں دلی کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ علاء الدین خلجی کی فوجوں کے ساتھ دکن جانے والے بہتے تھوڑے تھے۔ لیکن ۱۳۹۷ء میں جب دولت آباد دارالسلطنت قرار پایا تو حکم بادشاہ دلی کی تمام رعایا دکن کو بھیج کر تھی، جس کی تفصیل امین بطوطہ کی کتاب "سفرنامہ ابن بطوطہ" میں ملتی ہے۔ وہاں مستقل ہونے والوں میں ہر پٹے کے لوگ شامل تھے۔ فوجیوں کے علاوہ دھوئی، چمچ، عالم، مختلف پیشے کے تعلق رکھنے والے بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے ساتھ ان کی زبان بھی گئی تھی جو دکن کے علاقہ کے بعد ایک خاص مافیہ ثقل اختیار کر گئی تھی۔ ہم اردو کہتے ہیں۔ یہ بھی دلچسپ امر ہے کہ محمد بن قلیق نے اپنے فیصلے پر نظر پڑائی کی اور ایک بار بعد دلی منتقل ہونے کا فیصلہ لیا اور کہا۔ لیکن بہت کم لوگوں کا علم ان واقعوں میں ہونے اور وہیں رہنے میں آئے۔ اس کی تفصیل شاہنشاہ مرزا ظہیر احمد بیک یوں بیان کرتے ہیں:-

"محمد بن قلیق نے اگرچہ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اپنا پایہ تخت دلی سے دولت آباد منتقل کر دیا تھا۔ لیکن اسے جدید یا احساس ہوا کہ شہر دلی کا قیام پایہ تخت رہنا زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ اس نے پایہ تخت کی منتقلی کا وہ بارہ حکم دیا۔ لیکن بہت کم لوگوں کا علم انوں نے جو ۱۳۹۷ء میں دکن چا کر میں گئے تھے وہ بارہ تھے۔ کافی کوسہ سب نہیں سمجھا اور وہیں کے ہر جگہ۔ محمد بن قلیق نے دکن کے ارتقا کی اور سیاسی امور کی دیکھ بھال کے لئے ایک خاصہ دفتر کیا لیکن ابھی دو دہائی بھی گزرے نہیں ہائی

تھی کہ امیرانِ صمد کی خودمختاری کی وجہ سے کنہر سلطنت دہلی کا اقتدار زبردست کم ہونے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امیرانِ صمد میں سے ایک میر علی الدین بکلی شاہ نے ۱۳۲۷ء میں محمد بن تغلق کی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے ظہیر گڑھ میں ایک خود مختار سلطنت کے قیام کا اعلان کر دیا جو پہلی سلطنتِ گھمناکی۔ بعد میں یہ سلطنت بدلتی ہوئی۔ علا الدین بکلی شاہ کو تمام امیرانِ صمد کی حمایت حاصل تھی۔ اسے نئی سلطنت کا بادشاہ واصل انکھ امیروں نے ہمایا قلعہ بنول جمیل جاپانی اب دکن کی سلطنت میں لوگوں کے ہاتھ میں آگئی تھی جو شمال کے ترک ہونے کے بعد جو خود کو دکن کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ نئی سلطنت کی بنیاد میں اقتدار کی بیوں کے علاوہ شمال دکنی کے چند بات بھی شامل تھے۔ جمیل جاپانی نے دکن کی اس نئی صمدتِ حال کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا: "اس نئی سلطنت کی بنیاد میں شمال دکنی کے چند بات شامل تھے۔ شمال دکنی کے جوش میں انہوں نے سیاسی ناخوشی کے طور پر ان تمام عناصر کو بھرا دیا جو شمال سے تعلق اور خصوصیت کے ساتھ مرز میں دکن سے تعلق رکھتے تھے ایک بوڑھا علاقائی حربے کے طور پر بیسوں نے دل کھول کر دشمنی روایات کی جو اصل افغانی کی، دکنی رسوم و رواج، مہلوں، ٹھیلوں اور تہوہوں کو ترقی دیکر باہمی ربط و ربط، میل جول اور معاشرت و تہذیب کو گہرا کر لے کے لئے اس زبان کی سرپرستی کی..... جسے آج ہم اردو کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس عمل نے جنوب میں شمال کے خلاف ایک تہذیبی دیوارِ مدافعت کھڑی کر دی اور ہر عظیم کے دونوں حصے ایک طویل حربے کے لئے ایک دوسرے سے کٹ کر رہ گئے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ۱۳۸۷ء سے ۱۳۹۷ء کے لئے کر قریباً تین سو سال سے زیادہ عرصے تک یہ زبان جو شمالی ہند سے آئی تھی سرزمینِ دکن کے لسانی و قبضہ ای اثرات قبول کرتی ہوئی آزادانہ طور پر نشوونما پاتی رہی۔ جسے علامہ کی بجائے وہاں کا ہے جسے علم دکنی اردو کے نام سے پکارتے ہیں اور جس کا ادب اردو زبان کی تاریخ میں ایک ایسی نشان و باب کی حیثیت رکھتا ہے۔"

یہ بات یہ واضح ہے کہ دکن کی خود مختار سلطنتوں نے اردو کی ترویج، اشاعت میں خوب خوب مدد ملایا۔ واضح ہو کہ ۱۳۸۷ء میں یعنی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ بھی سے اردو میں تصنیف و تالیف کا ایک حویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ بعد کی شکستوں نے اس امر میں کچھ کمی نہیں کی اور یہ بالکل سچ ہے کہ حالی شاہی اور قلعہ شاہی سلسلے اردو کا نگار بڑھاتی رہیں۔

دراصل دکن میں فارسی کی نسبت مقامی زبانوں پر زیادہ زور تھا بلکہ فارسی کے اثرات بہت کم تھے۔ ادب اردو اپنی پہلی نوکریا یہاں کے لیے تنگ قال ثابت ہوئی، علاقائی روایتیں، اردو میں ترقی و ترقی پر سائے آسکی تھیں۔ مگر دکن میں پہلے ہی سے اردو بولنے والے اور لکھنے والے موجود تھے۔ یہ دیکر عبدالغفار سردار کی کاہن خیال درست ہے کہ:-

"دکن میں اس زبان کے چلن و نشوونما پانے اور زوال ہونے کے اعتبار کر جانے کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ جنوبی ہند کے مختلف المہن علاقوں میں شمال سے آنے والوں کے لئے اتحاد کا واحد مہاراجہ کی زبان تھی۔"

یہی وجہ ہے کہ اردو کے اولین صوفیوں نے دور ہی سے ملنا شروع ہوئے اور اس زبان کا بغیر پوری طرح تیار ہو گیا۔ جس میں محمد پروغائی تھی۔ صوفیوں نے اپنے طور پر اسے ہی رشد و ہدایت کے لئے منتخب کیا۔

شمالی ہند میں ابتدائی زبانِ وادب کا ٹھکانہ قلعہ ہوا چکا۔ اس قلعہ کے بعد اس کا احساس ہوتا ہے کہ دکنیات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور کئی علاقے کے شعراء ادبِ قلعہ کا جزو خاص ہو جاتے ہیں۔ مثلاً گجراتی ادب کے انکار، پہلی عہد کے شعراء وادب اس کے بعد ہی خود مختار یا استوں کے قیام کے بعد بھاپور، عادل شاہی دور، اس کے بعد کو محمد علی گوکنڈہ اور قلعہ شاہی دور۔ مگر دکنی روایات کے اثرات کا رنگ ہوتا اور بھاپور اور گوکنڈہ کے سقوط کے بعد دکنی روایات کا آواز۔ ابھرا مسعود سلطان کے بعد اہم صوفیوں کے ذکر کے یہ بحث ختم ہوتی ہے اور دکنی ادبیات کا باطلہ عہد شروع ہو جاتا ہے۔ آئندہ صفحات میں ہمیں سرخیوں کے ساتھ الگ الگ علاقے کے شعراء ادب پر روشنی ڈال رہا ہوں۔



یہی صورت گجری میں ہوئی۔ دہلی کی زبان کے اثرات گجری پر بھی پڑے۔ لگے۔ یہ اور بات ہے کہ علامہ دین علی کے زمانے سے ہی دونوں گجریوں میں آمیزش ہوئی۔ اس کی وجہ صوفیائے کرام کا اسلام کی اشاعت کا پلہ تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود بعض گجراتی صوفیاء یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ دہلی کی زبان کے اثرات کی وجہ سے گجراتی زبان ایک خاص رنگ اختیار کر رہی ہے۔ محمود شیرانی نے اس امر کا احساس دلایا ہے کہ صوفی شاعر بھالہ الدین باجن بنیاد دہلی اور دہلی کا ایک ہی چیز بنا کر گئے تھے۔ چنانچہ گجری کو ہماری زبان پر بھی کہا جانے لگا۔

اس مباحثہ سے الگ گجرات سے تعلق رکھنے والا لادیم ادب گجری ادب کے نام سے موسوم ہوا۔ اس ضمن میں ایک اہم امر کی طرف اکتانہ قسم کا تیسری یا اس قوجہ اشارت ہے۔

”معلوم ہوتا ہے کہ گجرات کے صوفیاء اور ادیبوں کے شعور میں یہ بات پختہ حد تک موجود تھی کہ وہ زبان کے معاملے میں گجراتی زبان کے ادیبوں سے جدا گانہ سامانی نشا نشا رکھتے ہیں۔ وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ جس زبان میں وہ ادب تخلیق کر رہے ہیں وہ اپنی زبان سے لے کر گجرات اور دکن تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے وہ ایک وسیع تر سامانی روایت کے شاعر تھے۔ اس روایت کی تفصیلات کے لئے ”گجری“ یا ”گجری“ کی یہ اصطلاح اس خطے کے ادیبوں کی قلمی اوراد کو گجراتی سے ممتاز و تیز کرتی تھی۔ چنانچہ شیخ علی محمد جی گام دہلی کی تصنیف ”بہار اسرار اللہ“ کے پہلے جلد میں جو ۳۱-۱۵۳۰ء سے پہلے کی تحریر ہے۔ یہ اصطلاح موجود ہے۔“

بہر حال گجری ادب اپنے زمانے میں خاصی ترقی کرتا ہے اور اس کی تاریخ تک جگہ ۱۳۰۰ء سے شروع ہوتی ہے اور ۱۵۰۰ء پر ختم ہوتی ہے۔ ذیل میں گجری ادب کے چند قابل لحاظ شعرا کے بارے میں اچھائی اقتصاد سے چند اور نام بتا کر رہا ہوں۔

بہاؤ الدین باجن

(۱۳۸۸ء - ۱۵۰۶ء)

شاعر بہاؤ الدین باجن کے سلسلے میں پروفیسر محمد شیرانی کے مقالے کے علاوہ شیخ فرید کے تحقیقی مقالہ ”شاعر بہاؤ الدین باجن“ حیات اور گجری گام“ سے مصروف کی زندگی پھر شاعری پر پھر اہم روشنی پڑتی ہے۔ یہ احساس ہوتا ہے کہ خوب گم گمشدہ ملی گجری گام دہلی کے علاوہ شیخ باجن گجری ادب کی تاریخ میں اس لئے اہم سمجھے جاتے ہیں کہ انہوں نے اس بولی کو ادبی و تاریخی بنیاد پر سامان رواں انجام دے کر گجری بولی زبان کی سنگ بنیاد بنائی کے ساتھ ادبی مہار حاصل کر سکتی ہے اس کی گلی گلیں چلی گئیں۔ باجن ۱۳۸۸ء میں احمد آباد میں پیدا ہوئے۔

گجری ادب

تیسری جگہ کے اثرات اور زبان ادب پر دور رس رہے ہیں۔ سمجھی جاتے ہیں اس خطے سے دہلی اور قوالی ملانے خاص طور سے متاثر ہوئے۔ اہالیان دہلی کو کئی طرح کے قصائدات جھیلنے پڑے۔ اہل انتظامیہ بھی بڑی طرح متاثر ہوئے۔ انہوں نے خود ان کا ادب بھی۔ لشکرپوں کی ایک بڑی تعداد شہر فتح کر دئی گئی۔ خواص تو خواص ہی ہیں، عوام بھی شدید طور پر متاثر ہوئے۔ اشتہار کا واسطہ دہلی دور کیا۔ ادب دہلی میں کوئی ایسی صورت باقی نہ تھی کہ تمام زندہ رہیں۔ عدم تعلق کا یہ احساس نہ شدید تھا اور مرکز کی گزروں کی اتنی نمایاں تھی کہ دہلی کا تعلق مثلاً صوبہ دار خود قاری کا اعلان کرنے لگے۔ ایسے ہی لوگوں میں گجرات کا صوبہ دار بھی تھا۔ ۱۴۰۰ء میں گجرات کا خود مختار رہن بیٹھا اور مظفر شاہ کا لقب اٹھسے لگیا۔ جب جانا ہے کہ یہ مظفر شاہ کو حضرت محمدؐ نے کبھی بتا دئی تھی کہ وہ سلفیت گجرات کا لشکر اس کا شایہ ایسی بتا پانے سے مستغلوں سے بڑی محبت تھی اور اس کے یہاں ان کو ایک خاص درجہ عطا ہو گیا۔ کئی مشہور صوفیائے مثلاً قطب عالم میر، بہار الدین گجراتی، عثمان دہلوی، عثمانی، محمد امجد، سراج شاہ اور جگموج بہار، شمس الدین، آقا علی، علم الدین گجراتی اور حضرت شاد علیہ السلام اور دوسرے بادشاہوں کی قدر میں پھر اہم خیر ہے۔ دہلی والوں کی بھی انہیں ادب گجرات پر پڑنے لگی۔ اگرچہ یہ دیکھنے لگے کہ گجرات سے ایک ایسا علاقہ ہے جہاں امن اور سکون ہے۔ چنانچہ دہلی سے ہجرت کا سلسلہ قائم ہو گیا اور رہائے دہلی کی آمد تیز ہو گئی۔ ان صوفی تفصیلی اشعار احمدی نہیں دیتے۔

مظاہر و محاورہ حاصل مصدر بنانے کے لئے بھی ہندی طریقے استعمال کیے گئے ہیں۔ اس زبان پر ایک وقت ہرج بھاشا دکڑی، پنجابی، مراٹھی، گجراتی اور اردو ہستانی کے ملے جلے اثرات نظر آتے ہیں۔ ان سب زبانوں کے اصولی قواعد بھی ان میں نظر کرنا مستعمل میں آئے ہیں۔

قاضی محمود دریائی

(۱۳۶۹ء - ۱۵۳۳ء)

قاضی محمود دریائی گجرات کے برکھڑہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی ادبی اہمیت بھی قابل ملاحظہ ہے۔ ان کی پیدائش بقول مولوی عبدالحق ۱۳۶۹ء قرار دی جاسکتی ہے اور چندکے وفات ۹۷ سال کی عمر میں ہوئی تھی اس لئے وفات کا سال ۱۵۳۳ء میں قرار پاتا ہے۔ ان کا وطن برکھڑہ گجرات تھا۔ یہ اپنے والد قاضی حمید عرف شاہ پندرہ کے مرید تھے۔

قاضی محمود دریائی کو لوگ خوب محترم سمجھتے تھے۔ جن کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ وہ کشف و کرامات کی وجہ سے بھی معروف رہے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جب کسی کی کشتی بخود میں بھٹکتی تھی تو انہیں یاد کرنے سے کشتی بخود سے نکل جاتی تھی۔ اسی لئے دریائی مشہور ہوئے۔

قاضی محمود دریائی ایک صاحب دیران شاعر تھے۔ ان کا دیوان غصہ مخیم ہے جس میں ہندی روایات کی مرکزیت نمایاں ہے۔ ہر سطر پر ہندی مزاج اور رنگ کلام کو ایک خاص لہجہ عطا کر دیا ہے۔ ان کا دیران دھرم پور اصناف بھی ہندی سے نقل رکھتے ہیں۔ گو یہ دیران ہے جب گجراتی ہندی سے ہم آمیز ہو کر ایک خاص معیار اور قیاس حاصل کر لیتی ہے۔ ان کے کلام میں لطف قسم کی راگ رانگیاں ملتی ہیں، جن میں سراں کا ایک خاص اہتمام ہے۔ ہندی اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر پرکاش موہن لکھتے ہیں:-

”قاضی صاحب کے کلام پر گجراتی شاعری ہندی شاعری کے جتنی بھی روپ کارنگ اس حد سے غالب تھا کہ آپ پر یہ اعتراض کیا گیا کہ قاضی محمود محبوب اللہ از کلام ہندی نکلاں کی کہ وہ گوید کہ سن زن و اس خداوند خانی خداوند است اور جب یہ اعتراض قاضی صاحب کے پاس پہنچا تو قاضی صاحب نے بڑے جذبے کے ساتھ یہ اشعار پڑھے جنہیں سن کر سب سحرش خاموش ہو گئے۔ ان اشعار کی ہندی سے قربت دیکھئے:

”ماہنامہ ادب و ادبیات“، اردو، دہلی، ڈاکٹر جمیل، جالبی، ص ۱۱

ہوئے۔ اور ان کی وفات ۱۵۳۳ء میں ہوئی۔ زبان پور میں جن ہوئے۔ جواب ایک اسم زیارت گاہ ہے۔ جن خود اپنے کلام کو ہندی، ہندی اور گجراتی کہتے ہیں۔ ان کی زبان دریغ اور ہندی کے اثرات لئے ہوئے ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں جو اصناف اور بحریں استعمال کی ہیں وہ مقامی ہیں پھر بھی ان کے دور میں بعض مظاہر وسیع تر بننے کے ہیں جس میں انسانی جذبات و تجربات آئینہ ہو گئے ہیں۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایسے تجربات ہندوستانی تہذیب و روایت کے پاسدار ہیں۔ موصوف کے کلام میں صوفیانہ کیف و کم کی کئی ہی صورتیں ملتی ہیں لیکن ان کے عقائد کبیر جتنی ملے سے بھی قائم کیے جاسکتے ہیں۔ طرز اظہار میں ہندی مزاج صاف بھٹکتا نظر آتا ہے۔ ان کی کتاب ”مخزن رحمت اللہ“ کی اہمیت مسلم ہے اس لئے کہ اس میں اردو کے قدیم کے گرائیڈ نمونے دستیاب ہو جاتے ہیں جن سے قدیم اردو کے مزاج و منہاج کو بخوبی سمجھنا آسانی ہوتی ہے۔ ہاتھ کے یہاں صوفیانہ عقائد کس طرح سے کبیر جتنی ملے سے متعلق ہو گئے ہیں۔ اس کی ایک تصویر مندرجہ ذیل اشعار میں دیکھی جاسکتی ہے:

راول	ریول	ہم	مجاہد
پہا	پہن	راکھا	کھانہ
ہم	دور	ایک	دیت
پانی	لوڑ	ہند	میت
بچے	۲	چھوٹی	یہاں
یہ	کچھ	دیوے	سو ہی کھانو

ہاتھ کے کلام میں موسیقی بھی ایک خاص انداز میں جھلکتی نظر آتی ہے اور اس طرح ان کے اشعار میں کشتی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس ذیل میں جمیل جالبی کی تفصیل ملاحظہ ہو:-

”موسیقی کی یہ روح انسان کی یہ عبادت، جذبے کی یہ قربت، جو ہاتھ کے کلام میں رس مگوئی ہے، آج بھی انہیں اس لئے متاثر کرتی ہے کہ یہ موسیقی آج بھی زندہ ہے۔ شیخ اجمی کا کلام گانے بجانے کے لئے مخصوص سروں کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں ہندوستانی تصوف کا مزاج سراپا کیے ہوئے ہے جو ہندو اور مسلمان دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ جالبی کے کلام میں مزاج کی خفہ اور نرمی، فقیرانہ صدا کا کھلنا اور لہجے کی مٹھاس بھی آج بھی اچھی لگتی ہے۔ شاہ جالبی کے کلام میں انداز ان سب ہندی ہیں۔ فارسی و عربی لفظوں کو بھی اسی مزاج میں ڈھالا گیا ہے۔ شیخ

بِسْمِ اللّٰهِ كَرَّمَ لَوْنِ دَر چھند چھند الی

پنگی اور عرذلی اور پال اوریا عیا تپہ آس

واجب طور پر اس کتاب کے ادھے ہیں۔ پہلا ہندی عروضی سے راستہ ہے اور دوسرے میں عربی، لاری اور ان عروض کو جگہ دی گئی ہے۔ اور اصل یہ کتاب ہندی کے قوافی کے طے کی گئی ہے۔ لہذا اسے پہلا نیز اختلاپ سے تعبیر کرنا بھی کچھ غلط نہیں ہے۔ محمود شیرانی نے اسکا ہنگامی اور انتہائی کتاب کے بارے میں بڑی قیمتی رائے دی ہے اور اس رائے کے بعد یہ نتیجہ نکلا جاسکتا ہے کہ محمد تقی قطب شاد اسی راوی پر عمل چلا کر اس کی کلیات میں اور اوزان و بحر و بحر و قافیہ قوافی کے زیر اثر استعمال ہوئے ہیں۔ گو یا "پچھلے پچھلے اس" نے اولیٰ نظر رائے میں ایک خوشگوار تہذیبی عمارت کو دیا ہے جس سے سینے دیے کی تشکیل کا سامان مہیا ہو گیا اور قافیہ قوافی اور اوزان و بحر و قافیہ قوافی میں داخل ہو گئے۔ کہا جاسکتا ہے کہ گہرے کی گہری قافیہ سے ہم تہذیب ہو گئی اور اس کی منتظروں کے لئے اس کے مزاج کی ضروری کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔

نہی کی اور پھر اذیت کے اب میں پرانے سیدہ خلترا اور مکیان چند جھگڑا لیں اور قطرانہ ہیں :-

[illegible]

سید بنی کے مرید تھے۔ تصوف کی تاریخ میں ان کی خصوصیت جگہ تو ہے ہی لیکن ان کی عظمت کی ایک اور وجہ قابلِ مذمانِ ایمان پر ان کی قدر و حد ہے۔ "امواجِ خوبی" فارسی لفظ کا ایک خواصورت نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ "تحفۃ الاکرام" جلد اول صفحہ ۶ میں ہے کہ "میاں خوب محمد پیش رو، دلش کافل و صاحبِ خیر، بودن در تصوف دست و سدا داشت و بر جائز چلن چنان نما و شرح نوشت، امواجِ خوبی و خوب تر گنجِ نیر از ایشان یادگار مشہور و معروف است۔۔۔۔۔۔ تاریخ وصال "خوب تھے" لفظِ راست ہے۔ "خوب تھے" سے تاریخ و وفات ۱۰۴۳ھ یعنی ۱۶۱۴ء برآمد ہوتی ہے۔ لیکن سید صاحب نے تاریخ وفات ۹۷۹ھ کو ہی تسلیم کیا ہے۔

خوب محمد چشتی کی اردو ادب میں اہمیت ان کی مثنوی "خوب ترجمہ" کے باعث ہے، جو ۱۵۷۸ء میں تصنیف ہوئی۔ پھر انہوں نے ۱۵۹۱ء میں "اصول خوب" کے نام سے فارسی میں اس کی شرح لکھنے کی۔ خوب محمد چشتی اس زمانے کے صوفی ہیں جب تکرارت کی سلسلے زوال سے انکار ہو چکی تھی۔ انکار کا ایک عالم تھا۔ شب اکبر نے ۱۵۷۲ء میں اسے قلع کر لیا۔ "خوب ترجمہ" ۱۵۷۸ء میں تالیف کی گئی۔ گو پایا انتشار کے زمانے کی کتاب ہے، جب ہر جگہ بے یقینی کی فضا تھی اور ہر ترجمہ خط کا احساس لوگوں کو مسلسل متارہ تھا۔

"خوب تر جین" میں ایسے اکتھار دی کہ کوئی کیفیت نہیں ملتی بلکہ پیشی نے تعارف کے بعض مسائل کو بڑھانے کی کوشش کی ہے اور ایسے مباحث میں اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں لیکن ایک خاص بات جو اس سلسلے میں کہی جا سکتی ہے خود پیشی کے قول کے مطابق تجربات کی بولی میں غریب اور غم کی بات شامل کی گئی ہے۔ متعلقہ شعر ہے:

جیوں دل عرب عجم کی بات

مست یولی یولی تقریباً

مکویا جو رہنماں مگر ہی ادب سے بہت کم معیاری اردو کی طرف قائم ہو رہا تھا۔ اس کے اولین معیاروں میں پیشگی کا سامنے آجاتا ہے۔ چنانچہ اکثر اہل لکھنے والے اس کے سامنے آجاتے ہیں۔

”یہ غلام سناٹا اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ پراکرت اور جدید ہندوستانی زبانوں کے درمیان اس کی زبان کو ایک عبوری نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ سرسری مطالعے سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں وہی لسانی خصوصیات پائی جاتی ہے جو قدیم پنجابی، قدیم ہرج، قدیم کشتی اور قدیم سرہنی میں بھی ملتی ہیں۔ یہ خصوصیات دراصل پراکرت کی اپ بھرنش شکلوں میں مشترک معلوم ہوتی ہیں جو اس سے پرے اس انگریز کی تائید ہوتی ہے کہ بھائی لونی جو اس وقت برصغیر کے ایک بڑے مفسر ہیں لونی جاتی تھی، بہت سے عناصر مشترک رکھتی ہے۔ قدیم پنجابی اور قدیم کشتی کے مختلف عناصر سے بعض اہرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہ زبان پنجاب سے دہلی اور بعد ازاں کجرات اور کنس میں بچتی۔“

کہ اس وقت امیرانِ ممدہ جہاں کہیں گئے تخت پر بیٹھا تھے ہر لمحہ انہیں صورت کا خطرہ تھا، ان میں کوئی تعداد میں آؤں کہ جب فتح ہوئے تو اس کی خبر سلطان کو ملی اس نے ایک سٹے فرمان کے ساتھ عزیز خاں سلطان کو خلعت سے بھی نوازا لیکن امیرانِ ممدہ تک کچھ باقی بھی ہو گئے اور بعض امیروں کو لڑ کر دیا۔ اب کہیں میں بغاوت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ دلی کی حکومت انہیں کسی حال میں قابلِ قبول نہ تھی، چنانچہ حسن کا گھوٹے ۱۳۳۷ء میں دولت آباد میں بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس طرح کئی سرے کے بعد پختی ریاست علاء الدین حسن پختی کے ہاتھوں آ گئی۔ یہ ایک جری مجلسِ خداداد منصوبہ بندی میں ماہر بھی تھا۔ لہذا اس نے ایک مشہور و ریاست قائم کی جو ایک دو سال نہیں ایک سو نوے برس قائم رہی۔ وہ ہر مجلس کو دوست بنائے رکھا اور اس کے ساتھ چلتے والے سرداروں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ سلطان تاج الدین فیروز جو ۱۳۹۷ء میں تخت نشین ہوا ایک قوی بادشاہ ثابت ہوا۔ اس کے دور میں پختی سلطنت کو بہت عروج ہوا۔

ایسے تمام امور سے صرف سیاست ہی نہیں سنی کیف و کم میں بھی تغیر و تبدل پیدا ہوا۔ چونکہ پختی سلطنت ایک مستحکم نظام کے ذریعہ تھی لہذا کوئی زبان کا ایک شخص بھی پیدا ہوا، جو اثرات دلی کے تھے اور قریباً ختم ہو چکے تھے اور کوئی زبان کی اپنی خصوصیت کے فروغ کے امکانات بڑھ گئے اور ایک طرح سے پختی نظام نے ایسے خاص دلی لسانی و معاہدہ کو طرح مضبوط کر لیا۔ قادیان اثرات نام کو روٹھے۔ دراز لڑی قند باب اپنے رنگ و آجنگ میں اعلیٰ لگی۔ صرف زبان کی حد تک نہیں بلکہ تعلیقِ سلی پر بھی ایک انبیاء قائم ہو گیا لیکن ایسی ساز و کار لھنا سے پھر شاہانہ سر پرستی سے نون الخلق کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ صوفیانہ روایات نے بھی اپنا کردار نبھایا۔ صوفیاء تو محبت و عقیدت کے پیکر تھے ہی، یہ صورت عام ہو گئی۔ ان کی زبان و ادب ختم حاکم پختی دور میں کیا کچھ تھا اس کا اندازہ اس دور کے پختی شعرا سے بدلتی ہوتا ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

فخر دین نظامی

فخر دین نظامی کے حالات زندگی آج بھی پردہ خفا میں ہیں۔ ان کے بارے میں کوئی بھی تفصیل نہیں ملتی۔ دلی ادب کے محققین نے یہ کچھ لکھا ہے۔ وہ قیاس پر مبنی ہے۔ دینے ان کا حراز چلر کی سر پر ہوتا دیا جاتا ہے۔ یہ پورے سولہ کلو میٹر پر واقع ہے۔ دروازے پر یہ تحریر ہے۔

”حضرت خواجہ سید شاہ مولانا فخر دین صاحب قدس سرہ“

لیکن یہ نہیں کہاجا سکتا کہ یہ اسی مجلس کا حراز ہے جس نے ”کم در راؤ پدم راؤ“ تصنیف کی ہے۔ فخر دین نظامی اپنی مشہوری ”کم در راؤ پدم راؤ“ کی وجہ سے ہی محققین کی تحقیق کا موضوع بنے ہیں۔ اس مشہوری کے بارے میں سب سے پہلی تحقیق نصیر الدین باناشی کی ہے انہوں نے دراز ”معارف“ ۱۹۳۲ء میں اس کا تعارف پیش کیا تھا۔ اس مشہوری کا دما ”کم در راؤ پدم راؤ“ بھی شاعر کا تجویز کردہ نہیں ہے۔ لیکن کوئی چند تاریخ اور نصیر الدین باناشی کے علاوہ کوئی دوسرے نوک

پختی ادب

ادب ادب کا پختی دور اس لئے اہم ہے کہ ادب کے قدیم کی تاریخ اسی عہد سے شروع ہوتی ہے۔ گو پختی ادب کی پہلی ابتداء ہے جس پر بعد میں علامہ تغیر ہوئی رہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ پختی ادب کا یہ بھی سراپا ہے جس کی شروعات پختی دور ہی سے ہوتی ہے۔ یہ دور چار سو بیس صدی کے تقریباً نصف سے شروع ہوتا ہے اور سولہویں صدی کے اولین پچیس سال پر محیط ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہر تعلق نے جس طرح دلی کا اپنی نگاہ میں رکھا تھا اس کے اثرات پورے چارے تھے اور اس بادشاہ کے مزاج کی اثراتی پختی کی سیاست کو مسلسل متاثر کرتی رہی تھی۔ عہدِ تعلق میں امیرانِ ممدہ کی انتظامی صلاحیتوں کو تحسین کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ان امیران نے نامتو بہ حالات کا پاس دلی سے مقابلہ کیا تھا۔ علاء الدین طغی نے ہی امیرانِ ممدہ کا نظام قائم کیا تھا جس میں ہر گاؤں پر ایک ٹک سردار امیر کی طرح سے انتظام و انصرام کرتا تھا۔ بعد میں تعلق سلا مین نے بھی امیرانِ ممدہ کے کام کو تحسین باور کیا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ ہر تعلق کے دور حکومت میں اختصار و محبت بڑھ گیا۔ یہ اس کی حالات اثر ہونے لگے۔ تعلق کی حالت کا یہ اندازہ حالات کا یہ حرکتوں سے ملامت خواہم خوف زدہ رہتے اور ہر گھڑی وہ عزم و ہمت کا پیکار معلوم ہوتے۔ یہاں تک کہ تعلق نے ۱۳۳۳ء میں عزیز خاں کو تخرات اور دلی کی سرداری بخشے ہوئے امیرانِ ممدہ کے حاتمے کا حکم دیا۔ یہ سب کے سب کُل کر دئے گئے۔ جس کی تفصیل فی الدین کی کتاب ”تاریخ

”سب“ ”مہرانہ احاسنین“ کی طرف دیکھیں آجیے تو چند خطروریز نکات واضح ہو جائیں گے۔ جس سے ہمہ تنوں

...فكشوا من تحتها فوجدوا عظام بغير عظام

نصیر الدین ہاشمی نے لطیفی کی ایک غزل بھی اردو کی ہے۔ یوں تو محض ایک غزل سے غزل میں اس کے سلطان کا ٹھیک ٹھیک پتہ دھوا رہے پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ دلی غزلوں میں عام طور سے محبوب کی رنگ و آئینک رکھتا ہے۔ غزل کا مولیٰ مزاج نیک طبع ہوتا ہے یہی صفت لطیفی کی غزل میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ گویا اس وقت تک کہ دلی غزل مزاج و یہاں سے مراد کارٹیں رکھتی، چاہے وہ جس دور کی بھی غزل ہو۔ صورت تو بہت بعد میں دلی کے یہاں پیدا ہوئی ہے۔

مشاق

نہیں پرہیز مشاق کا بھی ذکر ہونا چاہیے۔ اس کی اب تک پانچ فروغیں دستیاب ہیں۔ لیکن ان غزلوں میں بھی کوئی معنوی تہہ درہی نہیں ہے اور ایسا احساس ہوتا ہے کہ طبعی مشق کا جو سلسلہ عام طور سے غزلوں کا مزاج رہا ہے وہ اتنا اسی سے رنگ و ہار بھلا رہا ہے۔ فکر کی چھاپ کہیں نہیں ملتی اور بے زندگی اور بے نکات کے اسرار و رموز سے کوئی رشتہ قائم ہوتا ہے۔ لیکن حسن و جمال مرکزی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں جن کی تصویر کشی مقامی رنگ و آئینک کی بد سے آئینک بن جاتی ہے۔ مشاق کی یہ غزلوں کے نمونے تھم کا نصیری نے بھی مدح کئے ہیں وہیں سے میں چند اشعار نقل کر رہا ہوں:

او کیونٹ کسری کرتی ہمن مہانے جلی ہے آ
رہے کھلنے کو تیل دلی او چپتے کی گلی ہے آ
سورج مہاں میں جیون دنا نظراں کا بچی تر قمر
جوانت جواں بھری سرخے اور رخ او پڑھلی ہے آ
سورج کے گل میں چاند جیوں میں سج گئے بیکل دست
قربان اس کے ہاتھ پر جن اسے تری بیکل گوزی
آپ دیات اور پ ترے جاں بخش جواں پرور ہے
مشاق یو سے سول چا عزت بھری ارکلی گوزی

میراں جی شمس العشاق

(۱۳۹۷ء - ۱۳۹۷ء)

شمس العشاق دلی صوفیوں میں اپنی نگارشات کی بد سے بیجا نام تصور کئے جاتے ہیں لیکن ان کے حالات زندگی بھی اب تک صحیح طور پر سامنے نہیں آئے بہت کچھ قیاسات پہنچی ہیں لیکن انہوں نے اپنی خود نوشت میں اپنے والد کا

لطیفی کے حالات زندگی پر یہ تھا کہ ہیں۔ لیکن نصیر الدین ہاشمی 'لوکن میں اردو' کے صفحہ ۷۴ پر رقمراز ہیں کہ اس کا ایک قصیدہ ہے جس میں شاعر محمدی درج ہے اور شاہ محمد کا تعلق، ٹٹل اندر بہت دشمن کے گھرانے سے تھا۔ لطیفی کا نام مشاق کے ساتھ ساتھ آتا ہے یہ دونوں ہی کبھی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ سلاطین کا قید پر ان کے اثرات بتائے جاتے ہیں۔ ان کا ایک مرید ایسا تھا جو دکان خرید کر لائی تھا جس کے قصیدے معروف ہیں۔ کرائی سے لطیفی اکسب کرتا رہا تھا۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے بھی لطیفی پر ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان 'قدیم اردو شاعر لطیفی کے زمانے کا قصیدہ' ہے۔ اس میں انہوں نے اسے سترہویں صدی کا شاعر بتایا ہے۔ ہر طور لطیفی کو قصیدے سے خصوصی ربط تھی۔ اس کی زبان مستفہ قصیدے کے سلاطین معلوم ہوتی ہے۔ جس میں ایک طرح کی تکلف پائی جاتی ہے۔ قصیدے کی خصوصیات میں شوکت اللطاف کی ایک جگہ ہے۔ لطیفی کا قصیدہ ایسے الفاظ سے ماری نہیں۔ "ہار جی ادب اردو" سید جعفر گیلانی چند جہان میں لطیفی کا قصیدہ درج ہے، جو "پارسی ادبیات مسلمانان پاکستان دہلا" سے ماخوذ ہے۔ میں اس کے چند اشعار نقل کر رہا ہوں۔

صبح ہوا یا صفا دین کا کھلا کوا
چوڑ چمن کی ہوا غیب ہوا بارغن
سورج سرگ کے گھوڑے ظاہر ہوا
میں کا دین کے سین جلایا دکن
کرن کی جہاد و عداوت کی کالک جہ
فرش طبع بچھا خسرو روی پہ من
چہار پیر برقرار ہوچکا دنیا تھا منہار
غرب کے کوئے سے ڈول آیا دین
نہیں سورج جہان سے گل جوئے سرک کے
دین کا کابل مٹا تین میں کھچا انج
سرک سے نگلیں چہر لعل لہ کے سحر
سور چھپایا شجر چند دکھنا کھن
چند کا ہوا بچا دین کی دلی ایجا
ننگ و جہ میں چھپا جہانک کے رائے جن

ہوں جن سے لفظ کی Spirit کا یہ چل ہے:

عشق کے سن عقل پریشاں آگست اچھے راج
مادر کی کیر باز بکادے ہامری کیرا کاج
عقل کے بنا کرین سگداریے کسور کار
عشق کے دن ہم چا کی تو اچھے ساز
بود کہ تو ہم چا کا ہے تو اچھے ساز
عشق کے تو ہم ریا امیر کھینچے بار
بود کہ کی کلیا عوڑیں باجیں اکی بات
عشق کے یہ کیل کھا: سبھی اسی کے ہاتھ
بود کہ یوں حلیم ہوا تو کچا ہت دے
عشق کے بنو دینا بھر راکھ یہ کون ہے

میراں کی ایک اور نظم "غزل غفر" بھی ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں ہے۔ اس میں
مکالمے ہیں اور یہ مکالمہ غرض اور میراں کی کے درمیان ہوتا ہے۔ ان کی ایک اور نظم "منظر مرغوب" ہے۔ جس میں صرف
تین اشعار ہیں۔ یہ بھی سالار جنگ کے کتب خانے کی زینت ہے۔ جس کا ذکر تو براہ راست "تاریخ ادب اردو" علی
گڑھ میں کیا ہے۔ راج اور کر با شام علی نے "منظر مرغوب" اور "چند رشیدیات" کی تفصیلات پیش کی ہیں اور ان کی کیفیت
پر اچھی خاصی روشنی ڈالی ہے۔

فیروز شاہ بھٹی

یہ بھٹی سلطنت کا آٹھواں حکمران تھا۔ جس کا عہد حکومت نومبر ۱۳۹۵ء تا ۱۳۹۷ء تک شہر کپا ہوتا ہے۔ یہ بھٹی
سلطنت کے عروج کا بھی زمانہ ہے۔ فیروز کا روحانی منسلک قندوم شیخ محمد گمانی سے ملتا ہے۔ اس کا لقب تاج الدین تھا
جہاں سے۔ مٹی و گن میں ان پر شاہ کی بی بی اہلیت ہے اس لئے کہ ایک طرف تو اسے یہی تہہ حاصل تھا تو دوسری طرف
علی شافعی بھی ہے اندازہ تھا۔ فیروز کو قتل احاطہ کا شاکر دیا جاتا ہے جو بعد ازاں تاتاری کے شاگرد تھے اسے فیروز
بیدی بھی کہتے ہیں جس کی تخلیق "پہلے نامہ" معروف ہے، اس میں ایک شعر یوں ہے:

مجھے پتوں سے قلب دین چادر کی
تخلص سو فیروز ہے بیدی

فیروز نے اپنے قندوم کی بھر پور مدد کی ہے۔ ایک طرح سے دونوں کو جوازی دکھا ہے جس سے پورا قندوم ملی سے اس
کی عقیدت صاف چھٹکتی ہے۔ اس لئے بھی کہ قندوم کی وفات ۱۵۶۵ء میں ہوئی لیکن "پہلے نامہ" اس سے پہلے لکھا
جائے گا۔

واقع ہو کہ مل دہی نے اپنی مثنوی "قلب مغربی" میں فیروز کا رعبہ کو بیات احرام سے یاد کیا ہے۔ مثنوی
اشعار دیکھئے:

کہ فیروز آ خواب میں رات کوں
دعا دے کے چہرے مرے بات کوں
کہ فیروز محمود اپنے جو آج
تو اس شعر کوں بہت ہوتا روان
اور نکاح علی نے "پہلی بخت" میں اسے یوں یاد کیا ہے:

نہیں وہ کیا کردں فیروز استاد
جو دہجہ شاعری کا کچھ میرے داو

فیروز شاہ بھٹی قادری کا بھی شاعر تھا۔ اس کا فارسی کلام کچھ حاصل ہوا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے فارسی
سے خاص دلچسپی تھی۔ سید صاحبزادہ گمان چتر میں لکھتے ہیں:-

"فیروز کی غزلوں میں بعد کی اور فارسی روایات کا ایک نیا احراج نظر آتا ہے جس میں گیتوں کا
دس ہزار سٹاس بھی ہے اور غزل کی روایات کی جھلک بھی"۔

یوں فیروز کی ادبی شہرت کا زمانہ "پہلے نامہ" ہی پر ہے لیکن فیروز اور مسعود حسین خاں اس کے ادبی وقار کو
تسلیم نہیں کرتے بلکہ یہی اس سے دکن کے اسلامی مزاج کو کھینچنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ "پہلے نامہ" میں "شکر تاجان" کے
اثرات صاف طریقے پر نظر آتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ تاریکی والا بھی استعمال ہوتے ہیں۔ لہذا یہ ایک لحاظ سے سنز
اسلوب کی حامل نظم ہے جس میں مقامی اثرات تو ہیں لیکن ایک اعتبار کے ساتھ۔ یہی وہ زبان دیوانا ہے جو بھٹی قلب
شاہ کے یہاں زیادہ گھر کر مانتے آئے۔

فیروز ایک ایسا شاعر ہے جس کے یہاں بنیادی عناصر خاص طریقے سے ملتے ہیں۔ اس کی محبوب کی جو صورت
سامنے آتی ہے وہ بھی مقامی نوعیت کی ہے۔ فیروز کی غزلوں میں جنس کیف بھی ملتا ہے جس میں ایک طرح کے رفیع کا
احساس ہے۔ جیسے ان کے یہاں محبوب یا ایک مثالی کردار بھی ہے۔ جس میں وقار و صاف ہیں جو بعد میں اردو میں غزل
کے مصنف کی اور کیا ظہور کرتی ہیں۔ یہی وہی وہاں کے عمل میں مختلف زبان بولنے والی عورتوں کو بتاتا ہے، چاکر لکھتا ہے کہ

تلف الیہ کی کیفیت سے آگاہ ہو سکتا اور متعدد زبانوں پر اس کی دسترس ہو اس شخص میں مہر القادری اور سرادری "علی اللہ" چارچ اوپ اور "امین" چارچ اوپ ہیں۔

"غیر وز شاہ کو زبانیں پہننے کا بھی بڑا شوق تھا۔ زبانوں کو پہننے اور ان پر موجود اصل کرنے کیلئے اس نے یہ نوکھ طریقہ اختیار کیا تھا کہ مختلف زبانیں بولنے والی عورتوں سے اس نے شادیاں کی تھیں اور اس بات کا بھی اہتمام کیا تھا کہ ان عیالات کی زبان کو دوسری زبانوں سے ملا کر بولنے والا بن جائے۔ اس لئے ہر زبان بولنے والی عیال کے لئے اس کی ہم زبان بھینریں تو کر دی گئی جاتی تھیں۔ وہ دیائے عیال کے کھارے فیروز آباد کے نام سے اس نے خوشبو بنایا تھا وہ وہ اصل اس کے لئے لڑکیوں کی راگزار اور اس کا زبانوں کا تجربہ تھا تھا۔ یہیں عیالات میں اس کی ایک لگ زبانیں بولنے والی عیالات بھی رہتی تھیں۔ اس شعر کے کثیر مراتب بھی پائی ہیں۔"

شاہ اشرف بیابانی

(۱۳۵۹ھ - ۱۵۳۹ھ)

شاہ اشرف بیابانی کے والد کا نام ضیاء الدین بیابانی تھا۔ اسلاف میں ایک سید عید اللہ کریم تھے جو سندھ سے دکن آئے تھے۔ ضیاء الدین بیابانیوں میں مکتوبتہ رہے۔ گویا وہیں قائم ہوئے۔ اس کا پڑا نہیں بیابانی کہا جاتا ہے۔ پھر بھی لقب ان کی اولاد کو منتقل ہوتا رہا۔ انہیں میں ایک شاہ اشرف قادری آباد جالند میں رہتے تھے۔ ایک اعجاز کے مصنف ان کی پیدائش ۱۳۵۹ھ میں اور وفات ۱۵۳۹ھ میں ہوئی اور جالند ہی میں دفن ہوئے۔

اشرف بیابانی کا سلسلہ نسب گویا روزاہٹوں سے سلطان العارفین ابو العباس احمد کبیر نقاشی معشوق ہند سے اور انہیں راہٹوں سے حضرت عیسیٰ سے ملتا ہے۔

"نومر بار" واقعات کو پانچویں ہے لیکن اس مشہوری میں حضرت امام سمعی سے مزید ملی دشمنی کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت کی بہرہ نما سے مزید ایک معاہدے کا کام رہا۔ اس مشہوری کے ۹۰۹ ابواب ہیں۔ یہ ۹۰۹ھ میں تصنیف ہوئی گویا ۱۵۰۳ء یا ۱۵۰۳ء کی تصنیف ہے۔

"نومر بار" کے مصنف شاہ اشرف بیابانی ہندی پر خاص دھڑیں رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ہندی کی اصل زبان تھی۔ چنانچہ شاہ اشرف کی زبان میں اگر ہندی الفاظ بہت ہیں تو یہ حیرت کی بات نہیں۔ صرف الفاظ ہی نہیں بلکہ خیالات و تصورات بھی ہندی ہیں۔ اس مشہوری کی زبان کے پہلے میں پرکاشی عیال راقطرا ہیں۔

"مشہوری کی زبان کو قدیم اردو کی بجائے قدیم ہندی کہا جا رہا ہے۔ مشہوری میں نہ صرف الفاظ ہندی ہیں بلکہ ہندی کے بہت سے محاورے اور استعارے بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ اس پرکاش کا نام گویا ہندی اور انگریزی کے درمیان کلا کر کیا گیا ہے۔ بات دیکھتے ہی سے پتہ چلتا ہے کہ آئے ہیں۔ آثار و مایات کی جگہ سور اور چنور آج کی جگہ ملن اور آکاش زمین کی جگہ دھرتی زمین کی جگہ سور و تکلیف کی جگہ کھو، چٹم طبع کی جگہ عیسیٰ مسلمان، چٹا پانی کی جگہ اٹھا اور لالہ، کان (معدن) کی جگہ کھان، بار کی جگہ بھار، پانی کی جگہ نیر، عیال کی جگہ بیانا، روح کی جگہ جیوا، جیوا اور پران، جسم کی جگہ اٹھ اور اسی قبیل کے ہندی الفاظ نے مشہوری کو ہندی سے چند قریب کر دیا ہے۔ نومر بار کا موضوع خاص اسلامی دور کو بھی ہے لیکن اس کے اظہار و بیان کے لئے ہندی ادبی روایات اور تصورات کا سہارا لیا گیا ہے جس کی وجہ سے مشہوری کی عمومی فضا ہندی سے متاثر ہو گئی ہے۔"

ایک خیال یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ اشرف کے پیش انحر کمال الدین حسین علی واعظ کاشانی کی "روحہ اشہد" رہی ہوگی۔ لیکن یہ خیال غلط نہیں ہے۔ دیکھیں اس میں واقعات کو جگہ کے بہت سے انجم کو شے نظر انداز کر دئے گئے ہیں۔ زبان کی کیفیت کا اندازہ کرنے کے لئے چند اشعار دیکھئے:

پھولوں باڑی آٹھائے	سہلی چنیا ہوئی جانے
کھیلنے سید لوبو بھر	کا چکا کھ پے دھر
دکھوں لینا دنگل جانے	بارش ملے تے ہے پردائے
دوگر دوکھوں جو لاگ	لے جوں کی ٹی آگ
پون پر ہوا علم خدا	دوتے رہے تر لوگ سدا

گویا اس مشہوری کی اسانی ایسی ہے کہ سادہ سادہ اسے ادبی اظہار سے کم وقعت کہا ہے۔



ہندوؤں کا تعلق اس کی سلطنت میں وارد ہو گیا۔ تمام امور کے بارے میں عسکری نظام سے غافل نہیں رہا۔ دوسرے سرائیکی بھی اس کے لفظی قلم پر چلتے رہے اور تقریباً ایک صدی تک بھاپو، علم و شہادت کا چند اہم مرکز رہا۔ مصروفی کو بھی فروغ ہوا۔ اس زمانے میں وہے مگر اپنے مسروروں پر بہتے تازاں تھا۔ امرانی اور ترکی مصروفی نے فن کے فن پر بھی اثرات ڈالے اور دونوں جگہ کے اعظام سے ایک نئی جہلیات نے راہ پائی۔ ہمدارد نے اپنی ہمدردی کو ہمدردی میں نکالا جس سے نئے طرح کی آرائش اور فنکاری ابھری۔ گویا بھاپو کی تہذیب اپنے آپ میں تھیں کہ سرطلے میں دریا، جس پر اس زمانے کے لوگ تازاں تھے تو وہ کچھ کھلے تھے۔

عادل شاہی یا جہان پوری تہذیب ۱۳۸۹ء سے ۱۶۸۵ء تک تو استوار رہی لیکن چھوڑ دیا۔ وہ بے زوال نہ ہوئی۔ ۱۶۸۶ء میں اورنگ زیب نے بھاپو کو فتح کر لیا اور اس سے اور اس کے تاج کاٹنے کے۔ اب وہ جہد یعنی اورنگ زیب کی صورت باقی نہیں رہی، جس کے خصائص بھاپو کا اہم جانب ہوئے تھے۔ مگر یہ بھی ہوا کہ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب اس اورنگ زیب سے کوئی کر گیا۔ اب اختیار کا ایک دور بھر شروع ہوا۔ عرب نے سر اٹھانے لگے بلکہ ان کا بغاوت نہ روئے شدہ اور توجہ ہو گیا۔ ابتدا میں انہوں نے بھاپو کی تمام تہذیبی صورتوں کو مٹا دینے کی غرض سے اور سلطنت کو تاراج اور بے باک کرنے کی تمام تر سیاسی پالیسی سوشل جالی گھسیٹا۔ ظاہر ہے یہ درحقیقت متاثر ہوا۔ تب ہی یہ احساس ہوا کہ اب یہ تہذیب نہ ہوا۔ انوں تک کا ٹھکانہ روہتے کی۔

لیکن اسی دور میں ۱۶۰۰ء کے آس پاس فن موسیقی کی ایک معیاری کتاب "کتاب نو میں" لکھنے والے آئی۔ اس کا مصنف ابراہیم عادل شاہ دہلوی ہے، جس کا عہد ۱۵۸۰ء سے شروع ہوتا ہے اور ۱۶۲۷ء تک قائم رہتا ہے۔ عادل شاہی دور کے علمی امور اور شاعریات و کتب کے مباحثے آئے ہیں۔ ایسے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ "کتاب نو میں" ۱۹۵۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اگرچہ یہ ترجمہ اس کا تفصیلی تعارف بھی کرایا ہے۔ اس کتاب کی تفصیل علی گڑھ کی جامعہ ادب اردو جہد اول میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ابراہیم عادل شاہی دور میں موسیقی نے اپنی ترقی کی کہ اس کے مختلف شعبے پیدا ہو گئے، چراغ ایک دوسرے سے بہتت لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ "کتاب نو میں" کا اختصار اس لئے ہے کہ اس میں شکریت اور برہنہ ہاشاک کا لحاظ کڑت سے استعمال ہوئے ہیں۔ مگر یہ بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابراہیم عادل شاہی نے آئے آئے دہلی ادب و شاعری کی روایت قائم رکھی ہے، جن میں علی گڑھ کی جامعہ شاعرانہ پھرتے ہیں۔

برہان الدین جامن

(۱۵۵۳ء - ۱۵۹۹ء)

میراں جی حسن عشاق کے فرزند کا نام برہان الدین جامن تھا۔ یہ بھی سو فی صد ہندو تھے اور ان کے لطیف بھی۔ جامن کے دادا نے اکبر الدین صاحب (مقدس حکمت العارفی) کے قول کے مطابق چغتائی خاندان میں شادی کی تھی۔ شہر حسین عظیمی نے

پہلی دور کی پرائمری اور امتحان دینے کی طرح کے دلیل پیدا کیے۔ ۱۳۹۰ء میں دوسری چھٹیوں کے یوں کہ جانے کے غیر کلیوں نے اس کے انتشار سے خاکہ و افکار چاہا۔ ان کی نگاہ میں اس عہد کا آئینہ یوسف عادل تھا۔ مصروفی کیا گیا کہ اگر اس کی ہونے میں یہاں تک کہ اسے شکرانہ یاد دیا جائے تو بھر بھی سلطنت کی رہی تھی نہ کہ کاغذات ہو سکتا ہے۔ دوسرے لوگوں کے علاوہ ان کوں نے اس کیفیت کو شدت سے محسوس کیا اور یوسف عادل کی ہمدردی میں بچا ہو گئے۔ کسی سلطنت کی بعض دیا میں یا تو باقی ہو چکی تھیں یا بھلاست کے قریب تھیں۔ ایسے میں یہاں کا سارا انتظام درہم برہم ہو گیا تو فوجی قوت کمزور ہو گئی۔ نتیجے میں عادل شاہ اپنے آپ کو شکرانہ دیکھ لگا، یہاں تک کہ اس نے ایک طرح سے بارشاہت کا اعلان کر دیا اور جب وہ شکرانہ ہو گیا تو مقررہ ضابطے کے مطابق اس نے اپنے نام کا خلیفہ بھی چھوڑا۔ شروع کیا۔ اب وہ "خان" بنائی نہیں رہا۔ قہار بادشاہ ہو گیا تھا۔ مختصر یہ کہ ۱۳۸۹ء سے اس کی شکرانی ہو گئی۔

ایک خاص بات یہ تھی کہ یوسف عادل شاہ و فوجی لطیف کا بچہ ولد اور تھا اور اس جہاں سے ہر دور۔ اس نے اپنی سلطنت میں ایسے لوگوں کی پذیرائی شروع کی جو فوجی لطیف سے وابستہ تھے۔ شعر ادب سے اس کا شغف شعر شاعری کے لئے عام تھا۔ سب ہوا۔ اس کی شکرانی میں شاعروں کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ ان کا یہی نہیں اس سے اسے علم و ادب کا اتنا شہرہ حاصل ہوا کہ اپنی سلطنت کو اس باب میں مرکزیت دینی چاہی۔ دور دراز سے اس فن دانے جانے لگے۔ اسلامی

الوجود ممکن الوجود، ممکن الوجود اور عارف الوجود، ویسے بھی "ارشادِ نہ" میں جو سوالات کا نام کئے گئے ہیں ان کا تعلق زیادہ تر مذہبی امور سے ہے۔ جن میں کچھ فلسفیانہ امور پائے جاتے ہیں۔ جنہیں جالبین نے جافرم کی حد کا ذکر کرتے ہوئے اس کا احساس دلایا ہے کہ اخلاق، تصوف اور شریعت و طریقت یہ سارے جزو الٰہی کی نظم و نثر کا قوام ہیں۔ ان کی دوسری اہم مثلاً "حجۃ البیقا"، "وصیت الہادی"، "مطلع اسرار الایمان"، "تسیم کلام"، "تکلیف و وعدہ" اور "مشکوٰۃ رجحان الصلین" اور مشکوٰیاں "کفر نامہ" اور "مسافرت، خانِ میان و جانِ خلاصہ" وغیرہ اہم سمجھی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی مستند رسائل ہیں جن کا ذکر دلخواہ سے کی جا سکتا ہے۔

دردِ اصل یہ سب کی سب تخلیقات و مشاہدات ہی سے تعلق رکھتی ہیں اور دنیاوی طور پر بعض شہر گوئی میں نظم نہیں ہے۔ ساری نظموں میں موسیقیت کا بھی احساس ہوتا ہے اس سے انکار ہوتا ہے کہ یہ مصنف عذراقتی سے فانی رحمت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر نجم کشمیری احساسِ دلالتے ہیں کہ:-

انسانی اعتبار سے جانم کبریٰ راایت کے بہت قریب ہیں چنانچہ دو ایسے کلام کو کبریٰ سے تعبیر بھی کرتے ہیں اور یہ کہ ان کی زبان و واضح طوہ کا درجہ اسالیب کی طرف ہمیں نگہ ثانی ہے جس میں خلاصہ اور سادگی ہے۔“

لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہندی اثرات ان کے گلام پر بہت جلد ہی نظر آتے ہیں۔ انہیں کسی حالی میں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ابن الدین اعلیٰ

(1740-1047)

شخصی اہمیت کے لیے، رشا ورجان الدین چانم کے بیٹے امین احمد نے اعلیٰ ایسی ایک صفائی
 بزرگ سے جنہوں نے رعد و ہوا سے گھٹا ہوا ایک سو گھنٹہ کی سیڑھی پر چڑھ کر ایک سو گھنٹہ کی ترقی
 میں بسر کر دی۔ ساتھ ہی ساتھ اسی حوالے سے مقدمہ اور کی عدالت بھی ناخوش ہو گیا۔

امین اللہ بن اعلیٰ کے والد ہر جان اللہ بن جاقم کا انتقال اس وقت ہوا جب یہ عزم اور صبر تھے لیکن ان کی پرورش و پرداخت اسی طور پر ہوئی جس طور پر اس کے خاندان کے دوسرے افراد کی ہوئی رہی تھی۔ خصوصاً اس زمانے کے ایک بزرگ محمود خوش دیان نے ان کی تعلیم مکمل کی۔ جاقم کی ولادت ۱۵۹۹ء میں ہوئی۔ گویا اعلیٰ کی پیدائش کا سال بھی یہی ہے۔ ان کا انتقال ۱۶۰۷ء میں ہوا۔ اس سبب سے ہمیں جاقم کا بچہ قضا از میں :-

”اٹھاوا میں علم میں وظیفہ دینی ان چند پرگزہ و چند رنگوں میں شمار ہوتے ہیں جن کا فیض آج بھی

جاری ہے۔ دیکھو! میں شادی پر رواہ ہے سے دو میل کے فاصلے پر ایک ہلکے ٹکڑی پر سطح پر آتے۔
 تجلیہ کوسں رواہ ہے چھٹا آج بھی دولت نگار دیتا ہے۔ جس کے لیے اسکی اللہ بن علی
 عالم بے خودی میں خوشی ہیں۔ اللہ اپنے والد پر ایمان اللہ بن علی عالم کے چند ہاں
 پیداوے۔ خوشی رہاں سے تعلیم و تربیت پانچ مرتبہ خلافت پر بیٹھے ہوا اس خاندانی روایت کو
 آتے ہاں جواب دارا سے ہوئی خلافت کے ساتھ نہیں ورثے میں علی بن علیؑ

امین الدین اعظمی کی قلمی کمزوری اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ وہ کم از کم نوکریک خاص نفع دینے میں شعوری کوشش کر رہے تھے۔ گویا ان کے زمانے سے قدرے کم شکر و تیر لیا جا رہا تھا اور جی نہیں چاہا کہ ان کی جیروں کو بگاڑا۔ اس کی متعدد کتابیں مثلاً رسالہ "وجودِ حق" "تکلیف داریں اللہ پر" "مشقِ بند" "مہربانانہ" "پگلی نامہ" (مجموعہ بند) "محبتِ ذات" "حجِ کھلی" "شرحِ کلمہ" "پیر" "نورنامہ" اور "رموزِ السائکین" وغیرہ اس امر کا پتہ دیتی ہیں کہ ان کی غایت یہ تھی اسلوبِ اختیار کرنا ہے جو لازماً زیادہ تفہیم کی صورت پیدا کر سکے۔ یہ جگہ ہے کہ ایسا طرزِ عمل، عقلی اور حسی کے یہاں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ خصوصاً عقلی کی "چند جدول مہذب" اور "چھاپہ پوری روایت کے مسئلے کی تکلیف ہے اس کی تشریح اور اعلیٰ کی "کلیت الاسرار" کی تشریح وہ کامان اختیار کر چکی ہے جسے غایت تفہیم کر سکتے ہیں اہل علم کی صورت زیادہ قیمتی ہو کر سامنے آتی ہے۔

اٹلے سے دو طرح اختیار کی جس میں تخریق اور رضا حد درجہ ہے۔ ایسی تخریق اور رضا صحت میں مختلف الفاظ کی کوئی کنجوش نہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ ابن الدین اٹل ہے والہا کی خبر کے خلاف ہے۔ یا مصلحت اور دینی کی طرف مائل ہیں۔ اس باب میں بر ابن الدین یہ قائم اور ابن الدین اٹل کی تخریق تقابلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد مسیحی نے ایسے مطالعے پر جن میں متعدد درجہ اول تخریق پیش کیا ہے:-

”شاہد ہاں الدین عالم کے دو سالہ گلاب الحقائق نے حضرت ابن کس اس نثری رسالے کا مقابلہ کر لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ حضرت ابن کو مربوط طبع کھینے کا کس درجہ طاقتور اور انھیں اپنے باپ کے مقابلے میں ذہنی اور اظہار پر کتنی قدرت حاصل تھی۔“ لکھتے الحقائق کی زبان اکڑی اکڑی، کٹاؤگ اور انجھی ہوئی ہے۔ جملے نامکمل، اسجورے اور غیر مربوط ہیں اور مباحثہ بیان کے تسلسل اور خیالات کی ترتیب سے عاری ہیں۔ بجز بیان کا یہ عالم ہے کہ بعض کو قدم قدم پر اشعار کا سیاہ پلٹا پڑتا ہے۔ اس کے برخلاف حضرت ابن کی زبان تلخی ہوئی ہے۔ جملے چست اور فقرے درست ہیں۔ ردیاد تسلسل شرار سے فرق نہکام کرتا ہے اور وہاں بحثی ادبی موضوع اور عیب و نیک کو نہ صرف سیدھی سادی اور مربوط طبع میں بیان کر

نئی بادشاہی موضوع بنا ہے۔ انکا بھی نہیں بلکہ دہاری حالات کے علاوہ باغ، بگل، شعری لڑتی، موسیقی، تقریبات وغیرہ بھی منظم ہوئے ہیں۔ باجی کوئزوں کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے اور یہ جملہ باتیں بادشاہ کی عظمت میں اضافے کا سبب بنتی ہیں۔ عبداللہ نے جابا کو یہ شعری ہر لحاظ سے تشبیہ بخش ہو کہ وہ اس تعریف بھی جائے اور اچھوت یہ ہے کہ اس شعوی میں جس طرح اس زمانے کی زندگی صحت آئی ہے وہ ہر لحاظ سے اس شعوی کی اہمیت کا باعث ہے۔

”ابراہیم نامہ“ میں شاعرانہ وزن بھی بہت سحر ہے، چاندیابندہ، تلمیحات کا استعمال کیا گیا ہے۔ مجلس اور عام زندگی میں مناسبات کو بھی فراموش نہیں کیا گیا ہے۔ مجلس جانیوں نے لکھا ہے کہ:-

”ابراہیم نامہ کے زبان و بیان دلچسپ اور آہنگ دگر اور ہیئت سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اسلوب جو کتاب نورس میں اپنے نقطہ صراج کو پہنچا تھا اب اس کے خلاف رد عمل شروع ہو گیا ہے اور فارسی اسلوب و آہنگ کے ذریعے اندر سے اندر اپنا رنگ ہمارا ہے ہیں۔ اسی وجہ سے جائز اور محبت گرد کے مقابلے میں اس کے مزاج میں ایک حد تک اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ابراہیم نامہ اس رد عمل کی تحریک کا پہلا ادبی روپ ہے جس میں فارسی روایت اسی طرح آہستہ آہستہ گھل مل رہی ہیں۔“

ظاہر ہے اس اسلوب میں فارسی اور عربی اسلوب کا تناسب بڑھتا تھا سو بڑھا ہے، شاعرانہ کیف و کم میں زیادہ دلکشی آگئی ہے اور شاعری کی سطح کا ارتقاع سے منسلک ہے۔ دراصل عبداللہ شاعری کے بارے میں ایک واضح تصور رکھتا تھا۔ بعض اقدار اس کے نقطہ نظر کو واضح کرتے ہیں:

بجی سچ ہے عقل کی سول کا	بجی داس ہے عقل کے پھول کا
بجی روپ لاحق کیا جگ رہی	بجی جوت ہے گٹ ہو قد دت رہی
بجی لا رچیا سب ہو عالم شوق	بجی روپ ہے گٹ ہو کن جھلون
بجی در میان وہ ازل ہو ابد	رہیا جی تر لوک لا کر سہ
نکل میاں دریا جی یک بجی بند	افیا شوق ہو موج بھ دل سہ

حسن شوقی

(۱۵۳۰ء - ۱۶۳۲ء)

تذبحہ دینی شعرا میں حسن شوقی کی اہمیت میں روز بروز اضافہ ہو جا رہا ہے۔ ”میر جانی نامہ“ کے ترجمہ میں شاعر نے خود نامہ حسن شوقی لکھا ہے۔ اس بنا علی کی ”پہلیں“ میں بھی یہی نام ایک شعر میں آیا ہے۔ اپنی ایک غزل کے مطلع

میں بھی شوقی نے قدیم کی ضرورت کے لحاظ سے شرقی حسن یعنی حسن شوقی ہی لکھا ہے۔ لہذا نام کے لحاظ سے کوئی الجھن نہیں۔ بعض شہادتوں سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ جنگ تالی کوٹ ۱۵۶۳ء کے وقت حسن شوقی نظامی شاق دربار سے وابستہ تھا۔ ”فتح نامہ“ نظام شاہ سے یاد انداز ہوتا ہے کہ حسن شوقی کی زندگی زیادہ تر نظام شاہی سلطنت میں گزری۔ عادل شاہی سلطنت کے وقت حسن شوقی بڑے عاصروں کا حصہ بن چکا تھا۔ بعض جگہ اس نے محمد عادل شاہ کی فیاضی کا بھی ذکر کیا ہے اور جب حسن شوقی کو لکھنؤ آیا تو اس کی عمر قلمی و حل بگل تھی۔ اس کا انتقال بھی یہیں ہوا۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یہاں بہ نسبت شاعر بہت مقبول رہا تھا۔ شعرا میں اس کی عزت تھی۔ اس نے محمد قطب شاہ کی تعریف میں بھی قصیدے لکھے اور شکاریاں بھی لکھیں۔ جس کا ذکر ڈاکٹر زور نے ان الفاظ میں کیا ہے:-

”وہ کو لکھنؤ میں بھی بہت مقبول رہا اور یہاں کے شہروں میں اپنا رنگ بھارتا رہا۔ محمد عادل شاہ قطب شاہ کی تعریف میں قصیدے اور اس کی فرمائش پر کوئی شکاری بھی لکھی۔ لیکن اب یہ ثابت ہے۔“

ابن کمالی بھی اپنی شعوی ”پہلیں“ کے ایک شعر میں اس شاعری کی اہمیت کا احساس دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس حسن شوقی ہوتا تو مجھ پر رحمت بھیجتا:

حسن شوقی دگر ہوتا تو فی الحال
جزا دوس بھیجتا رحمت منہ اپراں

شوقی کب پیدا ہوا اسے قطعی طور پر نہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن جنگ تالی کوٹ کے وقت وہ تقریباً ۱۵ سال کا تھا۔ لیکن ہے کہ وہ احمد نگر کے بادشاہ بہان نظام شاہ کے زمانے میں پیدا ہوا ہو۔ نظام شاہ کا زمانہ ۱۵۰۸ء سے ۱۵۵۲ء ہے۔ اگر ابراہیم عادل شاہ اول کے زمانے میں پیدا ہوا تو اس کا زمانہ ۱۵۳۵ء سے ۱۵۵۸ء ہے لیکن مالک رام نے جو تاریخ لکھی ہے وہ ۱۵۳۹ء یعنی ۱۵۳۱ء ہے۔ بہر طور اس کی پیدائش اور وفات کے لحاظ سے قلم جانی کی تحقیق کے بعض رخ کو سامنے رکھنا چاہئے یہ موصوف نے لکھا ہے کہ:-

”پہلیں ۱۰۶۶ھ میں لکھی گئی اور اس وقت حسن شوقی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک اور مضمون میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، یہ نواں ملتا ہے کہ شاہ صیب بنگلہ کے انتقال کے وقت ۱۰۳۱ھ میں حسن شوقی نے قطب غزالی کے انتقال سے شاہ صاحب کی جرات و وفات لکھی تھی۔ گویا ۱۰۳۱ھ میں حسن شوقی زندہ تھا۔ اگر جنگ تالی کوٹ کے وقت حسن شوقی کی عمر پچیس پچیس سال، دین نی جاکے تو ۱۰۵۱ھ میں اس کی عمر ۹۳-۹۴ سال بنتی ہے اور اس کی عمر کے کسی شخص کا اندازہ نہ چاہئے

اس دنیا کو کوئی عجیب و غریب واقعہ نہیں ہے۔ مثلاً شاہ باجن نے ۱۲۳۳ سال کی عمر پائی۔ باجن کے والد ۱۲۰ سال تک زندہ رہے۔ گیسو دراز نے ۱۰۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس طرح حسن شوقی کا سن ۱۱۰ سال تو تقریباً ۹۳ حد بنتا ہے اور اس کی وفات کا سن ۱۰۲۶ اور ۱۰۵۰ء کے درمیان متعین کیا جاسکتا ہے۔

اس وقت اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شوقی کی "فتح نامہ" چھٹ گزری کی "نورس" (۱۰۰۶ء) اور عبدال کی "نور انجم نامہ" (۱۰۱۲ء) سے قدر بہتر ہے۔ لہذا حسن شوقی کی تخلیقات کو اس بھی ملاحظہ میں رکھنا چاہئے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نظام شاعری سہل و سہل اور کسی حد تک ارتقا پذیر ہو چکی تھی اور اس کا کیا رنگ تھا۔

حسن شوقی کی دو مشیتیں ہیں ایک شوقی نگار کی اور ایک فرائی گوئی۔ اس کی شوقی "فتح نامہ" کلام شاہ میں ۲۱۰ اشعار ہیں جسے دکن کی جی کوٹ ۱۵۶۳ء کی فتح نامہ میں اس نے مرتب کیا۔ واضح ہو کہ حسن نظام شاعری کا سرچشمہ تھیو میں اور اس سے قانع نہ تھی کوٹ قرار دیتا ہے۔ حسن شوقی نے یہ شوقی مشین نظام شاہ کے حضور میں پیش بھی کی۔ گو یا اس شوقی سے دو شاہ کی مزید عنایتیں کا خوبیاں غمیرا۔ اس شوقی میں دکن کے بادشاہوں کی بجاہری کے علاوہ ان کے عراق کی افتاد، سخاوت، انصاف و غیرہ کا مفہوم کیا ہے۔ دراصل جی کوٹ کی جگہ دام راج کے خلاف غمیرتی ہے جسے شوقی نے غزوان، شہزاد اور راون وغیرہ بتا ہے۔

اس شوقی میں فارسی کے اثرات کی کاروائی بھی نظر آتی ہے۔ بجا پوری اسلوب فارسی سے اس قدر قریب ہو جاتا ہے کہ ایک طرح سے دکن کے ادبی اسلوب سے الگ ایک واضح طراز پیدا کرتا ہے۔ حسن شوقی نے اپنے شاعرانہ کمال کے کئی ثبوت فراہم کئے ہیں۔ اس کے یہاں تہذیبیت، استعدادت کا جالی بچھ ہوا ہے جس سے شاعرانہ اسلوب نکھر کر ۳۰ سے ۴۰ سال آفرینی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کی شاعری عام طور سے دو ہیں۔ پہلی صورت چھٹھو شوقی میں ایک روای اور ایک اسلوب کا اندازہ سامنے آتا ہے، جو کئی طرح کے اعتبارات رکھتا ہے اور یہ بھی صورت ہے جتنی ہے کہ کئی حد تک ایسی شاعری درو کے فساد اسلوب کے مزاج سے اہم آہنگ ہو رہی ہے۔

دام راج جب قتل کر دیا جاتا ہے تو غصوں اور بے کراہی ہر فرات کے مصائب سے آزار ہو گئی اور واقعہ ہے کہ حسن شوقی کے اظہار سے وہاں پیدا کیا ہے کہ وہاں کی جبریہ پر یک نظر نگاہوں میں آجاتی ہے۔ جمیل جیانی نے اس صورت واقعہ کو اپنے انداز میں اس طرح لکھا ہے۔

"جب دام راج سنگھان میں پہنچا، اشرافیوں اور سونے کے ذخیرہ کے نظر آتا ہے تو شوقی کے بیان سے یہ جھٹکالے کے اندر پہنچتا ہوتا ہے کہ اس سے سخت نفرت کا

اظہار کرے اور جب جنگی باجی اسے اپنی سوغت میں لپیٹ کر سوار کے پاس پہنچا دیتا ہے تو اس کے دل کی کلی کل جاتی ہے۔ موقع و محل کے مطابق حسن شوقی شعوری طور پر ایسے اظہار لکھتا ہے کہ وہاں اثر پیدا ہو جو وہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہ عمل وہ پوری شوقی میں کرتا نظر آتا ہے مثلاً ارام راج و جاہ اپنے قصہ کو حسن نظام شاہ کے پاس دراز کرتے ہیں تو اس خطا میں وہ خود اس کے منہ سے ایسے شعر نکالتا ہے۔

سو میں دام و جال کوں اصل ہوں
سو شہزاد کین ماد کی نفس ہوں۔

حیرت انگیز طور پر اس شوقی میں جذبات پر نظر رکھی گئی ہے۔ جسک دید الی ملاحظہ کی میں ایسے مرتے آتے ہیں جنہیں منظوم کر کے آسان نہیں لیکن شوقی ایسی مثالوں سے بھی کام لیا اور کامران گزرتا ہے۔ جنگی معاملات پر اس کی فکر چند گزری معلوم ہوتی ہے۔ فوجوں کے مل، باجی اور دوسرے ذرائع جو جنگ میں استعمال کئے جاتے ہیں اس کی تفصیل اس شوقی میں ملتی ہے تاکہ انہیں دو جذبات کی مگائی کو یوں پیش کریں کہ ۱۰۱۰ کو کوشش کرتا ہے کہ جو احساس دلوں میں بگڑا جاتا ہے وہ بطریق حسن عمل پذیر ہو جائیں۔ بعض اشعار کی روشنی میں فردوسی کے "ہفت نامہ" سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ شاہزادہ راجہ راجات ہوئی لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ انہیں گھنہ اشاعت کی شدت جو فردوسی کے یہاں تھا وہ اس شوقی میں کم جاتی ہیں۔ اس لیے اسامات کو منظوم کرتے ہیں وہ شاعری کے اعلیٰ قاصدوں کو کہیں بھی نظر انداز نہیں کرتا چنانچہ تہذیب، استعدادت کے علاوہ دوسری مشیتیں شوقی نے کوفت سے خوب خوب استعمال کی ہیں۔ گو یہ شاعرانہ حوصلہ میں دواپنے وقت کے ممتاز لوگوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے مگر یہ کہنا صحیح ہو گا کہ شوقی دکن اور فارسی روایت کے درمیان ایک لمبی کی مشیت رکھتا ہے لیکن جہاں "فتح نامہ" فارسی اسلوب کی طرف اہل نظر آتی ہے وہاں اس کی دوسری شوقی "میر بائی نامہ" میں اس کی شدت ہو گئی ہے۔ دونوں کے فرق کو سامنے رکھتے ہوئے یہ آسانی سے کہہ جاسکتا ہے کہ شوقی ایک وقت دو روای اسلوب پر قائم ہے اور دکنی اسلوب سے بھی بے غور نہیں ہے اور دکن کے دوستان میں ایک اہم رول ادا کرتا چاہتا ہے۔ اس لئے دونوں شوقیوں کا مقابلہ اور موازنہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ "فتح نامہ" کسی حد تک فارسی اسلوب کی طرف رواں بہتا "میر بائی نامہ" میں دکنی تہذیب کا کچھ سیٹے کی کوشش ملتی ہے۔

حسن شوقی نے "میر بائی نامہ" میں سلطان محمد عادل شاہ کی شادی کو مرکز قرار دیکھا ہے۔ واضح ہو کہ یہ شادی نواب مظفر شاہ کی لڑکی سے ہوئی تھی جس میں ۱۷۴۳ اشعار ہیں اور اس کے چار حصے ہیں۔ اس شوقی میں عادل شاہ کی شادی سے تھوڑے دیر بعد کرکٹ کیا گیا ہے۔ جاوید شہزاد کی تصویر بھی پیش کی گئی ہے مگر دوسری مثالوں کا بھی ذکر ہے۔ دم راج کی صورتوں کا بھی ادھار کیا گیا ہے۔ کھانے پینے کے طریقے سے لے کر تہذیب و غیرہ کے ۱۲۰ بھی سامنے آئے ہیں۔ واضح ہو کہ اس شوقی

• حسن شوقی "میر بائی نامہ" میں ۳۱

میں یہ شوق فراہم ہوتا ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کی تہذیب و تمدن پر بددعا کی تہذیب سے ہمہ رشتہ ہو رہی ہے۔ اس قابل اعتدال و اعتدال سے جو کہ شاد و بات میں ہوتا ہے اسے روکنا چاہئے۔ لیکن ہمارے شاعری کی زندگی میں ایسے تمام امور پر نظر رکھ کر سامنے آئے ہیں۔ ہندوستانی طور طریقے، عورتوں کے مسائل، جس طرح داخل ہو کر تاریخ و تہذیب کو لایا ہے وہ وہی ہے۔ آج اس کو اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے لیکن شوقی نے بہت پہلے اپنے سادہ رنگ و رنگ جہاز کی آنکھوں کے سامنے چلی کر دیے ہیں۔

حسن شوقی نے غزلیں بھی کہی ہیں اس کی غزلوں میں ایک طرح کی شیریںی سب سے اور یہ شیریںی ہی اس کے کلام پر جاری نظر آتی ہے۔ جہاں کہ غزلوں میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ آج کے معیار کے لحاظ سے دور از کار معلوم ہوں گے لیکن پھر بھی اثرات میں کمی نہیں اس کے بیان کا چالو ہے۔ اس کی غزلیں عشق و محبت کی کیفیت سے سرشار نظر آتی ہیں۔ ان میں تصور و اسالیب اپنی تمام تر ایک کے ساتھ موجود ہے۔ اس کی غزلوں میں واضح طور پر محبوب و معریت ہے اور عاشق مرد۔ یہ کہ وہایت غزل میں پرانی چڑھتی رہتی ہے۔ اس کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جوں ہوں تو سدا سے لگے جو دھن اکھن میں
رو پھول پہاں ہوں اپنی رتی ہے غنہ چمن میں
بہب دھن اکھن کھڑی ہے تن اکھن پر کی ہے
نقصہ حسن کا چڑی ہے دل مل رہا رہا رہا میں
خوش ہانگ لا سدا سے شوقی دین ہوا رہے
جیوں چاند سوں ستاروں آگے ہیں سیام گھن میں
راستے نہیں سرنگ ہیں دوست جو ترنگ ہیں
کرتے ایسی جی ہنک ہیں ٹکھو نور کے گھن میں
حجہ ٹکھو دے خراسان کوچن دے ہندوستان
راستے ادھر بدھتے ستارے دن میں
سنا انکے سو کا لا دھتے یہو تک ایسا
تبا رہے بھلا تجھ نہیں کے انکھ میں
عاشق جو مجھ پہلو رہا سدا رہا جو کھو رہا
میتوں فریاد رو رہا یہ باز کھن میں
رہتا ہے تجھ انکھ ہریوں کی یاد شاہی

شوقی کی ہے چاروں ہنس ہنس کے سو ہری
انکھ غزل تہداری جو سو ہے گھن میں
ڈاکٹر تقیم کا شیریں کی یہ بات چاہی کی جاسکتی ہے کہ۔

”شوقی نے غزل کا بنیادی بنایا اس میں ابتدا ہی سے ہاری غزل کی دین والا کھو جو نظر آنے لگا ہے۔
لجلی بھونک شیریں فریاد عشق بازی نازک و خسار قاصد، ناز و دایا شمع شراب پیالہ موسیٰ کا فر،
زادہ، صبح اور زرخیز وغیرہ کے علامات اور تہذورات اس کی غزل میں مسلسل ظاہر ہوتے
ہیں۔ اس کے یہاں غزل کا مذہب عشق بھی ہے۔ مذہب عشق کی کبھی روایات اور قاصد اس کی
غزل میں موجود ہیں۔“

عادل شاہ شاہی

(۱۶۳۸ء۔)

غنی عادل شاہ شاہی شاہی تخلص کرتا تھا۔ سلطان محمد عادل شاہ کا کھلونا بیٹا تھا۔ اس کی پیدائش ۱۶۳۸ء میں ہوئی۔
اس کی تربیت شاہی خاندان کی روایت کے مطابق ہوئی۔ وہ شاہی خاندان کا کھلونا بیٹا تھا۔ اس کا شمار عالم بھی
کہتے تھے۔ شہر وطن سے اس کا تعلق ابتدا ہی سے تھا۔ اس سلسلے میں اس نے کافی واقفیت حاصل کی۔ شاہی میں بھی شعر
کہتے لیکن ان کی کبھی شاعر تھا۔ ۱۶۵۱ء میں اس کی عمر میں فوت ہو گیا۔ اس وقت سلطنت سازش کا کارخانہ، مغل اور مرہٹے ایک
دکن کی زمین پر قابض ہو چکا رہے تھے۔ حیرت انگیز طور پر اس نے ان سب کا مقابلہ کیا اور فتحی باب ہوا۔ حالات ایسے
نظر آئے کہ وہ ادب کی طرف سے غافل نہیں ہوا۔ اپنے وقت کے جیسے ملایا اور ہندوستان، قابل لحاظ شعرا اور شاعر اور شعور کو قریب کر
دیا۔ اس کے دوبارہ شاعر بھی رہا ہے۔

شاہی کی ایک سلف میں ہندوستان تھا۔ اس نے قید رہے کہے۔ شوقی، غزلیں، اسراغلی، گیت اور دوسرے اور
تخلیق کئے۔ صرف ان قصیدوں کی طرف توجہ دیتے تو اس کے یہ قصیدے اس کے دیوان میں ہیں، چنگ شاہی، غزلیں، شعرا
ادب سے آگاہ تھا۔ ابتدا میں اس کے قصائد کی وہی اہمیت ہے جو فارسی قصیدوں میں پائی جاتی ہے۔ قید و فانی کا نال پہ ہے کہ
اور ہنگامہ دو، آجنگ جلد رکھتا ہوا اور اس میں موسیقی بھی ہو۔ یہ سب صورتیں شاہی کے قصیدوں میں پائی ہیں۔ یہاں گھنوں ہوتا
ہے کہ شاہی کے قصیدوں پر شاعر کی کثرت ہے۔ وہ نتیجہ نہیں کرتا لیکن شاعر کی قصیدوں سے بہت دکھائی دیتا ہے۔ اس
کے قصیدوں کی گزریں وہاں ہیں نہیں بلکہ الفاظ ضرورت کے مطابق آتے ہیں۔ اس کا تخیل بیکار متحرک رہتا ہے اور وہ
تخیل بیکاروں کو جسم کرنے میں بڑی بھرپور کامیاب رہتا ہے۔ یوں تو اس کی شاعری کا مزاج بھی فارسی آئینہ ہے۔ لیکن وہ
ہندوئی رنگ کو بھی کبھی فراموش نہیں کرتا۔ اس کے قصائد کے علاوہ غزلیں اور مرچے بھی پڑھتے فراہم کرتے ہیں۔

حالات زندگی اب تک نہ بیٹھے ہیں آئندہ لیکن قصہ بے تحیر نہیں ایک باب سلطان محمد عادل شاد سے متعلق ہے اس لئے یہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اس کے دو بار سے وابستہ رہا تھا۔

صنعفی نے "قصہ بے نظیر" میں ایک سیاحی حضرت تمیم انصاری کے حالات قلم کئے ہیں۔ ان سے منسوب عجیب و غریب واقعات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کا پاس رکھا ہے کہ روایات ساتھ دیں۔ دیکھتے ہیں کہ یہ قصہ مرزا اور متوازن ہے۔ اس میں مراد، مشیت، تعریف، غریب، غریب، غم، خال، شاد، غنی اور بد تالیف کے بعد ۱۳۵ اشعار حضرت تمیم اور ان سے وابستہ واقعات کے سلسلے میں ہیں۔ غزلی ایک زمانہ بانی اعزاز سے شروع ہوتی ہے۔

قصہ میں ہے کہ حضرت محمد یحییٰ کے سامنے ایک قانون آئی ہے اور بیان کرتی ہے کہ اس کا شوہر چار سال سے غائب ہے۔ اس کی خوش پوش کا کوئی انتظام نہیں چنانچہ اسے اجازت دے دی جائے کہ وہ مقدونی کرے۔ حضرت مرزا نے مزید تین سال انتظار کرنے کے لئے کہا۔ جب یہ مدت گزر گئی تب حضرت مرزا نے چار سو روپے کا ہوا کر کے لئے کہا۔ یہ وقت گزرا کہ وہ عورت حاضر ہوئی تب حضرت مرزا نے اجازت دے دی اور ایک سو روپے سے نکاح بھی ہو گیا۔ نو جوان اس کے گھر گیا جس شب عبادت میں گزارنے کا تہیہ کیا۔ جب وہ عورت کو نکاح کرنے کے لئے آگیا تو ایک کھڑا اور تو اس شخص کو لگا اور اپنا نام تمیم انصاری بتایا۔ اب یہ قصہ مرزا سے حضرت مرزا کے سامنے آیا۔ حضرت مرزا نے جب یہ بات حضرت علی کو بتائی تو انہوں نے فرمایا کہ آنحضرت صلی علیہ وسلم نے یہ بات ان سے پہلے کہی تھی تب تمیم انصاری کو ایک دیا لگا کر لے گیا اور پانچویں طبق پر پہنچا دیا۔ وہ مسلسل مصائب کا شکار ہے لیکن حضرت الیاس اور حضرت خضر کی مدد سے سات سال چار مہینے بعد حیدر کو ملے۔ اس کے بعد حضرت تمیم انصاری کو بخش کر لیا گیا اور عورت اسے واپس کر دی گئی۔

اس قصہ میں جو باوقیہ فقرات حاضر ہیں ان کا احساس کیا جاسکتا ہے۔ صنعفی نے کوشش کی ہے کہ واقعات منطقی طریقے پر سامنے آئیں اس طرح کہ اس پر یقین ہو کہ ہر ایک معجزہ اور محترم قسم کے ہیں مثلاً حضرت الیاس، حضرت خضر، حضرت مرزا اور حضرت محمد یحییٰ علیہ السلام کے بعد وہاں۔

قصہ آخر کا ہے اور مشرقی بھی لکھا ہے۔ اسے حجاز کے شاد سے یہ مذہبی مشرقی کہی جاسکتی ہے۔

لیکن یہاں بھی اس بات کا احساس کیا جاسکتا ہے کہ کہن میں قوی اسلوب ارتقا پذیر ہو رہا تھا اور نامیاء مختصیہ المبررہ تھا۔ یہ سلسلہ ازراہیم نامہ سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ اساز ہو رہا تھا۔ صنعفی نے فارسی اسلوب کو اپن کر ایک خاص معیار اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے انداز میں یہ سائنس اور ہر جہت میں بھی ہے۔

قصے میں فارسی منظر اس طرح پیش کیے گئے ہیں کہ وہ مکمل بن گئے ہیں۔ جذبات، احساسات کی بھی خوب خوب تر بجائی گئی ہے۔

شاہ بول اول توں جہان کا
جو خلق ہے نمن و انسان کا
اہل خلق مول اس کو پیدا کیا
سو اپنی محبت میں پیدا کیا
زمین پر شیا میں کون خوار کر
رکھا نسل آدم کون گوار کر
تو اس پر اکا ہے سو ساری گویوں
کیا فرق پائی میں غریبوں
غنی تنگ ہے عالم العیب کا
غنی سوچ دن ملک دار عیب کا

فرض ہے کہ صنعفی بھی ایک ایسا شاعر ہے جو اپنے اسلوب بیان کی دہ سے بڑی وابستہ رکھتا ہے اس لئے اس وابستہ کو برتنے کی کوشش کی جو بہت آہستہ سیاری اور سے قریب آ رہی تھی:

نیکس سات محبت نہ کس سات بات
نہ تھا ج تھا کوئی میرے سببات
یہ ہم جنس وال کوئی نکلوں لے
چند سوہ مراد میرے چلے
چند سوہ دسویں حال راج دیک کر
گوارے عیارے ممکن کے لہر

مثنوی اور مقیم

(۱۴۶۱ء - ۱۴۶۵ء)

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مقیم اور مثنوی ایک شاعر کے درمیان ہیں یا ایک مقیم؟ اس سلسلے میں آئی اوپ کے محققین کی رائیں مختلف ہیں۔ سیدہ قطر مرزا مقیم اور مثنوی کو دو مختلف شخصیتیں سمجھتی ہیں بلکہ اکبر الدین صدیقی سمجھتے ہیں کہ مرزا مقیم نے فارسی میں دو مختلف مقیم استعمال کیا اور ان کی مثنوی اور مثنوی "چند بدین و مہیاز" کا مصنف ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کا یہ اعتراض ہے کہ شاعر کا مقیم مقیم ہے نہ کہ مثنوی اور یہ مثنوی کہ مثنوی "چند بدین و مہیاز" ۱۴۶۸ء سے قبل مکمل ہوئی تھی۔ اس زمانے میں مقیم چھوڑ کر مثنوی کو اپنا قرار نہیں ہے جس سے ہم "چند بدین و مہیاز" کا شاعر اسے قرار دے سکیں۔ جبکہ اکبر الدین صدیقی کا خیال ہے کہ تاریخ اور تذکرہ میں کوئی اور شاعر مثنوی لکھتے ہوئے مثنوی پڑھا جاتا تھا اور قصے مرزا مقیم اور مثنوی کے نام سے شہرت پائی ہے۔

ہر حال، مرزا مقیم اور مثنوی اگر ایک ہی شاعر ہیں تو اس سے بہت زیادہ فرق نہیں پڑتا اس لئے کہ "چند بدین و مہیاز" ہر لحاظ سے مثنوی کی تحقیق ہے، جس کی زندگی کے احوال پر وہ قصائد ہیں۔ دیکھتے ہیں یا دیکھنا چاہئے کہ مقیم فارسی کا بھی شاعر تھا جس نے "نغمات کس وقت مرتب کی تھی جب تخلص بکیری شیخ ہوا تھا۔

"چند بدین و مہیاز" کا قصہ بھی یاد سے تعلق رکھتا ہے۔ خاص کر یہاں ایک حلقہ کو یاد ہے۔ اسے ہم

غواصی کی مشقوں "سیف الملوک" و "دیج البھال" "سانٹے اچھل گئی" "چندر دین و مہیار" میں اس کے شیع کا انداز دیتا ہے۔ ایک اور جگہ اس کی ہے "سیرام و بانوئے حسن"۔ اس میں مثنوی کی "چندر دین و مہیار" کا ذکر ہے۔ متعلقہ مثنوی ۱۵۰۰ء میں لکھتے ہوئی تھی جب کہ "چندر دین و مہیار" ۱۰۲۹ھ کی تصنیف بتائی جاتی ہے جو درست نہیں۔ مثنوی نے اپنی یہ مثنوی اپنا اصلی محرک دیکھ کر لکھی تھی۔ ایک شعر میں اس نے خود غلیظ کا لفظ استعمال کیا ہے:

کہاں پر شکایت کہاں میں اعلیا
بچن کا نظار کہاں لے چلا

اس شعر کی وجہ یہ ہے کہ "چندر دین و مہیار" ایک عشق پر مشق ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا بڑا ہا پاس کے سامنے تھا اور پھر عشق کے معاملہ ہے۔ نتیجے میں اس کے ذہن میں ایک غلطی سامنے آئی۔

یہ بات بھی یاد رکھنی ہے کہ "چندر دین و مہیار" کا مہیار وہ نہیں ہے جو غواصی اور غمر کی کی مشقوں کا ہے۔ مثنوی سداوت و قصہ گوئی پر مبنی ہے لیکن کوئی ندرت پیدا نہیں کر پاؤں۔ اس لئے کہ مثنوی میں فنکار کا دور نہیں ہے اور نہ تو تخلیقی قوت ایسی ہے جو شاعری کو بلند مقام عطا کرتی ہے۔ لیکن اس مثنوی کی ایک خوبی تو بہت واضح ہے کہ اس میں انوکھے و غلطیوں میں غمر نہیں ہیں اس لئے جو کچھ ہے وہ فطری ہے۔ اس سے یہ صورت سامنے آتی ہے کہ وہ سرور کی زندگی سے مصائب اور مسائل از خود سامنے آگئے۔

یہ بات بھی کہنی جاتی ہے کہ مثنوی پختہ ہو پر گونڈ و گے شعرا سے زیادہ متاثر ہے جبکہ اس کا عشق بچاؤ سے تھا۔ دیکھتے مثنوی نے بھی بچاؤ پر مبنی شاعری دیکھی ہے اس طرح افسانہ کیا کہ اس میں غامض الفاظ میں استعمال کے اسلوب میں احترازی کیفیت پیدا ہوئی۔ کہہ سکتے ہیں کہ مثنوی نے بچاؤ کے جنگ اسلوب سے اپنے آپ کو دور رکھا جو دوسرے شعرا کا انداز رہا تھا۔

"چندر دین و مہیار" کی کہانی جس طرح سامنے آتی ہے وہ عام طور سے ایسے ہی قصوں کی طرح ہے جس میں عارضی طور پر عاشق و معشوق الگ رہتے ہیں لیکن آخری مرحلے میں یا تو وہ وسعت و مہارت کا پتہ چلتا ہے یا تو وہ جانتے ہیں۔ "چندر دین و مہیار" کا قصہ بھی ایسے ہی قسم کا ہے۔ عاشق مسلمان ہے اور محبوب ہندو۔ مہیار چندر دین کو ایک شیلے میں دیکھتا ہے اور اس دیکھنے ہی عاشق ہو جاتا ہے۔ مہیار ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے اور پاگل کی طرح اوڑھ اور بھٹکا بھڑکا ہے۔ پھر اس کی ملاقات بادشاہ سے ہوتی ہے جسے وہ کسی طرح اپنے عشق کی روایت کہتا ہے۔ تب بادشاہ اپنے علاقے کی تمام خواتین سے اس کا رابطہ کرانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ شادی کرے لیکن یہ تو کسی کو پہنچائی نہیں نظر میں ہمیشہ مثنوی رہتی ہیں آخر میں ایک فقیر کی مدد سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پیر دین چندر دین بھی راجہ کی انگوٹھی پہنی ہے۔ بادشاہ رابطہ قائم کرنا ہے لیکن ہندو مسلمان کے امتیاز سے یہ رشتہ نہیں ہو پاتا۔ اسی دوران ایک شیلے میں مہیار کی ملاقات چندر دین سے ہو جاتی

کے قدموں میں فوت ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چندر دین بہت متاثر ہوتی ہے۔ ہر طور پر جب راجہ اٹھلی جاتی ہے تو وہ اُسے بڑھتی ہی نہیں تب وہ از خود چندر دین کے گل تک پہنچ جاتی ہے۔ جب بادشاہ و مہیار مثنوی کا سامنا کرتا ہے تو بہت متاثر ہوتا ہے اور مثنوی کو اجازت دیتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ تب مثنوی بادشاہ مثنوی کو لے لیتی ہے اور ایک چٹک پر سو جاتی ہے اور جہاں رہا بھی موت کی آغوش میں پل جاتی ہے۔ حالانکہ راجہ الگ الگ قبرستان لے جاتی جاتی ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ ایک ہی گھر میں دونوں سو جتے ہیں۔ انہیں الگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن ایسا نہیں ہوتا اور عاشق و معشوق ایک قبر میں دفن کر دئے جاتے ہیں۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ اس میں مثنوی الفطرت عناصر نہیں ہیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ جو قصے کا قوام ہے فطرت کے مطابق نہیں۔ عشق و محبت کے قصوں میں جو مبالغہ ہوتا ہے وہ اثرات کو سدھار جانے کے لئے ہوتا ہے اور ایسا فطرت کو فوق فطرت کے صغر سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن فطری انداز سے ہندو مسلمان کا جو اختلاف ہے وہ سامنے آ جاتا ہے اور اس اختلاف کی بحث میں دو مسائل بھی ابھر جاتے ہیں جو دروازے سے ان دونوں کے حصے سمرا رہے ہیں۔

مثنوی کی یہ مثنوی حیرت زانیہ ہے۔ اس لئے کہ اس طرح کے قصے عام میں ہمیشہ منبول رہے ہیں۔ دور کیوں جابجائے میر (شعلہ عشق) کے علاوہ مثنوی "سوز و گداز" کے شاعر عشق پر مبنی کے یہاں بھی ایسا ہی قصہ معلوم ہوا ہے۔ حیرت یہ ہے کہ لاشوں کا معاملہ بھی ایک جیسے ہے جبکہ عظیم آرا کی اس مثنوی کو حقیقت پہنچایا جاتا ہے۔

"چندر دین و مہیار" اس لئے بھی قبول عام کی سند رکھتی ہے کہ اس میں عارضی زبان کی طرف لپک کا ایک انداز ہوتا ہے جب کہ اردو شمالی اسالیب سے قریب تر ہونے کی طرف دیکھی گئی۔ مثنوی کی شاعری پر فارسی اسلوب کی نشان دہی ذیل کے اشعار سے کی جاسکتی ہے:

دور جا کبھی شیر میں تھا بہت در
خیارت میں فاضل دو صاحب ہنر
ہنر ہے فراست میں کامل افتا
خصامت باغت میں فاضل افتا
دلے عشق دل پہ تھا حاصل بہت
افتا طوب صورت کا مال بہت
لمبی مجھے خوب صورت دکوا
پریم کا ہلال سرا مجھ چکھا

ایک رشان ہوا صبر بان
دیا اس کوں معشوق کا دیر نکال

ذیل میں جس قسمی کے بعض اعداد نقل کر رہا ہوں جس میں عشق کی تعریف بھی ہے اور حسن و جلال کے کیف کا

اظہار بھی:

غلامی میں سب کے پرست ہے اول
پرست میں نہیں کوئی ”و جا قل“

پرست بن عشق کہیں اچھا نہیں
کہ مرنا و مینا سمجھتا نہیں

پرست کی ندی نہت البتہ ہے
پرست سوچنے دیا یہ پلٹی ہے

پرست کی پہلی پر کہ جس تھا ہے
دعا کے صدور کا دھڑکا ہے



قطب شاہی ادب

گوکلند و دور کے قطب شاہی سلطانین کی دلچسپ داستان ہے۔ دراصل ایک قبیلہ ترکستان کا قبائلی قراکو کیا جاتا تھا۔ اس قبیلے کے سلطان گلی کے حالات اسے خراب ہو گئے کہ اس نے اپنا وطن ترک کر دیا اور کسی طرح ہندوستان پہنچ گیا۔ اس کی قسمت نے پورنی کی اور وہ ہندویش، آگن کی قطب شاہی سلطنت کا بانی ہو گیا۔ واضح ہو کہ یہی بادشاہ سلطان محمود گزداں ہو چکا تھا اور اب جھدر یا تھم وجود میں آ چکی تھیں۔ سلطان محمود کے انتقال کے بعد گوکلند ویش قطب شاہی ریاست قائم ہو گئی۔ یہ ۱۵۱۸ء کی بات ہے۔ لیکن کبھی کوئی انکتاب نہ صرف ملک اور ریاست کیلئے بہتر ہوتا ہے بلکہ شعروادب میں بھی اس سے نئی روح آ جاتی ہے۔ قطب شاہی دور میں کچھ ایسا ہی ہوا۔ سلطان قلی قطب شاہ کا زمانہ ۱۵۱۸ء سے ۱۵۳۳ء تک محیط ہے۔ اس کی دیکھیں سالہ حکومت ایک طرح سے یادگار رہت ہوئی۔ ایسے اس قبیلے کے چار حکمرانوں نے ۱۵۸۰ء تک حکومت کی۔

سیاحی اعتبار سے یہ زمانہ استحکام سے عبارت ہے۔ ریاستوں کو فروغ ہوا، امن و امان کی فضا قائم ہوئی۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہوئی کہ علوم و فنون کو قابلِ لحاظ حد تک فروغ ہوا۔ قطب شاہی دور کے کئی ادب نے استقامت اختیار کی اور ایسے ادب کے کئی اسرار کھنچے ہوئے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کا دور علوم و فنون کے لئے ذریعہ ثابت ہوا۔ سب سے دلچسپ امر یہی کہنے کی جگہ ہے، جس کے بعد دکنی ریاستیں نہ صرف متحد ہو گئیں بلکہ ان کی قوت بھی خاصی بڑھ گئی۔ واضح ہو کہ مسلم تہذیب اور ثقافت آگن دور میں سے ارتقا پذیر ہونے لگی تھی۔ قطب شاہی دور میں اس کا فروغ و بڑی تھا۔ اب یہ بھی ہوا کہ شمالی اور جنوبی ادبیات کے ادغام کی صورت میں بھی نکلتے تھیں۔ شاہانہ سرپرستی سے مجموعی طور پر قدیم

لیکن اس کے متعلق اشعار محدود ہیں۔

۱۱) جو حالات بیان کئے گئے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کئی بعد از قید سے خاصہ اثر قریب تھا اس کی شاعری میں مشترکہ لکھری جو خصوصیت نمایاں ہے اس کا احاطہ اس تصور سے کیا جاسکتا ہے۔ اور ہندوستان کی قید کا ایک ایسا اثر بیان میں کر سکتے آتے ہیں جس کے یہاں ہندوستانی رنگ بہت بھرپور ہے۔ طرز اور بیان میں دو کئی بھی ایسی مثنوی کو تمہیں جو ان تفسیر و استفادے میں اپنی مثنوی کی خوبیاں کرنا ہے۔ (قید ہندی کی چھاپ پر جو نظر آتی ہے اس شخص میں اکثر زور لگتے ہیں)۔

محمد قلی قطب شاہ

(۱۵۶۶ء - ۱۶۱۲ء)

نظیر اکبر آبادی سے بہت پہلے محمد قلی قطب شاہ نے اردو شاعری میں ہندوستانی لکھری روت چکانی تھی، جس کی تفصیل آگے دی گئی۔

قلی قطب شاہ کی پیدائش ۱۵۶۶ء میں ہوئی اور وفات ۱۶۱۲ء میں۔ درمیان میں جو کئی سیاسی سلطنت جب زوال پذیر ہوئی تو کئی بعد لکھنے لکھنے میں پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں۔ ظاہر ہے ان میں کوکنڈ اور بیجاپور کی سلطنتیں ایسی ہیں جن پر اردو کے حوالے سے نگاہ پڑتی رہی ہے۔ کوکنڈ کی قطب شاہی سلطنت کی بنیاد سلطان قلی نے ڈالی تھی، جو ترکستانی قبیلے قراتو کو کا ایک فرد تھا۔ پھر اس کے بعد جیشہ لگی، بیجان قلی اور ابراہیم قلی کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ یہ سب کے سب علم دوست تھے۔ جیشہ لگی فارسی کا ایک مستر شاعر تھا۔ ابراہیم قلی جو اس کا چھوٹا بھائی تھا علم و فن سے بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔ ابراہیم نے مگر کی ہندو سلطنت میں تقریباً سات سال تک پناہ گزین رہا تھا اور اس کی مدد سے ہی وہ کوکنڈ پر قابض ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی جو ساری لکھی تھی اس میں ہندو اس سے لادھی کی کیفیت نمایاں ہے جس کی وجہ سے وہ ہے۔ مذہب کے معاملے میں بھی اس کا لکھنے لکھنے کی تائید اس کے سیرانہ نام سے ہوتی ہے۔ وہ اپنی سلطنت کو Purnali مثنوی کیلئے عطا کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اس نے دیہی زبانوں کے شاعروں کی پذیرائی کی کہ ان میں بڑی نصیحت دی۔ اس کے دو بانی شاعروں میں شلوک ایک شاعر اور کئی لکھار تھا۔ اس کے علاوہ چنانچہ کئی کئی اور شاعروں کے شاعروں کو اس کی سرپرستی حاصل تھی۔

ایسے تمام نامور سے چند اندازہ لکھیں جن میں سے کس نام سے اس کو کوکنڈ شعر و ادب کے لئے ایک خاص مرکز میں کیا تھا۔

قلی قطب شاہ سلطان ابراہیم کا بیٹا تھا جس کے دوسرے بھائی بھی تھے مہو القاد اور حسین قلی۔ قلی قطب کی ماں شنگی عورت تھی۔ یہ کافی اوپر رکھنے والی خاتون تھی۔ قلی قطب پندرہ سال کی عمر ۱۵۸۵ء میں کوکنڈ کا تخت نشین ہوا جس کی ایک ٹیڈ بہو مثنوی کا قصہ بہت مشہور ہے جو مثنوی کی روح ہے۔ راقم الحروف نے اپنی کتاب "قطب مثنوی" اور اس کا تصدیق جاننا "مثنوی قلی قطب" اور اس کا قصہ کے مثنوی کی دو داستان تفصیلی سے بیان کی ہے۔ ان دونوں کا مثنوی قلی کا قصہ ہے جو مثنوی کی مثنوی "قطب مثنوی" کا مندرجہ ہے۔ اسی مثنوی کی بدولت حیدر آباد شہر تعمیر ہوا۔ وہ اس میں مثنوی مثنوی کا نظم کی رہے والی تھی۔ سب قلی قطب شاہ تخت نشین ہوا تو حیدر آباد اس کا نام ہوا کہ مگر کھانہ میں چار ہزار ہے جو حیدر آباد کی خاص چیز ہے۔ جو مثنوی کو حیدر آباد کا خطاب ملا اور اس سبب یہاں مگر بعد میں حیدر آباد ہو گیا۔

"قلی قطب شاہ نے حیدر آباد میں ایک مثنوی لکھا کی شریعت میں جو احمدیہ تھا اور ملک کے چار طبقوں کا دل موہ لینے کے سلسلے میں خود اپنے باپ سلطان ابراہیم سے زیادہ کامیاب رہا ہے۔ اس کا لہجہ، ذوق قطع اور معاشرت بالکل ہندوستانی تھی۔ یہ اتنے ہے کہ اگر ابراہیم کے بعد محمد قلی جیسے اصرار تخت نشین نہ ہوتا تو کوکنڈ کا مثنوی قلی تو ان اس انتہائی عروج کو نہ پہنچ سکتا جس کی وجہ سے ہندوستان کی زبان اب تک مشہور ہے۔

اس میں مثنوی قلی تو ان کے پیدا کرنے کے لئے محمد قلی نے مذکورہ خاص اسلامی عیدوں کے علاوہ اور بھی تقریبوں اور شہر سے لگائیں جن میں نوروز، ہفت روز، برسات کی تقریبوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔"

قلی قطب شاہ کے یہاں کوکنڈ، سورا، چیتھہ، پیر، پندے، بعض نظموں میں فطری طور پر آتے ہیں۔ لہذا ان کی نظر میں اپنے پرندوں کے گنے گنے بغیر نہیں رہتے تھے۔ اس کی مجموعہ ان میں بھی ہندی کیف و کمر لکھی ہیں بلکہ ہندو م کی حامل ہیں۔ لکھا کوکنڈ، بیجاپور، جیشہ، سندھ، سائوٹی۔ اس کی بارہ پیروں اسی طرح کے دم کے ساتھ سامنے آتی ہیں جو سب کی سب اس کی مجموعہ میں ہیں۔ اس کی طراویں میں بھی سائوٹی، سندھ، بیجاپور، چیتھہ، ہندو، سندھ، بیجاپور، ہندی جیسے نام سامنے آتے ہیں۔ گویا قلی قطب شاہ کے یہاں ہندو اور ہندی شعور اس قدر آشوب میں ہے۔ لہذا وہ ان کا الفاظ سب ہی رنگ میں ملنے لگتے ہیں۔ اس کی ایک مشہور مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہندو کھیلوں مثنوی کا آ بیار
 ہمیں ہے چاند، میں بولوں جوں ستار
 چیتھہ کندن کے چاروں آفتاب چھوٹا
 ہندی ہوں چھتہ ہندوں کو مٹا دیا

عمر لای قلب شاہد کا عمل کیا ہے مجلس اشاعت کی خطوطات کی طرف سے شائع ہو کر مظہر مہر آجکا ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد وہی دینی کے بارے میں رائے جلتی پڑتی ہے اور باہر سے ریختہ کالاب محمد تقی قلب شاہ کے لئے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اس کا کام نہ لی سب سے زیادہ رنگ اور لچسپ ہے۔ پھر جس کی غزلوں کی تعداد بھی وہی کی غزلوں سے بہت زیادہ ہے۔ اس کے کلام میں جدید طرز شاعری کے مطابق نظمیں کے اسے نظیر نمونے موجود ہیں کہ شاہہ اقبال سے قبل کسی شاعر کے کیا تھے یا وہ انہیں انشاء فرمائیں۔ ان نظمیں میں محمد تقی قلب شاہ نے اپنے عہد کی زندگی کو محسوس کروا ہے۔

عمر گلی کا زمانہ دلی سے قریب دو سو سال پہلے کا ہے۔ اس لئے اس کی زبان دلی کی زبان کے مقابلے میں خاموش اور قدیم ہے اس لئے ممکن ہے کہ قلی کا کلام اتنا ہی بدعت کیا جائے جس قدر وہ کا کلام مقبول ہے لیکن قلی کے کلام میں ہندی الفاظ اور دلی لہجہ کی سمجھا کے کی آسرتاز یا چاشنی ہے اس لئے اس کی شاعری ہندی شاعری کا بہترین نمونہ بن سکتی ہے۔
مخلصہ یہ کہ جو خاصا افسانہ آکبر آبادی کے یہاں تلاش کے لئے میرا وہاں از پیش قوی قلوب شاد کے کلام میں ملے گا۔

(-1252)

[illegible]

اسم اسد اسد اسد اسم اسد
آتش و کافور یازده اسم

Mathematics 2020, 8, 106

ہست و منت خمد سو گدوان چل اوپر
بھوان یا آگ کھر کی بھوان

میر تقی قطب شاہ قطب شاعری سلسلہ کا چوتھا باب شاہ تھا۔ اس نے گونگھڑ پر اٹھیں برس حکومت کی۔ اپنی تخت نشینی کے نو سال بعد اس نے شہر حیدر آباد کی بنیاد رکھی۔ شیرازہ دہلی احمد دہلوی نے اپنی کتاب "واقعات مملکت حیدرآباد" میں لکھا ہے "جب سلطان نے دارالسلطنت محمد نگر گونگھڑ کو اپنی جاہ و منزلت کے موافق نہ پایا اور اس کے حصار میں امر اس پر کی سکت نہ کے لئے کافی مہیا نہیں پائی تو اس میدان میں جدید شہر کی بنیاد رکھنے کا حکم دیا، جہاں اب حیدر آباد واقع ہے۔ تھوڑے سے عرصے میں شہر کے علاوہ عمارات و دولت خانہ شاعری و دروازہ کمالی و دارالافتاء و خانقاہ، ہائیکڑہ و جلوہ خانہ و دفتر خانہ و دیگر خانہ ہائے کارخانہ جات و قصر ہائے اہل خدیات و دارخانہ و تینوں خانہ و سلمہ خانہ و مطبع و مسجد جامع و تشریف خانہ کمالی سب تعمیر ہو گئے۔" اس سے پتہ چلتا ہے کہ محمد تقی قطب شاہ ایک اولوالعزم بادشاہ تھا جسے تعمیرات سے خاص دلچسپی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس کے دربار میں علاؤقلی شاعر و مصنفین کی ایک بڑی تعداد تھی۔ یا شاہ نے صرف شعر و شاعری کا دلدادہ تھا بلکہ اس ضمن میں وہ دوسروں کی دہمیری کرتا تھا۔ اپنی ذاتی تخلیقات کے علاوہ اس نے فارسی اور دکنی زبان میں متعدد کتابیں لکھوائیں۔ اس کی موت کے بعد اس کے چائشیں بیٹے محمد قطب شاہ نے اس کی تمام تصانیف جمع کر کے مرتب کیں۔ ۱۶۱۲ء میں اس کے کام کا ایک مجموعہ مرتب کیا گیا، ہذا لغزہ و مصلحت پر مشتمل ہے۔ ذرا کمزور دوسرے مجموعہ ترتیب دے کر شائع کروایا ہے۔

تقی قطب شاہ نے بڑی تہدارانہ سہولت پائی تھی۔ اس لئے اس کا کلام بے حد روزگار لگ اور مستوفی ہے۔ اس نے مختلف اور کئی عنوانوں پر شعر کہے ہیں۔ اس لئے اس کے کلام کا مآب سے بڑا مصطفیٰ خلافت کی وصیت ہے۔ جہاں اس نے قصیدہ، غزل، مثنوی اور مرثیہ لکھے ہیں، سچائی، شائستگی، نظمیں بھی لکھیں۔ ان کی تعداد کافی ہے اور انکی نظمیں بھی مضامین کے اعتبار سے بہت بلند ہیں۔

تاریخ و تمدن ایران در سده های نخستین

اب شریکی گنجائش نہیں۔"

وجہی نے ایک دینی حرپائی تھی اور اپنی زندگی پر بادشاہوں کے عہد میں گزری۔ "مسبوس" عبدالغفر قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۳۵ھ میں لکھی گئی۔ اس طرح اس نے ابراہیم خجی قنکب شاہ، محمد قنکب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبدالغفر قطب شاہ کا زمانہ دیکھا۔ چنانچہ نصیر الدین باقی صاحب کا خیال ہے کہ اگر ۹۸۸ھ میں وجہی کی عمر ۲۵ برس فرض کر لی جائے تو "قطب مشعری" لکھتے وقت یعنی ۱۰۱۸ھ میں ۵۵ برس اور ۱۰۳۵ھ میں یعنی "مسبوس" لکھتے وقت ۸۲ سال مر رہی ہے اور یہ تو ایسی عمر نہیں جو غیر ممکن ہو۔ اس مندرجہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وجہی کی پیدائش ۹۶۳ھ کے قریب ہوئی ہوگی۔

"قطب مشعری" اور وجہی کی ایک گہرائی یہ تھی کہ اس کتاب کو مرتب کرتے ہوئے مولوی عبدالغفر نے اپنے حقد میں لکھا ہے:-

"ایک قیاس اس مشعری کے متعلق یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس ملک پر دو سلطان محمد قنکب شاہ اور بھاگ متی کے مشہور مشعری دو داستان بیان کی گئی ہے۔ وہ واقعات بھی عالم شہزاد کی کاہے۔ لیکن یہ ایسا جو تحقیق کتاب سے اس کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا۔"

لیکن "اکبر گوپی چند" رنگ بھر بھٹا لکھنے والے اس واقعہ میں لکھتے ہیں:-

"اس میں عشق و محبت کے جو واقعات انسانی نوعیت میں خوش کھ گئے ہیں وہ محمد قنکب کی عاشق مرانی کے تھے۔ مطابق میں اور ان کا در پر دو متعلق محمد قنکب اور بھاگ متی کے درستی مشعری سے ہے۔"

خان رشید نے اپنی کتاب "تین شہزادوں" میں بھاگ متی پر میر حاصل بھٹ کی ہے۔ موصوفہ کا خیال ہے کہ اس مشعری کی بیرونی بلاشبہ بھاگ متی ہے لیکن اسے اصل نام کی جگہ اس کے خطاب مشعری سے یہ لکھا گیا ہے۔ انہوں نے اس نمونہ میں چند اسباب کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو درج ذیل ہیں:-

(۱) چونکہ بھاگ متی یا بھاگ دینی عبدالغفر قطب شاہ کی ماں کا اصل نام تھا اور وہ بھاگ متی سے مراد تھا اس لئے اس کے اصل نام کو حذف کر لیا گیا۔

(۲) عبدالغفر قطب شاہ بھاگ متی کے اصل نام کی جگہ اس کے خطاب مشعری اور عبدالغفر کو لکھ دیا تھا۔

(۳) قطب کی کتابت سے مشعری زیادہ قریب ہے۔ بھاگ متی میں وہ بات ہے جو انہیں ہوئی۔

(۴) افراد مشعری عطار اور پیر و مہتاب و مرزا وغیرہ مسبوسوں کے نام ہیں۔ اس لئے قطب کے ساتھ مشعری کا ذکر زیادہ ضروری ہے۔

یہ سارے دلائل دہی ہیں۔ اس لئے اس میں شبہ نہیں کہ مشعری کے پروردگار بھاگ متی ہی ہے۔ اس کوئی انگریز مشعوپوں کی انتہا غراب کے احوال سے ہوتی ہے لیکن مشعری "قطب مشعری" میں قنکب شاہ کو خواب۔ وقت کی راستی معلوم ہوتا ہے۔ غراب کے بعد ہی قصہ کے سامنے ہے۔ جس کا خلاصہ مولوی عبدالغفر کی زبان میں ہے:-

"..... محمد قنکب شاہ کے اب ابراہیم قنکب شاہ کے کوئی چھٹا پوتا تھا۔ آخر بیٹا ہوا۔

بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ بادشاہ کی گئی۔ زمانے کے رواج کے موافق نصیم دی گئی۔

شہزادے نے ایک روز خواب میں ایک ناز میں کو دیکھا، اس پر عاشق ہو گئے۔ اب جو کچھ کہی

تو نظروں میں دی۔ اس وقت دوزخ پر حالت غراب ہونے لگی۔ بہت کچھ بکھا دیا گیا کچھ اڑا

ہوا۔ آخراں کے ایک خیر معور عطار پور سے سارا مسلمان کے ساتھ اس ناز میں کی گھاٹی میں

نگلے راستے میں بڑی بڑی محبتوں اور آفتوں کا سامنا ہوا۔ غرض ایک بہت خواہ طے کر

کے نکالے پہنچے۔ جہاں کی وہ رہنے والی تھی۔ وہاں میں بہت ہو جاتی ہے اور مشعری کے صاحب

اسے لے کر نکلتے داتے ہیں۔ جہاں بڑی محبت و محاسن سے شادی ہوتی ہے۔"

مشعری "الکب مشعری" میں ایک مرکزی شخصیت ہے اور یہی ایک مرکزی شخصیتیں بھی ہیں۔ لیکن وجہی کو اس اور بھاگ متی کے درمیان نہیں ہے۔ مشعری کے کچھ کردار آئینہ ہیں اور بڑے بڑے ہیں۔ ماحول کے تحت بدستور ہیں۔ پر کوئی شخصیت نہ ہے۔ اس لئے یہ جو داستان کا حصہ ہوتے ہیں۔ ان کی شخصیت چکڑا نہیں ہے۔ اس لئے یہ کردار غیر قطعی اور معمولی بھی ہیں۔ واقعات و حالات ان پر اثر قائم نہیں کرتے بلکہ یہ خود ماحول اور اعتبار منطقی ہوتا ہے۔

مشرقی کا کردار بھی بڑا اعلیٰ معلوم ہوتا ہے۔ وہ شہزادی ہے لیکن بھارتی کی دیوانی نہیں اس پر طاری ہیں۔ مشعری کے کردار کا روشن پہلو ملازم سے اس کا حسن سلوک ہے۔ یہ ملازم بہت وقت اس کی سبکی و اس کے ننگسار ہے۔ وہ مشعری کے سارے دائرے آگاہ ہے اور اسے وقت ضرورت نصیحت کرتے ہیں۔ انہیں "آئی" مشعری یہاں بڑی عقیدہ معلوم ہوتی ہے۔ ملازم کے دل کو نہیں لگتا۔ اس کا شیوہ نہیں لگتا۔ اسے مل کا درجہ دینے آتا ہے۔

لیکن ایک شاعر کی حیثیت سے ملازم کے امتیازات نمایاں ہیں۔ انہی نے اپنی مشعری میں تکیہ کیا ہے۔ اس کا بکس جال بکھا دیا ہے۔ اس کے یہاں تکیہ کیا ہے۔ اس کے اس قدر میں بڑی حد تک ہے۔ انہی نے انہی کے چہرے میں نمائندگی کے لئے اپنے ذہن کی غیر معمولی قوت اور تخیل سے کام لیا ہے۔ مطلق اور غیر مطلقا اس کو ہم آہنگ کرتے ہوئے وہ بڑی کارائے معانی سے کام لیتا ہے۔ ذہن کی پختہ نگری کی آئی اور بھارتی نے مطلق اور غیر مطلقا اس میں

بھی کوئی دلوں کی نکل نکل پدا کر گیا ہے اور یہ کھنڈ نکل نکل شعر کے پیکر میں آتی خوبی سے پیدا کیا گیا ہے کہ ان کی یہ دلی کا کوئی احساس تک نہیں پہنچا۔ مثلاً:

جھنجھکیا نہیں اس نکمے کالے سے

کہ مچھلیاں وہ سبزیاں ہیں چالے سے

یہاں بھری دھنیں شاعر کے ذہن میں حال کا تصور پیدا کرتی ہیں۔ جن میں دو آنکھیں اسیر ہیں اور یہ آنکھیں دانشور میں بکھر کر حال کی مچھلیاں معلوم ہوتی ہیں۔ یعنی کالے بالوں میں دو آنکھیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے دو مچھلیاں حال میں بکھرتی ہوں۔ یا پھر:

وہ چٹکی ہیں تازی اکھ میں

کہ بیٹھا بھنورا تب کی پلک میں

معتوق کی آنکھ وہی کے لئے دم کی چاک ہے اور پتلی اسے بھنورے کا تصور دیتی ہے۔ گویا محبوب کی آنکھ کی پتلی ایسی تھکی ہے جیسے دم کی چاک پر بھنورا بیٹھا ہو۔ پتلی کی ذرا کٹ کی جس قدر بھی داو دیں کہ ہے۔ ایسے ہی موقع پر دہمی کا بقول درست معلوم ہوتا ہے کہ:

بہر حال اس کو کہیا جائے گا

جو کوئی اپنے دل سے نکلے گا

دہمی کی تشبیہات کی دنیا ہر جگہ ہی ہوتی ہے۔ اس کی گفتگو صلاحیت تمام گوشوں سے اپنے بولے لئے آب و گل تلاش کر سکتی ہے۔ چاہے وہ ہر نیک کا مصلیٰ ہو کہ امرا و نیک کی تسبیح سے والے دہمی کے لئے تمام تراشیا شاعری کے حدود کے اندر ہیں۔ بنیادیں وہ اپنی پسند کے مطابق استعمال کر سکتا ہے:

دل ان مصلے ہے ہر نیک کا

یہ تل تو جو سراپاں کا

معتوق کے عقائد کے مطابق کیسے اتنی اچھی تعبیر کسی ہلکے کار شاعر کے ہی نہیں کی جاسکتی ہے۔ بحر اظہار کی بات تو یہ ہے کہ ایسی دور انداز تشبیہات اشعار میں استعمال ہو کر مزید دلکش نہ ہوتی ہیں۔ دہمی نے اپنی قوت اختراعی سے انھیں نہ صرف قائل قبول دیا ہے بلکہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ ذہن اگر ساتھ دے تو ہر شاعر ان امور دہمی اشعار کے پیکر میں دلچسپ بن سکتے ہیں۔ دہمی کی کامیابی اس بات کی دلیل ہے کہ نفس مضمون جو اسے خود اتنی اہمیت کی چیز نہیں سمجھتا اس کے حسن ادا کا پہلا اہمیت رکھتا ہے۔ دہمی کی اپنی تشبیہیں شاعری کی حدود کو وسعت دیتی ہیں اور شاعر کے احاطہ اظہار کو وسیع بناتی ہیں۔

لہ آرمیاں ہیں سو صحن گول ہے
کہ سنبلی کی ٹیوں چھاؤں گول ہے
آنکھ کے وہی بھنورے ایسی تھکی ہیں جیسے شاعر کے سر پر طرہ:

انگیاں پر بھنورے چھند سول چھاندے ہیں

کہ نکالیں سرال پہ طرے کالے ہیں

چمن شمع سے روشن ہے۔ بگڑے بگڑے لے گلاب سے سرور سے ہیں:

چمن تر شمع شمع کے ہے آب سول

کہ سول دھڑے ہیں بگول گلاب سول

پیشہ پر پڑتی نکم ہے، کد تخی پر حادثات کا اللہ ہے:

رہی چٹکی ہیں بیٹے پر چھب سول آ

پتلی پر اچھے تیوں الٹ ٹٹ کا

معتوق کوڑے پر سوار ہوتی ہے تو اس کی کٹی تشبیہیں دل ہیں۔ جیسے دہمی میں روشنی یا ناکارہ ناک کے سر پر کن یا چنے کوڑے پر سوار بیٹھا ہو یا جیسے دہمی جری رات میں مغل:

ہوئی سار شہر تک رنگ ہر دو بار

دھونیں میں اچھیں جیوں چھٹکے اچھ

پہم جگتے جوتے سول ناک ہے

کہ طاؤں بیٹھا، نکر کاک ہے

سو شہر تک رنگ ہے اچھے نارچوں

کہ مغل دھڑے رات اندھاری میں جوں

گرد و غبار سے اتنی تاریک جگہ کو ہالوں کا مسکن تصور کر لیا ہے:

دیکھی گرد اند کا ہے ہے غار

کہے جو اچھااں اپنے کا ہے غار

شیر اور ہر شعری کے مطاب کو دوسرے مضمون کا لانا جاتا ہے۔

ایورنی شہنشاہ، دھونیں دھار

دور۔ مدد رات آٹے ایک غار

یہ ساری علامتیں جس نے علیٰ نبیوں کی ہیں بلکہ مختلف نکتے والوں نے اسے اپنے اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ لاکھوں مایا میں چند یحییٰ نے اس کی وضاحت کی ہے کہ اور و نثر کی ابتدائی صدیوں کی بارگاہی میں رہنمائی کے چکار کی طرح۔

ایک جھٹ چکی آتش ہے کہ ”مب دس“ کا اخذ کیا ہے اس لئے کہ وچنی نے کہیں بھی اس سوال کو چھیڑا تھا نہیں۔ دراصل اسے ایک قصہ محمد بنی ابن سینک کا ہی یہ نام پوری کی فارسی مثنوی ”استور انا شاق“ اور اس کا خلاصہ ”تر“ قصہ حسن اولیٰ اور ”سیستان خیال“ میں شکی بہار و مہکین ہو گیا اور اس نے اپنے طور پر اس میں رنگ بھرا شروع کر دیا۔

کہا جا سکتا ہے کہ "سب دین" ایک غیر معمولی کتاب ہے، جس کی مثال ملے جوں ہے۔

دعویٰ کی نظر کافی بخش ہے۔ اس میں ایک طرح کی موتیقی پائی جاتی ہے۔ جسم کا خمیری نے اس کے اندر "سبز" ظہور دینی "سب دین" کا اندازہ پر دھبہ تو بھگت تو محسوس نہیں کیا ہے لیکن اس کے سب کے سب کی صفات اور سلامت کی تعریف کی ہے۔ دعویٰ کے سلسلے کی نقد وے تفصیل کا اظہار اپنی تاریخ میں دواں طرح کرتے ہیں:-

"دعویٰ کی دواں سترہویں صدی کے درج سوم (۱۶۹۷ء-۱۷۵۹ء) کے دور میں جس ہوئی ہے۔ یہ دواں زمانہ ہے جب شہنشاہی کا ٹکڑا دینی ادب کے سہری دور سے گزر چکا تھا۔ محرقی قلعہ شہنشاہ اور دعویٰ جیسے بلند مرتبہ شعرا کے کلام سے لگنٹھ دینی ہجرین اور بیروانیات کا سفر پورا کر چکا تھا۔ دعویٰ کی تالیف "سب دین" اس عہد کا حاصل قرار پائی تھی۔ "سب دین" کا یہی اثر کاہم ترین نقش بھی ہوا تھا۔ یہ دینی کتاب ہے جس کے بارے میں محمود شیرانی نے کہا تھا کہ اس تالیف کو دورہ زمانہ کے ساتھ دینی نیست ہے جو "سب دین" کے کوہری کے ساتھ اردو مقامات عہد کی کوتاہی کے ساتھ ہے۔ قلعہ شہنشاہی دورہ دعویٰ کی دواں کے بعد دعویٰ کو حد تک جاری رہا۔"

غواہی

غواہی کا پورا نام شیخ حسین بیاد الدین اور غواہی ٹھکان تھا۔ دراصل یہ پورا نام طاقت مرزا نے اپنے ایک مشہور "تکب الشجر غواہی اور اس کا کلام" جو سال ۱۷۵۳ء میں شائع ہوا تھا میں رقم کیا ہے۔ لیکن بعضوں نے اس کی تردید بھی کی ہے۔ دوسرے لوگوں کے علاوہ نصیر الدین شاہی بھی اس خیال کو رد کرتے ہیں کہ غواہی کا نام بیاد الدین تھا لیکن "تاریخ ادب اردو" چاندی صمدی، صفحہ ۱۷۰ پر نصیر الدین چند جہاں میں ہے کہ:-

"ما تکتہ الحروفہ کو اپنی تحقیق کے دوران عمر الدین شہنشاہی کا نقد مثنوی پر لکھا ہوا عربی مخطوطہ "غواہی" الاغضب" جلد اول دستیاب ہوا ہے جو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا غزوہ ہے۔ اس مخطوطے کے کاتب خود غواہی ہیں۔ انہوں نے حمران عثمانی کی انصاف انصاف کو جو عربی میں ہے فتح کے بجائے تصنیف میں تحریر کیا ہے۔ ترجمے میں غواہی نے اپنا نام شیخ حسین بیاد الدین علیہ السلام غواہی تحریر کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ غواہی کا نام شیخ بیاد الدین لقب غواہی نسبت از محمد و محمد بن محمد غواہی تھا۔"

اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ اس کی پیدائش ازادیم عادل شاہ کے عہد میں ہوئی، ابتدائی حالات شخصیت میں گزرے یہاں تک کہ بے حد معمولی ملازمت اختیار کر لی پڑی لیکن ابتدا ہی سے شعور و عمر کی بے باپ کے سلسلے میں کافی

انتہا کہ دبا لہذا وہ ایک ممتاز شاعر کی صف میں آ گیا۔ یہ سولہویں صدی کے ابتدائی زمانے کی بات ہے۔

غواہی نے اپنے دیوان کی ترتیب میں خاصی توجہ کی۔ سلطان محمد قطب شاہ کے وقت اس کی شاعری کافی اہم بن چکی تھی۔ یہاں تک کہ اسے عبداللہ شاہ قلعہ کے عہد شاہی میں قلعہ حاصل ہو گیا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ غواہی نے محمد قلعہ شاہ کی زمینوں میں فروغ بھی کیا جس جواں کثرت ہے کہ دواں دواں سے قریب ہو گیا تھا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ سید شاہ ابو الحسن حیدر علی اس کے ہر شعرے لیکن اس بات کی تردید بھی کی جاتی رہی ہے۔ غواہی نے خواہے پھر میراں شاہ سید شاہ حیدر علی اللہ کو اپنا مرشد قرار دیا ہے۔ غواہی کے لیاات میں اس کے اشارے ملتے ہیں۔

غواہی کہیں اپنے آپ کو غواہی بھی کہتے ہیں، اس کے علاوہ غواہی بھی۔ بہر حال غواہی دینی شاعری کے فاضل اہمیت حاصل کر چکا تھا اور یہاں تک کہ وہ انتظام سلطنت میں بھی داخل دینے لگا۔ دواں ملک اشرفیوں تھا بلکہ اس کی حیثیت امور سلطنت کے آج اہم ترین کی ہو گئی تھی۔ اس کے تھا کہ میں یہ قلعہ ابھرتی ہیں۔ عبداللہ قلعہ شاہ نے بطور علیہ اسے ایک کاؤں بھی دیا تھا۔ غواہی آخری دنوں میں بزرگ الدین ہو گیا تھا۔

غواہی نے لیاات تو چھوڑا ہی ہے اس کے علاوہ اس کی تین مثنویاں ہیں "یتا مثنوی"، "سب دین" اور "طولی نامہ"۔

"طولی نامہ" میں اس نے عبداللہ شاہ کی مدح کی ہے جب کہ "سب دین" اور "سب دین" محمد قلعہ شاہ کے عہد کی تصنیف ہے۔ اس میں بھی بادشاہ وقت کی مدح میں اشعار ہیں۔ عبداللہ اس شاندار چاہتا اور ان تھا کہ اسے "نصاوت آزاد" کا لقب بھی عطا کیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب دواں ملک اشرفیوں پایا گیا تھا۔ غواہی کی عظمت کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ اس کا ذکر شاہی جہاں میں بھی ہوتا تھا۔ قلعہ جو ہم میراں ہر صحن نے اپنے تذکرہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ضرور اس بات کی ہے کہ اس کی مثنویوں پر نگاہ ڈالی جائے۔

ایسا کہیں ہوتا ہے کہ "سب دین" اور "طولی نامہ" میں شاہ وقت کی مدح ہے:

بحر سلطان محمد اللہ آفاق میر
سلطنت شہنشاہ گرداں سرور
چراں چوہاں خسروی برج کا
امورک دن حسن کے درج کا

ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عبداللہ شاہ قلعہ کے عہد میں لکھی گئی لیکن اس کے پیش رو سلطان محمد قلعہ شاہ سے بھی اس مثنوی کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ مثنوی کا ایک مخطوطہ "سالار جنگ" میں محفوظ ہے جس میں شاعر کا مورخ سلطان عبداللہ شاہ بلکہ قلعہ شاہ ہے۔ مخطوطہ شعر ہے:

موسلمان محمد قلب شاہ کھن بید

جنگ آدھا دے ہو دیکھ دست گیر

یہاں لفظ "کھن بید" محمد قلب شاہ کیسے ہی ہے لیکن محسوس ہوتا ہے کہ بعد میں اسے بدل دیا گیا اور عبداللہ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے وہ اقتدار قائم کیے گئے جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔ اس کی تصنیف کا سال ۱۱۹۶ھ بتایا جاتا ہے۔

اس کا قصہ "الف بلی" سے ماخوذ ہے لیکن غور اسی نے اسے اپنے طور پر برتا ہے۔ مزے میں غور اسی نے اپنے تخیل اور احساس جمال کو بدھرام استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے واقعات موثر ہیں۔ قصہ گوئی میں کوئی بھول نہیں ہے اور دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ اس میں شہرت کے حسین مزہ قریبی سامنے لائے گئے ہیں۔ جہاں جنگ کا منظر نامہ ہے وہ کسی حد تک چکا چلو معلوم ہوتا ہے۔

غور اسی کی دوسری مثنوی "طوطی نامہ" تین چار ہزار سے زیادہ آیات ہیں۔ یہ ۱۲۳۶ھ میں ضیاء الدین غفری کے قاری طوطی نامے سے ماخوذ اور ترجمہ ہے لیکن اس میں بہتری الفاظ کافی پائے جاتے ہیں۔ ہر لحاظ سے دونوں مثنویوں کی قطعاً اسلامی ہے۔

غور اسی کی تیسری مثنوی "جینا ستوتی" ہے۔ اسے "چندالورک" بھی کہتے ہیں۔ سب سے پہلے نصیر الدین ہاشمی نے دریافت کیا تھا اور ڈاکٹر غلام عمر خاں نے "نور الہد" جلد اول ۱۹۶۵ء میں اسے شائع کیا تھا۔ اس کی کہانی کسی لوگ کھڑی نہیں ہے۔ بشمول ڈاکٹر پرکاش موہن اس کا ایک "ریخ" "جینا ستوتی" میں اور دوسرا ملا لاکو کی مثنوی "چندائن" میں اچاگر کیا گیا ہے۔ ایسے ڈاکٹر گوئی چندا رنگ اسے "چندائن" سے ماخوذ قاتے ہیں۔ "جینا ستوتی" کی کہانی کوئی متبادل تھا۔ شری رام شرما کی ہندی کا سچہ ۱۹۶۹ء میں اس کا اظہار کرتے ہیں کہ براہمن نے اپنی کتاب Folk song of Choleespari میں "چندائن" کے دس مختلف روپ سامنے لائے ہیں۔ جینتیس گڑھی میں لوک کی کہانی میں لوک کہ دھوبی ہے۔ غور اسی کی جینا ستوتی ڈاکو کی چندائن کی نقل نہیں ہے بلکہ اس کا قصہ مادھن کی جینا ستوتی سے منہ کھاتا ہے۔

غور اسی کی یہ مثنوی ہر لحاظ سے اسی سے رکھتی ہے۔ اس کا ہندوستانی ماحول بڑا پرکشش ہے۔ دکائے چمٹ اور راست ہیں کہیں کہیں غمزدگی کی زبان بھی ایک خاص انداز سے برتی گئی ہے۔ اس میں اولہ چاشنی بھی ہے۔

غور اسی کی مثنوی "طوطی نامہ" اصلاً غفری کا "طوطی نامہ" ہے جو قادی میں ہے۔ غور اسی نے غور اسی سے استفادے کا اعتراف کیا ہے:

ہوئے حضرت غفری جی حد

دیا مجھ اسے تو روائی اس سند

غفری کے طوطی نامے کا ایک نسخہ ڈاکٹر حسین انصاری نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بھی ہے۔ دیکھو یہ بات یاد رکھنی

صرف بارہ کا انتخاب کیا تھا کہ غور اسی کے بیان بھی یہ یاد رکھنا ہی ہیں۔ "طوطی نامہ" کو غور اسی کی شاہکار مثنوی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں سب سے پہلی سادگی اور روانی بدھرام میں موجود ہے۔ اس ضمن میں غفری اور کھن بید ہیں۔

"طوطی نامہ" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مثنوی غور اسی کے آخری زمانہ کی تصنیف ہے۔ اس کو شہرت، عزت اور وہ تمام دنیاوی مراعات حاصل ہو چکے ہیں جس کا کبھی وہ اندر مند تھا۔ شاید اسی لئے وہ دنیا کی باتیں، فقر و غنا اور دولت و ثروت سے بڑھ کر نظر آتا ہے اور دنیا سے کنارہ کشی، خاموشی، پنداری اور عشق الہی کی طرف راغب ہوتا ہے۔ وہ دنیا کو ایک ایسا دو شیرہ سے تلخ ہے جس کا ایک ہاتھ لوبوں کا ڈھانچا ہے اور دوسرا ہندی سے چا ہوا ہے۔ "طوطی نامہ" غور اسی کی شاہکار مثنوی ہے۔ "جینا ستوتی" کی طرح یہ مثنوی بھی خاص ہندوستانی قصہ گوئی ہے۔ "طوطی نامہ" میں ایک ایسی کشش موجود ہے جس سے ہر شخص ہر زمانے میں لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے اس مثنوی کا شمار دنیا کی اعلیٰ ترین ادبی کتابوں میں کیا جاسکتا ہے۔

غور اسی کے دوج ان میں نظم، غزل اور دستیاں ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ غور اسی غزلوں میں ۱۵۰۰۰ اشعار ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے کلیات میں کتنے ہی ایسے اشعار ہیں جو اس کے تخیل اور فکر کا بخوبی احساس دلاتے ہیں۔ ان میں گہرائی بھی ہے بلکہ اسے غزل کا بھی ایک ممتاز شاعر کہا جاسکتا ہے۔ اس کے عہد کے دوسرے شعراء اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ غزلیں انکی تہذیب میں ہیں۔

مخاطب کا انداز بھی عام دہلی جوہ سے الگ نہیں ہے۔ یہ اپنے مثنوی کو کہانی، انکی، بھانا، مثنوی، دھن، انداز کی جیسے باتوں سے یاد کرتا ہے۔ اس کی غزلوں کی جو محسوس حد و خال اور دوسرے رنگ روپ سے بھی ہندوستانی ہی ہیں۔ بلکہ انکی اثرات کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ تین اشعار دیکھئے:

کالی چٹیاں ہیں پھول بھر دھب سوں گھڑی سو پھول دیا

تاریاں کی مہرابی مگر کرتے تھے تارے تارے تار دات

لال در کمال رنگ بھرے بھرے

بھٹے بھین تارنگیاں جینا بنگالی

کھول بھر شیخوں بول بارے توں

مسک جی کی ہے پھول کی ڈال

اس کی برتری میں جو جمال پاتا ہے اور یہ صنف جس طرح اس کے پیر ہوئی ہے اس کا شک و شبہ نہ رہتا ہے۔
خبر تہ اہل ہوتی ہے جہاں اس نے قصیدے میں اپنے جوہر دکھائے۔ غرض کہ شاعرانہ اعتبار سے اگر غواص اپنے عہد کا
بے صدام مقبول شاعر ہے تو اس کی وجوہات موجود ہیں اور اسے اعتباراً رابرہ صیت اس لئے حاصل ہے کہ وہ اقطار ایک
یا کمال شاعر ہے۔ اپنے قصیدے کے اعتبار سے اس کا خیال ہے:

قصیدہ ہو غزل کہنے کے فن میں دیکھتا ہوں تو
غواص میں گھیرے غازیابی کی نکالی ہے

دلچسپ بات ہے کہ اس نے انور کی، خاکانی عرفی اور سودا کے رنگ میں قصیدے کیے ہیں اور اس کے قصیدوں
میں بڑی نفسی اور روحانی پائی جاتی ہے۔ غرض کہ یہ قصیدے کیے تھے لیکن غواصی کے قصیدوں کی بات الگ ہے۔
غواصی نے ریا میاں بھی لکھی ہیں جن میں چند غنیمت اور اخلاق و تعارف موضوعات ہیں۔ حسن و عشق کی
بھی ریا میاں ہیں جو پرائیں۔ غرض یہ کہ اس کے شاعرانہ جہات کئی ہیں اور وہ سبھی میں ممتاز نظر آتا ہے۔ اگر غرضی
حق کو سب سے بڑا قصیدہ گو کہ اہل حق اس کی پوزیشن اس کے بعد ہی آتی ہے۔

احمد گجراتی

(۱۶۳۶ء۔ ۱۵۸۹ء سے کچھ پہلے)

احمد گجراتی کا نام شیخ احمد شریف گجراتی ہے۔ ویسے وہ شیخ احمد کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے نام کا ایک
اور بڑا فضل اللہ بھی ہے۔ احمد گجراتی کا ایک تاریخی نام بھی ہے۔ جس سے سال پیدائش ۱۶۳۶ء برآورد ہوتا ہے۔ ان کا
گھرانہ تھی تھانہ

احمد گجراتی کی دو مشوایاں سامنے آئیں۔ پہلی مثنوی "پلی جھوں" ہے۔ اسے ادبی و جامی روشناس کرانے
والے حافظ محمود شرانی ہیں جنہوں نے ۱۹۲۵ء میں اس مثنوی پر "اور شیخ کا بی مگوین" میں ایک مقالہ شائع کیا تھا۔ اس کا
کوئی اور نسخہ نہیں ہے۔ ایک آرا خط جو بعد میں ملا اس کی حالت بہت خستہ ہے۔ "پلی جھوں" کا سال تصنیف صحیح نہیں
ہے۔ ایک قیاس ہے کہ ممکن ہے یہ بہت پہلے کی مثنوی ہو لیکن جس کی جانچ نے احمد گجراتی کی ایک اور مثنوی "یوسف زلیخا"
کا چہ چلایا ہے جو ۱۵۸۰ء سے ۱۵۸۸ء کے درمیان لکھی گئی ہے۔ اس مثنوی کو سیدہ ہمنہ نے ۱۹۸۳ء میں ترتیب دے کر
شائع کر دیا ہے۔

احمد گجراتی شاہ ولی اللہ دین سے سرپرست تھے انہوں نے اسے خلافت بھی عطا کی تھی۔ محمود شرانی نے لکھا ہے کہ وہ

"محمود شرانی کا یہ بیان صداقت پر مبنی نہیں ہے۔ ان کی نظر سے احمد گجراتی کی مثنوی بے صفا و
زلیخا نہیں گزری تھی۔ جس میں شاعر نے اپنے روحانی و ہر شاہ ولی اللہ دین طوی گجراتی کا
ذکر کیا ہے اور ان سے خلافت عطا ہونے پر اکتفا فرما دیا ہے۔ محمود شرانی نے مثنوی
الٹنی جھوں میں احمد گجراتی کے اہل درختہ کو دیکھ کر غائب ہونے کا نام کی تھی۔ مثنوی زلیخا
جھوں بھی چنگیز علی صاحب شاہ کی زبان میں لکھی گئی تھی اس لئے شاعر نے غائب ہونے کا نام
غرضی کی خاطر حضرت علی اور ائمہ اطہار کی خوب دج کی ہے۔"

احمد گجراتی کی مثنویاں اس کے حالات پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔ "یوسف زلیخا" میں وہ ایک ایسا شاعر مظلوم ہوتا
ہے کہ جس کے حالات اقتصادی طور پر تحقیق ختم ہیں۔ چونکہ وہ خود اپنی خوش نصیبی پر فخر کرتا ہے لیکن اس کے برعکس "پلی
جھوں" میں اس کی زندگی انتہائی پریشان کن نظر آتی ہے۔ وہ اپنے حالات سے بے حد پریشان مظلوم ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا
ہے کہ اس سے کوئی اچھا روزگار برسر نہیں لہذا وہ مختلف مشغلوں میں اپنا وقت صرف کرتا رہا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ دونوں
مثنویوں کے زمانے میں کافی فرق ہے۔ اس لئے کہ پریشان حالی کے بعد وہ ۱۵۸۰ء سے دوبارہ خود اس میں خاصا
وقت لگا رہا۔ اس لئے دونوں مثنویوں کی تاریخ کا قیاس ایک شکل اس پر مبنی نہیں ڈالی جاسکتی۔

بہر طور، احمد گجراتی نے اپنی مثنوی "یوسف زلیخا" میں جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ ہر طرح کی ہے۔ جسے
تعمیم کا شعری شہدہ دیکھی کہتے ہیں۔ ایسے اسلوب کا تقاضا بھی ہے کہ وہ پانے رنگ کا اختیار کرے۔ لہذا یہ کہنا سکتا ہے کہ
احمد گجراتی کوئی آداب زندگی اور زبان کا پاسبان رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی زبان میں لہجہ است کے آثار ہیں۔ لیکن
"یوسف زلیخا" جس کی تاریخ تصانیف ۱۵۸۰ء اور ۱۵۹۸ء کے درمیان بتائی جاتی ہے۔ ایک الگ اسلوب کا چہ دیتی
ہے۔ یہاں وہ رنگ غالب ہے جو "پلی جھوں" کا طرز و انداز تو بخوبی احمد گجراتی اپنی ذکر سے متاثر نظر آتا ہے۔ اس سے
قلم ہوتا ہے کہ کیا اقطار دونوں مثنویوں میں ایک ہی شاعر کی ہیں۔

لیکن دونوں مثنویوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ احمد گجراتی اپنے عہد کے تہذیبی مناظر کو ہر درجہ احسن
چشم کر سکتا تھا۔ اس کی نگاہیں ہر ایک پر تھیں۔ عورتوں اور مردوں کے لباس، ذریعہ رات، آرائش و زیبائش کے طریقے،
شکار کے سامان ان تمام امور کی تفصیلات اس کی مثنویوں میں ملتی ہیں۔ گو یہ وہ بعد و حال تہذیب کی ایک دہے میں داخل ہو
کر اس کے لفظ شریک کرنا چاہتا تھا۔ اسے زبان و بیان پر تہذیب و تہذیب کی اہمیت اس کے یہاں تشبیہات و استعارات میں
خوش نظر آتی ہے۔

احمد گجراتی نے غزلیں بھی لکھی ہیں۔ اس کی اور غزلیں ڈاکٹر جمیل جالبی نے نقل کی ہیں۔ ایک مثنوی کی

زبان میں ہے۔ میں ذیل میں دونوں غزلیں درج کر رہا ہوں:

مٹھو گھٹ جب زور زنی کھ پتے مومن ڈال کر لکے
مقابل ہوئے تا ہرگز اگر سور ہجر لکے
محبت کل رات دھن سوں خوا یک بخود دیکھا
کہ سارے چاند و زلزل سو یک چلی بھر لکے
بچل کی جب ملت گھنے کلم میں ہاتھ میں لینے
اچا یک ہاتھ میں میرے کلم ہو پٹکر لکے
مومن کے کلم سوں گل گل کر نہیں سوں رات دن میرے
کہ پانی ہو کے بھ سارا کلیجہ اور جگر لکے
بیٹھے بچن ترے سن ؟ بات کر کے بگھیا
شیریں لہاں یو میرے جس شات کر کے بگھیا
الا بریا بھننا ہ دالی دیکھ کر میں
امرت بھلاں یہ گویا ہے بات کر کے بگھیا
بیتوں میں ہے منکسل سر پر ہے زور کا آجیل
جھٹکات دیکھ کر کہ کھ کا شب برات کر کے بگھیا
اشمن کے بولنے کا فی اعتبار مجھ کن
یک بات میں دھن کے کے گھٹات کر کے بگھیا
گلاں اچے سونہی کے تھکے ملے سوز لہاں
آب میلے اوچے غلہاں (کڑا) کر کے بگھیا
احمد دکن کے غزلیں جو تیاں ہے پر ملاحظہ
تو توں دکن کو اپنا گھرات کر کے بگھیا

ان غزلوں کے مطالعے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ احمد گجراتی تھے آتے آتے دکنی اسلوبِ قدوسہ فارسی اسلوب میں تبدیل ہونے لگا تھا۔ چونکہ مشائخِ مشنویوں کا تہذیب زمانہ و شمار ہے لہذا ایسے معاملات میں سباق و سباق کے ساتھ دوسری نگاشات سے موازنے کے بعد ہی کچھ حقیقی طور پر کہا جاسکتا ہے۔

ابنِ نشاطی

ابنِ نشاطی کا پورا نام شیخ محمد فقیر الدین ابنِ نشاطی تھا اس کے والد شیخ فخر الدین تھے لیکن ابنِ نشاطی کے تفصیلی حالات آج بھی نہیں ملتے۔ ایک خطِ نجس کی بنیاد پر استوار ڈاؤنٹس ایسٹ کالج نے "پھول بن" کے بارہ "خوشی نامہ" کو نشاطی کی تصنیف قرار دیا ہے لیکن زور سے اس خیال کو رد کر دیا ہے۔ ابنِ نشاطی کی ولادت کا سال ۱۰۳۰ھ اور ۱۰۳۵ھ کے درمیان قائم کیا گیا ہے اس کے نام کے آگے شیخ انشراح بھی لکھا جیسے الفاظ لکھے جاتے رہے مگر اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے وقت کا مرشد بھی تھا ابنِ نشاطی کو فارسی سے خاصی قربت تھی اردو فارسی شاعری کے حواج سے آشنا علوم ہوتا ہے۔ ابنِ نشاطی کی قلم تر شہرت "پھول بن" کی وجہ سے ہے۔ اس کا سن تصنیف کیا ہے یہ بھی ایک الجھن کی بات ہے۔ مختلف لوگوں نے مختلف تاریخیں درج کی ہیں لیکن عبداللہ زور دہی نے اپنی مرتبہ شہری "پھول بن" میں درج عمر ابنِ کیا ہے اس سے ایک واضح حوالہ نکلتا ہے یعنی ۱۰۶۵ھ:

اقرا دوش تا اریا یہ گھزار

ایارہ سوکوں کسم شے حق پر جاو

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ابنِ نشاطی سلطان عبداللہ شاہ کے دربار سے وابستہ تھا لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ وہ "پھول بن" کی تخلیق کے اربعہ بادشاہ سے قریب ہوتا چاہتا تھا اور یہ خود اس مشنوی کے ایک شعر سے واضح ہے:

اچو یو د مبارک پھول بن ہو

نظر میں ہم اچھو شہ کی بچن یو

لیکن یہ بات بھی ثابت ہے کہ "پھول بن" ایک فارسی قصے "برہنچا" سے اقتباس پر مبنی ہے۔ پہلے وہ بات کہ جاتی تھی کہ "برہنچا" ملا احمد دیلی کی فارسی تصنیف ہے لیکن اب یہ خیال سامنے آیا ہے کہ اس فارسی تصنیف کا مصنف احمد حسن زبیر مددھی ہے۔

"پھول بن" کے قصے پر غور کیجئے تو اس میں قہول کا ایک حائل نظر آئے گا ایک قصے کے خاتمے پر دوسرا شروع ہوتا ہے اس طرح کئی قصے ایک کڑی میں سما جاتے ہیں۔ اس کی داستانِ نشاطی پر جو بحثال نے ندی کی شکل بنایا ہے۔ اس کا شہر کہن بھی ایک مثالی شہر ہے جہاں خوشیاں ہی خوشیاں نکلتی رہتی ہیں۔ داستانوں میں دانشور کی ہر جگہ ہر جگہ ہے۔ یہ سب دیکھ کر ہم کا شہری نے استعارہ سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں خبر و خبر کی جنگ لگتا ہے۔ لیکن شکر کو ہر طور پر طلب ہوتا ہے۔ ۱۰۶۵ھ ہے۔ ایک اور صورت جو "پھول بن" میں اجری ہے وہ ہے مردان کا ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہونا۔ ان کی کئی مشنویوں میں اس طرح کا قصہ درج ہے۔ شہری "کدم و قدم را از" میں غرورین کا نام ہے تو وہیں کلب کا ایک خاص

لئے کئی طرح کے انتظام کئے ہیں۔ سب سے اہم بات جو سامنے آئی ہے وہ موضوع کے لحاظ سے اشعار کا حساب ہے۔ ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ شاعر محض جذبات کی روش میں بہ رہا ہے اور اسے یہ فکر نہیں ہے کہ کس کے سلسلے میں کتنے اشعار جناس کے جائز ہیں۔ لیکن ایسے تو ان اردو سب کو تکنیکی طور پر کامیابی کی ایک نئی تہذیب کرتا ہوں۔ اس مثنوی میں ۱۲۳۰ اشعار ہیں اور اس کی تصنیف میں چالیس دن صرف ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل چاکری نے اس مثنوی کی بعض منفرد خصوصیات کو اس طرح قلمبند کیا ہے:-

"طبعی نے اپنی مثنوی کی بنیاد فارسی شاعر گھالی کی مثنوی پر رکھی ہے۔ گھالی نے 'صفت بیکر' میں ہر بات کی بے انتہا نظر میں اس کے خاندان سہ ماہی کے چودہویں بادشاہ بہرام گور کی حکایت کو موضوع غنیا بنایا تھا اور اسات کی اہمیت یہ تھی کہ بہرام گور کی سات بیویاں جن میں سات باغیوں میں رہتی تھیں۔ طبعی کی مثنوی کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ شعریت اور قصے کے اعتبار پر حالات سے اس میں مثنوی کا فن ترقی پانہ شکل میں ابھرتا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مثنوی میں اشعار کی تعداد اور عنوان سے کی تقسیم میں ایک باطنی ملتی ہے۔ خلا پر عنوان کے تحت ایک ہی تعداد میں اشعار لکھے گئے ہیں۔ مزاج ابوالحسن میں جتنے اشعار لکھے گئے ہیں اتنے ہی اشعار شاہ راجہ کی مزاج میں لکھے گئے ہیں۔ قصے کے دوران میں ایک موقع ایسا آتا ہے کہ بہرام گور کا باپ اسے سات نصیحتیں کرتا ہے۔ طبعی نے ہر نصیحت کو بالآخر اس سات سات شعروں میں لکھ دیا ہے۔ اس مثنوی میں قدم قدم پر ایک اہتمام کا احساس ہوتا ہے۔ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ طبعی دلی مثنویوں کی روایت سے باخبر تھا۔ مثلاً جس طرح گھالی نے 'تغلب مشرقی' میں استادان فن کو خواب میں دیکھنے اور ان سے اپنے فن کی داوطلب کرنے کا ذکر کیا ہے اس طرح طبعی نے بھی کو خواب میں دیکھنے کا ذکر کیا ہے جو طبعی سے کہہ دیا ہے:

کیا بات طبعی میری نوبی

ایک اور خصوصیت اس مثنوی کی یہ ہے کہ اس کی زبان اور اسلوب بیان نہایت قریب تر ہو گیا ہے۔ اس لئے اس مثنوی کو آج بھی آسانی کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے۔ اس میں بہت سے اصطلاحات جھڑپ، سور، چور، سنے، غلام، بھٹہ، اچھٹا، چٹا، اچا، باغیر، ضرور، استدلال، مکہ، سنے ہیں۔ لیکن یہ اصطلاحات سنے سنے معیار کے اندرائی دور میں حتیٰ کہ دلی کی کے پاس بھی نہ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ طبعی کی یہ مثنوی چلی کی زبان کے گہرے اثرات کے تحت جتنی جتنی ہوئی زبان کی ترجمان ہے۔"

میر کے خیال میں یہاں سے جو روایت ہے اور اس سے 'بہرام گور' کی اہمیت کئی طور پر واضح ہو جاتی ہے اور یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ فارسی روایت کس طرح آہستہ آہستہ دہلی ہو کر دکنی ادب کے مزاج کو پیوستہ ہو چکی ہے۔

ابوالحسن تانا شاہ

(۱۶۳۳-۱۷۰۰ء)

تغلب شاہی مہار کے تشریف یافتہ ابوالحسن تانا شاہ کا قلعہ کوٹلہ سے تھا۔ ایک روایت کے مطابق وہ مہار تغلب شاہ کا چچا یا دادا تھا۔ کئی خیال غالی غالی کا بھی ہے۔ لیکن تاکہ جگہ بیرون اس نے اپنی کتاب "تغلب التواریخ" میں اسے مزید بیان کیا ہے۔ وہ اسے غلی کہتا ہے۔ کئی دوسرے لوگ گلی اسے باہر کے آدمی سے مہیر کرتے ہیں۔ لیکن "انگزارہ متوبہ" میں ہے کہ وہ سلطان مجدد کے رفیقہ داروں میں تھا۔ اس طرح دو شاہی نواسہ ان کا ایک فرد ہوا۔ ہر حال صورت حال جو بھی ہو۔ بڑے کرنا مشکل ہے کہ وہ واقعہ شاہی رشتے سے کوئی غلی تھا۔ لیکن اپنی خوش خلقی سے وہ مہار شاہ کی وفات کے بعد ۱۶۷۰ء میں تغلب شاہی سکران بن کر رہا۔

تانا شاہ کی تعلیم شاہ راجہ کی نگرانی میں ہوئی۔ وہ اس کا مرید بھی تھا۔ تانا شاہ کے کردار پر بھی ابھریاں اٹھتی جاتی رہی ہیں۔ کوئی "تغلی" سے تعلق کرنا کہ تصور کرتا ہے تو کوئی اسے سوجھ بوجھ سے شاہی اس کی ابتدائی زندگی کی ادنیٰ میں گزری ہو لیکن اس کا تاج عجب ہو جانا اگلیوں میں افسوس ہے۔ اس لئے کہ ایک مرتبہ تک وہ اپنے اجداد کی خدمت سے وابستہ رہا۔ یہ وہ مہار اور پروفیسر گلیان چلہ پھین نے "تاریخ ادب اردو" میں لکھا ہے:-

"جو کوٹلہ سے کے آخری تاجہ دہلی مہار کی تقسیم اس طرح ہے کہ چودہ سال تحصیل علم اور چودہ سال خدمت باغی خدمت مرشد میں بسر ہوئے۔ چودہ سال حکومت کی اور پھر چودہ سال قید و دولت آباد میں گزار دیئے۔ اب اس کا ایک فرزند جو دولت آباد کے زمانہ قید میں اس کے ساتھ تھیں گلی میں تھا خداوند خداوند سلطان تھا۔ غلی لڑکا، جس سے بڑی مہار دلی کا بیٹا پھر چارہ سے آخری بادشاہ سکندر عادل شاہ سے ہوا تھا۔ اب اس تانا شاہ کو قلعہ دولت آباد کے چچائی محل میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ جہاں اس نے زندگی کے چودہ سال ابتدائی کچھ ہی کے عالم میں گزار دیئے۔ سکندر بھی وہ ہے "چلی محل کا قیدی کے قریب غلی ایک پرہیزگار کی تھی جس میں کوٹلہ سے کے اس آخری قیدوار کے اہم قیدوار اس کی بیوی اور بی بی کی بیوی سوتیلہ کی کشتی کی کشتی تھی۔ راجہ الحروف کو انہوں نے قیدی تھا کہ مولوی عبدالحق نے انہیں اس نظم کو سنایا کرتے تھے صبح کرنا تھا۔ کیونکہ اس سے اور کچھ نہیں کے شب و صبح کا اظہار ہوتا ہے۔" ۱۷۰۰ء

میں ایک کسٹن تھا شاہ کا انتقال ہوا۔ اس کی تاریخ وفات ۱۲ ہجرات ۱۱۱۱ھ یعنی ۱۷۰۱ء کی ہے۔ سیکندر علی دہلوی کی تذکرہ دہلائیہ میں اس کا تذکرہ ہے:

دکن آ گیا شاد غازی کے بس میں
کئی آئی لیکن نہ عرض نہ ہوس میں
نہ چھٹی کبھی بات چودہ برس میں
یوں ہی عمر زری یہاں خار و خس میں
خانی نے مکان اہل دے دیا ہے
دکن لے کے چھٹی خانی دے دیا ہے ۱۰

یہاں اس بات کا ظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گوکنڈہ کے سقوط اور ایوان کسٹن ۱۲ شاہ کی قید و بند کی زندگی پھر موت نے گوکنڈہ کی خلیفہ تہذیب اور لسانی تہذیب کا کلیجہ قح کر دیا۔ گویا اورنگ زیب نے چھٹی کارروائی کی اس کے اثرات دور رس تھے۔ تہذیب و تمدن کے انہدام سے نئی صورتیں پیدا ہوتی رہیں اور فارسی اثرات تیزی سے کام کرنے لگے۔ لیکن یہ کہ ادب عالیہ کی تخلیق کے لئے یہ ایک فطری صورت پیدا ہوئی ہو لیکن گوکنڈہ کے جد اور بن جس طرح دکنی زبان میں اور دکنی کا رہنے والے تھے انہیں انگریزوں نے کیا جاسکتا ہے۔ اورنگ زیب کی فتح اور آخری شاہ گوکنڈہ کی شکست کو تہذیبی امید کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں بات ہے کہ اس ایجنے سے لامرکزیت کا بھی خاتمہ ہو اور ایک وسیع و عریض علاقے میں نئے طور پر اور بنی بنیاد رکھے پہنچے ہوئے۔

چاندلر میں زندگی بسر کرنے والے ایوان کسٹن کا شمار گوکنڈہ میں تھا اس لئے اس نے اپنے بعض احساسات کو شعر و ادب اور ادبیات کے ایک غزل ڈاکٹر جیمز کیمبرلی نے اپنی کتاب ”ادب اور ادب کی تاریخ“ (۲۰۳) میں درج کی ہے اور یہ احساس دلاتا ہے کہ یہ غزل طلبہ شاہی ریاست کی سیاسی تہذیب اور لسانی شکست کی علامت ہے تو دوسری طرف مظہر تہذیب طرز احسان اور دہلی کی فتح کی علامت ہے۔ یہ تعلق غزل کا نقطہ ہو۔

سے مرد تھی بدن تو ڈرا تک جہن میں آ
جیوں تھی شکست ہو کے مری انجمن میں آ
کب تک رہے گا جیوں اب تصور ہے عشق
اے شوق غور پند توں تک بھی عشق میں آ

چاہتا ہوں دھنک قد میں کروں عطر شعر کی
اے معنی پندر شتالی سوں میں میں آ
اے جان بولکھن توں اٹھے خوشی لکھ ہے
بد تھا کون کھول کے مچھ جہن میں آ

لیکن یہ غزل ڈاکٹر جیمز کیمبرلی کی ”تاریخ ادب اردو“ جلد اول (ص ۵۰۸) میں بھی ہے۔ جن کی رائے یہ ہے کہ اس غزل کا فارسی اصناف اور رنگ سخن اسے دہلی کی آواز سے قریب تر کر دیا ہے۔ جیمز کیمبرلی کی تاریخ میں ایوان کسٹن کی ایک اور غزل کوئی کچھ کہنے کوئی کہنے کی مدح ہے جس ہے۔ اس کا بھی حراج وہی ہے۔ کچھ اور اشعار جو ان کسٹن ۱۲ شاہ سے منسوب کئے جانے چاہتے ہیں وہ یہ ہیں:

کس دھن کبوں چاہوں کہاں کچھ دل پہ بھل چھرات ہے
اک بات کے جوں گے سخن یوں ہی میں بارہ بات ہے
منا تھیں کا پھر سوں کوئی جھوٹ کوئی سچ کچھ
کس کس کا ہر سونہاں سخن کوئی کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے



طریقہ زندگی میں ملا سکتا کا پہلو ہونا اس بار بار شرافت اور نجاست پر نہ صرف کیا جانے لگا، نظم و نسق کسی بھی فرد کی عظمت کی دلیل ثابت ہوئی۔ کہہ سکتے ہیں کہ تہذیبی اعتبار سے یہ صدی اس بار اور طریقہ زندگی کا ایک ایسا رخ سامنے آجائے۔ یہاں پر پادریوں کی کھینچے ہیں اس نوس منظر میں تصوف نے بھی جگہ پائی۔ غالباً ہوں میں اس کی بازگشت تہذیبی جہاں ساری کی مضمینیں ایک خاص آغاز اور رخ اختیار کرنے کی طرف ماقبہ ہوئیں۔ تصوف نے تعلیم، الہیات کے نئے آفاق پیدا کئے جن میں عشق و محبت نے ایک خاص اہمیت سے جلا پائی۔ صوفیانہ تصورات میں کبریا کی اور معنویت کی تکمیل پیدا ہوئی اور عشق عشقی کے شاعرانہ بیان کی صورت میں بری۔ ایسے تصوفانہ تصورات بعد میں امدادی شاعری کی روایت میں گئے اور ان میں تہذیبی کی ایک صورت سامنے آئی۔ صوفیانہ آستانوں نے اپنی کامرنگی سے ان کی نگاہ کرنے کی کیفیت پیدا کی لیکن ہر عظمت کا ایک بستہ رخ بھی نہ کسی طرح پیدا ہو جاتا ہے بلکہ امر و نہی کا قائل غصت، رجحان بھی شاید ہی دینے سے بچتا ہوا۔ اس لحاظ سے اردو شعراء ادب کو خاصہ اہمیت دیا۔ نیرت ہے کہ بعض اہم شعرائے امر و نہی کی دہائیوں کا نام کریں جن کی تحصیل میں جانے سے طوہت آج بھی مکمل ہو جاتی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانے میں بھی اور تصوفانہ تہذیبی زمین میں بھی تصوفی رنگ ہمارے لگے۔ جن کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

دو ادبی وستان

لیکن عمومی نقطہ میں یہ بات واضح کی جا سکتی ہے کہ جذبات نگاری کی اعلیٰ سطح سامنے آئی۔ واقفیت کا رنگ غالب ہوا۔ تصوف کے نوس منظر نے عشق آفرینی کی نئی صورتیں پیدا کیں اور انصاف و بلاغت زبان کی جگہ ملی اور شعر و نثر خاصہ زور حاصل کرنے سے اردو کا حیا و بلیغ ہو اور اس زمانے کے بعض شعراء تاریخی کا نہ صرف انوکھے حصے میں گئے بلکہ اردو شاعری کی پہچان ان ہی سے قائم ہوئی۔ لیکن ۱۹۵۷ء کے بعد پادریوں اور ادبیات نے حالات کا رخ موز دیا۔ دلی برادریوں اس طرح کا انکسار و شعراء جو کہ ورنہ زندگی بسر کر رہے تھے، پس اٹھ کر، کئے اور اردو کی دوسری اہم تہذیبوں کی طرف مراءجت کرنے لگے۔ ذیل میں جس عہد متعلقہ کے شعراء اور ادبا کا جائزہ لے رہے ہیں۔ ایسے تجزیے میں ہر شاعر و ادیب کی اپنی شناخت سے متعلقے آئے گی۔

دو ادبی وستان

یوں تو روایتی طور پر شعراء ادب کے مخصوص حراج کی شناخت وبتوں سے کی جاتی رہی ہے لیکن میں غلطی جوہ زیدی کے اس نقطہ نظر سے اتفاق کرتے ہوں کہ ایک اسکول کا حراج کسی دوسرے وبتان سے نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ ہوتا ہی ہے۔ لیکن اختصار سے مرکزی پہلوؤں پر نگاہ کی جائے تو کچھ مختلف صورتیں ضرور ابھرتی ہیں۔ ابتداً ان ہی کو پیش دیا کر میں چند نکات پیش کر رہا ہوں۔ یہ وہ نکات ہیں جو عام طور سے دلی اسکول سے وابستہ کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ قصاص نہیں کہیں کہیں لکھنؤی وبتان میں بھی لکھیں گے اور اس شعر وبتان عظیم آباد میں بھی۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ دلی ادب کے مولدوں نے اتنی بات تو ضرور کی کہ قادی کی بالادستی کا ختم کرنا چاہا۔ تحریک ہے کہ بعض عہد اہم شعراء کے یہاں قادی ترکہوں کی بھر مار نظر آتی ہے لیکن اب تک جو تصور تھا کہ قادی ہی میں شعر کہنا شعر کو سب سے وہاں ہونا نظر آتا ہے۔ اب تجزیہ سے اردو قادی کی جگہ یعنی نظر آ رہی ہے۔ عربی اور انجلی کیف وکم کے انعام سے اردو حیرت انگیز حاشی حاصل ضرور کر رہی تھی لیکن ایسا نہیں تھا کہ ان زبانوں کا تسلط محض کیا جاسکتا تھا۔ بلکہ اسالی طرح پر ہمارے اہم اساتذہ شعرائے صرف اردو کو ایک مختلف اسالی جہت سے آگیا کیا بلکہ اس کا اپنا رنگ نکھر کر سامنے آئے۔ ان کا اپنا آواز سکھ رخصت کی چیز ضرور، ہر بعد میں ایک روایت کے طور پر ہمارا ادبی سرمایہ ثابت ہوا۔

دو ادبی وستان

دلی کے بعد ایک دوسرا وبتان، دو وبتان، لکھنؤ کے نام سے معروف ہے۔ اس کی کچھ خصوصیات بیان کر دینی چاہتی رہی ہیں اور یہی خصوصیات اس اسکول کی شناخت ہیں۔ سب سے پہلی بات جو ابھر کر سامنے آتی ہے وہ اس اسکول کی لطافت زبان سے متعلق ہے لیکن یہ لطافت نہایت میں دلی جاتی ہوئی نظر آتی ہے اس لئے کہ نہایت بڑے اور اس کے حسن کی خصوصیات میں جو چیزیں پیش کی جاتی ہیں اور جو روایت، دیکھا کہ اور سامان آ رہا تھا۔ یہ طوہت چیزیں ہر عہدوں کے حسن و جمال سے علیحدہ نہیں تھیں۔ لیکن ان میں تہذیبی وبتان ایک جگہ کا ذریعہ بن جاتی ہے جہاں واقفیت کو کوئی اہم نہیں اور نہ ہی

رومانیت یا پاتی ہے۔ معشوق کو خاتون کی اوصاف سے متصف کر کے اس کی روت اور جذبے کا طبعی محسوس بھی نہیں۔ پھر ایسا بھی ہے کہ تفصیلات کو روئے کار لانے کے لئے کھنکھوٹی شعرا و دہلوان اور سرغزل نگار کہتے ہیں اور اس عمل کو وہ اپنا کمال قرار کرتے ہیں۔

کھنکھوٹی اسکول کے شعرا کا عایت نفی کی طرف خصوصی توجہ کرتے ہیں جس سے زبان میں ایک کھیل کی کیفیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ رہا یہ کہ غلطی کو بھی ایضاً ایک پہچانے کا عمل عام ہے۔ عشق و عاشقی کے سرسٹے میں معاملہ ہندی پر بہت زور صرف کیا جاتا ہے جس میں مطہیت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ تشکیبات و استعارات نزاکت و لطافت نہیں پیدا کرتے بلکہ بیگانہ فحری کے لئے استعمال کیے جاتے ہیں۔ کھنکھوٹی اسکول کا ایک وصف فاشی بھی ہے۔ فاشی جو کہ بھی عنصر فحش ہے ماحرور و پستی بھی ملتی ہے۔

لیکن یہ نکتہ ہر جہہ کہ کھنکھوٹی اسکول کے نام ہیں لیکن اس کا کوئی نہ کوئی نکتہ ادبی اسکول میں بھی ملتا ہے۔ قصور اسکول کی چند اہم خصوصیات شعری کی ذیل میں ملتی ہیں اور انہوں نے بارہ نکات درج کئے ہیں۔

کھنکھوٹی اور ولی کی شاعری میں جنس کا تفاوت ہے۔ کھنکھوٹی شعرا کی محبوبہ لازمی طور سے عورت، نازک سے تعلق رکھتی ہے۔ کھنکھوٹی شعرا مردوں سے متعلق نہ ہوں، ان کے تراکیب کا خاص طور سے ذکر کرتے ہیں۔ ان کے زیورات کی تفصیل بیان کی جاتی ہے، ان کے لباس پر زور دیا جاتا ہے۔ طوائف اور رقص و سرور کی کیفیت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ چند سماج و ہندو اندسم و غیر وہ منہج طور پر سامنے آتے ہیں۔ لفظ پری کا بطور خاص استعمال ہوتا ہے۔ کھنکھوٹی شعرا کو کھنکھوٹی کہنے کا بہت شوق ہے اور کھنکھوٹی شاعری کی ایک اہم خصوصیات غزلوں کے مضمون میں رسول مقبول، گلشن یا امیر کے نوسن سے طلب نجات ہے۔

لیکن "زاد دلی اسکول" اس ایسی تو جیسا کہ پیش کی گئی ہیں جن سے متفق نہ ہو سکتا ہے۔ میں چند دہلی کے دلی کو بھی حصہ ہیں۔ لیکن میں اس بحث کو طول نہیں دینا چاہتا اس لئے کہ بعض عناصر اگر تو اثر سے اٹھتے ہیں تو پھر ان سے وابستہ اسکول ان علی بنیاد پر پہنچانا یا جاسکتا ہے۔

اسد میں ذیل میں چند کھنکھوٹی شعرا اور ان کے حدود خال پیش کر رہا ہوں۔



اٹھارہویں صدی عیسوی کا ادب

اٹھارہویں صدی کا سیاسی بحران

اعمار ہو کر صدی کا ہندوستان اولی لحاظ سے پتہ اہم ہے تاہم سیاسی نقطہ نظر سے بعض مراحل اہم تھیں۔ بے
چس۔ کیا وہ وقت ہے جب مرہٹوں کی طاقت عروج پر ہوئی ہے۔ اور ان کی حکمت عملی مغلیہ سلطنت کی پریشن کا باعث
بھی۔ دراصل مرہٹوں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ مغلیہ سلطنت کو یہ دو برابر کر کے دو مغلوں کی طرح ہندوستان پر قابض ہو
جائیں گے۔ بظاہر یہ ایک خوابہ ظہور ہوتا تھا لیکن ان کی پالیسی و فلاحی اسلحہ کام پانی دہی اور مغلیہ حکمرانوں کے لئے
باعث تشویش بھی رہی۔ یہ ٹکس سڑ ہو کر صدی کے درمیانی حصے میں شروع ہو چکا تھا۔ ہر چند کہ اس کا تعلق دہلی سے تھا
لیکن نشانہ دہلی کی سلطنت۔ ان کے عزائم ہے جہاں تھے اور حرکت و عمل میں تیزی و طراری تھی لیکن مرہٹوں کو یہ احساس تھا
کہ وہ آئندہ ساکنہ مغلیہ فوج سے ٹکرانے کے لئے چاہتے ہیں۔ لیکن انہوں نے چاہتے ہوئے نہ کر سکا۔ ان کے ہاتھ ایک خاص
بازو۔ ان کی علیحدگی پسندی پہلے قابل مرہٹوں اور ایک محدود دہلی لیکن آہستہ آہستہ ان کا دائرہ عمل بڑھ گیا۔ اور گتہ در گتہ
عائشہ کواری صدی تک ایسی بغاوت کا سر اٹھنے کے لئے وہاں میں دینا پڑا۔ مغلیہ سلطنت مرہٹوں کی ہر ہر سرکوبی کرتی رہی لیکن
منتظر کر ائی لیکن ہر شکست کے بعد ان کے عزائم بلند ہوتے اور وہ پھر کیجہ جاتے اور کوئی نہ کوئی ناکامی کھینچ لیتے۔
صوبہ اور شاہستہ خاں نے ۱۶۶۰ء میں انہیں چوڑ سے دہلی لے کر پھینکا لیکن مرہٹہ سردار شیواجی خاموشی سے بغاوت کا کام
کرتے ہوئے ۱۶۸۵ء میں دہلی اور پھر وہاں داخل ہو گیا۔ اس نے انہیں بے خوفی سے شاہستہ خاں کے یہاں حملہ کر دیا اس
کے لئے یہ شاہستہ خاں کے کئی سپاہیوں کے علاوہ اس کی کوئی اور ہتھیاری جہاز نہیں تھی۔ پھر اس نے سورت کی تجارتی بندر

یہاں درج کر رہا ہوں:-

”جن دنوں مانگیر بادشاہ شہر دکن میں معروف تھا، بجگی کی برق اطراف بندہ گرد ہی تھی۔ دہلی اور گرد و نواح کے لوگ حکام کی باہلی اور سستی کے سبب اطاعت و فرمان چاہی رہے۔ سوڑ چکے تھے اور عہد جلالتا بعد و تسلط اور حکومت دہانے کے لئے ایک طوفان بے تیزی رہا کر دکھا تھا۔ تھرا کے گرد و نواح کے اکثر بگے انہوں نے ظلم و ستم سے اٹھ کر راستوں اور گزرگاہوں پر گولے مار کر کے وہ خود سری اور بیباکی کا علم بلند کر رہے تھے۔ شرقا کی عزت و ناموس امیری و بے حرمتی کی دستانوں کا نشانہ ہو رہی تھی۔ بڑے بڑوں کی آمد و است و غوری کی خاک میں مل رہی تھی۔“

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد جہاں سے اور بھی خراب ہوئے گئے اور اب سکھوں نے بھی بغاوت شروع کر دی۔ ہر گز بندہ سکھ نے سکھوں کو غلوں کے خلاف منظم کرنے کا مزمع نہ کیا تھا۔ یہ صورت چنانچہ کے وقت سے ہی شروع ہو چکی تھی لیکن اب وہاں میں سکھوں نے اس کی جڑ تک چڑھ کر دی۔ جاٹ ان کے ساتھ ہو گئے۔ خاندان کے نام سے ان کی کارروائی تیز ہو گئی۔ انہوں نے کچھ نئے قلعے بھی بنوائے تاکہ ان کی سوڑ طریقے پر لڑائی جائے۔ نو ارب بادشاہوں کی ایک حکمت تو یہ ہو چکی تھی۔ یہ حکمت تھی کہ جاٹ اور چانوں کی دکان تو بدراش تھی اور ان کے ساتھ ہو گئے۔ ایک شخص بندہ واری کا ساتھ دیا۔ اس نے سکھوں کو زیادہ منظم طریقے پر لڑنے کے لئے تیار کر دیا۔ اسی سلیطے کی ایک کڑی ۱۰۵ء سے متعلق ہے۔ یہاں انہوں نے سنا کہ چھوٹا اس محلے میں گم از کرم و بد چار مسلمان مارا گئے۔ اب بندہ واری کا پنجاب کو پر سکون رہنے نہیں دینا چاہتا تھا لیکن جون ۱۰۹ء میں ہیرا گئی تو ان کو دیا گیا۔ اس سارے سے سکھ بد دل تو ضرور ہوئے لیکن نوے نہیں اور ادھر ادھر بغاوت کرتے رہے۔ کئی مظاہرہ و جدوجہد ان کی سرکوبی پر مامور ہوئے۔ انہی یہ الزام جاری ہی تھی کہ بدراش نے پنجاب پر غارت کیا۔ درانی کے غلوں سے مظاہرہ و جدوجہد جاری ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی نے ایک طرح سے پنجاب کا کھانا دھوا دھم کر لیا۔ اس صورت حال کا سب سے بڑا فائدہ سکھوں کو ہوا اور وہ پنجاب میں خود مختار ہو گئے تو ایک سو سال تک باہلی غلوں کو نقصان نہ پہنچاتے رہے۔ اس طرح کا اب ان کے دہانے کے آثار نمایاں ہو گئے۔ سکھوں کی جگہ انڈیہ رہنے لگی۔ بدراش کی حالت دیکھ کر سکھوں نے ان کے خلاف سے بے چین تو رہے لیکن کبھی کیا کرتے تھے۔ اب بادشاہ و امرا انہی کے قتل پر مجبور تھے۔ ان کے ساتھ ان کے امراء کی اسی صورت حال تھی۔ اسی صورت حال میں نو ارب چانوں کا نوبہاں اور نو ارب چانوں کا نوبہاں احمد شاہ ابدالی کی طرف سے ہاتھ لگے کہ اب مرہٹوں سے وہی حالت دہانے لگی ہے۔ اسی صورت حال میں نو ارب چانوں کا نوبہاں احمد شاہ ابدالی کی طرف سے ہاتھ لگے کہ بدراش کے بعد ۱۲۰ء میں باہلی بہت بچھ گئے۔ لیکن مرہٹے سرکار نے دلی کے اہل تلاف پر قبضہ کر لیا۔ بادشاہ اب کچھ نہیں کر سکتا

۱۱۱۰ء اورنگ زیب قائل تھا اس نے دیر قتل اور بے شک کو اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ شیواجی حکمت عملی میں دیر تھا۔ اس کی شاہ و دیہی تھی۔ اس نے غلوں سے غارتگری شروع کرنا بہتر سمجھا۔ اس نے یہ کام اس کے حسن دہلی سے انجام دیا کہ اسے انگریزوں میں جوش دے دی گئی اور ۱۶۹۸ء میں شاہجہان آباد میں اسے قتل کر دیا گیا۔ لیکن شیواجی کو ایسے منصب سے ذوق کوئی سرکار تھا نہ وہ اسے اپنی کوئی عزت سمجھتا تھا۔ اچھے اچھے اس نے اپنی بدولت جاری رکھی اور جون ۱۲۷۳ء میں ایشیا بھارتیہ نشینی کی رسم ادا کی۔ اس سے صغر کے تو ہوتے ہی رہے لیکن اپنے مشن میں وہ پارے طور پر اس وقت کامیاب نہ ہوا۔ دوسروں کو اس نے اپنا جاکس نہیں مقرر کیا خصوصاً اس کے بیٹے سنبھا نے باپ کا طعنہ لیا کر لیا۔ ۱۶۸۰ء کے آس پاس اورنگ زیب نے ایک بار پھر مرہٹوں کو شکست دی لیکن اس کے بعد واران کے جو محلے بہت نہیں ہوئے۔ جب ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو اس وقت مرہٹے کو روڑہ چکے تھے لیکن اس وقت انہوں نے تھے کہ اپنے آپ کو سمجھتے تھے اب اورنگ زیب بھی نہیں تھا تو ان کی موصول افواہی ایک طرح سے طاقت سے نہ رہی۔ وہ مختلف جگہوں پر چھپے ہوئے تھے لیکن خبر متحرک نہیں تھی۔ ایک بار پھر شمالی کے خواب نے ان کو تھیرا اور بہادر شاہ اول کے زمانے میں غلوں کے کئی علاقوں میں فصد سنا۔ ان پر پھانچا اور اورنگ زیب آباد میں شدہ چھوٹوں کا آغاز کر دیا۔ اس طرح ان کے قبضہ کئے ہوئے علاقوں میں مسلسل توسیع ہوتے گئے۔ مرہٹوں نے مختلف وقتوں میں مالوہ، بڑی میل کھنڈ پر اپنی حکومت کا آغاز کر لیا۔ محمد شاہ و بعد گزشتہ ۱۲۰ء سے ہوا اور اس نے بے خوشی و غارتگی کے پیر و کردئے۔ اس سے ان کا حوصلہ اور بھی بڑھا۔ وہ تو دہلی پر قبضہ کرنا چاہتے تھے لیکن آہستہ آہستہ وہ مختلف علاقوں میں گھس گئے اور ان کے بادشاہ شہزادہ کو ایسے ہی مرحلے میں اپریل ۱۷۰۷ء میں مرہٹوں نے انہیں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ دہلی اور پٹنہ بھی ان کے قبضے میں آ گئے۔ ۱۷۱۰ء میں مرہٹوں کی ایک بڑی اہم جنگ غلوں سے پانی پت کے میدان میں ہوئی اور ان کی شکست ہو گئی لیکن مرزا نجف خان (انگل ۱۷۱۰ء) کے بعد شاہ عالم کے زمانے میں ہی ان کا قبضہ دہلی پر ہو گیا اور یہ ۱۸۰۳ء تک یہاں تکرا رہا۔ مرہٹوں نے ان کی مدد سے اپنا خواب پورا کر لیا۔ اب جاٹ بھی سرانجام دے گئے۔ ایک دہشت گرد کو ان کی رہنمائی میں انہوں نے پہلے ہی بدولت شروع کر دی تھی۔ اورنگ زیب اس وقت زندہ تھا اور اس نے انہیں شکست بھی دی تھی۔ لیکن ان کی بغاوت بہت شدید تھی۔ اورنگ زیب مرہٹوں کی سرکوبی میں مصروف تھا تو انہوں نے دکن مانج کی رہنمائی میں علم بدولت بلند کر دیا۔ غلوں کا قاب پے دھند ہوا تھا۔

اب ان کی بہت اتنی بڑھ چکی تھی کہ وہ مظاہرہ و جدوجہد کو کوئی ٹھیکہ دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ جاٹوں کے کسی ایک رہنما کی سرکوبی کر دینا تو کوئی دوسرا کھڑا ہو جاتا۔ اورنگ زیب بھی اپنی توجہ میں کم تیار ہو چکے تھے۔ انہیں اپنی طرف سے ہاتھ لگنے والے تھے۔ صورت حال ایسا پیچیدہ ہو گئی کہ سلطنت مظاہرہ و جدوجہد پر توجہ دے نہ سکتا تھا۔ جاٹوں کی بہت بڑھتی چلی گئی انہوں نے ان کے کارروائی بھی بند کر دیا۔ راج رام ۱۷۱۸ء میں مارا گیا تو انہیں ہلکا سا لگا۔ اسی صورت حال کا ایک

دوسرے روز انہوں نے اس کا نام رکھا کہ اب اس کا نام رکھا جائے گا اور وہ اپنے ماہوار مشاہیر و اہل قلم

معاشرتی کا یہ عالم تھا کہ اب ان نوابوں کی عورتوں کی تھوڑی بڑی گولی جاتی ہے جیسے
شاہی اسٹیشن میں کھڑیاں لگی جاتی ہیں۔ مثلاً شکار خانہ کے حرم میں سائیکس کو سے زیادہ
عورتیں تھیں جن میں سے دو بڑا بڑا عرصہ اور اسی بچہات تھیں۔ اور یہ کہنے کی ضرورت تھی
تھیں کمال میں سے نکاح صرف جاری سے ممکن تھا۔ نہ جانے اتنی عورتوں کا یہ کیا کرتے تھے؟
واضح رہے کہ شہر کی مہلکین ان سائیکس کو پرستار تھیں۔ وہ بے غی ایک سرور کسانہ مہر جہا
میں لکھتے ہیں: "مستورہ سوجلیہ والیاں۔ تاوردہ نرمانہ شہرہ طاقت بھری بی بی میں عاق ملازم تھیں۔ ہارہ
سو چست و چالاک، چپا ک، لہجہ سوتیلی میں، یکسا، جان دلیری، صراپا بازار الہ کے علاوہ ہزاروں
نہریاں جہان کی حوالیاں، ہاں سہار شک مہر، کسین، جن کے انگ کے دن، پر لی و حاضرت۔"

لیکن اسی دوران اردو شاعری نے نئے سونے کے کنوئیں کھلے۔ تفصیل تو آگے آئے گی لیکن یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ اس
عظیم زمین میں ایسا مگولی کی روایت سامنے آئی۔ پھر اس سے انحراف کی صورتیں پیدا ہوئیں۔ زلی کی شاعری کی طرف کی
سلطنت کے ساتھ نمونہ پر ہوئی۔ پھر کئی اہم شعرا پیدا ہوئے، جن پر الگ الگ کہیں تفصیل کہیں اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی
جاری ہے۔



تقریباً سوا سو سالوں کے بعد دنیا جانتے تھے لیکن پانی بہت میں اس کی شکست ہوئی۔ شاہ ولی اللہ عارضی طور پر کامیاب
ہو گئے لیکن یہ صورت دیکھ کر انہیں رنج۔ جنوری ۱۶ء میں احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم دہلی کی تخت نشینی کو قبول کرنے سے روکے
اسے مضبوط کرنے کی کوشش کی لیکن بادشاہ کی غیر حاضری کے سبب اس کے بیٹے جوالہ بخت کو جاس تھیں مقرر کیا۔ ۱۷۰۷ء
میں شاہ عالم تخت پر بیٹھا تو لیکن سکون کیاں۔ دلی پر تو مرہٹے چڑھ آئے تھے ۱۷۰۸ء میں انھوں
سے محرم کر دیا اب ایک عہد شاہ ولی کی تخت پر جھٹکن تھا۔

یہ ہے وہ مختصر مدتی مغل سلطنت کے زوال کا پس منظر قائم کرتا ہے۔ اس زوال کے ارد گردی بہت سے پہلو ہیں
جن پر بحث کی جا سکتی ہے لیکن یہاں اس کی ضرورت نہیں۔ ایسی صورت میں شعر و ادب بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔
دلی جب لڑی تو اردو کے نئے مراکز میں اس کے شعرا بے گھر ہوئے گئے۔ اس کی تفصیل آگے کے صفحات میں شاعروں
کے ذکر کے ساتھ پیش کی جائے گی۔ سواد، میر، عالم، فقیر اکبر آبادی نے "شیراز شوب" لکھ کر اپنے دل کا بخار نکالا اور اس
دور کے اشتہار کی سوشل تصویر کشی کی۔ اب جو مراکز تھے وہ فیض آباد، کھنور، نرخ آباد اور عظیم آباد تھے۔ میر اور سجاد کھنور
لیکن انہوں نے اپنی شاعرانہ وضع میں تبدیلی نہیں کی۔ انسا، جرات اور تھیں کھنور قندہ بیب میں رہ چکے تھے۔ جہاں "سجاد
علی شاہ کے فیض سے مراد ہیں اور طوائفیں مرکزی حیثیت رکھتی تھیں۔ عیاشی تھیں العین تھا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سیم اختر
لکھتے ہیں:-

"نصیر الدین حیدر کے باورچی کے متعلق مشہور تھا کہ وہ بادام کے جاول تراشتا اور پستے کی
دال تیار کرتا تھا پھر ان سے اس قدر تھیں بچھڑی پکاتا کہ جو دیکھنے میں ماش کی تھوڑی معلوم
ہوتی تھی لیکن کھانے میں اس کا ذائقہ ہی کچھ اور ہوتا تھا۔ جس کا زبان مدتوں بھلا رہتا تھا۔
اسی صورت سے واجد علی شاہ کا رکاب دار بھی کھانوں کی دیکھتے تھیں کر رہے میں ایسا کمال
رکھتا تھا کہ مرے کو کھانے تو درہم بھر دیتا تو مرے کو کھانے تو غیر جی کا لطف آتا اور فیضی
کھاتے تو پلاؤ کی لذت آتی تھی۔ بعض دوسرے رکاب داروں نے بھی کھانوں اور مخصوص
چاہوں کی تیاری میں عرب حسب مصلحتیں دکھائی تھیں۔ مثلاً کسی نے پلاؤ کو کو دھب کے چاہوں
سے تیار کر کے تاب کو جو دیرات سے مشابہ دیا۔ کسی نے آدھا چاول اور جوئی اور تھنہ کو
سفید بنا کر انار دارا بناد کر دیا۔..... چھانچاں الدولہ کے عہد میں کھانے کے اسرار خواں پر چھ
مختلفہ جتنوں سے کھانا آتا تھا۔ ان میں سب سے مخصوص باورچی خانہ مرزا حسن رضا خان کے
ماقت تھا جس میں دو ہزار روپے روزانہ کی پختہ ہوتی تھی۔ دوسرا چھوٹا باورچی خانہ جواول
مرزا حسن علی کے تحت تھا اور پھر بڑی خان کی گرامنی میں آگیا تھا اس پر تین سو روپے روزانہ

کے عید و بچہ منظور شاعر باشند و قریب حرکت دے۔

گویا پھر نے واضح کیا ہے کہ ایہام دو قسمیں ہیں جس سے شعر کے بنیادی الفاظ یا الفاظ سے روایتی برآہ ہوتے ہیں ایک قریب اور دوسرا بعید، لیکن شاعری مراد سنی عید سے ہوتی ہے۔ ہندی میں بھی اس کی صورت ملتی ہے جہاں اس کو شلیش کہتے ہیں۔ مظهر اعلیٰ لکھتے ہیں:-

”جہاں ایک شہد سے قوت قناری کے ذریعہ دو یا دو سے زیادہ معنی ظاہر ہوں وہاں شلیش کی صنعت ہوتی ہے۔ اس کے دو خاص بچہ ہیں (۱) تفسیل ایہام (۲) معنوی ایہام۔“

موسول نے یہ امور ”مجملہ انکار پر دہی“ مختلف ڈاکٹر مستعار چند سے لفظ کے جڑ اور ریشم سے ایک مثال بھی دی ہے:

جو رحم گئی دہی کے گل کیوت کے سوئی
بارے اجیار و کرنے بارے اندھیر و سوئی
(رحیم)

ایہام کوئی سے متکرت کا کیا ہوتا ہے اس مسئلے میں ڈاکٹر منظور لکھتے ہیں:-

”مگر حسین آزاد کا خیال ہے کہ اردو میں ایہام کو ہندی و عربیوں کی اساس پر فروغ حاصل ہے۔ آزاد کا یہ خیال اس حقیقت پر مبنی ہے کہ متکرت میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی موجود ہیں۔ متکرت میں اس علت کا نام شلیش ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں اول سہلک جس میں لفظ سالم رہتا ہے۔ دوم سہلک جس میں لفظ کے تھوڑے بگڑے کر کے یہ صنعت پیدا کی جاتی ہے۔ مولوی عبدالحق نے آزاد کی تائید کی ہے اور لکھا ہے کہ اردو ایہام پر زیادہ تر ہندی شاعری کا اثر دو اور ہندی شاعر یعنی سنسکرت سے لگتی ہے۔ انہی میں کوئی شک نہیں کہ ایہام کی صنعت فارسی ادب میں بھی موجود ہے۔ تاہم اس زبان میں سنسکرت اور ہندی کے لفظوں کی تعداد اور طرز استعمال سے لگتی ہے اور ہندی شاعر نے ان کا استعمال اس اعتبار سے کیا ہے کہ طبعیت پر گراں نہ گزرتے۔ چنانچہ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ فارسی میں یہ صنعت ہے مگر کم۔ ہندی اور عربی میں لفظ کے پوشیدہ مفہوم کو سامنے کے یا ضمن میں اس کے کور لگانے کا خیال اس سے پہلے اردو میں ایہام

ایہام گوئی کی روایت

اردو میں ایہام گوئی کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ ایہام گوئی ایک تحریک کی صورت میں اثر پذیر ہوئی، جس کے بانیوں میں کہیں مضمون کہیں نائی کا نام لیا جاتا رہا ہے۔ ایسے ایہام گوئی کے علمبرداروں میں کئی دوسرے اہم شعراء بھی ہیں جن کا ذکر تا کر بڑے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ایہام گوئی کیا ہے؟ اگر صرف اسے صنعت کے ذمے میں رکھ کر بات کی جائے تو کہا جائے گا کہ یہ ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں (مجموع میں) انار وھو حسن مسعود حسن رضوی کے حوالے سے لکھتے ہیں:-

”اس کتابوں میں فارسی کی قدیم کتاب رشید وھوہ کی احوال کی آخری و تاقی اشعار جس کی تھیلک کو تفریعاً سوا آٹھ سو برس گزر چکے ہیں۔ اس میں ایہام کے معنی یہ کہان اقلیدہن لکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد شمس الدین رازی کی کتاب ’الجم فی معایر و شعراء الجم‘ ہے۔ بدلی کی بعض دوسری کتابوں مثلاً ’مجمع المصنف‘ ’معارف الکلام الدین‘ اور ’معارف الابدان‘ ’معارف شمس الدین‘ ’تغیر اور ’تغیر الابدان‘ ’معارف و حسب علی انانی میں بھی ایہام کے صرف اصطلاحی معنی دائے گئے ہیں۔ غرضی سن امیری نے ’معارف الحسن‘ میں ایہام کے لغوی معنی بھی دائے ہیں اور وہ ہیں۔ جہاں وہ ہم اندر لکھتے۔“

اسی مفہوم کو دوسرے طریقے سے پھر نے بیان کیا ہے۔ ”نکات اشعار“ میں ہے کہ:-

• نکات اشعار، مرتبہ: ڈاکٹر محمد رفیع، ص ۱۶۳

کی تحریک ہندی اثرات کا نتیجہ ہے اور یہ اس رنگ کی لکھی ایک سلسلہ نظر آتا ہے جو فارسی کے خلاف ملک میں پیدائش پا رہا تھا اور بالاسطاطہ طور پر اردو کے فروغ کا باعث بن رہا تھا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ شاہی ہند میں اردو شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب غلیہ سلطنت کا زوال ہو رہا تھا، اور ملک ذریعہ کے آخری دور میں دکن میں اردو شاعری جس انداز سے ہو رہی تھی وہ دہلی کے شعرا کے علم میں تھی۔ جو ہم چاند پوری نے دلی دکن کے سینے میں لکھا ہے کہ وہ ۱۰۰۰ء میں دہلی آئے۔ ان سے پہلے میر تقی میر دہلی کا بہبودی کاظم موجود تھا۔ کئی دوسرے لوگ بھی تھے مثلاً مرزا عبدالقادر بیدل، مسعودی خان، قزقزاش خاں امید۔ یہ سب کے سب دنیا کی طور پر فارسی کے شاعر تھے لیکن اردو میں بھی شعر کہنے لگے تھے۔ اسی عہد میں سراج الدین علی خاں آرزو نے بھی یہ محسوس کیا تھا کہ فارسی کی جگہ اردو کو اپنا لینا چاہئے یعنی فارسی میں شعر کہنے کے بجائے اردو کو ترجیح دینی چاہئے۔ شاہدہ گلشن نے دلی کو یہ ہدایت دی تھی کہ اردو میں شعر کہیں۔ ظاہر ہے ایسا مشورہ سنوں نے دیا بھی تھا کہ نہیں یہ نیک شاد میں دیر ہے لیکن دلی دکنی کا دیوان دلی تخیل کیا تو حالات یہی بدل گئے۔ محمد شاہ بادشاہ کا عہد ۱۷۰۷ء سے ۱۷۴۸ء ہے۔ جب تک شاہی ہند میں اردو شاعری اچھی عام نہیں ہوئی تھی لیکن محمد شاہی دور میں دکنی زبان میں شعر کہنے کی تحریک زیادہ بڑھ گئی۔ اس طرح ہو کہ دلی کا دیوان محمد شاہ کے دوسرے سال جلوس یعنی ۱۷۰۸ء میں پہلی بار دلی میں طرح مقبول ہوئے اس کا حال سب پر روشن ہے۔ حوالہ یہ ہے کہ میر اور سوا بھی تہہ ہوئے بغیر تہہ ہے۔

دیسے اردو میں ایہام گوئی کی تاریخ محمد شاہ کے ابتدائی دور سے شروع ہوتی ہے اور اس تحریک کا ازہم از کم ۲۵ برس تک رہتا ہے۔ میر تقی میر بھی ایہام کے سلسلے میں آئے اس کے اس طرح رقم کرتے ہیں:-

”ایہام امت کہ در شاعران مفلک این حق درواج داشت و آکوں طبعاً مصروف این صنعت کم است مگر سبیل عقلی بہت شود۔“

دلی میں چھ اہم و بہم گو شاعر کا ذکر کر رہا ہوں۔

شاہ محمد مبارک آبرو

(۱۶۸۶ء — ۱۷۴۳ء)

ان کا اصلی نام شیخ نعم الدین تھا اور عرف نام محمد مبارک آبرو۔ آبرو تھیں تھا۔ گوالیار کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا ایک مونی بزرگ تھے جن کا نام شیخ سعید الدین عرف شاہ محمد غوثہ عطاری تھا۔ انہیں سراج الدین علی خاں آرزو کا رشتہ دار بتایا جاتا ہے اور شاہگر بھی۔ ان کی پیدائش گوالیار میں ۱۶۸۶ء میں ہوئی، جوانی ہی میں دلی آ گئے اور شاہی طرز امت اختیار کی۔ گروہی نے لکھا ہے کہ آبرو ایک زمانے تک سن کے والد کے ساتھ رہ کر دلی میں رہے اور اپنی خدا امت

کا صلہ بھی پاتے رہے۔ گروہی نے یہ بات اپنے تذکرہ ”نور بخش گویاں“ میں لکھی ہے۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جب آبرو نے دنیا داری ترک کر دی اور قائد ہو گئے۔ ان کی ایک آنکھ ناب ہو گئی تھی۔ تذکروں میں ہے کہ ان کے سرطان میں شونی مغلزشت تھی، جس پر کئی عوارض مغلزشت تھی۔ چنانچہ ایک مثنوی ”در مویذہ آبرو فی مثنوی“ تحقیق کی جس میں اس زمانے کے جلائے کار کا لطف لے لے کر بیان کیا گیا ہے۔ مصحفی نے اپنے ”تذکرہ ہندی“ میں یہ اظہار دیا کہ ۵۰ سے ۶۰ کے مگر کے چکے تھے کہ گھوڑے سے لات داری، ضرب کاری لگی اور فوت ہو گئے۔ دلی ہی میں قبرستان سید حسن رسول لہا میں دفن ہوئے۔ سراج الدین علی خاں آرزو کے مطابق ان کی ولادت کی تاریخ ۳۳۳ھ ہے۔

آبرو دنیا کی طور پر بھالیات سے بہرہ ور تھے۔ طبیعت بخش و دلکش طبع تھی۔ لباس میں بھی طرہ دار کی نکاتی تھی۔ ان کی حسن پرستی اتنی نمایاں تھی کہ تذکرہ نگاروں نے ان کا خاص طریقے پر ذکر کیا ہے۔ ذاکر غلام حسین ذوالفقار نے لکھا ہے کہ:-

”انہیں خوبصورت چیزوں سے صحت ہے۔ خوب رویوں کے قدرتی حسن و جمال کے علاوہ اس میں غرض پوشی اور جفا کا بھی شائبہ ہے جس پر آبرو نے پوری ایک مثنوی لکھ کر اس زمانے کی پوشاک، راج، راج اور بائیکین کی تصویر کشی کی ہے۔ باران خوش مذاق کے ٹھٹھ، میلے خیلے، چربی اور موٹی جہوار اس دور کی اچھا مٹی زکوہ کی میں تامل و زیست کے پر لطف مواقع تھے۔ آبرو کو بھی یہ مواقع بڑے عزیز تھے۔ ان کی شاعری میں بسنت اور بولی، عہد اور نوروز ہر طرح کے مولیٰ آویاروں۔ سے طبیعت کا ثبوت ملتا ہے۔“

آبرو کی شاعری ایہام گوئی میں ایک خاص مقام پر رکھتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے یہاں سچے اور پر خلوص جذبات کی کمی نہیں۔ ٹھیک ہے کہ ان کے یہاں کوئی لکھی حکام نہیں لیکن ایک سنگ چان کی شاعری اتنی صحت گری کے ہر جوہر دل کو گھنٹتی ہے۔ آبرو نے ہماری الفاظ خوب استعمال کئے ہیں۔ بلکہ ہندی آداب و رسوم کو بھی اردو میں برتنے کی کوشش کی۔ چند اشعار موصوفے کے طور پر درج کر رہا ہوں:

دل کو غلجی کے کھول سب دیکھا
شوق پالا تمام تھہ لب کا

غزلوں، آبرو کو چاک دل دت سوں نکلا ہے
کھو گیا حال ہے دشت دلوں میں اس دوانے کا

میر نے بھی اس طرح تائید کی ہے۔

”شعر ہر لہری خوبی داندہر دہاں دراپہ خندہی آورو خردی شہرہ مگر گاہے مجھے ہی کر۔“

یعنی قرآنی سے بہت چلے ہے کہ نالی شہرہ ہے۔ چنانچہ ان کے کلام سے بھی ان کے مسلک کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس ضمن میں صرف دو شعر نقل کرتا ہوں۔

شہید عشق ہے نالی مرا دل
کہ یہ نکلا ہے خاکہ کربلا کا

سومہاں کے سرا ہیں دل تسبیح
بھیر سجے ہیں کربلا کی ہیں

فقیر دیکھ صدیقی نے نالی کی شاعری کا جائزہ لینے ہوئے ان کی شاعری کو بیش کوش اور خوش چینی سے تعبیر کیا ہے۔ ان کے یہاں عشق کا تصور بھی بڑا پائے ہے لیکن یہ جسم، جان کا عشق ہے جس میں اخلاقی اقدار پوشیدہ پاتے۔ یہاں یہ بھی واضح کرنا چاہیے کہ اس دور کی ان کے خاص رویہ تھی۔ نالی بھی اس میں جلتا تھے۔ ظاہر ہے اس کا اثر ان کے تصور عشق پر بھی پڑا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

تھیں حسن کا نگار کروں
کہوں مردوں کے چھپے گوروں سے

ایک اور شعر دیکھئے:

نزدیک ان کے نہیں منسوب دہانے کوں عاشق کے
سوارے خاں ہے لڑکا شمع کر لیتا ہے برساتی

لیکن نالی کے یہاں ہندوستانی عناصر کی بھی کافی جگہ ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے ادیبوں کی عکاسی بھی خوب خوب کی ہے۔ اس باب میں سید و جعفر نقوی ہیں۔

”نالی ایک ہاشور اور مہری حیثیت سے ہر دور شاعر تھے۔ اپنے گرد اچلی کے حالات و

دعائے اور بیچ و خم سبھی رکھتے تھے۔ ان کے بعض اشعار میں اپنے دور کے ہندوستانی اشعار،

نکمرانوں کی عالمی اور امرا کی پیش پرستی اور بے حس مسیحاں اشعار اور اخلاقی تفریق کی طرف

دیکھ کر دل میں کمی کی چھان لگے ہیں۔ اے لے برو کی تنہا

ہوس کی خاطر تھارے منہ بھکان اپنا برنہ بنا

تلی ہے جی پرہ کی کاغیس، تلخ تلخ کر گناہیں راتیں

تھارے، جن میں نالی بائیں، اکارت اپنا جسم گنوا

شا کر نالی

(۱۶۹۳ء — ۱۷۴۷ء)

جن لوگوں کے نام پر نام کوئی کے سلسلے میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، ان میں شا کر نالی کی شخصیت نمایاں ہے۔ ان کے حالات زندگی کی تفصیل نہیں ملتی۔ خاندان کے احوال بھی معلوم نہیں ہیں، پھر بھی بعض تذکرہ نگاروں نے جو کچھ لکھا ہے ان کی بنیاد پر چند باتیں کہی جاسکتی ہیں۔

شا کر نام اور نالی کھنڈ تھا۔ اپنی بات طے ہے کہ بچی تذکرہ ہندی، گجتن ہندی، تذکرہ شعرائے مراد اور دوسرے تذکرہوں سے معلوم ہوتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے سید شا کر لکھا ہے مورخہ اسم نے اپنے ”مجموعہ نقرائیں“ میں شا کر روح کیا ہے۔ چند اشعار بھی لکھے ہیں اور نالی کے مدح بنے والے تھے۔ جو انہیں کے اپنے اس شعر سے واضح ہے:

اگر عشاق جو ملنے کے نالی کا غنم میں کر

تو ہوگا شاہ جہاں آئے غریباں میں میرا

نالی کب پیدا ہوئے، اس پر بھی اتفاق نہیں ہے لیکن تذکرہوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی وفات جاتی ہی میں ہوئی تھی۔ مجھے دہلی کے بعد صرف ان کی پیدائش کا اندازہ لگایا جاتا رہا ہے۔ قاضی مہدالود نے نالی کا سن ولادت ۱۶۹۳ء طے کیا ہے اور وفات ۱۷۴۷ء لیکن فقیر دیکھ صدیقی، جنہوں نے دیوان شا کر نالی پر تحقیقی کام کیا ہے، اس تاریخ سے اتفاق نہیں کرتیں۔ نالی کا پیشہ پتہ مگر تھا اور نوب اسیر خاں انجام کے مطلع کے بارے میں تھے۔

شا کر نالی کے چہرے پر چپکے کے داغ تھے یا اطلاع بھی تذکرہ اس سے ملتی ہے۔ حراج اور میرے کے بارے میں جو اطلاع فراہم ہوتی ہیں ان سے چند چہتا ہے کہ دشمن اور طرف تھے خوش طبعی ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ خوش طبعی اور نہ نالی ایک طرف لیکن جھگڑا کوئی اور حراجی کے سبب قدم سے ہر گز نہیں تھے۔ ”حقیقت اشعار“ میں کریم الدین نے ان کے بارے میں اس طرح لکھا ہے:-

”بہت خوش مزاج تھے۔ ہر کسی کی جھگڑا تھا۔ رام چلنے سے لڑتا تھا۔ ہر ایک سے جھگڑتا تھا۔ اس سے

نبات ڈانی مشکل ہو جاتی تھی۔ بجائے نالی کے اگر پائی تھیں کرتا تو میرے نزدیک بہتر تھا۔“

اشعار سے لکھے ہیں۔ ناگہانی نے ایک شعر آشوب بھی لکھا تھا جو مکمل حالت میں دستیاب نہیں ہو سکا ہے لیکن اس کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناگہانی اپنے دور کے خطوط اور اس کی دیگر کتب حالت کو کتنی شدت کے ساتھ محسوس کرتے تھے۔ ناگہانی اپنے دور کی سماجی انتہائی امرا کی بے معنی زندگی و علم و ہنر کی بے قدری اور علاج کے اعلیٰ طبقے کی بے حس کے بارے میں کہتے ہیں:

سوائے گنجلتہ نہیں ان کو تک درس کی بوجھ
عجب قماش ہے اس دور کے امروں کا

بہت غافل ہیں صاحبِ نوبت اور سب بند کے سامنے
انکے نہیں علاقوں سے مگر جس سر پہ آ با ہے

ہیں خوشامد طلب سے اہلِ دول
غور کرتے نہیں بحر کی طرف ۔۔

کاش کہ ناگہانی کے یہاں رکاوٹ اور ایڑھالی اس دور نہ ہوتا:

مجھ سے مگی کے چمکے کب ہو بدوش
تیاست اس سخن کو گدگدائی ہے

مگر نہ ہو کے رات رہا نہیں رقیب پاس
رہنے کی ہے دلیل یہ جار بٹھا ہوا

خائف پاس تن بین ملایا
بہانا اونگی کا بے

نقادوں نے اس کا احساس داغ ہے کہ ناگہانی کے یہاں روانی اور بے ساختگی بھی پائی جاتی ہے۔ حالانکہ ایہام کو شاعر میں کے یہاں صنعت گری پر توجہ دینا اور دینے کا حق ہے۔ روانی کا محب ہو جاتی ہے لیکن ناگہانی کا ایک اچھا خاصہ کام ایہام کو بے عبادت ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مختلف صنعتوں کو خوب خوب برستے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً اور بدائع کا اس طرح استعمال کیا ہے کہ ان کی شاعری میں مریض کا دل نمایاں ہو گئی ہے:

کسے یہ تاب جو اس کی جلی میں رہے ظہر
دور طہر لاتی ہے بچن میری گھر یوی

کیا گرم ہو کے برق سا ہم پر کڑک جی
آخر کو منی گھٹا کے ہمارے بھڑک جی

شراب سرخ ہے اور ست رنجیلے
ہوا جاتا ہے تو کیوں درد پنا لے

ہر طور غزل کے علاوہ ناگہانی کے یہاں دوسری صنعتیں بھی خوب باور پاتی ہیں۔ انہوں نے قصیدے بھی لکھے ہیں اور بے بھی بشر آشوب، اسوحت، قطعات و ریاضیات اور محسن بھی۔ ان کی تفصیل خاصہ کرنی ہوگی "ایمان شاہر ناگہانی" میں۔ انھوں نے نظم صدیقی کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ اس سے پہلے ان کے قصیدے ہی نے اسی سلسلے کی کاوش کی تھی جو مکمل نہیں ہوئی۔

ظہور الدین حاتم

(۱۹۹۹ء - ۱۹۸۳ء)

حاتم مخلص تھا اور دوسری بھی لیکن حاتم کو ترجیح حاصل ہوئی۔ ان کے والد شیخ الفلاح الدین کا آبائی وطن دہلی تھا۔ حاتم ۱۹۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت کا ماہ "اپریل" ہے۔

حاتم کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں تفصیل نہیں ملتی لیکن اندازہ ہے کہ انہوں نے زمانے کے مطابق تعلیم حاصل کی ہوگی۔ پندرہ سال کی تھیں۔ ساتھ ساتھ شاعری سے رغبت خاص تھی۔ ۱۹۷۵ء میں خواب ادارت الملک ایمر جاں کے مدیر جبہ جیتے دیگر امیر نور الدین خان سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۷۵ء میں اس طرح کی ملازمت ترک کر دی اور دہلیس ہو گئے۔ لیکن پہلے داد بخش دینے تھے اور وہی طرح کی زندگی گزارتے رہے تھے جس میں آرام و آسائش کا پہلو جادوی تھا۔ ۱۹۷۶ء میں انہوں نے دوا کی نظمیں لکھیں جن کی خاص اہمیت ہے کہ ایک نظم "پرو" "وصف قیود" ہے اور دوسری نظم میں قیود و مضمون ہے اور نام ہے "وصف قیود"۔ حاتم نے ایک طویل مثنوی "یزم عشرت" بھی تخلیق کی۔ چاند شاہ کی حدیث میں ہے اور اس زمانے کے ممول کی تھوڑی سی بھی کرتی ہے۔ جس میں ناگہانی کی جڑی اڑھت تھی۔

حاتم کی روحانی رہنمائی سے تھی لیکن ان کی صحبت امرالذوق و سائے کا ادب و شاعری سے بھی تھی۔ لیکن طرزِ شاعری کو ایک طرف تو زندگی پیش و عشرت کی تھی دوسری طرف درائشی اور فقیری کی تھی۔ وہ بچوں، فقیران اور رنگہ نقیوں کے لئے ان کے دل میں بڑی مہم تھی۔ مشہور ہے کہ موصوف باول مل کے نیچے پر اکثر حاضر ہوتے۔ اور جب ملازمت سے

سکندر دہلی ہوئے تو مستحقاً آستانہ مرشد سے وابستہ ہو گئے، جہاں انہیں شرفِ عصا کیا گیا۔ (اشع جو کہ شاہِ حاتم سلسلہ فروریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اب ان کا کام عبادت و وظائف تھا۔ گو وہ ان کی زندگی اور مصروفیت میں تقسیم ہوتی ہے۔ ایک نصف وہ ہے جو پیش و محضرت سے عبارت ہے تو دوسرا دور۔ نئی اور فقیری ہے۔)

شاہِ حاتم کی بصعداری کے بارے میں ابھی اتفاق کرتے ہیں۔ اچھے لباس زیب تن کرتے، اصنافِ سحر سے رہتے، دہندہ پہنچے، خیر کلاہ و دستار باندھتے تھے۔ جب شاہِ دہل کا انتقال ہو گیا تو درویش شاہ نسیم کے بچے پر آگئے۔ غرض کہ درویشی اور فقیری ان کی آخری زندگی کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ اس سلسلے میں غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں:-

"یہاں سے شاہِ حاتم کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جو قلندری اور درویشی سے عبارت ہے۔ وقتِ پختہ پختہ شروع تھے۔ صوم و صلوة میں باقاعدگی تھی۔ سکھ سے توبہ نہ کر لی تھی۔ البتہ لباس میں نکاست تھی۔ بہت پاک صاف رہتے، آزادوں کے خلاف اشع نہ پہنتے، دکاؤں و دستار باندھتے اور ایک بار ایک جھڑی اور روٹھی کے آراؤں کا شمار ہے۔ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ شاہِ دہل کی وفات (قریب ۱۷۴۹ء تا ۱۷۵۰ء تا ۱۷۶۳ء تا ۱۷۶۴ء) کے بعد شاہِ حاتم ایک دوسرے درویش شاہِ تسلیم کے بچے (شاہِ دہل راج گھاٹ پر قلعہ معلی کے زیرِ روبر) میں شریف فرما ہو گئے۔ شاہِ حاتم کی رویتِ زندگی کے دور میں بھی امر اور ممان کی تقسیم و تکریم کرتے رہے۔ چنانچہ شاہِ عالمگیر ثانی، دارالملک نوآباد شاہِ جہاں وغیرہ کا ذکر انہوں نے اپنے کلام میں کیا ہے۔ شعر، سخن سے دلچسپی اس دور میں بھی قائم رہی اور درویشانِ محسوس میں شریک ہوتے رہے۔"

اگر شاہِ حاتم کی شاعری پر غور کیا جائے تو احساس ہوگا کہ یہ ایک وقتِ فوری کے بھی شاعر ہیں اور اردو کے بھی اور انہوں نے ریختہ کی غرض، دہ کے دیوان کے دلی چھپنے سے پہلے ہی قہقہہ لگائی تھی۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ محمد شاہی مہد میں ایسا مگوئی بطور خاص ایک حراج کا بھی تھی۔ اکثر شعر اس سے متاثر تھے۔ حاتم نے بھی اثر قبول کیا اور خوب کیا۔ لیکن ایک اہم شاعر کی حیثیت سے ان کا دیوان ۱۷۳۱ء ہی میں مرتب ہو گیا۔ اسے شہرت بھی نصیب ہوئی۔ لیکن حاتم ایسا مگوئی کے دائرے میں زیادہ دن نہیں رہ سکتے تھے۔ جب اس کے خلاف درویش شروع ہوا تو وہ بھی جانب ہوئے اور شعر کہنے کے لئے فطری انداز اختیار کرنے کو مقدم بنانا۔ بچوں کے بعد حاتم نے ۵۵ھ میں "دیوانِ زاوہ" کے نام سے ایک دیوان مرتب کیا۔ یہ نام درویش اور "دیوانِ زاوہ" کا موازنہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ کچھ پرانے اشعار قائم رکھنے کے اور کچھ اشعار درویشی اصلاح کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ "دیوانِ زاوہ" ان کے قہقہہ لگانے کے مقابلے میں مختصر ہو گیا۔ یہ سے انصاف ہے کہ انہوں نے اپنے آئندہ سادہ و سادہ، قصیدہ، شاعرانہ، جموں، آزادوں کی اصلاح کے سلسلے میں اپنا موقف پختہ کیا۔

"دیوانِ زاوہ" کا ایک ٹکڑا غیبی لائبریری میں تھا ہے اور بقول افتخار اس سلسلے کا کاتب آخری مجموعہ ہے۔ اس میں ان کے آخری دنوں کا بھی کلام شامل ہے۔

"دیوانِ زاوہ" کیوں مرتب ہوا ہے اس میں مختلف قسم کی تعلیلات بھی درج کی گئی ہیں۔ یہ کہ وجہ اس کی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ حاتم کا شاعری کلام بھی ایک مغلطے کی شکل میں علی گڑھ لائبریری میں موجود ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ حاتم نے اپنی اپنی جگہوں کی ہے لیکن فارسی کے سلسلے میں مرزا اصحاب ہی ان کے استاد ٹھہرے۔ شاہِ حاتم ایک قہر الکلام شاعر کی حیثیت سے آج بھی مشہور ہیں۔ ان کی شاعری کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اس میں ان کے زمانے کے حالات کسی نہ کسی طرح سے باور کئے ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ حاتم نے ایک لمبی عمر پائی تھی۔ لہذا ان کے عہد کی کیفیت کی تعلیم کے لئے ان کی شاعری ایک عام وسیلہ ہے۔

شاہِ حاتم میں تو غزل کے شاعر ہیں لیکن انہوں نے "شہر آشوب" بھی تصنیف کیا ہے۔ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مزاحیہ دور کے بعض اہم مساجلات کو شاعری کے ذریعے نشان زد کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاہِ حاتم کے پہلے دور کی شاعری ہی کو ایسا مگوئی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ دوسرے دور میں وہی عشقیہ و اراستہ اور صوفیانہ خیالات ہیں جو شاعری کا اور خصوصاً غزل کی محو حراج رہے ہیں۔ لیکن حاتم کی ایسی شاعری شہر اور دہلی ہے جس میں غمِ عالم کی کیفیت جاری رہا ہے۔

شاہِ حاتم باہر سے نجات تو نہیں لیکن انہوں نے اس دہلی میں زبان و جان اور دہلی کے عمارتوں اور دوسرے امور پر اپنا موقف پیش کیا۔ انہوں نے دہلی کی زبان یعنی بھاکھا وغیرہ سے اپنے آپ کو انک کیا، دہلی کے اپنے کلام کا طرزِ امتیاز بنایا۔ غلام حسین ذوالفقار کا یہی کہ ہے کہ:-

"شاہِ حاتم نے ان اصنافِ حاتم کے مطابق "دیوانِ زاوہ" کو ترتیب دیا۔ البتہ مثنوی، غزل اور غزل وغیرہ اشعار دیوانِ مہم کو درجہِ ستور رہے۔ یا حاتم کے ان خیالات سے اس دور کے لسانی تحولات کا پتہ چڑھتا ہے۔ اس سے قبل شاعری میں زبان کا کوئی معیار قائم نہ ہوا تھا۔ اس میں مختلف بولیوں کا مخلوط تھا۔ محمد شاہی دور کے ادبی مذاق نے دہلی کی، بھاکھا، زبان کو معیاری اور فصیح قرار دے کر نامور لوگوں اور نامور نویس لکھنؤ کو متروک قرار دیا۔ (انگر چہ اصلاحِ دیوان کی اس تحریک کی پھیل تھوڑی سی، لیکن امام بخش، امام بخش، کے ہاتھوں ہوئی) اس طرح درویشانِ دہلی کا ایک یاد اور شروع ہوا۔"

بہر طور میں کلام حاتم سے کچھ اشعار نقل کر دیں جن سے ان کے حراج و سیمان کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے جو مثنوی حق پر نہیں ہے، اس کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

تہا کو کہ نہ جانوں کیا سبب ہے
ہے مژ سہیں کہیں مژ طلب ہے

طلب ہے تیری اس کہیں اس سبب سے
 ملاوے گزرا سے پیارے کے لب سے
 فنا سب گزرا گزرا کر ہم پائے
 ہر اک نے چاہ کر تب منہ لگایا
 کہے وقت کہ تہا کو کیوں بٹے ہے
 کہ مجھ بھل ترے پاؤں سے ہے
 تہا کو نے کہا حق سے بھل کر
 برا کر بات ہے من آستیں کر
 آئین لب جان اور جو ہی جلوے
 جہن میں عشق کے تب گل کز دست

ایرا مکا ایک شعر بھی یاد رکھو:

بولی زبان ال ترے باتھ سے کھاتے بیڑا
 کیا فصول پڑھ کے کھاتے تھے تجھے پانی کے بیچ

وحدت الوجود کے متعلق ان کے شععار کا حلقہ ہوں:

کہیں گل ہے کہیں غنیمت کہیں بوٹا
 کہیں درد اور کہیں دریاں ہوا ہے
 کہیں مسجد کہیں بت خانہ ہے رو
 کہیں کفر : کہیں ایمان ہوا ہے
 کہیں خلق : کہیں خلاق عالم
 کہیں خوار : کہیں پیراں ہوا ہے

احصا کے نام یہ ہیں: وہ شائد، کاکل، وزلف، چیس، چشیں، کوش، مارو، چشم، مرکت، ہڑکوں، چینی، خسار، خیال،
 دامن، لب، زندان، زبان، ذوق، چاہ، ترخ، کرکریں، دوست، دُلاؤ، پیکر، نگشتے، پستان، سین، شکر، کمر، حصار، کھوس، سانی،
 باغن، کلف، پاؤں، صفت، انار، جسم، خرام، بکھوئی، نفل، صلو۔

شکوہ قائم ۱۷۸۳ء میں فوت ہو گئے۔ مصطفیٰ نے اپنے تذکرہ "مظہر ثانی" میں سراجی روایات تصدیق کی ہے۔

سال تاریخ از خود رستر
 بکبر این مصرعہ بگو شمع خرد
 کہ کز مصطفیٰ ہے پر سیلات
 تو صد جہت شہاد حاتم مرد

ڈاکٹر ذور نے قطعی حبان کا تذکرہ ۱۲۰۲ھ لکھا ہے۔ اس کی اصلاح فاضل عبداللہ دو نے رسالہ "معاصر"۔
 پندرہویں کی ۱۲۵۱ھ میں کر دی ہے۔

سراج الدین علی خاں آرزو

(۱۶۸۷ء — ۱۷۵۶ء)

سراج الدین علی خاں آرزو ایہام گو شعرا کے نام سمجھے جاتے ہیں۔ اس طرح کے شعر کہتے دے آئے وہ بھی
 تھے، جنہوں اور کثرت بھی۔ ظاہر ہے یہ قید آرزو کے شاعر تھے۔ انہی نہیں بلکہ ان کے شاگردوں کے شاعر بھی مثلاً
 سجاد، بکرو، طاہب، جسٹ، لدوی، وغیرہ آرزو کے شاگرد تھے۔ گوہر ان کے شاگردوں کے شاگرد کی بھی تعداد خاصی رہی ہے۔
 میں نے ذکر کیا ہے کہ میر جی خاں آرزو کے ہی شاگرد تھے۔ لیکن خود میر نے تصدیق چائی اور انکار کرنے سے کام
 لیا ہے۔ اس باب میں میر میرا نے خاں آرزو کے شاگرد اور انکار کرنے والے قطبہ پائی آیت نمونوں سے اس "آرزو" کو سب
 پتہ ڈاکٹر بر ۲۳ دسمبر ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔ اس میں "شکاتہ اشعار" اور "تذکرہ" کے نام سے میر کی تصدیق پائی چ رہی
 والی ہے۔ اس کے علاوہ مولوی میراجی و خلی میرا اور دو، بکرو، رام، منظور آوی، کئی دوسرے لوگوں نے اس کی وضاحت
 کی ہے کہ کس طرح میر نے انتقال کے بعد خاں آرزو کے سلسلے میں بیٹا اور کذاب سے کام لیتے ہوئے انکار کرنے کیا
 ہے۔ یہاں چاہیاد تصدیق دے کہ خاں آرزو شعر و ادب کی ایک برتہ ذی شعیرت تھی۔ یہی نہیں کہ یہاں کوئی کے لئے آیت
 راہ تھیں کی بلکہ ان کی دوسری حد مات بھی اتنی گرفتور ہیں کہ انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

سراج الدین علی خاں کا اصلی نام سرین احمد بن علی تھا نیز خطاب استخوان خان۔ یہ خطاب آقا امام غفر نے
 لکھایا تھا۔ لیکن استاد ایام کا بیڑہ میں۔ کہ اس کی جگہ خان نے لے لی۔ آرزو کے اسلاف کا وطن گوہر تھا۔ لیکن آرزو
 ۱۶۸۷ء میں اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حسام الدین تھا۔ انہوں نے شی آرزو بنی درخشاں اور دھارم

غیب سے نکالی۔ آرزو اپنے والد کو عالمگیر کا منصب دلالتا ہے۔ لیکن "شعر عشق" میں ہے کہ وہ عالمگیر کے شعلے تھے۔ آرزو کا سلسلہ نسب والد کی جانب سے شیخ کمال الدین یعنی شیخ العسکری الدین چراغ دہلی سے وابستہ ہوتا ہے۔ ماں کی طرف سے محمد گوث کی لیاواہی تھی۔

آرزو دسب چودہ سال کے تھے تو شعر کہنے لگے اور میر محمد امجد الدین کی شاگردی میں آئے۔ پھر میر تقی علی حسن ان کے استاد ہوئے۔ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد وہ اور محمد زب کے لشکر کے ساتھ دکن چلے گئے لیکن ابھی نو سینے ہی گزرے تھے کہ وہ ایک آگے اور گوالیار میں قیام کیا۔ بہادر شاہ کی تخت نشینی پر پھر وہ اکبر آباد آئے اور تقریباً پانچ سال سلاطین ہوا الدین سے غلط فہم کی کتابیں پڑھیں۔ فرخ میر کے زمانے میں سرکاری خدمت پر مقرر ہوئے۔ پھر سزول ہوئے۔ لیکن بہادر شاہ کے عہد میں اخبار نویس کی خدمت انجام دینے لگے۔ ۱۱۷۷ھ میں آرزو دہلی آئے وہیں ان کی ملاقات آندرام مخلص سے ہوئی جنہوں نے منصب اور جاگیر کے علاوہ خطاب بھی دلایا۔ ۱۱۷۵ھ میں وہ مستور بیگ کی وفات کے بعد آدھ آگے پھر شیخ الداد کے ملازم ہوئے۔ ان کی تصانیف مختلف جہات کی ہیں مثلاً "دیوان آرزو" "مشکوٰۃ شوق" معروفہ "ہوز و ساز" "مشکوٰۃ جوش و خروش" "مشکوٰۃ مہر و ماہ" "افسانہ عبرت" "نور عالم آب" "سراج اللغات" "خفاہان شرح گلستان سعدی" "شرح سکندر نامہ" "شرح قصائد عرفی" اور "تقدیر میں" "سبب المظلمین" "سراج منیر" "دقائق بلاغت" میں "عید کبریٰ" "قواعد میں" "معیار الافکار" "نزال الغار" "مظاہر میں" "پیام شوق" اور "نقائش آرزو" "تذکرہ میں" "تجلیہ القاسم" "زماں میں" "آداب عشق" "گلزار خیال" اور "آرزو عشق" وغیرہ انہیں تصانیف کی بنیاد پر انہیں شعروادپ میں ایک اور مقام حاصل ہے۔ جملہ جہانیں جکتے ہیں:-

"خانہ ناز و شاعر بھی تھے اور عالم افکار، ماہر لسانیات، محقق اور لغت نویس بھی۔ وہ فارسی، اردو اور سطریت کے علاوہ کئی علاقائی زبانوں مثلاً پنجابی، دری، بھارتی، ہریانوی اور اودھی وغیرہ سے بھی واقف تھے۔ موسیقی، فنِ مرثیہ گوئی اور علمِ عربی میں بھی استادی کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف میں حدودِ نحو ہے۔ فارسی میں لکھے جانے کے باوجود ان تصانیف کا اردو زبان و ادب پر گہرا اثر ہے۔ ان اثر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس دور میں تعلیم یافتہ لوگ فارسی زبان سے اس طرح واقف تھے جس طرح آج کے تعلیم یافتہ انگریزی زبان سے واقف ہیں۔"

صحفی کی روایت ہے کہ انہیں "گل افشرا" کا خطاب حاصل ہوا تھا۔ آرزو رنجو گوئی کی طرف بہت کم رجحان رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تذکرہوں میں اس پر چند اشعار سے زیادہ نہیں ملتے۔ فرخ کو آرزو کا اردو میں کوئی ایسا نسخہ ہے۔ حیدری نے لکھا ہے کہ وہ ان فارسی اور ہندی رکھتے تھے لیکن آرزو کا کوئی ایسا دیوان آج تک نہیں ملا۔ واضح ہو کہ میر جیسے شاعر نے انہیں استاد اور پیر مرشد کہا ہے یہ اور بات ہے کہ انہوں نے اپنے ایسے استاد سے رشتہ توڑ دیا۔

میر کے علاوہ اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کی تحریف و توصیف کی ہے۔ اکثر ملک حسن اختر و فطر از ہیں:-
"تذکرہ نگاروں نے ان کی بے حد تعریف کی ہے۔ میر نے انہیں استاد اور پیر مرشد کے علاوہ ایسا ہر دستہ شاعر اور عالم قرار دیا ہے جس کا کافی ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔ میر حسن کہتے ہیں کہ میر خسرو کے بعد ان جیسا صاحب کمال، پرگو اور خوش گویا نہیں ہوا۔ اور آرزو کے خیال میں خان آرزو کا زبان اردو ہندی و دہلی کا بھٹکا ہے جو کہ اردو و بھٹکا و منطوق پر ہے شورش انہیں مراد شاعر ان ہندوستان اور ملک الشعراء کہتے ہیں۔ ان کا اندکام بڑا ہی نہیں ملا۔ اس لئے ان کی شاعری پر مطلق تبصرہ کرنا ممکن نہیں۔ جو کام تذکرہوں میں ملتا ہے اس میں ابہام گوئی کے معلق رہا ہے شعر نہیں ہیں۔ غالباً تذکرہ نگاروں نے اپنے اشعار نقل کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ اس وقت ابہام گوئی کا روح شمع ہو گیا تھا۔"

واضح ہے کہ آرزو کے گہرا تاثر شعری مجلس یعنی مطاوعہ ہوا کرتا تھا۔ اسی حوالے سے "طبقات الشعراء" میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک مشاعرے میں سوانے ایک غزل پڑھی، اور اصل پر شعر فارسی کا تھا لیکن سوانے اسے اپنے طور پر ترجمہ کیا تھا اور اسے اپنا شعر بنا کر کیا۔ حاجی محمد علی قدسی کی مجلس میں ایک آدمی ایسے بھی تھے جنہوں نے سوار پر مرتے کا لڑھکایا۔ لیکن اس موقع پر آرزو آواز دے کر انہیں ابھارے۔ شعر پڑھا:

شعر سوچا حدیث قدوسی ہے لگو رکھیں چاہئے نکل بہ نکل

میں دلی میں آرزو کے چھ اشعار نقل کر رہا ہوں جن سے ان کے خزانہ شاعری کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے:

ہزار غزلوں میں تو نہ تھا

کیا تم جہانِ ہونے والے کوئی ہوئے

سے غارت بیچ جا کر شمشے تھا توڑے

ناب نہ آئی دلی کے اپنے بچھوئے چھوڑے

حدیثِ عرق میں (وہا) تھوڑے قن سے لگے

موتی نے کان بچھوئے تیرے سخن کے لگے

اپنی نسوں گری کو اب ہم تو بار بیلے

بار مہا پہ کہتا اس دریا پر کی تو

اب خواب میں ہم اس کی صورت کو ہیں ترستے
اے آئندہ ہم کہا بختوں کی یادوں کو

رات بیدارنے کی اھستہ سنی دوتے دوتے
شع نے جان دیا صبح کے ہوتے ہوتے

دارغ چھوٹا لٹس یہ کس کا لیو ہے قافل
ہاتھ بھی دکھ مجھے رہا ترا دھوتے دھوتے

شیخ شرف الدین مضمون

(۱۷۳۵ء-)

شرف الدین نام اور مضمون قلمی اکبر آباد کے قریب قصبہ جان موہم پیدا ہوئے۔ شیخ فرید الدین گنج شکر
کی اولاد میں تھے۔ اس کا ذکر انہوں نے خود کیا ہے:

کردوں گیکوں، ہر شکر ہوں کو مرعہ
کہ دلاؤ دلاؤ ہے بابا فریہ

جان موہم ابتدائی زمانہ گذرہا۔ جب جوان ہوئے تو شاعر چلا آیا آگے۔ بعض مہذّبوں سے پوچھا ہے کہ
مضمون نے دریاے ہیرا کے کنارے زینت المساجد میں سکونت اختیار کی، جب ۳۰ سال کے ہوئے تو دل میں ایک
دوسری فطرت پیدا ہوئی اور ورہائش ہو گئے۔ میر نے انہیں ذکر و پند لکھا ہے لیکن قاسم انہیں سپاہی پند کہتے ہیں۔ میر حسن کے
مطابق محمد الملک نواب امیر خاں کی ملازمت میں بھی رہے ہیں۔ مضمون اپنی شاعری کے سلیسے میں اصلاح مرزا اعظم
جان جاناں اور خان آرزو سے پلٹتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں قول بہت ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ اسی سبب ان کے ہمارے
دانت جھڑکتے تھے۔ بعد ازاں آرزو انہیں مذاق سے شاعر بنادیا کرتے تھے۔

مضمون صوفی مسلک ہونے کی وجہ سے متعدد درود تھے۔ لوگوں سے اخلاقی اور مذکر کجی متاثر کرتے تھے۔ شر
کے شرقات کے یہاں حاضر ہوتے اور کسب فیض کرتے۔ قہر کے پادے میں سے بے کے انہوں نے کیا، مضمون کے یہاں
حاضری دتی۔ ان کی وفات ۱۱۳۵ھ بمطابق ۱۷۳۵ء میں زینت المساجد میں ہوئی۔

ایہاں کو شاعر کی حیثیت سے ان کا بھی ایک خاص اقبال ہے۔ ان کے بیان میں کچھ اشعار تھے۔ یہ بحث طلب
مسئلہ ہے۔ شفیق اور کمال آبادی لکھتے ہیں کہ ان کا خیال سرمدیت پر مشتمل تھا۔ (بحوالہ "پشتان شعرا") لیکن میر نے یہ

میر نے ان کی شاعری کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ ان کے شیخ الخاوا سے واضح ہے کہ وہ شاہی الفاظ اور
کے مشتاق تھے۔ کوہِ حضرت گری اور مضمون آخری کی طرف قاسم قویہ تھی اور الفاظ کو کلاں سے مٹی میں استہلال کر کے پیچیدہ
صورت پیدا کرنے کے کمال نظر کرتے ہیں لیکن مضمون ام شعرانے بھی انہیں کھن کرادوی ہے۔ انہیں ایک سودا بھی چاہا۔
ان کی موت پر سودا نے یہ شعر کہا تھا:

جانیں اٹھ گئیں یادیں غزل کے غریب کچھنے کی

سہیا مضمون دیا ہے دیا سودا سو دیوانہ

مضمون کا کلام سادگی اور بے ساختگی سے خالی نہیں۔ بعضوں نے ان کے کلام کی بے ساختگی اور فطری انداز
کو نکال کر دیا ہے۔ لیکن یہ بات یہ ہے کہ مضمون کے یہاں ایہام کی بھی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ سب پاکی جاتی ہیں۔
انہوں نے رعایت لفظی سے خاص طور سے کام لیا ہے۔ اپنی ایہام کوئی پر مضمون کو نہ دہیں تو انہیں کا شعر ہے:

ہوا ہے چمک میں مضمون میرا شیر

طرح ایہام کی سب سے نکالی

جس عہد میں مضمون شعر کہہ رہے تھے اس عہد کا طراز ہی مضمون آخری کی طرف تھا۔ خیال میں قدرت
بیدار کا تذکرہ کمال سمجھا جاتا تھا۔ مضمون ایک ام ایہام کو شاعر شمیم کے چاہتے ہیں ان کا نام طراز اور طریقہ کار قہار شعری
یاد رکھا جاتی تھی جو ایہام کو شاعر ہی نے تشکیل دی تھی۔ ان کے چند اشعار درج کر رہا ہوں:

ہم نے کیا کیا نہ ترے غم میں اے محبوب کیا

میر ایہاب کیا، گریہ یعقوب کیا

کوئی اس چمن کا دلی میں فریاد نہیں

دل تو حاضر ہے لیکن کہیں دلور نہیں

کیا سچو لیل نے باغ عمارے بمن میں تاشیاں

ایک تو گل ہے ادا اور نشہ ہر ہالیاں

اگر پاؤں تو مضمون کو رکھوں باغ

کروں کیا ہر نہیں گنگا مرے ہاتھ

کرے ہے دار بھی کمال کو نہ جان

ہوا معصوم سے نکلتا یہ حل آج

چاہتی تھی میں آگے جو مرا محبوب جاۓ ہے
کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی نئی ادب جاۓ ہے
انفوسِ یار جھٹ پت پتے ہیں دل کو اٹھا
کئی ساحلوں سے سکھا زلفوں نے جیری لٹکا

مصطفیٰ خاں بکرنگ

مصطفیٰ خاں نام اور بکرنگ تخلص تھا۔ میر حسن نے اپنے تذکرے میں بھی نام لکھا ہے "تذکرہ اکبر" میں
بھی ہے لیکن مصطفیٰ علی خاں کے دیباچہ میں ان زور دیں غلام مصطفیٰ لکھ ہے۔ بکرنگ کا اپنا شعر ہے:

ان کو تم مت بوجھو اوروں کی طرح
مصطفیٰ خاں آشنا بکرنگ ہے

بکرنگ دلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے دو اہل خاں جہاں لودھی تھے اور بادشاہ کی ملازمت کرتے تھے۔
بکرنگ بھی رنگین طبع تھے۔ ملنے جلنے کا ایک خاص انداز تھا۔ انکی سمجھتوں سے گھبراتے نہیں تھے۔ ان کی شاعری کے اسناد
خاں "روز تھے لیکن مرزا فقیر جان جاناں سے بھی اعلانِ فی قہم۔ اس سلسلے میں ان کا پتہ جان دیکھئے:

بکرنگ نے حاش کیا ہے بہت دے
تھیر سا اس جہاں میں کوئی میرزا نہیں

ایہام گوئیوں میں ان کی بھی ایک خاص جگہ ہے۔ ان کی تاریخِ وفات متعین نہیں ہے لیکن "نکات الشعرا" میں
اس کا اظہار ہے کہ ۱۵۵۷ء سے پیشرفت ہو چکے تھے۔

مصطفیٰ خاں بکرنگ صاحبِ دیوان تھے۔ تاہم نے اپنے تذکرے "تخون نکات" میں ان کی ایات کی تعداد
قریب ۵۰۰ بتائی ہے۔

بکرنگ کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ایہام گوئی کی وجہ سے انہیں بھی معتدوں
سے بڑی دلچسپی تھی۔ ان کے یہاں استعارات کا خاص نظام ہے۔ عشق کے مفہام میں انہوں نے قوافی سے استعمال کے
میں لیکن ان کے یہاں عشق جھلکی بھی ہے اور عشقِ مجازی بھی۔ بکرنگ صاحبِ دیوان شاعرِ تنہم کہے جاتے ہیں۔ ان کا
دیوان "اسپر گرنے" دیکھ تھا جس میں ۱۰۰۰ اشعار تھے۔

مضمون آفرینی کے باوجود بکرنگ کے کلام میں وہ مٹی پائی جاتی ہے۔ دیرے عارفے لفظی کے معیار بھی
ان کے ہاں ملتے ہیں۔ انہوں نے ان کی یاد میں کہتے تھے ان کے کام کا جسے ذکر کرتے تھے "بکرنگ" اور "بکرنگ"۔

عشق بکرنگ کی ہوئی ایش
جب سے تیرا وہ دوست دار ہوا
سکتا نہیں ہے ہات کسی کی تو اے جی
تھ کو ترا غرور نہ جانوں کرے گا کیا
ہرنگ شمع دایم تھہر گھٹا میں
جیہ دوتے بھرے ہم انجمن میں
پارسائی اور جہانی کیونکہ ہو
اک جاگہ آگ و پانی کیونکہ ہو
نہ کہو یہ کہ یار جاۓ ہے
دل سے صبر و قرار جاۓ ہے
خیال چشم و ابرو کر کے تیرا
کوئی سبب ہوا کوئی خرابات

ڈاکٹر جمیل جالبی بکرنگ کے بارے میں اپنی رائے اس طرح ظاہر کرتے ہیں:-

"بکرنگ کی زبان صاف ہے۔ محاورے کی رچاوت اس کے کلام میں طراوتی ہے اور
خصوصیت کے ساتھ ظہور کا اور اس میں اپنی برتری ہے۔ اس کے باعث نئے ہی زبان پر
چڑھا جاۓ۔" *

عبدالوہاب بکرو

(۱۷۵۰ء)

یوں تو تذکرہ میں ان کا ذکر ہے لیکن تفصیلات سے عاری ہیں۔ یہاں تک کہ میر نے بھی ان کے سلیب میں کوئی
خاص ملاحظہ فراہم نہیں کیا۔ اس لئے یہ کہنا کہ انہوں نے دو تین یا دو تین جہاں میں دیکھا تھا ان کے کلام کا بھی
ایک اسی نسخہ بھی تک سامنے آیا ہے جو "دیوان جاناں" کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور ہر نسخہ میں ہے۔ اس نسخے سے یہ

اطوار کیم پہنچتی ہے کہ وہ دہلی میں قیام پذیر تھے لیکن ان کا خاص وطن نام تھا۔ وہ اشعار جو ایہام کے ہیں ان کے وطن کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

کہو مجھے ہے وہاں جان جو تم میں طرح سخن

تو نکرو جھوڑ دہلی راہ تب نام کون لے گا

جی ہو وصل ہانی سے صدارت اکبر (جو) تب

ترا نکرو شامی ہے نہیں ہرگز سامنے کا

نکروئی وقت ۱۵۵۷ء کے آس پاس مہین کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں کوئی سند نہیں ملتی۔

ان کے دیوان کے سلسلے میں بھی کوئی امور ابھرتے رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے بہت سے اشعار نظم کر کے طابع کر دئے یا کوئی جواو یا ان طبع جو گیا۔ جمل جالی نے خوب چند ذکا کے حوالے سے لکھا ہے کہ:-

”کی مرتبہ اپنی منتخب قریبات کو جمع کیا (اور ایک مختصر روح بن مرتب کیا) مگر ضائع ہو گیا۔ جب

اس نے دیکھا کہ یہ ہر تقریر کے سوا کچھ نہیں ہے تو اس نے شاعری بند کر دی۔“

لیکن اتفاقاً اندازہ ہوتا ہے کہ آریہ نکرو کے استاد تھے۔ نکرو نے آریہ کا ذکر متعدد اشعار میں کیا ہے۔ جن میں

شعر دیکھیے۔

نکرو من تیرا کے سخن رہتا ہے زاد

اس عاشق کے ہائے زمانے کو ہر لمحے

من آریہ کے مصرعے نکرو ہوا ہے نکلے

اگے ہر نگر کہ کہ لے اپنی زبان سے کیا خوب

ہے فیض آریہ میں میری نظر بلند اپ

کیونکہ نہ ہمارے نکرو بھو گھر کون رسائی

گویا نکرو ایسی یہ چاہتے ہیں کہ ان کے استاد آریہ والے کے شعر کی تحریف اپنی زبان سے کر دیں اور یہ بھی کہ نکرو ہر اصل آریہ کی کے کام کا کار ہوا ہے۔ مگر یہ کہ ان کی نظر میں جو بلندی ہے وہ اصل آریہ کی کا فیض ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نکرو آریہ کے ایک ایسے شاگرد تھے جس کے کام میں استاد کا رنگ چلا جانا مگر پر تھا۔ گویا یہ ایک حد بندی تھی جو خود نکرو نے قائم کر رکھی تھی۔ نتیجے میں ان کے کام کو بڑے وقت میں پذیرا کرنا پڑتا ہے کہ انہیں نہ نکرو آریہ کے اثر سے بے نیاز نہ ہو سکے۔ حالانکہ ان کا یہ خیال ہے کہ ان کے استاد کے کام کو بڑے وقت میں پذیرا کرنا پڑتا ہے کہ انہیں نہ نکرو آریہ کے اثر سے بے نیاز نہ ہو سکے۔ حالانکہ ان کا یہ خیال ہے کہ ان کے استاد کے کام کو بڑے وقت میں پذیرا کرنا پڑتا ہے کہ انہیں نہ نکرو آریہ کے اثر سے بے نیاز نہ ہو سکے۔

کسی دوسرے کام کا کام اتنا ترجیح ہو کر سامنے آئے کہ انفرادی طور پر اس شاعر کا کوئی اثر قائم نہ ہو سکے۔

لیکن یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ ہمدانی نہیں بلکہ دہلی میں نکرو کے لئے ایک تنقید کے قائل شاعر تھے، چنانچہ ان کے کام میں دہلی کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ جانی لکھتے ہیں کہ نکرو، روایت ایہام اور دہلی کی ہمدانی کا شاعر ہے۔ ظاہر ہے اس سے بھی نتیجہ نکلا جاسکتا ہے کہ نکرو کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ ایہام کے شعر اسانی کے آگے بھی خود ہے جس تھے چنانچہ جذبات و احساسات فطری طور پر شعر نہیں بنتے۔ نکرو ہوں! دوسرے ایہام کو شعر ان کا طرز اور انداز بیان ایک دوسرے سے بہت مختلف نہیں۔ بہر حال، نکرو کے ایہام کے رنگ کی نشاندہی کے لئے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دیکھاں آگ میں جل کر ہوئے راتو

جیسی تھ کریم ہو عاشق نے مہدیا

مست آنکھیں کا دیکھ دیکھا

دلی مرا ہو گیا ہے مہدیا

برہم نکرو کے کہوں نہ آیا ہوئے

دے گیا مجھ کوں سرو قد ہوا

مگل دن ہائے ہم میں کہوں روتا

ہم ترا لڑکے نہیں اپنی ہوتا

بیچ چہٹے ہے سرمہ میں جیہاں تیاں

قول میری ہے اسے نکرو غزالی

صدر الدین خاں فائز دہلوی

(۱۶۷۹ء - ۱۷۵۹ء)

صدر الدین خاں، نام اور فاضل تھے۔ نواب تاج دوست خاں کے صاحبزادے تھے اور ان کے والد نواب آریہ ایم خاں عہد شاہجہانی کے ایک اہم امیر تھے۔ چلی مرزا خاں کے بیٹے اور شاہی منصب دار تھے۔ ظاہر ہے وقت کی ایک بڑا کار شخصیت تھی۔ ان کے شاگردان کے اثرات میں عہد کے چلائے جاتے تھے۔ لیکن ان کے آپ کے بعد جو خلیفہ سلطنت کی کیفیت ہوئی، اس سے ظاہر کہ ان کا اثر ان کی خاصا خاصا اثر جو ان کے کہنے میں خاصا خاصا اثر تھا، وہ بھی ایسا نہ تھا کہ

یہاں ممکنات سے بچتے جوان کا شعار اور باقلا۔ جاگیر بھی جو تھی وہ بہت معمولی تھی۔

فانز کی ولادت کب ہوئی اور موت کب؟ اس مسئلے میں تذکرے کا موشی ہیں۔ لیکن ان کی ہی قبروں سے کچھ شاہدوں کی بناء پر ان کی پیدائش کے سال کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ یعنی یہ کہ فائز ۱۷۷۹ء تا ۱۷۸۵ء کے درمیان پیدا ہوئے۔

عبد محمد شاہی کے امیران مرزا خواجہ مصداق الدولہ خاں ووزیران خاں سے فائز ملتے رہے تھے۔ اس طرح شاہی دربار سے تعلق رہا تھا اور انکی صحبتوں کا ان کے خزانچہ پر بھی اثر پڑتا رہا۔ چنانچہ سیر و شکار سے بڑی دلچسپی رہی لیکن مطالعے کا ذوق بھی رہا۔

فائز اپنے وقت کے ذہنی علم پر ادب کی شاد مکتے جاتے ہیں، جن کے مطالعے کی وسعت کا حال روشن ہے۔ وہ دنیا، عشق، فلسفہ، طب، ریاضی، ہیئت، کلام اور معنی و بیان پر ذہنی قدرت رکھتے تھے۔ عربی زبان پر بھی دسترس تھی۔

ان کی تصنیفات پر ایک ٹھکانہ ڈالنے تو اندازہ ہوگا کہ ان کے علم کا دائرہ کتنا وسیع ہے؟ ان کی تصنیفات اہل میں درج کرتا ہوں:-

اعتقاد الصدور، طریق الصدور، صراط الصدور، مبارکات الصدور، التبعہ، الناظرین، انوار الصدور،

اسرار القلوب، ذرا لہر مٹا کر آئے، انفس الوزراء اور شاد الوزراء، نظم الصدور، تحریر الصدور، رسالہ

بالغیۃ، ابدیۃ الصدور، ازجہ الباقین، اختصار الصدور، ارتقاۃ الصدور، ذخیرہ کلیات، ذویان

فارسی، دیوان رشتہ

فائز فارسی کے بھی شاعر تھے اور اردو کے بھی۔ مسعود حسن رضوی نے انکی شاعری کا پہلا صاحب دیوان شاعر بنایا ہے لیکن یہ غلط ہے۔ ان سے پہلے آکر نے انادیلوان مرتب کیا تھا اور اس مسئلے میں غلطی کی تصحیح نہیں ہے۔

یوں تو فائز کے یہاں غزلیں بھی ہیں لیکن ان کے یہاں شہر میں کی تعداد خاصی ہے۔ مسعود حسن ازجہ کا بیان ہے کہ وہ شاعر میں شہرت کم کرتے تھے۔ فائز نے قصائد سے تعلق بہت کم رکھا لیکن اس صنف کے بارے میں جو خیالات پیش کئے ہیں ان کی اپنی اہمیت ہے۔

غزلوں کا اندازہ مثالی اور بے ساختگی سے میر دور ہے۔ روانی ان کے کلام کا ایک حصہ ہے۔ عام طور سے فطری انداز اختیار کرتے ہیں۔ فائز نے اپنے دیوان میں خطبے کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے ان میں یہ بھی ہے کہ وہ ذاتی آواز کو اہم سمجھتے ہیں، نیز یہ کہ تنگدلی ان کا شیوہ نہیں ہے۔ محبت زبان پر ان کی حامل نگاہ ہے۔ صنائع پر ان کا بھی ایسا جگہ پر خوب استعمال کرتے ہیں لیکن ایسے معانی میں بھی دور دراز کی صنف کا رنگ کو اپناتے ہیں۔ قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے شہر بات کے مسئلے میں کچھ اور بھی لکھا ہے جن میں انکی ادب کی ہیں جنہیں محفید کے ذمے میں رکھا جاسکتا ہے۔

کرتے۔ یمن پرستی اور جمالیاتی احساس کا جوہر فراہم کرتے ہیں۔ سید کا شعر لکھتی ہیں:-

"اپنی عمر یوں میں انہوں نے اپنی حسن پرستی اور اپنے جمالیاتی ذوق کے رچاؤ کا تذکرہ کیا ہے۔ فائز کی غزل میں ایک ارضی محبوب اپنی ساری مادی کیفیت کے ساتھ قاری کے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے اور فائز نے اس کی عفو و طرہ بازی، اس کے جمال دل آرا کی عمر گنجی کی اور اس کی ہر کشش خلصیت کی مرقع کشی ہی کو اپنے فن کا مقصد و محور بنالیا ہے۔ عشق بھاری کے گونا گوں تجربات، اس کے عیب و فساد اور زندگی کے سرو و گرم کی پراثر تصویریں فائز کی غزل کو حقیقت پسندی کی خوبیوں سے مستفاد کرتی ہیں۔ خوبصورت تشبیہات و استعارات و کھیل سلاز سے لورستان کی یاد کی جگہ بیت نے فائز کی غزل کو ہر آفریقہ عطا کی ہے۔ انہام سے شعور کی گرج کے باوجود فائز کے کلام میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ محبوب کے خدا حال اور اس کے کہاس کی معروضیت میں ذہنی بولی تصویر بھی غزل مسلسل اور مقامی رنگ کی پے پائی دہی شاعری سے اثر پذیر رہی کے فائز ہیں۔"

فائز کی شہر بات نظم کے اعتبار سے مختصر ہیں لیکن یہ سب کی سب مترنم و بکراں میں ہیں۔ چند شہر بات کے نام

ہیں: چھٹ، انہام، سلا، جوگن، تعریف، چھٹ، اہمیت، بھنگون، تعریف، جہان و غیرہ۔

فائز کا دیوان مخموم نہیں ہے۔ اس میں کل ۳۶ غزلیں ہیں، لیکن ۳۳ غزلیں ایسا ہیں جو دلی کی طرحوں میں تعلق

کی گئی ہیں۔ ظاہر ہے فائز کی نگاہ میں وہی ایک ایک بل اور مثالی شاعر تھے اور اس طرح وہ ان کی غزلوں پر غزلیں کیوں کہتے۔ فائز کا انتقال دہلی میں ۱۸۷۸ء میں ہوا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جب پہلے غرام کرتے ہیں

ہر طرف قفل عام کرتے ہیں

دلی بھاتا ہے سب کا وہ ساجن

دلی فریبی میں اس کو کیا فن ہے

اے سخن وقت جاں گزاری ہے

موسم بیش و افضل باری ہے

قدو اس خوش اور سحر بگن پام

ہے مہتاب کا قفل بازی ہے

سید عبدالولی عزالت

عزالت کے والد سید سعد اللہ تھے اور سید محمد اللہ نام محمد کے صاحبزادے تھے جن کا تعلق راستہ بریلی کے ایک قبیلے سے تھا۔ اتحادی نہیں بلکہ مشہور بزرگ شاہ جہر محمد کے نواسے تھے۔ اس واسطے سے سید عبدالولی عزالت رشد و ہدایت کی وراثت سے نالاں تھے۔ عزالت کی تعلیم و تربیت ان کے والد نے کی تھی۔ محفوظات میں انکس و محرمات میں بھی۔ والد کی تعلیم و تربیت کے بعد سے یہ بھی عمر و فضل کے اعتبار سے اپنے وقت میں بیحد اہم تصور کئے جاتے تھے۔ اردو ہندی پر تو دوسرے تھے ہی موصوفی اور مصوری کے بھی انداز دیتے۔ سرسید صاحب کا بڑا شوق تھا۔ شعر و شاعری ان کے مزاج کا ایک حصہ تھا۔ ان کی کئی تصانیف یا مجموعے جن میں کچھ مصدوم ہو چکے ہیں جیسے "راگ پانا"۔ یہ ایک مثنوی ہے اور اس میں بارہ موشعار ہندوستانی موصوفی کے سلسلے میں ہیں۔ دوسری "سالی نامہ" ہے جو تالیف ہے۔ ایک تعلیف "قطرین کبر جہ" ہے۔ چاقی اور جوان اردو۔ اردو زبان ان میں بہت دور رس مگر نیاں، اکہ، دوسرے، ویرا اور لٹھ، جھولتا وغیرہ ہیں۔ ان کے دوا ان میں ایک ایسا چہرہ بھی ہے ہمارا دیکھیں۔

عزالت کا اسلوب بیان دلکش اور شگفتہ ہے۔ موصوفی سے گہرا تعلق ہونے کے سبب وہ جانتے تھے کہ کلام میں ترقی کس طرح پیدا کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستانی شاعری کے بھی شاعر تھے۔ اس لئے ان کی ترکیبیں انجمنی سلیقہ سے استعمال کرتے تھے۔ ان کے یہاں صنعت ایہام موجود ہے لیکن کلام کا بڑا حصہ اس سے بہت دور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عزالت کا کلام ہموار نہیں۔ کہیں کہیں بہت اعلیٰ قسم کی شاعری ہے تو کہیں بہت ہست۔ لیکن ان باتوں سے ان کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ تعلیم و محراب ان کی اپنی ایک اہمیت ہے۔

محمد محسن فدوی

(۱۲۹۶ء۔)

محمد محسن، فدوی تخلص تھا۔ لیکن گاہے گاہے محسن بھی تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد میر غلام مصطفیٰ صاحب سید مصطفیٰ تھے۔ ان کی پیدائش لاہور میں ہوئی تھی اور فرخ میر کے زمانے میں وہی تھے۔ پیدائش کا سال ۱۲۹۶ھ ۱۸۷۹ء میں کیا گیا۔ بعض تذکرہ نگاروں میں ہے کہ شاکر تہی کے شاگرد تھے لیکن مصطفیٰ انہیں آزاد کا شاگرد دیتے ہیں۔ بہر طور محسن فدوی کا تعلق شرفیہ جہان آباد سے تھا۔ یوں تو خانوادہ عالی طور پر روایتی کا طریقہ خانوادہ میں تو لیکن فدوی نے خاندان سے اختیار کر لی۔ موصوفی اور شاعر سے دلچسپی تھی اور شاعری بڑا اختیار تھی۔

فدوی نے انجمن ادبیہ عرب کیا تھا جس کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو پمپٹل میوزیم کراچی میں محفوظ ہے۔ اس

تذکرہ میں سے چند چٹا ہے کہ محمد محسن فدوی کی طبیعت میں بڑا انکسار تھا۔ شاعرانہ خوبیوں کے سلسلے میں کوئی تعلق کو راہ نہیں دیتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انہیں دنیا کی دکاوی اور فریب سے سخت غریب تھی۔ دولت و ثروت سے بھی ان کا کوئی تعلق نہیں تھا کہ وہ دنیا میں خوش تھے ہر ای طرح کی زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ ہے کہ ان کا محبوب بھی شرافت سے بے مزہ معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ آبرو کے شاگرد تھے اس لئے ایہام کوئی ان کے شعری مزاج کا حصہ تھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اس گل بدن کون ہارے میں لالہ کہا کرد

اس سرو قد کے باز کوں ہلا کہا کرد

آر و نکاح میں اٹک یہ دریا سے کم نہیں

دلیا سے گر جو کم ہو تو تالا کہا کرد

تو اپنے ہاتھ سے اے ہم تن مطلق کو سست کھوتا

نقصیت ہائے ہر آن اس کا ساتھ ہی سوتا

شاہ ولی اللہ اشتیاق

(۱۲۸۸ء۔۱۳۴۷ء۔)

شاہ ولی اللہ اشتیاق اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی میں فرق کرنا چاہیئے۔ "گلشن ہند" میں جو لکھا گیا ہے دو گچھ نہیں ہے۔ شاہ اشتیاق مرزا میرزا علی نقی کے شاگرد تھے۔ میر نے احساس دلایا ہے کہ کبھی کبھی روایت کہتے تھے۔ لیکن ان کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ چارہاں ہند تھے۔ "ہندستان شعرا" اور "گلشن ہند" میں ان کی ایک ایک غزل ملتی ہے۔ ان غزلوں میں بھی ایہام کوئی کے اثرات ہیں۔ ان کی وفات کا سال ۱۳۴۷ء ۱۳۴۷ء بتایا جاتا ہے۔ بقول تہیل چٹائی ۱۲۳-۱۲۴ء میں جب میر تقی میر مراد آباد سے دہلی آئے تھے تو شاہ اشتیاق ہی نے ان کی تعلیم و تربیت کی۔ بہر طور، اس باب میں ڈاکٹر ملک خضر کی تحقیق یہ ہے:-

"نام شاہ ولی اللہ اور گلشن اشتیاق تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں سے تھے اور حضرت شاہ گل تخلص بہ وحدت کے پوتے تھے۔ لطف کہتے ہیں کہ نقل ابراہیم خاں مرحوم سے شاہ میر گل کو ان کا چھ کھارے لیکن راقم دیکھنے کے گوش زد یہ مضمون نہیں ہوا ہے۔ فی الحقیقت سرتبہ علم کا اس عالمی دتا ہے کہ لیاہت بلند تھا۔ یہاں تک کہ "مگرانی" میں "مگر جہ" اور "مگر" کا زبان خلوتی پر آج کے دن تک شاہ ولی اللہ محدث کر کے جاری ہے والد ماجد ہیں جہ..... جس کا نام عالمی مولوی میرزا امیر ہے۔" دراصل لطف کو غلط فہمی ہوئی اور میر مولوی

کریم اللہ دہلوی لکھنؤ کے ایک فاضل تھے۔ لڑکپن سے ہی شاعری میں مہارت حاصل کی۔ اردو اور مولوی عبدالحق صاحب نے لطف کو اس تحقیق پر اداری اور کہا، بعض ایسے لوگوں کا حال بھی دیا ہے جن کی نسبت اردو کی شاعری کا تعلق بھی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کوئی کہہ سکتا ہے کہ شاد ولی اللہ اردو کے شاعر تھے، مگر ان کا تعلق اشتیاق قادیان سے نہیں ایک فاضل بھی تحقیق تیار ہوئی ہے۔ لطف کو کام کے اشتراک سے دھوکا دیا ہے۔ ایک بات انہیں بھی تھی کہ شاد ولی اللہ دہلوی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس کی طرف اشارہ کر دیا۔ شاعرانہ انداز میں ان کو شاد ولی کا بیرو۔ لکھا ہے، یہ نکات اشعار (ص ۱۸) تذکرہ شعراء اردو (ص ۸) حقیقت اشعار (۶۶) تذکرہ عظیمی (ص ۱۸) میں شاد ولی کو ان کا والد لکھا گیا ہے۔ جو درست نہیں ہے۔ شاد ولی اللہ محدث دہلوی ۱۱۷۶ھ میں فوت ہوئے جبکہ نکات اشعار (۱۱۶۵ھ) مخزن نکات (۱۱۶۸ھ) اور تذکرہ رشتہ گو یاں (۱۱۶۶ھ) میں اشتیاق کی وفات کا ذکر ہے۔ تذکرہ رشتہ گو یاں میں تو لکھا ہے کہ چند سال ہوئے فوت ہو گئے ہیں۔ اشتیاق کی حقیقت ۱۱۵۰ھ میں فوت ہو چکے تھے۔ جیسا کہ صبح بخشنی نامی زمانہ اور "مختصر عشق" سے معلوم ہوتا ہے۔ اور عشق یا اگر افسانہ ششدری میں بھی انہیں شاد ولی اللہ اشتیاق نے بھی سال وفات ۱۱۶۱ھ متعین کیا ہے۔ اسی کی تائید میں اقتدا حسن نے ایم اے (اردو) کے لئے لکھے کے مقالے میں ان کا سال وفات ۱۱۶۱ھ لکھا ہے۔ حالانکہ یہ تذکرہ شاد ولی اللہ محدث دہلوی کا سن وفات ہے اور شاد ولی اللہ اشتیاق کا۔ اشتیاق سرحد میں پیدا ہوئے۔ ان کا کسی پیدائش معلوم نہیں ہے لیکن محمد فیروز سندھ ۱۳۳۹ھ میں دہلی آئے تو انہوں نے اشتیاق کے ساتھ جاہلیت میں رہنا شروع کیا۔ اس وقت اشتیاق کی عمر اگر تیس بیس برس ہو تو وہ ۱۱۰۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔

محمد شایق دور کے دوسرے شاعروں کی طرح اشتیاق کے یہاں بھی احمدیہ اشعار ہیں، شراب بھی موضوع بنی۔ ان امور کے لئے تین اشعار ملاحظہ ہوں:

لوگوں کے چہروں کی نگے کہ نگر اس کو چوے

ہر ایک گمراہ ہے جنوں کو دھول کوٹ

دہلاؤ ہو گی گھوڑی صبت آنکھوں کو دتا ہے

بیلا اور بھی پتا لے بھن یہ دور چلتا ہے

آخر ہونے کا ناپا قیامت کے دن پتا
بچہ بات سے چھڑا کے جو دامن بھگ گئے

میر محمد سجاد

میر محمد نام تھا اور سجاد نکلیں کرتے تھے۔ اسلاف آزد ہائی جان کے تھے۔ ہندوستان آئے اور اکبر آباد میں مقیم ہوئے۔ سجاد کے والد میر محمد عظیم تھے، جو مراد آباد کے صاحبزادے تھے۔ سجاد کے دادا بادشاہ کے شہسپا تھے۔ سجاد اکبر آباد ہی میں پیدا ہوئے لیکن "مخزن نکات" میں میر حسن نے شاد ولی کو کسی فاضل کی بنیاد پر لکھ دیا ہے۔ سجاد مضمون کے شاعر تھے۔ انہوں نے ابتدائیں سجاد تھیں، ان کی تین بعد میں اس سے الگ ہو گئے۔ ڈاکٹر مصلح چاہلی نے ان کی وفات کا سال ۱۲۱۳ھ اور ۱۲۶۱ھ کے درمیان لے لیا ہے لیکن "تذکرہ مسرت افروز" میں ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۶ھ کے درمیان کی تاریخ متعین کی گئی ہے۔

میر سجاد خوش لوٹیں بھی تھے۔ شعر تو کہتے ہی تھے، شعر بھی میں بھی عاشق تھے۔ تذکرہ کران سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری بھی استاد کی سے دو چار تک پہنچ چکی تھی۔ میر حسن کا خیال ہے کہ ان کے یہاں زیبا میں درد و اندیشی بھی ہے اور چاشنی بھی، جس سے کام میں فتح پیدا ہو گیا ہے۔ ان کے چند اشعار نقل کر رہا ہوں:

جان و دل سے قبول سب جان

بہر بھی محل میں قری مجھے آتا

اس زمانے کی دلی کا رنگ

دن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

میں طرح کوہ گنگا پہ گزریں گی

بہر کی یہ پہاڑ کی دامن

میں جو اس کی نگہ میں جاؤں

دل کو کچھ مہم ہوا سنا پاتا ہوں

ہے کہ تازہ گوئی کو مرزا مظہر نے رواج دیا۔ "اشعار و تذکیر" میں بطور اول مرزا کا دینی
کی مختلف دینوں اور کمال مرزا کی تکیوید۔ اس حضرت روح دادہ۔"

مولانا محمد حسین آزاد بھی "آب حیات" میں اس طرح رقمطراز ہیں:-

"خان آرزو وہی شخص ہیں جن کے دامن تربیت سے ایسے شائستہ فرزند تربیت پا کر اٹھے جو
زبان اردو کی اصلاح دینے والے کہلائے یعنی مرزا جان جاناں مظہر....."

بہر طور مرزا مظہر جان جاناں کی شخصیات کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) "دیوان فارسی" جس کے بارے میں موصوف کا اچھا بیان ہے "اس سے میں سال قبل ایک عزیز نے فقیر کے
تھوڑے سے اشعار جمع کر کے اس غرض سے پیش کئے تھے کہ فقیر اس کا مقدمہ لکھ دے۔ میں نے چند سطریں لکھ دی تھیں۔
لیکن ان کو مستر خیال نہیں کرتا، کیونکہ وہ مطالب اس عبارت کے ضمن میں آگئے ہیں۔"

یہاں ایک فارسی دیوان کے حوالے سے بات کہی جا سکتی ہے کہ جو عقلی اور جیسے اشعار اردو میں پائے جاتے
ہیں ویسے ہی فارسی دیوان میں۔

(۲) "خط جواہر" مرزا نے مختلف درازین سے ساتھ کے اشعار جمع کئے تھے۔ یہ انتخاب ان کے اپنے پسندیدہ
اشعار کا ہے۔ فارسی شاعروں کے اشعار اس میں درج ہیں۔

(۳) "مکاتیب ستر" (فارسی) اس میں مرزا مظہر کے فارسی خطوط ہیں۔ ان خطوط میں مرزا نے مسلوب و مقسوف کے
مساکین و نکات شریعت و طریقت کو تہذیب و تمدن انداز میں پیش کیا ہے۔

(۴) "اردو کلام" مظہر جان جاناں کا کوئی دیوان موجود نہیں ہے۔ ان کا اردو کلام جو مختلف تذکروں میں ہے
حیدرآزاد قریشی نے یکجا کر دیا ہے۔ ان کے اشعار کی تعداد ۱۶۳ ہے۔

لیکن ان کا طرز و تیار اردو شاعری کو کیا مگوئی سے نہایت ہلا ہے۔ چنانچہ انہوں نے شاعروں کوئی راہ دکھائی
جو بہر حال بھری تھی۔ زبان کی شائستگی اور صفائی پر زور دیا اور ایک طرح سے اپنے شاگردوں کی اور دوسرے شاعروں کی
تربیت کی۔ ایسے میں مصطفیٰ انیس نقاش اہل کتب ہیں تو غلاموں۔

واضح ہو کہ بعض اثرات کے ذریعہ فارسی شاعری کا اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے کمال مرزا کا جس سے فارسی
ترکیب اور حسن بیان کا اثر دیکھا زبان پر بھی چڑھا۔ گویا اردو غزل ایک نئے حراج سے شایہ ہوئی اس کی طرح اردو میں شاعری
شکل پیدا ہوئی۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

بہار نئی گل آئے باغ بلبل بھول کر بیٹھی

دوانوں کو کہو اس وقت کر لیا میں علاج اپنا

مگر چہ الطاف کے بھٹلے یہ دل زار نہ تھا

اس قدر جو رو چھا کا بھی سرحد ہوت تھا

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ مرزا مظہر جان جاناں کی شاعری مثلاً حقیقی کے جذبات سے بھری پڑی ہے۔
مگر احساس کی شدت اپنی ایک پر۔ عشق ہی نے ان کے جذبات میں بھجان پیدا کیا جس بھجان میں جو طرح اور پاکیزگی
ہے۔ چنانچہ نظم کے جذبات کے اظہار میں وہ ایک طرح سے ترشح پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جن
میں ان کی غزلوں کے مختلف تجر کی نشاندہی ہوتی ہے:-

یہ حسرت وہ لگی کیا کیا حسرت سے زعمی کرتے

اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغبان اپنا

جمن کس کس حرو سے آج دیکھ، لمحہ طرف پار

اشارات کر کے دیکھا جس کے دیکھا مسکرا دیکھ

نہیں پایا مرے رات کوں اور فریاد کوں ہاں

بس دیکھ بھری کوں پاندو دیکھا گزرا دیکھا

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے بھٹن سے لیک

جی نکل جاتا ہے جب نکلے جیسا تھی یہ بہار

خدا کے واسطے اس کو نہ ہو

بھی اک شہر میں قفس رہا ہے

وقت ہے یاد کے آنے کا

فکر کر شیخ سے بھانے کی

شاہ آیت اللہ جوہری

(۱۷۱۳ء-)

تجربہ علی مرتضیٰ کے بڑے بھائی حضرت جعفر کی اولاد سے تھے۔ بھائی محمد والد ہیں نقاشی حضرت جعفر سے
ایک بیٹے حضرت عبد اللہ جوہری ہیں جو بھائی ہیں حضرت علی سے ہیں۔ ان کے بھائی سے دہلی کے علی
اور معاذ یہ چھ بیٹے۔ معاذ کی نسل راجہ دودھ سنگھ تھیں لیکن علی کی نسل جاری رہی۔ ترقی اور تپان سے وہاں کے نقاشی

تقریباً نہیں ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یقیناً نے اشعار کہنے میں خاص محنت کی ہے اور کوشش کی ہے کہ وہ معیار سے نیچے نہ آئیں۔ مولانا عبدالحی نے پورے قلم کی ہے کہ اگر وہ جیسے رہتے تو میریوں یا مرزا کی کاغذی فن کے سامنے نہیں جلتا تھا۔ لیکن میرزا انی ضیائی ہے کہ یہ سب کچھ ہے۔ میرزا مرزا اپنی نوعیت کے اہم ترین شعرا میں سے ہیں جن کی مثال آج بھی نہیں ملتی۔

واقعہ جو کہ پورا پیغام کوئی کا تھا اس کے خلاف رد عمل شروع ہو چکا تھا۔ سطر چار چار ہاں تو اس کے رد کرنے والوں میں ایک ستون ہی تھے۔ اسی راستے پر یقیناً بھی چلے۔ چنانچہ ہزاروں خطی کی رد ان کے یہاں نہیں ملتی اور ایک طرح کی ایسی احتیاطی ہے جو تحقیق کو معیار سے آگیا کرتی ہے۔ صحت گری رد ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ یقیناً بھی پیغام کے خلاف جو کچھ شروع ہو چکی تھی اس کے ایک شاعرہ میں تھے۔ ان کی غزلوں کے سلسلے میں جمیل جانی بد نظار ہیں اور کچھ مثالیں بھی دیکھ سکتی ہیں۔

”یقیناً کی غزل میں لطافت و شائستگی کے ساتھ ایک تشکیلی و غیر تشکیلی کا احساس ہوتا ہے۔۔۔ شاعری وصف و حسن محبوبہ تک محدود نہیں ہے بلکہ عشق کے گرجا کو بیان کر رہی ہے۔ یقیناً کی غزل میں شاعری غزل کی طرح اہتمام کے ساتھ ہاتھ کو بیا کر بیان کرنے کی کوشش کا پتہ چلتا ہے۔ الفاظ احساس و خیال کے ساتھ ملا دہم آہنگ ہیں۔ یہاں ایسی بحر می اور زمینیں ملتی ہیں جو نہ صرف منتخب ہیں بلکہ اس سے پہلے ادب میں استعمال نہیں ہوئیں۔ زبان میں قاریت بخشنے کے علاوہ عام بولی چال کی زبان سے اس کا تکرار متعلق قلم ہے۔ مثلاً یقیناً کی یہ غزل دیکھئے:

اگر چہ عشق میں الفت ہے اور جا بھی ہے
ترا برا نہیں یہ فطرت کچھ بھلا بھی ہے
اس اثبات و اذ سے سودا گز نہ جائے کہیں
یہ دل کہو آپ رسید ہے کچھ جلا بھی ہے
یہ کون دھب ہے جہن خاک میں مائے کا
کسو کا دل کہو پاؤں تلے ملا بھی ہے
یہ تازہ ہے کہ اس سے وفا سے یہ پوچھوں
کہ میرے بے مرہ رکھے میں کچھ حرا بھی ہے
یقیناً کا شعر انوں سے گئے یار نے پوچھا
کو تار قندار مجھ سے دیکھ رہا مجھ سے۔۔۔

میر عبدالحی تاباں

(۱۷۵۲ء)

میر نے میر عبدالحی تاباں کے بارے میں لکھا ہے کہ:-

”بہت خوش فکر، خوبصورت، خوش اخلاق، پاکیزہ طینت، عاشق مزاج معشوق تھے۔ اس وقت تک شعرا کے گروہ میں ایسا فطرتی شاعر پروردہ ہم سے میدانِ عشق میں نہیں آیا۔ جب معشوق دنیا کے باتوں سے باخبر رہا، افسوس افسوس!“

ان کے سلسلے میں میر کا یہ شعر بھی ہے:

دارم ہے تاباں طبع احمد کا چھائی پہ میر
ہو نجات اس کو پھر ہم سے بھی تھا آشنا

میر کے یہ تاثرات تاباں کے نہ صرف مزاج کو واضح کرتے ہیں بلکہ ان کی معشوقہ طبعیت کی کیفیت بھی ظاہر کرتے ہیں۔ تاباں دلی ہی کے دہنے والے تھے اور سپردا سے تھے۔ جب بات یہ ہے کہ تذکرہ نگاروں نے ان کے حسن و جمال کا خوب ثبوت ذکر کیا ہے۔ مصطفیٰ کا بیان ہے کہ اس عالم فریب کے حسن و جمال اور حسین قاسم اھما کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے بجا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے حسن و جمال کا ان کی شاعری پر بھی اثر پڑا ہوگا۔

تاباں کی ولادت کا سال یا وفات کا سال قیاض قیہ ہے۔ حویلی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ”انبات اشعرا“ میں انیس مرحوم لکھا گیا ہے یعنی ۱۷۵۲ء میں وہ زندہ نہیں تھے۔ مختلف تذکرہ نگاروں نے ان کا سال وفات مختلف انداز سے لکھا ہے لیکن سب بے دلیل ہے۔ سہو جاں ایک انداز کے مطابق ان کی وفات کی تاریخ ۱۷۴۹ء سے ۱۷۵۲ء کے درمیان سمجھنی کی جاتی ہے۔

تاباں کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ پانچیاں، قطعات، مسودے، مخطوطات، مکتوبات، جلد پنچس، ہفتاد اور قصیدہ، مثنوی، قطعات، جہن ذخیرہ دو دروہیں۔ گویا انہوں نے اکثر صنفوں میں قلم اُڑائی کی ہے۔ زبان کی شاعری کے اُستاد اول حاتم ہیں پھر محمد علی مشتت سے اصلاح لینے گئے۔

اگر تاباں کی شاعری میں الفاظ کے استعمال کی روش کی طرف توجہ کیجئے تو انداز ہوگا کہ انہوں نے فارسی قریب کو اہمیت نہیں دی بلکہ ان کے مقابلے میں اپنے اسلوب کو مقامی زبان سے ہم آہنگ رکھنے کی کوشش کی۔ اس سے ان کے یہاں اردو کا مزاج زیادہ نکھر کر سامنے آیا اور اس میں ایک طرح کی لطافت بھی ہے۔ شاید یہی سب سے کہتا ہوں کہ تاباں کا دیوان

تاریخ ادبیہ اردو (جلد اول)

تاریخ ادبیہ اردو (جلد اول)

تاریخ ادبیہ اردو (جلد اول)

تاریخ ادبیہ اردو (جلد اول)

تاریخ ادبیہ اردو (جلد اول)

تاریخ ادبیہ اردو (جلد اول)

تاریخ ادبیہ اردو (جلد اول)

تاریخ ادبیہ اردو (جلد اول)

تاریخ ادبیہ اردو (جلد اول)

تاریخ ادبیہ اردو (جلد اول)

آئندہ راجہ مخلص

(۱۹۶۹ء-۱۹۷۰ء)

تاریخ ادبیہ اردو (جلد اول)

تاریخ ادبیہ اردو (جلد اول)

تاریخ ادبیہ اردو (جلد اول)

تاریخ ادبیہ اردو (جلد اول)

کرمی کے فضل گل سے دھوم آٹکا ہے باغیں اپنا
تدیک صاحب اپنا ، شفق اپنا ، میراں اپنا
خدا سے تک تو ڈشیریں خبر لے اس چاہے کی
کیا فرما دے تجھے سے سر کو بولہاں اپنا
ہوا کی تھک طرے ہے اور گل نے دھج دکا ہے
انگلے ان چمن سے صلیب اپ آشیان اپنا
بھرا ہے درمندی کا دھواں اس کے داغ اندر
دکھایا جاہتے لاکھ کوں داغ خوں چکاں اپنا
فرزاں کج چچا ہے ترے سرکان و اندر کا
ہے بھی تک دکھا دے یہاں ترسکں کہاں اپنا

میر اشرف علی خاں

(۱۷۷۶ء - ۱۷۷۲ء)

مرزا اشرف علی نام افغان تخلص کرتے تھے۔ شرافت نے ان کے والد کا نام مرزا علی خاں لکھا ہے لیکن "مکملین ہند" میں لطف نے انہیں مرزا علی خاں کنہ سے یاد کیا ہے۔ غالب کی جگہ ہو گا۔ خاں کا وطن دہلی تھا۔ یہ احمد شاہ کے دہلی بھائی تھے اس نے لگا کبے جاتے تھے۔ لیکن بعض پہ بھی کہتے ہیں کہ دہلی اصل تھا۔ یہ احمد شاہ نے انہیں دیا تھا۔

مرزا اشرف علی خاں سب پیر ہوئے ، معلوم نہیں لیکن اندازے کے مطابق ان کا سن پیدائش ۱۷۲۶ء بتایا جاتا ہے۔

ان کے ابا الیون خاندان کا تعلق معلی سے ہو رہا ہے۔ دہلی کا تعلق ان کی تعلیم و تربیت میں متعلقہ ماحول کا بھی اثر رہا ہوگا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اسی ماحول میں ہوئی ہوگی۔ ان کے استادوں کی فہرست میں قراباں خاں امید کا نام آتا ہے۔ لیکن بعض تذکرہ میں یہ بھی ہے کہ انہیں علی خاں ندیم سے ملے۔ مرزا علی لطف کے مطابق یہی صحیح ہے۔ ندیم کی شاگردی کے طے میں خود خاں نے ایک شعر کہا ہے:

ہر چند اب ندیم کا شاگرد ہے نصیب

وہ دن کے بعد دیکھئے استاد ہو دے کا

جس شخص کا رائے شفیق ہے "چندین شعرا" میں اس کی وضاحت کی ہے کہ خاں غازی میں امید سے اصلاح

نفاں احمد شاہ کے صاحب رہے تھے۔ یہ صورت ان کے بچپن سے تھی۔ لیکن جب احمد شاہ ۱۷۷۱ء میں تختہ نصیب ہو گیا تو پھر اس سے قرابت اور بیگمی ہو رہی تھی۔ ہزاری منصب حاصل ہوا۔ داغ ذکر ۱۷۷۵ء میں علاء الملک نے احمد شاہ کو قید کر لیا تھا اور انہیں احمد خان دہلیہ اس کے بعد خاں دہلی بنائے ہوئے تھے۔ اس کا دل خاں نے خود ایک شعر میں بیان کیا ہے۔ پھر وہ مرشد آباد آ گئے ، جہاں ان کے بچے اور بن خاں رہتے تھے۔ لیکن مرشد آباد میں بھی قیام مستقر نہ رہا اور دہلی چلے آئے۔ دہلی بھی اتنا کاغذ کھنٹی تو دیوانہ اب شجاع الدولہ کے یہاں فیس آباد چلے آئے اور ان کے یہاں ملازم ہو گئے۔ لیکن ان سے ان کی تاریخ نویسی اور خاں یہاں سے ہجرت کر کے مرشد آباد رائے کے یہاں حکیم آباد چلے آئے۔ یہ وہ ان کی زندگی کا خوشگوار دور تھا۔ ان کے انتقال کی تاریخ کہیں ۱۷۸۱ء اور کہیں ۱۷۸۲ء عطا پائی جاتی ہے۔ لیکن ان کا ایک لوسا حور ہے جس کے قلم سے ان کی تاریخ و واقعات ۱۷۷۲ء لکھی ہے اور یہی صحیح بھی ہوگی۔ خاں کا انتقال چند ہی میں ہوا۔

نفاں اپنے وقت کے قابل المذاق شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی شخصیت بڑی محبوب رہی تھی۔ جہاں کہیں رہتے تھے وہیں ان کا دل بہا دیتے۔ لطیف گوئی اور ہنس مٹی میں لطف تھے۔ حاضر جہانی میں کمال حاصل تھا۔ ہندوستانی مرشد آباد میں ان کی بڑائی ہوئی۔ ریلو کو بیان یا کمال میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ دراصل خاں مرزا مظہر کی اصلاحی تحریک سے بھی وابستہ تھے۔ بلکہ یہ کام انہوں نے بھی کیا تھی۔ زبان کی اصلاح کے متعلق جس کا بیڑا مقبرہ اٹھائے ہوئے تھے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے انہیں میرا دروہو کے مقابلے میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں یہ سچا ہے۔ ان کا ہر بیان ہے اس میں اپنے اشتعال پسند جن میں سوانا میر کے دوش و دوش رکھتا ہے۔ پس کہیں کہیں ہلک پڑا ہوگی ہے۔ چونکہ خاں مسلمان کرکھتے تھے اس لئے زبان کی شائستگی اور لکھنے کی سادگی کا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ ان کا بیان مختصر ہے۔ جن میں مذہبی تصدیق کے لفظ نہیں لکھتا۔ اور باعیاں ہیں۔ انہوں نے بھی یہی لکھی ہیں۔ چند اشعار دیکھئے

دست سے ہو رہا تھا مرا داغ داغ دل

اس گل کو دیکھتے ہی دہلے داغ داغ دل

ملا ہنکود چہا تے سے وہ اثر کہیں

لہجہ نہ میرے نام کو اے نام نہ کہیں

مرغ ہو اور بیتا ، صبا ہو اور بیتا ہو

ہم جم رہے یہ صحبت دانا ہو اور تو ہو

عالم میں موت کہ شوق نے دجا کیا مجھے

لیکن تجھے تو شیر ذوق کی دیا

کیا ہوا عرش پر کیا
دل میں اس شوق کے توراہ نہ کیا

قائم چاند پوری

(۱۷۲۲ء - ۱۷۹۳ء)

قائم نے خود اپنے نام محمد قیام الدین لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد بحث کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ لہذا مختلف تذکرہ داروں میں اس کے نام مختلف طریقوں سے لئے گئے ہیں۔ دو قابل اعتنائیں۔ مولانا اشیا زلی عرش نے بھی ان کا نام محمد قائم بنایا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے نام پوری صورت میں خود راہِ طبع کرتا ہے تو پھر بحث کی کہاں گنجائش رہ جاتی ہے۔

قائم کا وطن تھا یہ چاند پور، ضلع بکسور تھا لیکن ایک آدمی جس کے گھوڑوں کا نام محمد دوتا یا گیا ہے یہ شاید درست نہیں۔ من وادہ سے بھی تھیں نہیں لیکن بعض شہادتوں کی بنا پر ان کی پیدائش ۲۲-۲۳ء بتائی جاتی ہے۔ "خزن نکات" میں ہے کہ قائم کی ولادت ۱۷۲۲ء یا اس سے بھی ایک دو سال پہلے ہوئی ہو سکتی ہے۔

قائم کے ایک بھائی محمد منعم دہلی میں تھے اس لئے ابتدائی میں قائم دہلی آئے تھے۔ جوانی ہی میں شادی توپ خانے میں ملازم ہو گئے۔ مرہٹوں کے حملے کے بعد یہ بہت دل برداشتہ ہوئے اور ملازمت ترک کر دی۔ ویسے ان کی زندگی میں تنہا ہی گزار آئے رہے۔ انہیں حالات میں امروہ، سنبھل، مراد آباد اور آٹول کا سفر کرتے رہے۔ "تذکرہ شعرا" میں اردو کی تالیف کے وقت بنگال میں رہتے تھے۔ سیولی اور بیلی میں بھی ان کا قیام رہا تھا۔ ۱۷۷۷ء میں خواب محمد باغی کی دولت پر غافل ہو گئے۔ واضح ہو کہ نواب صوف نے سوا اور سوز کو بھی غافل ہونے کی دعوت دی تھی لیکن وہ نہیں آئے۔ جب نواب کی نظر قائم پر پڑی۔ غافلہ میں ان کی فکر اور اپنے ہاں مقرر ہوئی۔ اسی وقت مصحفی سے بھی ان کی ملاقات ہوئی جس کے "تذکرہ ہندی" میں اس کا ذکر اس طرح ملتا ہے۔

"واحد کہ یاد آں محبت گزشتہ و آں ناگاہی برول و دردی گز اوں۔"

سکر دلی کے جنگ سے بعد ہڑے کا سکون بھی نعم ہوا۔ چنانچہ اس اعتبار کے سلسلے میں قائم نے ایک "شیر آشرب" تصنیف کیا۔ پھر ۱۷۷۷ء میں یا اس کے آس پاس دو کتبہ آ گئے۔ اس کے بعد ۱۷۸۷ء میں خواب امیر بادشاہ نے انہیں داموہر علیا راجپور میں ان کا وقت اچھا گزارا اور ان کی ملاقات وہاں درباب کمال سے ہوئی اور خوران کی ذات مرکز قوج بن گئی۔

بعضوں کا خیال ہے کہ میرا سوا اگر نہ ہوتے تو قائم اپنے دور کے سب سے بڑے شاعر ہوتے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ قائم نے تو میر جیسے اور ذمہ دار ہاں ان دونوں کی ذہانت ان کے یہاں موجود ہے۔ لہذا حرمہ صدیقی لکھتے ہیں کہ:-

رفتہ رفتہ ان کی طبیعت پر غم و رنج کی کارنگ چڑھنا گیا۔ انہوں نے اپنے تذکرے میں بڑی روداداری اور حقیقی قراڑن کا ثبوت دیا ہے۔ "غزلے" میں جب مصحفی نے انہیں دیکھا تو اوجھڑ کر مریں رہا۔ یہاں شیعہ اختیار کر چکے تھے۔ چنانچہ مصحفی لکھتے ہیں:

"تقریر آواز و ایمان مونی بیلایاں درون کشی۔۔۔"

مصحفی نے ان کی ادب کے ذریعہ تمام کلیات قائم دو جلدوں میں مرتب ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ پہلی جلد میں ۷۷ غزلیات ہیں۔ دوسری جلد دیگر اصنافِ سخن پر مشتمل ہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

رباعیات: ۱۰۰ قطعاً: ۲۶ بخشات: ۷ مسمعات: ۲۰ ترجیع بند: ۱ قصائد:
۱۳ مشعرات: ۲۶ (۱۱ کلیات ۱۵ نظم شعریات اور ۳ طویل مشعرات) سلام: ۱۰ مسموعاتی: ۱۰
کلام فارسی (۳۳ غزلیات، چند رباعیات و قطعات اور ایک مسماع)

اسی تفصیل سے قائم کی قادر الکافی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگرچہ ان کی طبیعت کے جوہر شعری اور غزل کے میدان میں پوری طرح کھلے لیکن دیگر اصناف میں بھی ان کے کام کی سطح اس معیار سے ہرگز فرار نہیں ہے جو سوا اور میر جیسے اساتذہ کی قائم کر چکے تھے۔ ان کے قصائد میں سے صرف دو قصیدے لغت و صنعت میں ہیں۔ ایک قصیدہ مرزا سوا کی مدح میں ہے باقی اس قصیدہ کے مجموعہ و ماحول ہوتا ہے جو مختلف ادب و ادب سے کمرہ دار اور پرست رہے۔ ان کے قصیدوں کے موضوع اور اسلوب میں تو بے شک انہیں اشتباہیں ملتی ہیں۔ اس کی بنا نسبت کی وجہ سے ان کی تشبیہوں میں ضمن و جاویدت پائی نہیں رہی۔ لیکن زور بیان و محتات و جزالت اور رنگ و آفرین میں ان کے حساب سے معاصر شعرا میں سب پر برتری رکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قائم اپنی انفرادی طبع کے لحاظ سے منفی قصیدہ کے مراد میدان نہ تھے۔ انہوں نے دینی شوق اور فطرت سے قصیدے نہیں لکھے۔ میر کی طرح انہیں حالات روزگار نے قصیدہ گوئی پر مجبور کیا۔ قائم کے یہاں رباعیات، قطعے کی تعداد اور ان کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہے اور ان کا لفظی معیار بھی خاصا بلند ہے لیکن ان میں کوئی امتیازی شان نہیں۔ قطعاً تمام شخصی (حالیہ اندیشہ یا تاریخی) ہیں۔ رباعیات بھی نصف سے زیادہ شخصیات سے متعلق ہیں۔

نقل اس کے میں ان کی شاعری کے سلسلے میں حرج و مرج لگتے ہیں۔ اس سے پہلے میں ایک نظر "خزن نکات" پر ڈالنا چاہتا ہوں۔ واضح ہے کہ یہ تذکرہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں شعرا تین طبقوں میں تقسیم کر دیے گئے ہیں۔ شعرا نے

حکومت، بخور ان سوسپٹن اور شعرائے متاخرین۔ پھر ان سب شعرا کے ذہل میں ہر طبقے کی کیفیت قہر کی گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ قیوں دور اپنے نقوش کے ساتھ واضح ہو جاتے ہیں۔

قائم نے چونکہ متعدد صنفِ فن میں اپنا جوہر دکھایا ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند ملحوظات امور پر بھی لکھے جائیں جن کا تعلق ان کی صنف سے ہے۔ ان کی غزل میں شاعرِ قائم کی غزلوں کا مزاج رکھتی ہیں لیکن انہوں نے اس کے امکانات میں رہمت پیدا کی ہے۔ قائم جس طرح زمانے کے متاع ہوئے تھے ان کے احسانات میر جیسے دوتے تھے، یہ رنگ نہیں کہیں پایا جاتا ہے۔ نقادوں نے اس کی طرف بھی اشارے کئے ہیں کہ قائم کے یہاں پہلا مصرع تو بڑا چٹکا ہوا ہے ہے لیکن دوسرے مصرعے عام طور پر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ قائم کے یہاں کتنے ہی ایسے اشعار ہیں جو اردو شاعری کے تحت سے صنفِ اشعار میں آتے ہیں۔ یہ ارباب ہے کہ وہ انہی غزلیں کہنے کے باوجود میر اور ان کی دور کی حیثیت دیکھیں پچھتے۔ قائم کے دیوان میں ۱۳ قصیدے ہیں جس سے ان کی قہار الکافی کا پتہ چلتا ہے لیکن اس باب میں ان کا مقابلہ سورا سے نہیں کیا جاسکتا۔

نکلیات میں ۱۵۰ غزلیات ہیں ایک "شیرِ آشوب" اور دوسرا "ارکھِ قاضی"۔ گویا قائم کی یہ شاعری سے بھی دلچسپی رہی تھی لیکن ان کے جھوکوں میں طراز کا فقدان ہے۔ ان کی ایک ڈکو "رازِ گوشتِ مرہ" بڑی اہم ہے۔ قائم کی طویل مثنویاں بھی قابلِ ملاحظہ ہیں۔ "قصہ شہ" "موسم" "ہجرتِ افرا"۔ ایک اور مثنوی قصہ شاد اور موسم پر "عشق در دلش" بہت قابلِ ملاحظہ ہے۔ عشق در دلش اس سے متاثر ہو کر راجِ عقیم آبادی نے "اچا رشتی" تقلید کی۔ بہر حال مثنویوں میں ان کا ایک خاص رنگ ہے جو قلیل لفظ ہے۔ ان کی رباعیاں اور قطعات بھی اہم سمجھے جاتے ہیں۔ بہر حال ان کے شاعرانہ حرائج کی تقسیم کے لئے چند اشعار درج ہیں ان میں ان کی کرداروں:

نہ جانے کون سی ساعت چہلے سے پھرے تھے
کہ آگھ پھر کے ہ پھر سوئے گلستاں دیکھا
نہ کر ضرور تو منہم کہ ایک گردش میں
تغیر کا سا پہلو ہے تاج شادی کا
کشتِ نعلِ موج سے کرنا کوئی مقدور ہے جس کا
میں اور میری رضا پیادے جدھر چاہے اور لے جا
ہاتھی کا اپنی سبب اس شہر سے بچو

قائم اس بارغ میں بلی تو بہت ہیں لیکن
دل کھلے تالے سے جس کے وہ ہم آواز نہیں
ورور دل کچھ کہا نہیں جاتا
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا
تسست تو دیکھ لوٹی ہے جا کر کہاں کند
"چار ہاتھ جب کہ لب ہام رہ گیا
غیر اس کے کہ خوب دایکے اور
علم دل کا کوئی علاج نہیں
قائم اور قہ سے طلب ہو سے کی کیوں کر مانوں
یوں وہ جہاں ہے پر اتنا بھی نہ آموز نہیں
اس بہن میں دیکھتے کہیں کر ہر سو اسے شیم
ہے حرائجِ کیمت گل شرب اور ہم سے دماغ

شیخ محمد علی حزیں

(۱۷۶۶ء۔)

شیخ محمد علی حزیں کی وفات کی تاریخ ۱۷۶۶ء بتائی جاتی ہے۔ وہ ۱۷۵۵-۱۷۳۳ء میں ہندوستان و اردو میں پیدا ہوئے۔ ان کی ایک کتاب "تذکرۃ الرجال" کی راجو سے بے حد اہم سمجھی جاتی ہے۔ سب سے پہلے تو اس کتاب کے بارے میں حاکم لاہوری نے "مردم وید" سے ذاکر سید مراد اللہ نے مرتب کر کے "اور پھیل کاٹا" منکروں میں شائع کروایا ہے۔ حاکم لاہوری اس کتاب پر دوسرے سے بے حد بدگمان نظر آتے ہیں۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ اس کتاب کو لکھنے کی غرض ہی یہی ہے کہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کی خدمت کی جائے۔ کہا جاتا ہے کہ لاہوری بعد کے حجاز شخص تھے اور عاصیہ وجہ کے بکھر میں بٹاتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ انہوں نے اس زمانے کے بعد اہم فارسی داس مرزا الدینی خاص طور کی فارسی دلی کا بیچ کرنا شروع کیا اور ان کی فارسی پر مشورہ اعتراضات کئے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ بعض ہندوستانیوں نے خان آرزو کو ایک اہم فارسی داس کے طور پر پیش کیا تھا کہ وہ فارسی کے کسی امر میں بھی سند دے سکتے ہیں۔ یہ بات غرض کی یاد رکھیں گے کہ لاہوری اور پھر وہ آرزو کے جیسے نہ گئے۔ فارسی سے اسے حالات میں تنازعہ

زور پکڑتی تھی اور دو سال تک تازہ کی افلاک ٹھہری رہے خوش آوازوں نے ”سچوہ الفاطلین“ نام کی ایک کتاب لکھی جس میں مہموف نے وہ خط نظر پیش کیا کہ ایران کی ترکی قورن کی ترکی سے مختلف ہے ترکی میں کشکان اور قران کی زبان ہے قورن نہیں ہے۔ عربی اور ترکی یہاں تک کہ انہی کے الفاظ کا استعمال قورن زبان میں ہوتا رہا ہے۔ خان آندو نے یہاں تک لکھ دیا کہ ہندی الفاظ کا استعمال قورن میں منع نہیں سمجھتے۔ مستند قاری وہی ہے جو ربارشای اور زبان امارا میں بولی جاتی ہے اپنی شعرا کی خواہش کو اہم قرار نہیں دیتے۔ غیر زبان کے کتاب کی ابتدا میں ہندوستانی عربی پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ان بصیرت مندوں نے ”دار فخر“ میں بھی تبصرہ کیا ہے اور ”مطمون خاکس“ میں بھی۔

”تہذیب الفاطلین“ میں شیخ علی حزیں کے بہت سے اشعار کی غلطیاں سامنے آئیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ حزیں کا حکام بھی مستحق نہیں۔ حزیں پر اس کا رد عمل کیا ہوا اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس سے کئی ہجرت سراج سامنے آئے۔

سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ یہ امر واضح ہوا کہ ہندوستانیوں پر قادی کا عرب کم ہوا اور وہ کاغذ پر جو حوالہ جو لوگ پہنچتے تھے کہ اردو میں لکھنا ایک سلی بات ہے ایسا تصور کا اہم ٹھہرا۔ اب ہندوستانیوں کے ذہن میں یہ بات صاف ہو گئی کہ اردو میں بھی کس قدر کام انجام دے سکتے ہیں۔ آندو نے اردو کے حوالے سے فارسی کی صرف سند کو کافی نہیں جانتا بلکہ دونوں زبان کے اشتکاط اور ادغام سے جو صورت ابھرتی تھی اسے قادی قبول نہیں اپنی اردو شعر و ادب کے لئے یہ تازہ عہد اہم و بہت ہوا۔ اسے ہم اردو شاعری کے لئے اپنی زبان کے سلیے ایک اہم تاریخی موز بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہم نام شیری لکھتے ہیں۔

”علی حزیں اور خاں آندو کی اس تاریخی آواز پر کتنی ہی نکتہ چاہی ہندوستانی دانشوروں کو بولی بار چاری طرح یقین ہو گیا کہ وہ قادی میں کتنی حکیم دست گاہی کیوں نہ رکھتے ہوں، ایرانی اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ چنانچہ ایرانیوں کے قورن اور احساس پر ترکی سے نہایت حاصل کرنے کے لئے ہندوستانی شعور نے قورن کی جگہ اردو کو چالنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس تاریخی اقدام کی طرف لے جانے والی شخصیت خاں آندو نے رفتہ رفتہ جو ان شعرا کو اردو شاعری کی طرف راہل کرنے کی سعی شروع کر دی اور یہ شاعر آہستہ آہستہ ان کے فیض و تربیت سے کام لیں ہوئے گئے۔ خان آندو کے انہی ماحول اور اردو شاعری کے اولین دور میں بہت محدود خاں چاہت ہوا۔ آج اس عہد کے اشاعرے کا انہی طرح دعا و دعا کرنا مشکل ہے مگر انہار ہوساں ہندی کی۔ لی میں قادی شعرا، افلاک اور فطانت کے تذکرہ میں نظر ڈالی جائے تو ان کے اردو میں خاں آندو کی عقلی عظمت کی شاندار تصویر ہمیں نظر آئے گی۔ لیکن یہ خاں کا نام نہ تھا کہ انہوں نے ہندوستانی زبان کی اشاعت میں واضح اولیٰ کردار ادا کیا۔“

زلی، ولی اور سراج

یہ امر بالکل درست ہے کہ غلی ہند میں ولی سے پہلے ایسے شعرا کی تعداد کثیر تھی جو قادی سے رغبت رکھتے تھے۔ اس عہد تک کہ اردو زبان ہندوستانی اپنی عظمت کے ہار جو اردو میں منزل پر تھی، لیکن دکن کی صورت حال قطعی مختلف تھی۔ وہاں عراق و میاں کے قادیان سے لوگ اپنی اپنی سے جڑے ہوئے تھے اور ان کی روایات میں ان کی عادات کی بولیاں زیادہ اہمیت رکھتی تھیں۔ فارسی سے ان کا تعلق دینی تھا۔ شاید انہیں اس امر کا احساس بھی تھا کہ اس ضمن میں دو تعلقانہ طور پر کوئی موز کام نہیں کر سکتے۔ اس سکتے کی وضاحت کے لئے بہت زیادہ تفصیلی مباحثہ میں جانا ضروری نہیں معلوم ہوتا لیکن یہ احساس کہ قادی سے ان کا رشتہ بے حد کمزور ہے، یہ لوگوں کو اس کی طرف راغب بھی کرتا رہا، لیکن اب تک اس کے لئے قضا ہوا نہیں تھی۔ جنوبی ہند میں کچھ شعر قادی کی طرف دیکھ کر رکھتے تھے، لیکن ہندو کی اسی کتاب میں اپنی جگہ پر ہو چکا ہے۔ خصوصاً صرفی، شای، مومئی، خواص وغیرہ اور حسن شوقی ایسے شعرا ہیں جن کے یہاں قادی کی طرف بہت کا اعزاز ہوتا ہے اور قادی میں تتبع کے طور پر غزل کی خدا بھی پڑا ہوا ہے۔ ولی تھی۔ کہا جاسکتا ہے کہ ان میں رجحان کی کچھ نہ تھی۔ تو قادی ہی کو بعض شعر قادی کے مستحقین کو اپنے طور پر برتنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاید کاشن کی یقین اور ولی پورن کی روایات کی تفصیل سے آتی ہے۔ ولی نے شعری روایات کی دوبارہ زالی۔ اس طرح کہ وہ اردو کے پہلے قابلِ تلامذہ شاعرین کو تعلق دینی سے تازہ نگار قادی روایات کا حامل ٹھہرا۔ تفصیلی مباحثہ کا موضوع ہے۔

قول میں کوشش کروں گا کہ ولی، سراج، جعفر زلی اور دیگر اہم شعرا کی مخصوص اہمیت کے تحت ان پر تفصیلی انداز سے روشنی ڈالوں۔

جعفر زلی

(۱۱۵۳ء — ۱۲۱۷ء)

جعفر زلی کے حالات زندگی غیر متماہی میں ہیں۔ بعض تذکرات میں ان کا کچھ ذکر ہے مگر اس اتنا کہ ہرل کو تھے، اور تار و زار، فخر مجوسہ و دکان و دھڑ پست اور شوخ مزاج۔ لیکن "مجموعہ نثر" میں ان کا بیان نازولی غای کیا ہے اور یہ بھی کہ وہ سید تھے۔ خاندانی حالات سے کسی کو کوئی واقفیت نہیں، سوال و لا رہے بھی معلوم نہیں۔ لیکن جمیل جالبی نے اپنی تاریخ میں یہ اطلاع یکم پہنچائی ہے کہ وہ شاہجہاں کے آخری دور میں جوائے تھے۔ لیکن یہ بھی ان کا قیاس ہے۔ محمود شیرانی نے "مہاجب" میں اردو "میں یہ اطلاع یکم پہنچائی ہے کہ اگر تک۔ زلیب کی تخت نشینی اور میر جعفر کی ولادت ایک ہی سال کے واقعے ہیں اور یہ کہ جعفر کے والد کا نام سید عباس تھا، جن کا پیشہ کارکاری تھا، ان کے چچا کا نام میر سرد تھا اور متعدد ان کے چھوٹے بھائی کا نام تھا۔ لیکن رشید حسن خاں کہتے ہیں کہ یہ قیام نام نہیں مولفہ زعفری کی گہ ہیں۔ اس نے سارے خیالات کو لے لے ہیں۔ شیرانی صاحب نے بھی اس کتاب کو غیر معتبر بتایا ہے۔

رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ میر جعفر جعفر تھا۔ یہ بات قطعی ہے، تاہم اس مرتلے سے معلوم ہوتی ہے جس کا وہ ہیں ہے "رقعہ سید اہل کہ از نازولی فرستادہ"۔

موصوف نے جالبی کے اس خیالی کا بھی رد کیا ہے کہ دھڑلے میر نہیں تھے۔ لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ جعفر سید تھے۔ بکرم کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "میر دہرا از سادات نازولی"۔ میر میر حسن کے تذکرے کے حوالے سے میر جعفر لکھتے ہیں کہ "جعفر نے کئی جگہ خود کو میر جعفر لکھا ہے۔ ان کی وضاحت ہے کہ کلیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شہزادہ کام بخش کی فوج میں ملازم تھے اور ان کے معرکوں میں شامل رہے تھے۔ جن صاحب نے کلیات کے حصہ لکھ کر چارنگوں کا سوال بھی دیا ہے، جو کام بخش کے سلسلے کی ہیں۔ دراصل جعفر نے کام بخش کی نمائندگی کرنا چاہی تھی جس کی پاداش میں وہ ملازمت سے الگ کر دیے گئے۔ حریف وہاں کا اظہار کرتے ہیں کہ جعفر کو خود اس بات کی چھٹی تھی کہ اس نے کام بخش کی جو نگہی اور ساتھ ساتھ وہ شعراء بھی تصنیف کیے:

از لفظ ہے معنی خود ، از لاف ، یعنی خود

مقامی از ہر شک و تر ، کہ جعفر اب کہیں نئی

ہزار و قصہ ہزار ، سر ، لکھ (مرد)

انکوں کجا آں ہزار ، کہ جعفر اب کہیں نئی

نیچے میں جعفر وہ دور ہے اور پھر وہی آئے۔ اس کے بعد میں مستقل قیام ہو گیا۔ پھر وہ شہزادہ محمد اعظم کی

زلی نام کا جزو تھا یا خود جعفر کا اختیار کر دیا ہے یہاں اس سے بھٹ نہیں، بالبت ای نسبت سے اپنے نام ان کا نام "زلی" نامہ "رکھا ہے۔ اس نے خود ہی لکھا ہے:

جعفر ، شکر کن کہ در عالم

جا بجا نام تو زلی شد

شہرت مر مر بجز از ہر قسم

ہر کہ گنام زلیست ، لئی شد

جعفر نے لکھا تھا کہ یہ تھا:

سند ز ہر گندم ، مٹھ و مر

بادشاہ تہہ کش فرخ ہر

اس سلسلے میں نفل بادشاہ فرخ میرا قاری نام ہوا کہ جعفر کو نفل کروادیا۔ ایک قیاس کے مطابق یہ ساخنہ ۱۱۶۵ء میں عمل میں آیا۔ کو با زلی کا انتقال ۱۲۱۷ء میں ہوا۔ خواجہ عبداللہ نے عشرت کے "آپ" میں یہ اطلاع یکم پہنچائی تھی کہ:-

"دل سے جب آئے تو فیض آبار میں رہے۔ پھر لکھنؤ آصف الدولہ کے عہد میں چلے آئے اور وہیں انتقال کیا۔"

اس بیان پر رشید حسن خاں کی کثرت ملاحظہ ہوا:-

"آپ نے ملاحظہ فرمایا، خواجہ صاحب عبدالفرخ میر کے متحول کو عبداللہ آصف الدولہ میں لکھنؤ

میں سمجھنے لائے ہیں۔ یہ تو ذکر نہ معلوم کتنی بے سرو پا رواں کاروں کا خون ہے۔ چونکہ خواجہ صاحب

نے اس کا التزام کیا ہے کہ حوالہ نہیں دے دیا جائے اس لئے وہ اس قسم کی بے سرو پا باتیں

بیا سانی لکھتے چلے گئے ہیں۔"

بہر حال اکام جعفری اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور اس کے مطالعے سے بہت سی غلطیاں جو رواج پائی ہیں ان کا اثر اب بھی ہوتا ہے۔ بان میں ایک پیلو ہے کہ وہی میں جب دل کو دیوان آفا خالی بند میں قول کوئی کا آغاز ہوا۔ دراصل جعفر کا زمانہ اردو کی تاریخ کا ایک ہی ہے۔ رشید حسن خاں نے اپنی کثرت کی باتیں کہیں ہیں، جو میں نہیں نے الفاظ میں درج کر رہا ہوں:-

"یہاں ڈرامی دور کے لئے رک کر ایک اور پہلو پر بھی نظر ڈال لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

بہت سے لوگ تنگ نیچے کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ وہی میں جب ولی کا دیوان آفا تو شمالی ہند

(پراچی) میں غزل گوئی کا آغاز ہوا (پہلا لکھنؤ میں غزل گوئی کو فروغ حاصل ہوا) اس

طرح، روحانہ نمایاں ذہنوں میں جلوہ جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ دہلی میں اردو شاعری کا اصل سرمایہ غزل ہی رہی ہے۔ جعفر کا زمانہ وہی ہے جو دہلی کا ہے۔ جعفر کا کیا متوجہ ہے، اس میں ایک بھی غزل نہیں۔ یہ بات بھی اسی سلسلے کی ہے کہ جعفر کا قتل (بقول مشہور) ۱۱۳۵ھ میں ہوا اور دہلی کا دہلیوں ان مصلحتی کی روایت کے مطابق سن ۱۱۳۵ھ میں جعفر شہنشاہ (۱۱۳۳ھ) میں دہلی آیا تھا یعنی جعفر کے قتل کے کم و بیش سات برس بعد۔ اور جعفر اپنا دہلیوں اس سے برسوں پہلے قتل ہونے کے نام سے مرتب کر چکا تھا اس طرح یہ بات مسلم ہو جاتی ہے کہ دہلی میں اردو شاعری کی روایت کی بنیاد رکھنے والوں میں جعفر کو مقدم زمانی کا شرف حاصل ہے۔

گویا یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شمال میں اردو شاعری کا آغاز ساتویں صدی سے ہوتا ہے اور اس کا سہرا جعفر زلی کو بھی جاتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ اس باب میں غزلی کو شخصی اہمیت دی گئی، و درست نہیں، اس لئے کہ جعفر زلی نے غزلیں نہیں کہیں، بلکہ نظم ہی اس کی حقیقت کا جو برہنہ ہے۔

چونکہ جعفر زلی خود اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ کسب پٹی میں گزارا، باہر ہر صورت وقت کی تکفیل میں گزار دیا، ایسے میں رد عمل کے طور پر اس کی ہزلیہ شاعری کا وجود ہوا۔

محسوس ہوتا ہے کہ وہ اور جگہ زیب کے اردو فر کے تمام دمعاناب سے بلائی واقف تھا اور اس ضمن میں ہمدردی بھی رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کے بیان کی داخلی است بہت کھینچی تھی۔ لہذا وہ کئے انداز میں ان کی خدمت سے اپنے آپ کو روک نہ سکا۔ یہ بھی واضح ہے جگہ اور نگہ زیب ایک عرصے تک حکومت کی ضرورت کے تحت دکن میں قیام پذیر رہا، مگر مصورت میں شمالی ہند کا نظام (حکومت) سے نہیں ہو پایا۔ یہ صورت بھی دہلی کے یہاں افکار میں ڈھل گئی۔ جہاں جہاں اس نے ادارت و سرکاری کا مسلک اڑایا ہے وہاں اس زمانے کے نااہل و بھروسہ اور سرداروں کا الپ ہے۔ یہاں بات ہے کہ بیان اور اسلوب میاں لایا، جس سے سختی خوب پر یہ انداز و لگاؤ جاسکتا ہے کہ وہ تفسیر طبع کے طور پر یہ سب کچھ کرتا رہا۔

دہلی کے یہاں قلم کلام کی موجودگی اور بھی انہوں کو اس کے علاوہ صرف آزاد ہونے کی طرف راجع کرتی ہے، لیکن یہ درست نہیں ہے۔ بقول رشید حسن خاں یہ جعفر کی "کل کا نکاح" نہیں ہے۔ دراصل ایسے کلام میں بھی بھل و شام طرازی نہیں ہے بلکہ وہ اسوہ بھی ہیں جو اس زمانے کے امر اور ادب و علم و عقیدہ کی داخلی کو واضح کرتے ہیں۔ جعفر کے چار حاتم انداز سے بہت ساری غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں۔ لیکن یہ انداز واصل اس جہد ہی رد و ازل کا اشارہ ہے جس نے اس زمانے کا مقدر ہو چکا تھا۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ جعفر زلی کے یہاں تو کلی اور ترک دنیا کے بھی احساسات پائے جاتے ہیں۔ دراصل اس کا یہی شعر بھی وہ عالمی ہی ہے جو اس زمانے کے حالات کا فطری نتیجہ ہے۔ جعفر کا حسن دل ایسے پرانے حالات سے بے حد متحرک رہا۔ نتیجے میں جو ٹکٹاٹکے سامنے آئیں وہ اس کے مدخل کھانا کھانے کرتی ہیں۔ رشید حسن خاں نے جعفر پر جعفر زلی کے سلسلے میں یہ رائے قائم کی:

"جعفر کی شاعری اور شخصیت کی دو چیزیں خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعری حقیقت نگاری کے واسطے ہے اس کی شاعری نے شیر آشوب کے لئے زمین ہموار کی، اسکے بھائی القاسم نے اس کے بے ناگ انداز بیان نے شاعرانہ آرائش پسندی کے کشور کو جاری نہیں ہونے دیا اس اعتبار سے اس کو شاعر مبالغہ کیا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

دوسری بات جس کی اہمیت کچھ کم نہیں، یہ ہے کہ وہ مدخل کا سپلا شاعر تھا، جو بے جھجک اظہار رائے اور سچ نوائی کی بنا پر محتفل ہوا۔ اس بنا پر وہ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اور اور سے زمانے کے بعض ایسے مہیند انقلاب پسند شاعروں سے برتر نظر آئے گا جن کو ہر سیاسی موسم اس آتا ہے۔ ایک سچ جعفر شاعر جس نے شہر وقت کا نام لے کر اپنے مدخل و مدخل کا بے محابا اظہار کیا اسے کوئی خوف تشکیک، میوزک بیانی سے باز نہیں رکھ سکتا۔ ایسے شاعروں کی تاریخی اہمیت کا اعتراف نہ کرنا کم نظری کا اعلان کرنا ہے۔"

جعفر زلی کے شعری کارنامے بھی قابلِ ملاحظہ ہیں۔ اس زمانے کی شعری تنقید کے لئے اس کی طرف رجوع کرنا ضروری امر ہے۔ نمایاں جعفر زلی میں تمام چیزیں جمع کر دی گئی ہیں، اس کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں رشید حسن خاں کا مرتب کردہ "دہلی کی شاعری" جعفر زلی جعفر کے سلسلے میں بہت سے اقتباسات کو درج کرتا ہے۔ چنانچہ بات تو یہ ہے کہ جعفر زلی کے کارناموں کی تنقید کے لئے اس کی طرف توجہ کرنا لازمی ہے۔

میر حال اقامت مباحث کا مغزیہ ہے کہ جعفر اپنے زمانے کا ایک دیر اور مغز شاعر تھا اور غزل نگار بھی، جس نے بڑا کام چھوڑا، لیکن بار بار یاد رکھنا۔

دہلی دہلی

(۱۹۴۰ء)

دہلی دہلی (میر جانی) اردو کے پہلے شاعر نہیں ہیں۔ اب تک اردو نے کئی گروہ ل اور محبت کا ایک بڑا ذخیرہ اپنا ہمارے سامنے ہے۔ لہذا یہ بات تسلیم کرنی چاہئے کہ اردو دہلی دہلی تک تین سو سال سے لڑ رہی تھی۔

عجب بات ہے کہ دلی انکی کے نام کے بارے میں بھی بڑا اختلاف رہا ہے۔ مختلف تذکرہ نگاروں میں کہیں دلی اللہ کہیں شاہ دلی اللہ کہیں محمد دلی کہیں دلی محمد اور کہیں میاں دلی محمد لکھا جاتا ہے۔ لیکن اکی کے عہد سے قریب کھنے والوں نے ان کا نام دلی محمد ہی لکھا ہے۔ خصوصاً ”نگارستانِ غزل“ میں دلی محمد نام ہے۔ ”دلی خان دلی“ میں شاہد نے ان کا نام دلی محمد لکھا ہے۔ دلی کے مزہ ترین دوست سید عبداللہ علی بقول جیل جانی، جنہوں نے سترہ سو سو دلی میں دلی کا سفر کیا تو ان کے لڑکے سید محمد تقی نے یہی نام لکھا ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ نکالنا چاسکتا ہے کہ ان کا حقیقی نام دلی محمد تھا۔

ان کے دلی کے حلقے میں بھی خاصی بحث ہوتی ہے۔ لیکن بحث کا معاملہ بھی سمجھا گیا نہیں ہے کہ اسے کوئی واضح رخ نہ دیا جاسکے۔ دراصل بعض لوگ دلی کو گجراتی بھی کہتے ہیں لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ اس لئے دلی کو گجراتی نہیں آدورفت اور تعلقات کے باعث ایک ہی شخص۔ لہذا اگر دلی کا وطن گجرات نہ بھی ہو تو وہاں سے ان کا حلقہ رہا ہوگا۔ دلی نے خود اپنے آپ کو گلی اخبار میں ”دلی کا دلی لکھا ہے۔ ایک شعر قزاق زبان تو خاص و عام ہے:

دلی ایران و توران میں ہے مشہور
اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

جب نام اور دلی کے بارے میں ایسا اختلاف ہو تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تاریخ و فضا میں بھی اختلافی صورت ہوئی لیکن مولوی عبداللہ نے ”دلی خان دلی“ کے ایک نظم سے ایک قصہ دریافت کیا جو دلی کی تاریخ و فضا کو حتمی بنا سکتا ہے۔ یعنی ۱۷۷۷ء۔ ۱۷۷۸ء۔

باد چاہ دلی ساقی کوڑ علی
(متوجہ ۱۷۷۸ء۔ ۱۱۱۹ھ۔ ۱۷۷۷ء۔ ۱۷۷۸ء)

لیکن ڈاکٹر جیل جانی نے قلمی کجی ایسے چلنے کے جس سے یہ تاریخ و فضا بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔ ان کی تحقیق ہے کہ ۱۷۷۷ء۔ ۱۷۷۸ء۔ دلی کے زندہ رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔ پھر یہ کہ دلی محمد طبعی و کجی کر مرے اور ان کے مرشد استاد اور ساجی وغیرہ ۱۷۷۷ء۔ ۱۷۷۸ء۔ کے تین تین سال بعد تک زندہ رہے اور ایک اہم بات یہ ہے کہ ۱۷۷۷ء۔ ۱۷۷۸ء۔ میں دلی دلی آئے اور شاہ کوشن سے ملے۔ یہ ”الغزل و نعت“ کی مثال ہے۔ اس وقت دلی زندہ تھے۔ اور یہ ۱۷۷۷ء۔ ۱۷۷۸ء۔ کا واقعہ ہے۔ جس میں جانی نے اس بحث کو مزید طول دیا ہے۔ اس حلقے میں ”دلی کا سال وفات“ کے عنوان سے جیل جانی نے ”نثر“ اور ”پیش گوئی“ میں ”۱۷۷۷ء۔ ۱۷۷۸ء۔ کا بیان کیا جاسکتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود اگر نظر انداز کیا جائے تو دلی نے لکھا ہے کہ ان کی وفات ۱۷۷۷ء۔ ۱۷۷۸ء۔ میں ہوئی اور وقت بھی مقرر کیا یعنی مصر کے وقت لیکن جیل جانی نے اسرار کرتے ہیں کہ ان کا انتقال ۱۷۷۷ء۔ ۱۷۷۸ء۔ میں ہوا۔ اس حلقے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا، پھر بھی جیل جانی کی دی ہوئی تاریخ دلی معلوم ہوتی ہے۔

دلی کی شاعری کی بحث میں اس عہد کے ایک مشہور صوفی شاعر سید محمد کاشانی کا ذکر بار بار ہوتا ہے اور جن کے

اور اسالیب اختیار کریں۔ اس کا ذکر مصر کے تذکرے ”نکات اشعار“ میں بھی ہے۔ اس میں یہ جملہ لکھا ہے۔
”اسی سرمد خاں قادری کہ بیکار قائد اللہ اور ناکستہ خود پیر“

”شعر الہند“ جلد اول کے صفحہ ۲۶ پر بھی شاعر صاحب کی یہ نقل ملتی ہے۔

”محمد بن دکنی راگزشتہ درختہ و سوادنی اردوئے معلیٰ شاہ چہن آبا و سوزوں بکلیتہ ساجہ
شہرت دور و داغ قبول خاطر صاحب طبعان علی حراج کر دو“

بعضوں کو اس بات سے اختلاف ہے کہ صوفی شاعر کاشانی کے مشورے سے انہوں نے اپنا رنگ خن ان حد تک خد مل کر دیا کہ دلی ادب سے اس کا اپنا امتیاز واضح ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ دلی کا مقام قابلِ لحاظ رہا ہوگا اور وہاں کی جہاز دلی انصاف دلی کو اس کو کلی طور پر چھوڑ کر چھوڑ دیوں گے اور جب کاشانی کا مشورہ سامنے آیا تو بحر ان کی طبیعت اور نا متحرک بھی ہوئی اور اس کی طرف راجع بھی۔ لہذا ایک نئی صورت سامنے آئی جو دلی سے مختلف تھی۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ اب تک دکن میں مولویوں سے بہاد راستہ نہیں گزرتا۔ تمام انسانی کیفیات کا بیان بھی ایسا ہی صورتوں میں ہوتا ہے۔ لہذا یہ کہنا آسان ہے کہ دلی یا جسم و جان کی شاعری تاریخی موضوعات تو دیکھتی ہی تھی مگر یہ کسی سطح پر گہرائی نہیں تھا۔ اسی سے غرضات تک یہ صورت دیکھی جاسکتی ہے۔ صرفی اور دلی بھی متشکیک نہیں۔ تعویذ ہی صورت جو دلی ہوئی نظر آتی ہے وہ محمود اور حسن شرقی کے یہاں ہے۔ اب دلی نے نئی صورت پیدا کی اور وہ بہت نمایاں بھی تھی۔ ایک وصف تو یہ تھا کہ انہوں نے شمال اور جنوب کے الفاظ کا ارقام کیا اور دلی کی جگہ فارسی کو ترجیح دی شروع کی۔ دلی کی طرف یہ کہ کاشانی اسامات کو خدائی چلنے پر نہ لکھ دلی کو اس کا بھی بے حد اہمیت دی لہذا اب حسن و عشق کے معاملات کے ساتھ دوسرے جو نظر آتے تھے۔ غم جاناں و دلتہ جو کجی دلی حراج سے ہم آہنگ تھا اور صوفی دلی نے ان کو جس تھے جنہیں کلی طور پر دلی کہا جاسکتا تھا۔ ایسے میں غزل نے ایک نئی صورت لی اور نئے آفاق سے ہم کنار ہو گئی۔ پھر یہ بھی ہوا کہ مولویات میں دلی شاعری کے نئے امکانات روشن ہوئے۔ فارسی عروضی و بحر میں دلی دلی میں غزلیں ہی جاتے تھے لہذا اب محبوب خدائی احوال کے ساتھ دلی لکھنے سے بھی ملو ہوا۔ حسن و عشق کے دلی نے تیرہ کو دلی بھی محسوس کر سکتا ہے۔ صرف چار شعرا مل سکتے ہوں:

حسن تھا پودہ تجرید میں سب سواں آزار
طالب عشق ہوا صورت انسان میں
ہے ترا حسن ایسے کیاں
ہنسے سوں بہنہ کہی کہ جہے

گل و لیلی کا گرم ہے بازو

اس یمن میں ہجر کا گھر

جسے عشق کا شیر کاری گئے

اسے زندگی گھنٹا نہ بھاری گئے

یہ چاروں اشعار غزل کی کئی جتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے شاعری کی کئی کیفیں دریافت ہو سکتی ہیں۔ یاد دہانہ ہیں شاعروں کے لئے فضا ہموار ہوئی۔

کئی ادب میں عشق کی سطح کی کیفیت بہت نمایاں رہی تھی۔ یہاں تک کہ عشق جس کا گھٹا ہے شائستگی اور سنجیدگی خالی خالی ملتی ہے۔ شعرا اپنے آپ کو ضبط نہیں کرتے اور کھل کھینے کی ایک فضا ابھر جاتی ہے۔ لیکن دل نے تصور عشق کو گہرائی اور گیرائی سے ہمراہ کیا اور فادائی مطالعات کی روشنی میں داخلیت کے کیف پیدا کئے۔ جمیل چاہی نے نصرتی اور ولی کے حوالے سے یہ ٹھیک لکھا ہے کہ:-

”نصرتی محبوب کی ہفت کا ڈر بیان کر رہا ہے اور ولی خال کا۔ دلوں میں نے بھی روائے سے بدولی گئی ہے۔ نصرتی زم زم کا ذکر کرتا ہے ولی حوض کوثر اور طلال حبشی کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن دلوں کے حراج میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوتا ہے۔ ولی کے یہاں شائستگی اور عذوبت ہے نصرتی کے یہاں تہہ و بیداری اور بھوک ہے نصرتی کے سنجے میں سمجھ جاتی کا احساس اس لئے ہوتا ہے کہ یہ آواز مردہ اور یہ لہجہ متحرک ہو چکا ہے۔ دل کے یہاں ایک مردانہ آواز سنائی دیتی ہے اور وہ لہجہ دکھائی دیتا ہے۔ آج بھی اردو شاعری کا زندہ لہجہ ہے۔“

مکمل سے دیکھتے بھی آواز ہوتا ہے کہ ولی کا عشق تصوف کی مرحلہ میں کس طرح آگیا۔ ولی کی ایک مشہور غزل ہے جس کی ردیہ ہے جلالی یا بھٹائی یا اس غزل کے بعض اشعار میں بصر میں نقل کروں گا۔ یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ ادب کا عشق تصوف کے حلقہ اثر میں آکر قطعی مختلف ہو گیا۔ صوفی شاعر کشن کے علاوہ بعض دوسرے صوفی جن سے ان کا رونا چہرہ ہے وہ تھے شاہ نور الدین جن کا تعلق سرور علیہ سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ موصوف نے ان سے درس سلوک لیا تھا۔ لیکن بعض اس سے استثناء بھی کرتے ہیں۔ شاعر کشن کا ذکر آچکا ہے۔ واضح ہو کہ شاعر کشن جوں تو خود صوفی بزرگ تھے اور شاہ گل سرہن کی شخصیت وحدت بنی سید محمد سعید بن شاہ احمد مجدد دہری کے مرید تھے۔ اس نسبت سے انہوں نے نقل کشن شاعر کشن اختیار کیا تھا۔

ان کے علاوہ ایک سی کمال علی رضا کا ذکر آتا ہے جن کے ہاں سے کہا جاتا ہے کہ شاعر علی رضا سرہندی نے آپ کا فرق خلافت سے سرفراز کیا تھا۔ ولی کو ان سے بھی عقیدت تھی۔ ایک نام شیخ نور الدین سرور ولی کا آتا ہے جن سے ولی نے باقاعدہ علوم و نقل و نقل کا درس لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سرور ولی سطح کا شاعر ہی پر زیادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ عشق کی یہ تعلیم ولی کو ایک سطح سے جوڑتی ہے۔ لہذا ان کا عشق مجاز اور حقیقت کا ہر جگہ ایک احترام پیش کرتا ہے۔ ولی نے عشق کو کس طرح برتا ہے اس باب میں پھر اشعار دیکھئے۔

ہر طرف ہے جگہ میں روشن نام نفس الدین کا

نہیں میں ہے شہر جس کے اندر ہے پر بھین کا

ہے ہر کہ آب و رنگ ماہ نغمہ دامن میں

آتا نہیں کسی کے خیال و قیاس میں

خودیاں حیا سوں فرق عرق ہوں تو کیا محبوب

جس وقت جلوہ گر ہو بھال گوہر اہل

شیخ بزم وفا ہے امرت ال

سر داغ روا ہے امرت ال

ترا تہہ دیکھ اے سید معالی

خوشی نہیں کی ہوئی ہے فکر معالی

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں صرف مسلمانوں کے نام نہیں۔ یہاں ہم دامن بھی ہیں اور امرت ال اور گوہر اہل بھی دیکھتے ہیں جس طرح ایک عام ہندو اور تہذیب خصوصاً وہ جاہلیت سے ہر فرقے کو اپنے اندر سمیٹتا ہے وہ یہاں دیتی ہے۔ یہاں خارجی احوال کو نہیں دکھایا جاتا بلکہ دل کا کیف دیکھو اور آئینہ طالع ہے جہاں ایک صوفی شاعر اپنی تصویر بھی دیکھتا ہے اور دوسروں کی بھی۔ یہی عشق ایسی تک پہنچنے کا صحیح ذریعہ ہے۔ گوہر یہاں عشق محض خیالی نہیں بلکہ اس کی جزئی حقیقت میں پوشیدہ ہیں۔ یہ روایت ہندی بھی ہے ایرانی بھی۔ پھر اشعار نقل کرتے ہوں:

صنعت کے تصور نے صیانت کے صلے پر

تصور چاہے تری نور کون گل کر

دل کوں مگر مرتبہ ہو درجن کا
عشق ہے دیکھا سرئی جن کا

دیکھ تھ میں جمال حق کا ظہور
جس دعا گو شک پہ سارے ملک

عشق کر اے دل سدا تجرید کی
جانشینی ہے ابتدا توحید کی

عارفان پر بیوقوف روشن ہے
مگر فن عاشقی عجب فن ہے

مست غصے کے شعلے سوں جلنے کو جلائی جا
نک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھائی جا

تھ جھٹکن میں جل جل کر سب تن کو کیا کامل
یہ روشنی افزا ہے اکھیاں کو لگائی جا

یہ مباحث زیادہ Contemplative سے متعلق ہیں لیکن اگر کئی طور پر بھی دلی کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو کئی خوبصورت رد و نرد وازے ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں نئی تشبیہوں کا ایک جال بچھا ہوا نظر آتا ہے۔ ویسے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دکن کے اکثر شعرا احساسی جمال سے بہرہ ور معلوم ہوتے ہیں۔ یہ یاد رکھنا ہے کہ ادیب احساسی ترشح کی سطح نہیں سمجھتا۔ وہ اپنی تشبیہات وضع کرتے ہیں جن میں انقلابیت بھی ہوتی ہے اور علامتیت بھی۔ چونکہ شعر گو مہرانی سے متصف کرنے میں ان کا فنی ذہن کافی مدد کرتا ہے لہذا تشبیہوں، استعاروں اور دیگر دوسری جہتوں میں پائن آ جاتی ہے۔ ظاہر ہے یہاں نے لیکن ہوسکا کہ فنی نظریات نے ان پر بے آفاق روشن کئے اور لنگھوں کا ادیب استعمل بھی اسی طرح اعلیٰ سے مستخرج ہے۔ لہذا عشق و محبت سے لے کر زندگی کے دوسرے رموز و اعلام اسی طرح درست اختیار کرتے رہے۔ اگر دلی کا دیوان دلی نہ پہنچتا تو اردو شاعری کی ہرگز وہ گنجائش نہیں ہوتی جس پر ترجیح مقرر کرنے نظر آتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ دلی سے پہلے جملہ دلی کے یہاں کچھ ایسے نکتے تھے جو فنی صورت و اقتدار کو مہرے لیکن فنی طور پر دلی کو جو امتیاز حاصل ہے اولیات کے مسئلے میں وہ کسی دوسرے کو قہیب نہیں۔ ہاں اردو شاعری نے غزل میں حب دلی کے بعد نئے رخ اور وضع اختیار کئے تو وہ اس

ہے اس احساس کے ساتھ کہ اردو شاعری نے بہت سے نئے روپ اختیار کر لئے ہیں اور دلی کے بعد لکھنے کے رنگ و آہنگ نے اردو شاعری کو درست دی ہے لیکن تمام تر ارتقائی اور ارتقائی صورتوں کے بعد بھی دلی کا اقتدار اپنی جگہ ہمارے ان کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے۔

سراج اور رنگ آبادی

(۱۵۷۷ء - ۱۷۷۷ء)

سراج اور رنگ آبادی کا پورا نام سید سراج الدین سراج اور رنگ آبادی تھا۔ یہ اورنگ آباد (میں داخلہ) میں پیدا ہوئے۔ اس وقت تک دلی کا دیوان دلی فتح چکا تھا اور اس کے دور رس نثر نگار قائم ہو رہے تھے۔ یہ دور نکتہ ہے جب اورنگ زیب کا انتقال ہو چکا تھا اور چند سال بعد سراج پیدا ہوئے تھے۔ بھول عید القادر مہر دلی ان کے انتقال کی تاریخ ۱۷۷۷ء ہے۔ گویا انہوں نے ان کی زندگی پائی۔ جب ان کی عمر بارہ سال کی تھی تو علوم متداولہ حاصل کر لئے۔ لیکن ان کے حوا میں جذبہ مستی کی کیفیت نمایاں رہی تھی جس کا اظہار مکمل طور پر ہونے لگا تھا۔ اسی جذبہ مستی میں انہوں نے ایسے فارسی اشعار کہے جن کی اپنی اہمیت ہے۔ جب یہ جذبہ شدید ہوا تو گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور مہر انور دلی کرتے رہے۔ ہزاروں کے حوا سے دلچسپی لینے لگے۔ اس کی ہی حالت میں چشتیہ طریقہ کے ایک مولیٰ بزرگ شاد عبد الرحمن سے عمارت صحبت حاصل کی۔ انہوں نے کچھ وقت شاد بہان فریب کے حوا پر بھی گزارا۔ اس طرح تصوف ان کی فحش میں چلتا اور وہ جذبہ مستی میں سرشار و عشق و عاشقی کے مسئلے میں شعری تخلیقات کے مسئلے سے گزرتے رہے۔

سراج اور رنگ آبادی دراصل اس روایت کے امین تھے جو دلی کی روایت کہی جاسکتی ہے۔ اور یہ روایت دکنی شاعری میں خاصیت پرانی تھی۔ کئی شعرا کا انہاں اردو کی طرف تھانہ جو دکنی حوالے سے دور بکڑ رہا تھا۔ دلی کے دیوان نے دلی کی انشا اور بھی کر دلی اور شعر اکازی کو چھوڑ کر اسی طرف راجع ہو گئے۔ صورت یہ تھی کہ فارسی ہی میں شعر کہنا باعث عزت تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن دلی کی روایت سے کا پائے ہوئے اور اردو یا مقامی زبان کی اہمیت جو حقیقی معنی کی باس حد تک کہ اردو میں لکھنا باعث شک و شبہ نہیں بلکہ وقار کا سبب ہوا۔ سراج اور رنگ آبادی اس ادبی روایت کے امین تھے۔ یہ جو صدیاں سے دکن میں فروغ پا رہی تھی۔ دلی اور سراج کے ذریعہ شمالی ہند میں یہ روایت مروج ہو گئی اور اس حد تک کہ میر جو دار و درو، سبکی دلی اور سراج سے متاثر ہوئے۔ مہر حسن نے سراج اور رنگ آبادی کا ایک انتخاب شائع کیا جس میں انہوں نے سراج کی شاعری کی بعض کیفیتوں کو چند سطروں میں سمیٹا لیا ہے۔ میں وہ ملاحظہ کیا یہاں پیش کردہ ہوں:-

”انتخاب کلام کے ان چند دوسرائی میں ایک ایسا جمال پرست اور سفاخر شخصیت کی جھلکیاں

میں گئی جو زات و کائنات کے لئے عرفان کی تلاش میں ہے اور اسی تلاش کے عمل میں پڑھنے

اشعار میں ایک درد مندوں کی آواز بھی ہے اور ایک تہذیبی اور ایک تاریخی دور کی صدا بھی۔ اچھا شعر ہمیشہ شخصیت، ماحول اور ادب سے منہمک رہتا ہے۔ اور اس اعتبار سے اچھے شعرا کا مطالعہ پرانی شراب کا نشہ ہے جسے وقت فرسودہ نہیں کر پاتا بلکہ اور زیادہ شاداب اور پُر کیف بنادیتا ہے۔ سراج کا مطالعہ ایک وقت تو بخیر کے لئے جاوہر اس کا مطالعہ بھی ہے اور عصر حاضر کا زندہ اور تازہ نگار تجربہ بھی۔ *

میراثی خیال یہ ہے سراج کے بارے میں یہ خیالات بالکل درست ہیں۔ یہ کہنا کہ سراج پولی کے اپنے اثرات تھے کہ وہاں داروے میں رہے درست نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض غزلیں دلی جوں جوں جن پولی کے اثرات تھے ان کے چمکتے ہیں بلکہ کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ تمام تر سچائی نہیں ہے۔ جس قسم کا انتخاب سراج کے یہاں ملتا ہے وہ انوکھا بھی ہے اور ان کی فکری کیفیت کی تنظیم کا باعث ہے۔ پھر اس حوالے سے ان کی شاعری اور تہذیبی زندگی کے مطالعے کی آئی جہتیں نکلتی ہیں۔ روایتی اور سرسختی تصوف کی ایک ایسی شق ہے جو تخلیقی راہ اختیار کر لیتی ہے تو اس کے نئے امکانات سامنے آ جاتے ہیں۔ یہی صورت سراج کے یہاں پیدا ہو رہی ہے۔ میراثی خیال ہے کہ ایسا انتخاب ولی کے یہاں نہیں ہے۔ ہاں کچھ تصوف کے اعداد ان کے یہاں بھی ملتے ہیں لیکن عشق و عاشقی کا وہ کیف جو دامنیت کی منزلوں سے گزر کر ایک ایسے آفاقی کی طرف لے جاتا ہے جس میں انسانی زندگی اور تہذیب کی تطہیر ہوتی ہے سراج کے تصوف کا خاصہ ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ سراج درد کی طرح تمام تصوف کے شاعر ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سراج کے یہاں تصوف ایک بھرپور طرح پر ہے اور وہ عشق و عاشقی سے عبارت ہے جس میں حقیقی اور ربانی تصورات و محرکات کے ذریعہ پیش کئے گئے ہیں۔ جمیل جاوہر نے یہ بابا طور پر لکھا ہے کہ:-

"پوری اور شاعری کے پس منظر میں سراج کی شاعری کو دیکھا جائے تو وہ اور شاعری کے راستے پر ایک ایسی مرکزی جگہ کھڑے ہیں جہاں سے میر درد، مصطفیٰ، انیسویں، عارف اور اقبال کی روایت کے راستے صاف نظر آسکتے ہیں۔ سراج نے اور شاعری کے بنیادی رنگ کو چمکایا ہے اس لئے ان کی آواز سارے بڑے شاعروں کی آواز، سارے ادیبوں کے شمس موجود ہے۔ سراج ولی کی روایت کو بھی اپنے جذبہ عشق سے اٹھا آگے لے جاتے ہیں کہ ان کی شاعری کو پڑھنے والے میں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ہم دل کے ذریعہ کی نسل کے شاعر کا کام پڑھا رہے ہیں۔ سراج کے کام میں ولی سے زیادہ ایسے عشقیہ اشعار کی تعداد ملے گی اور اگر اس تعداد کا مقابلہ دوسرے بڑے شاعروں کے ایسے اشعار کی تعداد سے کیا جائے تو سراج یہاں بھی ہمیں مایوس نہیں کرتے ہم کلیات سراج سے کچھ ایسے منتخب اشعار نقل کرتے

جس میں کو پڑھ کر آپ آئے والے دور کے بہت سے شعرا کی آوازیں سن سکیں گے۔ یہ سب آوازیں آپ کی جالی پہ چالی ہیں:

شخطہ درد، جام بیک، بزم میں آتا ہے سراج
گردن شمع کون کیا پاک ہے زلزل جانے کا

میرے ہجر کے درد کا چادر کب آئے گا
یک بار ہو گیا ہے دوبارہ کب آئے گا

ہر صفحہ اس کے حسن کی تعریف کے خلیل
مکمل ہو ، بہار ہو ، یاساں ہو

مجھ میں ہم دست و گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا
چاک سینے کا نمایاں نہ ہوا تھا سو ہوا

قیلہ مدح کیا مجھ پہ خط آمداری کا
کفر ہند مسلمان نہ ہوا تھا سو ہوا" *

جمیل جاوہر نے عشق اور تصوف کو الگ الگ طور پر برتنے کی کوشش کی ہے جو سراج کی شاعری کا قوام ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں میں کوئی حد حاصل قائم کرنا ضروری نہیں بلکہ موصوف کا یہ خیال ضرور درست ہے کہ:-

"ولی کے کام کو سراج نے آگے بڑھایا۔ سراج کے پاس بمقابلہ ولی کے جذبات زیادہ صحت کے ساتھ جان خود ہے۔ ولی کے اشعار میں اکثر لہجہ یاد یا ماحول ہوتا ہے لیکن سراج کے یہاں یہ مکمل جاتا ہے اس میں بحری اور شغالی زیادہ جاتی ہے۔" **

میں سمجھتا ہوں کہ عشق کے حوالے سے سراج اور وہ کے ایک اہم شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں جن کے اثرات دور رس رہے ہیں۔ واضح ہو کہ سراج کا کلیات ضخیم ہے۔ اس کا مقصد بھرپور عشق پر مبنی ہے۔ کلیات سراج ۱۹۳۰ء میں عبداللہ اور سردی کے ذریعہ مرتب ہوا۔ پروفیسر سردی نے کلیات کی بنیاد و تقاطع کا پڑھ لی۔ اس میں شاعری "یوسف بن خیال" بھی ہے جو چار مکتوبات کے حوالے سے اس کلیات میں مرتب کی گئی ہے اس کا

* "ادبیات و تنقید" (جلد اول) جمیل جاوہر، ۱۹۹۳ء، ص ۵۵۲-۵۵۹

** "ادبیات و تنقید" (جلد اول) جمیل جاوہر، ۱۹۹۳ء، ص ۵۵۹-۵۶۰

انتخاب محرم سے پیش کیا ہے جہاں سے کچھ اشعار میں نقل کر رہا ہوں۔

اے آفتاب زری غلستہ جدائی میں
سراجِ آہ کوں آخر چرخِ شام کیا

بہار آنکی لپاس تو تھلاں کیوں نہ ہو رقیں
بھرا ہے رنگِ غنچوں کے گلابی آنچیتوں میں

اس لب کوں کب پسند ہیں دلی سکودیاں
لاک کے بھول کی ہیں بٹے قہودِ خودیاں

دے مجلسِ مجال میں ہر داگل مجھے
جتا ہوں تیریں سمراتِ برد کی آگیا میں میں

وہنی دشتِ محبت ہے دل زارِ سراج
حدِ دلچسپی کوں جاو کا کلی میں کر

تجھ لب کے تجسم میں ہے اجازتِ سیما
اے جانِ سراجِ لبِ دل بے جاں کوں جلا دے

پاکِ کھول کر مٹھی پلک کی موند لپٹے ہیں
مری آنکھوں نے شاید غراب میں کوئی لعل پادا ہے

تجھ ذلک کی غرقِ جہانِ باغ میں سنبل
کھا چھ اسی طعم میں سے پوشِ ہوا ہے

دل کے پردے ہوئے اب ایک اوراقِ پائی ہے
سب تو آخر ہوئی کتابِ ایک صفحہِ پائی ہے

بار کی وضع ہے مجالِ بنیر

جان دیتا ہے ترے ہر کی مٹنی میں سراج
آشنائی مٹی اے جانِ دقِ باقی ہے

خیرِ قہرِ مٹنی سن نہ جنوں رہا نہ پہلی دہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو ہے خیری دہی

خودی ہے کفر اگر ہم اچھیں تو یہ جاوے
طارے بعدِ خودی جانے کا خدا جانے

زباں میں خند و شکرِ دل میں دہر رکھتے ہیں
کسا ہوں سب کو جتنے آشنا ہیں بیکانے

گویا دکن سے جو ادبی روایت شمال میں منتقل ہوئی اس کے پیار گزاروں میں دلی کے بعد سراج اور نجف آبادی
چیں جنہوں نے نہ صرف یہ کہ دلی کے بعد نئے تخلیقی جہات تلاش کئے بلکہ شاعری کے نئے مضمرات سے بھی آشنا کیا۔ ان
کی مثنوی "یوسفیان خیال" اس امر پر دل ہے۔



سودا، میرا اور دوسرے شعراء

کہتا کہ غلو نہیں۔ گندہ کی انہیں سپاہی قرار دیتے ہیں تو ابتدا کی ہمت ہوگی۔ اس سلسلے میں کاظمی اختلاف حسین لکھتے ہیں کہ:-

"والدہ کے انتقال کے سبب جب فارغ التحصیلی کا دور ختم ہوا تو سودا نے فروغ میں ملازمت کر لی۔ میر تقی میر، فتح علی گزدری، حمید اور ملک آبادی اور قاسم نے ان کی اس ملازمت کی توثیق کی ہے۔ لیکن فوجی ملازمت کا زمانہ غالباً بہت مختصر رہا۔ ان کو اپنی ذہانت اور تیز فہمی کی بنا پر سودا قبول نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے بہت جلد ملازمت چھوڑ دی۔..... تو کمری کرنے کے بعد سودا نے امر کی مصاحبت اختیار کی۔ باپ کے حوالہ اور شاعری کی شہرت نے امر تک رسائی کو سودا کے لئے آسان بنا دیا۔"

سودا کی علمی صلاحیت کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ مصحفی نے انہیں مردِ علم قرار دیا ہے۔ لیکن کاظمی عبدالودود کا خیال ہے کہ "سیرت الفاضلین" کا مصنف جاہل نہیں ہو سکتا۔ قاسم نے اپنے تذکرہ "مجموعہ نغز" میں اس کا احساس دلایا ہے کہ سراج الدین علی خاں آرزو کے گھر منعقد ہونے والی شاعری کی تقریبات میں سودا شریک ہوا کرتے تھے۔ انہیں خاں آرزو کا شاگرد بتایا ہے۔ محمد حسین آزاد کو اس سے اختلاف ہے۔ ممکن ہے کہ ان کی صحبت سے فیض اٹھایا ہو۔ سودا پہلے قاری میں شعر کہا کرتے تھے لیکن آرزو کی کے مشورے پر اردو میں شعر کہنے شروع کیا۔ ان کے استادوں کے سلسلے میں چار نام لگے جاتے ہیں خاں آرزو، مشاعرِ قاسم، سلیمان علی خاں و دان و نظام الدین احمد صالح۔ یہاں تک کہ نو بیہوش کا اخلاق یہ ہے کہ وہ قاسم کے شاگرد تھے۔ ان کے "دیوانِ آرزو" کے دیباچے میں شاگردوں کا ذکر ہے اس میں سودا بھی ہیں۔ قاسم ہی کے حوالے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سودا اپنے زمانے میں ایک شاعری حیثیت سے اعتبار رکھتے تھے۔ شورش کابیان ہے کہ اگر سودا کو رنڈہ گویوں کا ملک اشعار خیال کروں تو جانتا ہے۔ مصحفی نے باواسطہ چوت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بعض لوگ سودا کو رنڈہ گوی کے فنی میں ملک اشعار کہہ کر بچتے ہیں اور بعض ان کا طعن صرف اور تو اوصاف میں ہمیں اور مرتے کا مرتب بناتے ہیں۔

ان کی ذات کی روشنی میں گمان غالب ہے کہ سودا کو ملک اشعار کا خطاب کسی بادشاہ سے نہیں بلکہ اہل ذوق نے ان کی استادی کے پیش نظر دیا۔ محمد انوار حسین تنہم سہانی نے کیا ہے سودا کے مطبوعہ بیہوش (۱۸۷۳ء) کے خانے پر یہ لکھا ہے کہ:-

"سودا کو ملک اشعار کا خطاب فتح علی گزدری نے دیا تھا۔"

سودا مسلسل سفر کرتے رہے تھے۔ ثواب بخاری الدین علامہ الفک کے مراد فرخ آج بھی آئے تھے جہاں مصحفی موجود

تھے تب وہ مہربان خان کی ملازمت میں تھے اور مصحفی کے مطابق سودا وہاں اس وقت موجود تھے۔ یہ بحث بھی علمی آئی ہے کہ وہ فرخ آباد ثواب شجاع الدولہ کی دعوت پر آئے تھے لیکن عام طور سے اس خیال کو غلط سمجھا جاتا ہے۔ سودا غالباً ۱۸۶۱ء تک فرخ آباد میں رہے اور جب ثواب احمد خاں نکلتا تھا ان کا انتقال ہو گیا تو فرخ آباد چھوڑ دیا اور بعض آباد آ گئے جو ثواب شجاع الدولہ کا پاپے تخت تھا۔ یہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی لیکن جب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد صرف الدولہ مسعود آرا ہوئے تو انہوں نے لکھنؤ کو حکومت کا مرکز قرار دیا۔ لہذا سودا بھی وہاں آ گئے۔ صرف الدولہ نے بھی سودا کی بڑی عزت کی اور ان کیسے دیکھنے کے علاوہ چاہیے رکھا۔ ان کی ہندو (دقیقہ ہندی) کے مطابق ثواب شجاع الدولہ نے ۲۰۰۰ روپے ہجیرا مقرر کیا تھا جسے صرف الدولہ نے جاری رکھا۔ اس زمانے میں ان کی ملاکات پر عالمانہ و ریسرچی کے عمل سے ہوئی ہے۔ اس میں ایک قصہ در چہڑ جاسن تھا جسے اردو شاعری سے دلچسپی تھا۔ سودا نے اذہان اس کی خدمت میں پیش کیا۔ بھی ۲۰ سالن شوق نے سودا کی وفات پر ایک قطعہ کہا تھا وہ یہ ہے:-

نکھو ج مہر زائے رفیع
چوٹی رجب کی جان میں گزارے
جب کہ (کہا) گیا ہوئی تاریخ
اس کے سودا جہان میں گزارے

گویا ان کا انتقال ۸۱۷ھ میں ہوا۔

سودا کی شاعری کی بحث میں ان کے الفاظ طبع پر روشنی ڈالی جاتی رہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موصوف نہ صرف خوش گفتار تھے بلکہ تعلقات عامہ رکھتے ہیں بھارت تھی۔ کسی کو خوش نہیں کرتا چاہے جسے ان کی خوش خوئی کی وجہ سے لوگ ان کی قدر کرتے تھے۔ اس پر طرہ دان کیا: جاہت تھی جس میں ایک کشش تھی۔ طبعیت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ایسے فرد کا حلقہ آزار دوستی رہا ہوگا۔ شاید ان کے اسلاف کی ذات ان کی اپنی طبیعت کی وسعت کی وجہ سے ختم ہوگی کہ ہر کس کا کہنا کی مدد کرنا چاہتے ہوں گے۔ یہ تو بچہ نہیں چلتا کہ انہیں تر کے میں کیا تھوٹا تھا لیکن اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے دوستوں میں بہت کچھ ڈرا دیا اور مضاہبت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اب ان کے حلقے میں سلاطین و زرا سے لے کر دھرمے رہے۔ لوگ بھی تھے۔ سودا ہمیشہ زندہ گئی مزار سے تھے، جس میں وسیع الفہم اور فراخ دلی کی ضرورت ہوتی ہے۔

سودا کی خوش اور ظرافت رنگ اہلی۔ چنانچہ ان کی شاعری کے دوقوں میں صراحتاً یہ لکھا ہے۔ انہیں نہیں کہ سودا نے کسی سے جنگ نہ کی۔ ہنر فوٹا شعر کے کرتے رہے۔ سودا اور قاسم کا شعر کہنا مشہور ہے۔ انہوں نے جو بھی

تجربہ تجربوں کو چھوڑ کر سوز کی تصنیفات کی تکمیل یا اس طرح بیان کی گئی ہے:

(۱) اندر و غزلیات کا ایک دیوان جس میں متحرق اشعار اور اس مطلع بھی شامل ہیں۔

(۲) تمیں جاں پس سے زائداورد تصدیق۔

(۳) میں سے زائداورد و مشغولیاں۔

(۴) تمیں سے زائداورد و غزلیں۔

(۵) ستر سے زائداورد و پائیاں اور چند مستزاد۔

(۶) پچاس کے قریب اردو نظمیں۔

(۷) دوسرے مجموعے۔

(۸) ایک ترکیب ہندو اسوئے۔

(۹) شمع کے چند مسودے۔

(۱۰) کئی مرثیے اور ملاح۔

(۱۱) اردو میں ایک دیوانہ جیسے نثری نمائندگی کے مرثیے پر تنقید کی نظم کے چالیس فقرے کے طور پر لکھا گیا ہے۔

(۱۲) فارسی غزلیوں کا ایک دیوان۔

(۱۳) فارسی میں لکھے ہوئے چند قطعے رہا میں، غزلیں اور ایک قصیدہ۔

(۱۴) فارسی میں ایک رسالہ عبرت الغافلین جس میں فارغین کی شاعری اور دوسرے شاعروں پر

استزاعات کو نکالنا مقصد رکھنا دیا گیا ہے۔

(۱۵) تقریباً ایک سو چوبیس پہیلیاں۔

(۱۶) ایک پنجابی غزل جو تدریج کی آغوش ہے۔

سوز کی جو بات کی بحث میں ان کی شاعری و طرز اشت کا ذکر یاد آتا ہے۔ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ یہ شاعری و انداز ادبی اس ماحول کا نتیجہ تھی جس میں وہ سانس لے رہے تھے۔ ایک اور امر جس کا اظہار کیا جاتا ہے وہ ان کا فارغی و افسانہ ہونا بھی ہے۔ یہ سب باتیں ایسی جگہ پر درست ہیں لیکن طرز نگار یا جھنگار کے لئے سب سے اہم یہ ہے کہ وہ شاعر کی ان دہواریوں پر مبنی فکر رکھتا ہے اور انہی تاہم دہواریوں سے اس کا دل کس حد تک متاثر ہے کہ دھڑکنے کی طرف دھکی ہو کر ان کی اصلاح پر کمر بستہ ہے اور یہ بھی کہ اس کی ذاتی دشمنی اس کا بغض اور اس کا عداوت جس حد تک اس کے قلب و جگر و رقت میں لے سکتا ہے اور اپنی جھڑپیں ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالنے ہوئے اس کے حدود کیا کچھ ہوئے ہیں؟

سوز کی جھڑپوں میں کچھ موزوں بات کے اشارے بعضوں نے اسے مختلف خانوں میں تقسیم کرنے کی بھی کوشش

کی ہے۔ مثلاً عالمی اور معاشرتی تیز اخلاقی خرابیوں سے متعلق نظمیں، حکومت کی بدعنوانی اور بے رحمیوں پر غزلیوں سے متاثر ہو کر ان کی تکلیفی جھڑپیں جہاں تیز افراد اشخاص کی ہے وہ کیوں یا ان کے مصائب یا ان کی طریق زندگی وغیرہ۔ لیکن میرا اہل خیال ہے کہ یہ سب دائرے ایک دوسرے میں مدغم ہیں۔ اس طرح موضوعات کے لحاظ سے ان کی شاعریات کی تقسیم بہت دور تک نہیں لے جاسکتی۔ کبھی کبھی اب بھی ہوتا ہے کہ شاعر کسی ایک شخص کو نکال کر باہر ہے لیکن اس عمل میں کئی دوسرے پہلو اس طرح عمل میں جاتے ہیں کہ ایسا ممکن ہوتا ہے کہ شاعر کہتا ہو کہ چاہتا تھا لیکن اس کی شخصی قوت فراموش (Transcend) کر گئی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب شاعر ان قوت بہت تیز ہوتی ہے اور اس میں غیر معمولی نظمیں کا مالک ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ موضوع تو بہت وسعت رکھتا ہے لیکن شاعر کی قوت تخلیق ایک خاص نقطہ پر پہنچ کر دم توڑ دیتی ہے۔ نتیجے میں وہ وسیع موضوع بھی سکر جاتا ہے۔ سوز کی جہاں بات میں یہ ماحمولوں کی نظر آتی ہیں۔ یہاں میں چند نکات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلے سوز کے ان موضوعات کو دیکھنا چاہوں جو بالکل ذاتی قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً شاعر کے سلیطہ کی بھڑپ یا قافزنگیں پر ان کے سلیطہ یا قیام الدین قائم کی بھڑپ یا سہر قیام الدین کی بھڑپ یا ایک ذات بہت آسانی سے کہہ دی جاتی ہے کہ سوز شخصی انویات میں اجتہاد کی حد تک پہنچتے ہیں اور کبھی کبھی وہ نفا کا نام کرتے ہیں جو اس میں طبیعت کو کمزور کرنے کا باعث بنتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ سوز کا کہنا ہے یہ اجتہاد ہی ہے اور کہہ سکتا ہے اجتہاد میں بال برابر تفریق ہے۔ اس کا یہ مفہوم نہیں کہ شاعر اپنے تخلیقی منصب سے گر جائے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس باب میں اس کی تخلیقی قوت اسے جہاں لے گئی ہے۔ اس لئے کہ شخصی جو پیش تصعب اور موزوں کا نتیجہ ہوتی ہے اور دشمنی میں القائلہ صاف جھنگار کے یہاں غایت احتیاط سے استعمال نہیں کئے جاتے بلکہ انہیں مبالغہ و غلو اور افراق کی مثالوں میں لے کر ان سے اجتناب ملحوظ ہے کہ اثر متاثر مقصود ہی جاتا ہے۔ عالمی شاعر نے خصوصاً انگریزوں کی انویات کے جو شاعرانہ سوز لے سائے آئے ہیں اور جن سے متعلق ذاتی ہنس و مزاح ہے وہ سب کے سب اجتہاد کی سرحدوں کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ میں یہاں صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ ڈیما میڈن کو شینڈول سے شکایت تھی۔ یہ شاعر آفاق نظریہ شاعر اس کے سلیطہ میں متعدد نظمیں لکھتا ہے۔ اس میں سے ایک Absalam and Achitophel لکھا ہے۔ یہاں شینڈول کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے وہ مزہ و سرگرمی کے لئے تو رکھا کہ اس کی ایک قصیدہ ہے جو سوز کی "تخلیل کا" ہے کہیں آگے نہ جاتا ہے۔ ایک جگہ شینڈول کے سلیطہ میں اس قسم کا قصیدہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہونکر کیم کو ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جو کائنات کا سب سے غمی شخص قرار دیا جاسکے۔ چند غمی صحنے میں اس کے کسی شعرے پر بھی نظر دیتی جاتے تاکہ اس کے اسلاف میں کیسے بھی کسی شخص کے یہاں مثل کی قربی موجود نہ ہو اور اس امر میں اسلاف کے سارے موزوں لکھا ہوں کہ ان کے یہاں انہیں ایک شعر بھی موجود نہ ہو یعنی شینڈول ہی کے یہاں نہیں بلکہ اس کے تمام افراد خانہ میں بھی نہیں ہونے کی اعلیٰ ترین صلاحیت ہو اور ہونے فرشتے یا سوز کہے جاتے جو ایک اس کے تمام رکھ رکھاؤ کا خلاصہ ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ Dullness جس اسی خاموشی کی میراث

تور کھاتا ہے جا کے پانہاٹے
یہ ہماری اپنی کے دانے

کہا جاتا ہے کہ عقیدہ و تصویف مذہبی عقیدہ و جھوٹا عقیدہ نہیں بن سکتا۔ جس طرح شادابی اٹھ بھڑک دہلوی کا مذاق اڑایا ہے اور دہلی اس لئے کہ موصوف نے اسیر معاویہ کے اوصاف لکھائے ہیں، کچھ مستحسن نہیں معلوم ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جو کچھ لکھی ہیں یہ پہلو ایک عیب کی طرح ابھر کر سامنے آیا ہے۔ اگر اس میں بھی شعری قوت ہوتی اور اس قوت کا شعری اظہار نظر میں آجول ہوتا تو ایک بات ہو سکتی تھی۔ شاید یہی عیب ہے کہ بیت کہ لوگ اس بیٹھ سے نکلا معلوم ہوئے ہیں لیکن اس کے مقابلے میں اگر تحکیم و غوث کی بھول لطفانہ پر غور کیا جائے تو یہ بات از غور طاہر ہو جائے گی کہ جس انگریزی اصطلاح Tapirasis کا میں نے ذکر کیا وہ بیان کس قدر واضح طور پر منطقی ہے۔ بات پس اتنی ہی کٹی گئی ہے کہ تحکیم و غوث تھے تو قسیم مگر طب سے تعلیمی واقف نہ تھے۔ چنانچہ ان کے طلاق سے جو صورت پیدا ہو سکتی ہے اس کا اندازہ لگا لیا جاسکتا ہے۔ نتیجے میں مگر ان اور اسی قبیل کے دوسرے لوگوں کا کاروبار جس طرح چمکتا ہے وہ سوا کی نگہوں سے دیکھنے کی چیز بن گیا ہے۔

ہر طور انداز میں یا کلی اختلافات کے سلسلے میں سوا کی نگہ یہ نظریں ملتی ہیں۔ مولوی صاحب کے سلسلے کا یہ شعر ہے:

کمن تو بعض یہ شر و عیوہ اہل زلہ
گو بہ مولوی سجاد عام اعنت ہا

اس مرحلے پر معاملہ ختم نہیں ہوتا بلکہ مذہبی دعویٰ میں خاندانی اور نسبی عظمت کی بھی بھڑک جاتی ہے

سجاد اکیلا نہ ہے پر از کرے جا۔ قلب
کائناتی ہمیں سے ہوں غلط کی طلت جس تک

ایک رہائی میں پھل نکلا، سجاد صاحب کی جھگڑا و خیر کا بیان ذکر کیا ہے کہ یہ سب ان کی خوراک ہیں۔ اسی طرح خور سے آگے بڑھ کر پوری قوم سے سوا رہا ہم ہیں اور وہ تو ہم ہے کشمیری۔ ان کا خیال ہے کہ کشمیری حضرت علی سے بڑھ کر محبت نہیں کرتے بلکہ بلوچ کے دشمن ہیں۔ میں نے لاپرواہی سے لکھا ہے کہ کاکت وہاں پیدا ہوا ہے جس سوا نے بدشعروں کی ہجو قبول کوٹھنا بنا ہے۔ خٹا خٹا تک کی بدی اور جاوید ندرت کا کشمیری کی کہیں۔ عجب اتفاق ہے کہ ایسے دلچسپ مصلوں میں شعر بھی معیاری نہیں ہو چکا اور سزا کی کیفیت رکھتا ہے۔ لیکن سوا ایک دوسری منزل کی طرف راہیں دہاتے ہیں، یعنی اپنے عہد کی سیاسی، معاشرتی اور انتظامی اشرفی کے احوال کو جو جاتے ہیں تو وہ شاید کمال قائل کرتے ہیں۔ ایک مشہوری "شیدائے فرادغوں کو ذوال" کی جھوم سے لیکن وہ دراصل اس زمانے میں شہر کی ہدائی کا حال ہے۔ خٹا و رشوت خوری، چوری، لکھتی و خیر کو عیاں کیا گیا ہے۔ ایسی ہی نظموں کا سلاسلان جھوٹا شہر میں لکھا ہے جن میں شیوہ کی حالت دکھاتے ہیں جاتی ہے اور محوی حالات میں دلی سے ہاتھ سے قلمیں تھرتھرتے ہیں۔ ایک قصہ "ایہود" ہے۔

یہ جہاں فراست بڑا سر پاؤں مارے مگر بار نہیں پاسکتی۔ فرشتے چھوٹے فراہم کرتے ہیں کہ شیدائوں کا خانہ ان اول تا آخر فراست سے خالی رہا ہے اور شیدائوں آج اس کا سب سے بڑا فراموش ہے۔ نظم کے متن میں جہاں تک تفصیلات آئی ہیں طر کے تیروں نے دکا کت کے کیتے ہی پہلوا جا کر رکھے ہیں۔ پھر دہلی میں نہیں بھی سامنے ابھرتی ہیں جنہیں میں نے غلو، اخراق اور مہالے سے واضح کیا ہے۔ اب سوا کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ مہالہ آرائی میں آج آگے نہ بڑھاتے ہیں کہ ان کے بیان پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے ایک غلط سمجھت ہے اور یہ بھی صحیح نہیں کہ مہالہ جو کوشیف کرنے کا سبب ہے۔

انگریزی میں ایک ادبی اصطلاح Tapirasis آتی ہے اس کے ذریعہ بڑی بلاغت سے مہالے کے انداز میں بڑی چیزوں کو خفیف اور خفیف کو اعلیٰ بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور ایسا کرنے میں کچھ مصلحتوں کی بھی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ کیا جاتا ہے کہ کسی شخص کا یوں مذاق اڑانا سبب نہیں ہے لیکن بھوکے شریعت میں یہ مذاق خاصا غلط ہوتا ہے اور شاید کہ وہ کو بہادران بھی بنا دیتا ہے۔ جان ڈماؤن نے اتنا تو کیا ہے کہ اس نے شیدائوں کو اپنے طر پر تیر سے جا دواں بھی بنا ڈالا۔ خفیک اسی طرح سوا نے خٹا کت کو جاتے دوام عطا کرنے میں غایت کامیابی حاصل کی وہ آج خٹا کت کو کون جانتا؟ شاید یہ صریح اس کا لہر بھی متعلقہ موضوع پر تحقیق کرنے سے گریز کرتے۔ سوا نے کسی موچا بھی نہیں ہو گا کہ وہ جس طرح اس کو در کو چٹا شامت بنا رہے ہیں وہ اس کی واقعی زندگی کا باعث ہو سکتا ہے اور سوا کے ساتھ ساتھ چلنے کا ان بھی۔ خٹا کت کے سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

گھر میں اب جس کے دلچ کڑے
ور پہ اس کے یہ بیٹھے ہوں او کے
گور سے پھر جو رحم اللہ کر آئے
میت اس کی اٹھائے یا نہ اٹھائے
میں لگ کر کسی کے گھر سے دو
ایک دور بھی گر کرے ہے نمود
لوگ تو دوڑے ہیں بھانے کو
دوڑے پہ لے رکھنی کھانے کو
ہر کسی بچے کی دکان پہ جا
اپنی باتوں میں اس کو لے ہے لگا
سوا

ظاہر ہے کہ اس میں بھی عوام کی پریشانیوں کا حال رٹم ہے۔ کچھ تجویزیں نہیں تو ایسی نظر آتی ہیں جیسے وہ آج کے حالات پر تعلیم کی لگی ہوں۔ آج بھی سرکاری عہدے صلاحیت پر نہیں بلکہ دوسرے معاملات کے سبب عطا کیے جاتے ہیں۔ سودا کے عہدہ پر بھی یہ صورت عکس ملتی تھی۔ چنانچہ:

خانقاہی کے بیل سے لے کر
شتر کے بچے کو قندیں دے

شتر چاند کچھتے ہیں کہ بیل کے دور اور اٹھانے کا وقت جس عمر کی سے وہ نظموں میں "شیر آشوب" کے عنوان سے دکھایا گیا ہے اس کا انداز ادبی ادبیات میں نہیں۔ بلکہ وہ ان کی ذرا دل یافتہ نمکنت کے اسرار کی زبانوں میں جاری کا ذکر یوں ہے۔

لجپ زار یوں کا ان دونوں ہے یہ معمول
وہ بدقت سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ان کی گود میں بچے کو اب کا سا بھول
ہے ان کے حسن طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیے مول

لجپ زار یہ ہے کہ سوائے ٹھوڑے پرستند و بھویات، اقتدار و تلمیذ کے ہیں۔ ایک طرف حضرت علی کے ٹھوڑے کی تعریف ہے تو دوسری طرف صلیب اللہ والہ کی ٹھوڑی کی عظمت۔ لیکن میں ٹھوڑے کی بھوسے سے علم پرستی متعارف ہیں وہ ہے "تمہید و تھنیک و روزگار" کا ٹھوڑا۔ جیسا کہ یہ فنی نظام کی خرابی کا نوہ ہے۔ بلکہ اس ٹھوڑے کے حالات سے ہم سب واقف ہیں اس لئے زیادہ مثالوں کی ضرورت نہیں بلکہ بھی چند اشعار کا احاطہ یوں:

نہ دانہ نہ دانہ کا نہ تھوڑ نہ سبب
رکتا ہو جیسے سب گلی خصل شیر خوار

ناحاقی کا اس سے کہاں تک کروں شمار
ماتد نقش فعلی زمین سے بجز فنا

برگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
اس مرتبہ کو بھوک سے بچتا ہے اس کا حال

کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گھوم
تصاب پر پھرتا ہے مجھے کب کر کے یاد

ایک اور کیفیت دیکھئے:

اک دن گیا تھا مانگے پہ گھڑا برات میں
دکھا جو بیاتے کو چلا اس پہ ہو سوار
جڑے سے خط بیابا و سید سے بجا سید
تھا سرد سا جو قد سو ہوا شارب پور دہر
بیچا غرض عروں کے گھر تک وہ نوجوان
شکوہ خیمت کے در سے سے کر اس طرف گزرا

گھوڑے کا یہ روپ بظاہر کسی خاص گھوڑے سے وابستہ معلوم ہوتا ہے مگر دراصل یہ تھنیک روزگار ہے اور نہ فائدہ کے نوجوانی نظام کا حال ظاہر کرتا ہے۔ غرض کہ اس کا صفت، اس کی تاتالی، اس کی سست رفتاری، اس کی بھوک کی شدت، میدان جنگ میں جھپٹے جھپٹے اس کی نفاذی و سبب اس نظام کی خرابی کی پر تو ہیں اور حضرت علی اور سیف الدولہ کے گھوڑے سے اس کا مقابلہ کیجئے تو نہ صرف دونوں کا فرق ظاہر ہوگا بلکہ شعری قوت کے اعتبار سے بھی اندازہ ہو جائے گا۔ اب ایک دوسرے جانور اچھی کی طرف رجوع کیجئے تو کھرازمہ باجی آئے سناٹے ہوتے ہیں۔ ایک عمارت کے کباب اچھے ہیں اور دوسرا لہر نہ پھٹ سکے گا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جس کسب و صیافت سے بھوک کی طرف سوراخ رجوع کرنے ہیں تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں، جیسا کہ بھوک پر شاعری عقلی اعتبار سے زیادہ اہم دیکھنا کہ بھوک ہے۔ اس لئے کہ وہ من کے جو پار ہوتے ہیں ان میں مبالغہ نمود اور اخراجی رویتا ہے انہیں کرتے ہوئے شاعری میں اندازہ نہیں آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بظاہر بہت مشکوہوں کے ذرا دل و جان کو فنی کدیر ضابطہ کدیر زبانیہ و سب کے سب کردار میں جاتے ہیں۔

لیکن قصیدے کے وہ کردار جو کسب و صیافت سے وابستہ ہیں وہ چاروں کردار کی صورت میں ذہن و دماغ کو متاثر نہیں کرتے۔ محض حسین آزاد ہیں جو اس کا موافق نہیں کرتے ہیں وہاں کچھ نہیں بولتے، بلکہ سوراخ کو اس فن کا پادشاہ کہتے ہیں۔

در اصل سودا الماطل نے بادشاہ ہیں۔ الفاظ ان کے ہاتھ میں گیلی فنی کی طرح ہیں اور وہ جس طرح کا زیور بن جاتے ہیں، تعلیق کر لیتے ہیں، الفاظ کوئی صلیب دیتے ہیں اور اپنے فنی کو میر کے ایک ایسی دنیا آتا کہ جسے جسے سراسر ان کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔ اس معاملے میں ان کا حریف آج تک پیدا نہیں ہوا اور سودا آج بھی بچے کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔

سودا کی شاعری کی تعلیمی چاکرے میں عام طور سے وہی نکات دہر بکھت رہے ہیں جو "آج دیا ہے" میں ملتے ہیں۔ محمد حسین آزاد ایک زمانے تک لوگوں کے ذہن و دماغ میں اس طرح سوار رہے کہ ان کی سرچشموں سے پتہ چلتا تھا کہ کتنا کھٹا آسان نہ تھا۔ یہ لہجہ ہے کہ انہوں نے بعض نکات میں طرح پیش کئے ہیں وہ سودا کی تنقید میں معاون ہیں۔

بھی۔ گویا میرور نجیب الطریقین ہوئے۔ شی کا۔ سلا حضرت مئی اور حضرت ناصر تک پہنچا ہے۔ "تذکرہ مراد" سے
سولف میں انجیم حاتمیں ہے کہ وہ بڑے عسقی جو طرح اور صاحب مٹی تھے۔ لفظ نے بھی "مکمل" میں لکھا ہے کہ
اگر شیخ فرید الدین غنی قلازاس کو کہ قلی کو کچھ لینے تو بیشتر کہ اندر اگھٹ قیر کو کہتے۔ ان لوگوں کے علاوہ سراج الدین جو شیخ
خان آزاد نے خوب میرور دکان کی بھائی میں دیکھا تھا اور جب یہ اسے قلازاس کی غمی کہ وہ ایک صاحب غم و دلا بھائی ہیں۔
جو کچھ ان میں دیکھتا ہوں اگر غرض میں سما قلازاس انہی تصوف میں دیکھا نہیں گئے۔

میرور نے اقتدا میں اپنے والد ہی سے تسلیم حاصل کیا تھا۔ وہ لفظ "مسم" نے "مجموعہ فقر" میں لکھا ہے کہ "مفتوی
مولاہم" مفتی نہایت مرحوم سے چڑا اور چند روز کی غریب علم اذوق کا مقام حاصل کر لیا۔ جو شیخین آزاد "آب حیات"
میں ذکر فرما رہے ہیں۔

"اول میرور کی غریب حالت کا بیان دراصل اس طرح کیا ہے کہ میرور کی حالت کا بیان دراصل اس طرح کیا ہے کہ
اور سالار کھانا اس کی شرح میں علم الکتاب ایک یہ لکھ کر کہ اس میں ایک صاحب گویا در مال ہے۔"
کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ۱۹ برس کی عمر میں جو شیخ نہیں لکھا تھا لیکن یہاں نہیں کہ میرور نے "مفتوی"
شرعی خود کو نہ لکھا کرتے رہے۔ لفظ "مسم" سے قائل ہوئے تھے۔ لیکن اس حوالہ میں کہ لکھا نہیں دے۔ ان
کا انتقال ۸۸ سال کی عمر میں ہوا۔

نفسیہ یہ طبع میں کمال کو بہت زیادہ نصرت نہیں دیتی جاتی۔ میرور اس حلقے میں درمیانی راہ اختیار کرتے
تھے۔ وہ عقیدے کے اعتبار سے اسے قول نہیں کرتے لیکن دوسروں کو اس سے دور کئے بھی نہیں۔ محسوس کا خیال ہے کہ
موسیقی اور سراج سے ان کا تعلق فطری تھا اور یہ قریب تھا کہ انہیں سلا لفظ کھنن دہلوی سے ملتی تھی۔ کھنن غریب موسیقی پر خاصی دھڑکی
دیکھتے تھے۔ اسی بنا پر انہیں سراج بھی کہا جاتا ہے۔ فریدور نے "آسرا" میں لکھا ہے کہ شاد کھنن کو موسیقی میں بڑا
اثر تھا۔ جب کہ اسے خود میرور اور لفظ کھنن کے حلقے سے متعلق رکھنے کا جرم کسی کی کسی سے پرستیں اور راگ سے دلچسپی لیتے
رہے۔ "مکمل" سے اپنے ذکر کے "تذکرہ ہند" میں گویا "میرور موسیقی سے ان کی دلچسپی کا حال لکھ کر دیا ہے۔

ان کی نظر میں ان کی تعلیق روشنی کی تھی۔ مشکل نہیں ہے اس کی وجہ خاص یہ ہے کہ انہوں نے ایک طرف
اپنی شاندار علمی روایت کو پاس دیکھا تو دوسری طرف شعر و صہب کے جھگڑے بھی نہیں پرورائے۔ ان کی خوشنویسی کا سب سے
ایسے میں ان کا ہر دست تعلیقی تصوف سے بوجھ تھا۔ ان میں بوجھ ہے کہ جہاں بھی ان کی شاعری کا ذکر آتا ہے ساتھ ساتھ
تصوف و مہر میں بھی آتا جاتا ہے۔ دراصل تصوف بذات خود ایک پیچیدہ اصطلاح ہے اور اس کے سمجھنے کی کوشش ہے۔
یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ میرور تصوف کی دوسری صورت اپنی کے حصول کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا ہر دست اور
صہب دل و عرفان آگیا کہ طرفوں کا جذب کر لیا ہے اور ایک ایسا اور ان کی شاعر میں دھڑکیا ہے جو ان کی کھڑ ہے۔

انجیم ہو کہ وہ دیکھتے تھے کہ شاعری سے زیادہ دانش کی کسمپرسی بھی تھی ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنے زمانہ
"میرور" میں شاعری کو قید انسانیت اور شان آہستہ سے قید کر دیا ہے۔ گویا انہوں نے اپنی شاعری میں ان دو صورتوں
کی بھی برائی کی کوشش کی ہے۔ وہ شاعری سے کول گولی کی طرح تلخ تک پہنچا ہے۔ وہ اپنے مضامین اور ان کی
شاعری سے غلط فہمیت سے پرے ہوا ان کے قصود سے باہر ہے۔

خود میرور سے کی تصانیف کا بیان کرتے ہیں۔ اور میں ایک اور ان امر ایک درجہ کی شاعر ہے۔ جب دوسری
کتابیں انہوں نے فارسی میں لکھی ہیں۔ "آسرا" پہلا دہلی کی پہلی تصنیف ہے۔ یہاں کہا جاتا ہے کہ یہ زمانہ انہوں نے پندرہ
برس کی عمر میں لکھا تھا۔ دوسری تصانیف میں "واہ" "مسم الکتاب" "آسرا" "میرور" "آب حیات" "میرور" "میرور" "میرور"
ہیں۔ "مسم الکتاب" اور اصل تصوف میرور کے تصنیف کی کتاب ہے۔ اس میں وہ پیچیدہ صہب کی ذہنی بحث آئے ہیں۔ تصوف
مطلق اور شمس سے ہمہ شکل بہت واضح ہے۔ دراصل تصوف کی راہوں کو اور نہ ہی ان کا انداز تحقیق ہے۔ ہر چیز کو دور کے عیاں
زندگی کی برائیوں اور کھر جیساں معلوم ہیں۔ لیکن انہوں نے "میرور" میں ان کا اظہار کیا ہے کہ عالم زندہ اور اس
کام زندہ دیکھتے ہیں اور اللہ کے مشول روشن طبع قلم چاہتا ہے۔

شعر پر میرور نے بھی نئی راستہ میں درجہ کی شاعر ہے۔
مزاج ان کا بیان ہے کہ۔

"ہر جگہ کہ جس کی طرح ہر شخص کے سامنے ہر جگہ ہے کہ ہر جگہ میں کئی بھی اس پہنچا
کا زمین والی نہیں جوت اور اس نے اس کے معرخی کج نہیں دیکھا۔ وہ نظم و نیا میرور سے سوز باطن
کو لکھتی ہے اور وہاں کا گوش شاد میرور زبان حال کی بات کہتا ہے۔"
ان میں وہ کہ کہ اشعار نقل کرنا اہل فن سے ہی کے واردات تھیں اور مزاج و مذاہن کا حریف آزاد
لکھا جاتا ہے:

کے جانتے کہ دل پہ مصیبت یہ پڑی ہے
کہ آگ کہ سمجھ ہے کہ وہ چلنے کی گڑی ہے
ہر آہ شہر باز ہے جہاں سوز چاہا
کیا آگ الہی مرے جیسے میرور پڑی ہے
اس طرح سے کہ لکھتے جو اتنے نہیں تھے
مطلوبہ میرور دیکھیں "تذکرہ" میں ہے

چھاپ ہے نہ ادبی کا نظم، ان کی زبان کا بھنگ کھڑی بولی کا ہے اور یہ بولان ہے جو
میر نے نہ شاعرانہ پر تک آج بھی بولی جاتی ہے جس میں دراصل کوئی عطا نہیں آتا ہے۔

میر تقی میر کی کھڑکیوں کے پتھر اٹھا دیکھو:

تو کہ شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
میں غم کچھ کے بیچ تو دیکھا کیا
ذکر بھی سر پہ ڈالنے کو نہیں
کس شرابے میں ہم ہلے آوار
تو کی ان کے لب کی کیا کہے
پھگڑی ایک گھوب کی سی ہے
میر ان غم ہاں گھوٹوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے
تو کی بھر جاتی میں کا یک اس میں
دل چاہا ہے کہ شک ہی بھی جاتا نہ گیا
آہ کی دل میں جکے ہے کہ پھگڑی تو میر
اسے کیا میری زبان کا لہر جوں لہجہ میں جاتا
نور پہلا غبار میر ان سے
عشق میں یہ ادب نہیں آتا
سربانے میر کے آہستہ ہوا
دھڑکی تھکے روئے ہوتے سنا ہے
ظلم ہی سے بچا سنا رہا ہے
دل ہوا ہے چراغِ مطلق کا

جو بازار سے نکلتا اچھا
رات کو میر گھر گئے تھیں

مراثر حسن کے جو لوگوں نے گواہ چھاتا کہ ہے کیا
تھے میر کہتے ہو صاحب وہی تو غبارِ خواب ہے

کچھ سوچ ہوا چنانچہ اسے میر نظر آئی
شاید کہ بید آئی، دیکھ کر نظر آئی

تو اسے کی مست ہاں دیکھ
کہیں ایسا نہ ہو کہ بحرِ فل ہو

دل کی دہائی کا کیا خاکہ ہے
تو گھر سے مرتبہ لونا گیا

اسے انوں نے اب کے کچروں کی دھپیں کہیں
دلیلیں: بیپ میرے ہیں تارِ ہر دلوں

مرے جلتے سے میری بھی میت میں
تمام عمر میں آکاہوں سے کام لیا

یاد اس کی آئی خوب لکھا میر باز آ
دیکھا بحرِ وہ کی سے کھلا نہ جانے گا

میر صاحب نا گئے سب کو
کل وہ شریف ان بھی اسے تھے

مراجم میں ایسا آگئی ہے ہمارے
نہ مرتے کا نظم ہے نہ بچے کی شادی

میر ایک تھوکی گاڑی چلی ہے کہیں میرا نہ ہی لیکن میں یہاں اس کی تعمیل میں تھیں جاؤں گا۔ میر کی ایک

یہ انٹرکسٹنگ ہے کہ جس کی بات ہے جو گزری ہوئی میں اس سے کہتے ہیں کہ $E=mc^2$ کی تاریخ ۱۹۰۵ء سے شروع ہوتی ہے۔ یہ دیکھ کر کہ پانچ تاریخ سے لگتی ہیں کہ کہہ سکتے ہیں۔

بہر اثر آئینہ کی ہم شخصیت کا نام ہے۔ عقلی حقیقی صورتیں ہماری دنیا کی حقیقت ان کے کام سے عیاں ہے۔ لیکن "روح ان اشخاص سے زیادہ ان کی مخلوق" خواب و خیال پر مشہور ہو گیا۔ جس کی تحصیل آسمان کے آرائی نورائیں عالموں سے چھوٹی کرشمہ جیسا، بہت عارف و شہساز ہیں۔ ان کی زبان و لہجہ کی زبان ہے، جس میں سہارا کی بجائے ہرگز کی کاغذی گلوب جیسا "نہاد و نیچے"۔

ہم نے کئی طرح نہ کی گئی تھی فرائی

۴۰۲

الحمد لله رب العالمين

[illegible]

— — — — —

$\frac{d}{dt} \left(\frac{\partial L}{\partial \dot{x}} \right) = \frac{\partial L}{\partial x}$

1. 2. 3. 4. 5.

$\frac{1}{\sqrt{2}} \begin{pmatrix} 1 & i \\ -1 & i \end{pmatrix}$

[illegible]

مفتی دیر بڑا گروہ بنی نہیں ہوئے کہ وہ اصل و اصل کے مسلمانانہ گویاں بنی تھیں۔ بہت کم وہ مسلمان ہو گئے کہ وہ مسلمان ہو گئے۔
 جہاں تک جہان کے مذہب کے متعلق ہے تو یہ بھی کہ اس کو کوئی ایسا مشفق ہو جس سے اس کو جو اصل کی باتیں بتا دیں تو اس کی
 ہوس۔ مصلحت کے سلسلے میں تو یہ مسلمانانہ ہو چکے ہیں کہ ان کو جو حق پر ہے اور ان کے پاس ان کے لئے کوئی چیز ہے جس
 مصلحت کے لئے ان کو ان کے ساتھ ہے وہ ان کے لئے ہے اور ان کے لئے ہے (تاکہ ان کی سزا نہ ہو)۔

گت و ہوا کے نکلنے کے سرطانی تکیہ غری میں بہت پہلے غری میں پہنچے ہیں۔ ملاوٹی مٹی کی انقلاب مشورہ میں اصل و ہوا کے احوال پیدا کیے ہیں۔ وہ سناٹا ہے۔ ہوا میں کوئی کواخی تصور میراڑ کے ہوتے ہیں۔ تصور میں مہل ہوتا ہے۔ ہر جہاں میں جسٹس کی لکھ اور لکھ کے تصور میں ہر اڑانے کے اور پہلے کے کسی نام سے کہیں۔ لیکن ہاتھ اور کھوں ہر جہاں سے "قباہ و قباہ" کی تھوڑی سی ہے اور جہاں کوایہ طویل سلسلہ قائم کیا ہے۔ لفظی جہاں کے شکل سے کہ طویل ہوتے ہیں۔ جہاں کے تصور میں ہر جہاں کشمکش کی ہے اور اس کا علاقہ ہوا کی مشی پر کیا گیا ہے۔ جہاں ایک مرکز کی مثال لکھ سوال قائم ہوتا ہے کہ طویل اور جہاں کی جہاں ہے صورت و لکھ کی تھوڑی ہے جس کی صورت میں ہوا میں ہوا ہے۔

[illegible][illegible]

غلابِ خیال - میراث
بہا عشق - مرزا شوق

پہار عشق - مرزا شوق

تجواب و خیال - میراث

اسماء بنت ابی بکر

تھا۔ پہلی میں ہاتھ دیا

ایسا محسنی ہوتا ہے کہ ایسا ہی جہاد پر دلی تے باغی کا اہل کی روایت کا اثر ہے۔ لیکن اس زمانے کی شہرہ میں ہونا کوہ اور ہونہ کی کیفیت پائی جاتی ہے اور جیسا کہ یہ صورت ہونے لگی ہے۔ خبر کا نام ہونہ کی کہ آگیا۔ لیکن اب ہونہ کی شناخت افسردگی یا حسرت یا اس کی وجہ سے نہیں بلکہ صاحب ہونہ کی وجہ سے ہے۔ وہ جیسا کہ واقعیت اور اس کی راہنمائی سے ان کا خلاف اور ان کے مزاج کی مختلف اشیاء ایک ہی راہ پر لگا رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے یہاں علمی امور اور امور دنیوی پائے گئے ہیں اور وہ کل کھیلنے کے انداز میں شعر کہنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اتفاقاً کے دربار سے میں وہ اپنے حالات میں بھی جو کس نفرت آتے ہیں اس لئے کہ میرے جواہر ان اظہار کی قیاد و انداز ہون بہت سے شعرا کی طرح تھے۔ میں جہاد بھی تھا۔ لیکن یہ بھی میری صورت نظر آتی ہے وہ بھی عشق و عاشقی سے بہرہ ور ہے۔ چند اشعار دیکھو:

کیا کہ کے اے کے ہے جو کہ اسی کے لگ چلوں

میں نہیں پر ہے ہو شوق و اپنے تیری نہیں

مرفط صلیب کو مے من کے بعد باز کیا

ہو تھکتے نہیں بلکہ ہے تو سوائی کیا

جس نے پائیں بھی ہونے نہ اور چلنے کی راست

وہ نہم کیوں کہ ہوا اہل کو کوہ ہونا

اس صاحب سے کیا تھکا ملاقات نہیں اور

میں نہ تو سو نہ تے رو راست نہیں اور

جن اشعار دیکھے ہیں جو جہاد میں مدد کے قیاد کر رہے ہیں۔ اور اصل قیاد نہائی سنی سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ اس نے خود شعری تحریر کی ہے۔ لیکن میں جو اس کے منہ کی لگا میں رہتے ہیں اور ان کے نصیب قرار میں نہ لکھی ہے انہیں شعر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور قیاد ہونے کے جہاد کے یہاں صاحب صاف صاف طریقے پر جہاد سے۔ وہ جہاد کے کھیلے میں جس طرح دشمن کو مٹا رہتے ہیں۔ وہاں دشمن کی کوئی حراج نہیں۔ یہاں تو ان کی بہت میں مردوں نے جہاد سے ہونے ہے۔ کوئی شاعر نے بھی ایسی صورت نہیں دیکھی لیکن میری اس ہستی تصور اب کے وقت میرا پستی کی بھی جیسے لکھا ہوا ہے اور مجیب نہ کر کی صورت میں ہو سکتے ہیں۔ جہاد ایک طرح سے ایسے حالات میں لگتی ہے جس اور اپنی سیاست میں عورتوں کی دلشادوں کو اپنے شعر کا جزو بناتے ہیں۔ کہ اگر وہ اپنے احسانات میں شہرہ لکھیں اور کھیلے اور شوق کی صورت سے کہ لے لکھیں ہونے کی نہ مری ہو رہتی کی تا مری ہو کر وہ ہونے ہے۔ یہی ہے کہ میرے کتب سے متعلق کہتے ہیں اور شوق سے لکھتے ہیں کہ یہ ہیں اور اور اوروں کے پسند و ناپسند

اور۔ حالانکہ یہ خیالات کل طور پر درست نہیں۔ یہ ہے کہ ان کے یہاں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو صوفی ہونہ سے بہت ہیں۔ پھر بھی ہر اور شیعہ کی شہرہ کی نہیں کی جاسکتا اس لئے کہ ان کی مشہور گوہر میں کہ ادب اور طبیعت میں عورتوں کے علمی ملاپ کی خواہش ہر زمانہ رہتی ہے۔ چند اشعار بھی دیکھیں:

دل ہے چہ ہنگامی جائے صاحب نہیں کر

وہ دن کے واسطے ہو کوئی شراب کیوں کر

کل واقع کار اپنے سے دو کجا تھا بہ بات

جہاد کے جو گھر رات کو مہمان ملے ہم

کیا ہائے کبوتے نے کیا ہم پہ کیا سر

جو بات نہ تھی۔ نے کی رہی تھے ہم

گو وہ نہ ہوں دیکھے ان کی آواز میں

کس کس سوت کی کہ تھی اپنی زبان پہ تھا

دل ہوش کو خواہش سے تھارے در پہ آنے کی

وہاں ہے لیکن بہت کہتے تھے کہ کی

نہ جواب لے کے قصہ دار چہ شراب انا

میں نہیں پہ ہونو اور بعد از شراب انا

تربہ ہر شے روئش کی کیا ملا کہ مری

اور ہے شہر جو ہوا اور ترح شراب انا

وہ افانگی میں تے نہ لکھے کھتے ہے دقا ہر

مری ہونگی ہے صاحب پہ چہ خطاب انا

جہاد میں مسیعیہ کا مل پر ملا کان کا یا ہے

جہاد ہم پہچان ملے کچھ دال میں کلا کلا ہے

جہاد نے ہر شراب بھی لکھے اور خوب لکھے ہیں سے متعلق دار کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ

ایسا محسنی ہوتا ہے کہ ایسا ہی جہالت پر دلی کے باغی کا اہل اس کی روایت کا اثر ہے۔ لیکن اس زمانے کی شہرہ میں سزا کو نہ دیا اور نہ جہالت کی کیفیت پائی جاتی ہے اور جہالت بہت ہی صورت ہونے لگی ہے۔ خبر کا نام نہ دیا گیا۔ لیکن اب علماء کی شناخت ضرورتی و اس کی وجہ سے نہیں بلکہ صاحب زندگی کی وجہ سے ہے۔ وہ جہالت سے واقفیت اور اس کی راہنمائی سے ان کا مخالف اور ان کے مزاج کی مختلف اشیاء ایک ہی راہ پر لگا رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے یہاں علمی امور زیادہ پر پائے گئے ہیں اور وہ کل کھیلنے کے انداز میں شعر کہنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اتفاقاً کے دروازے میں وہ اپنے حالات میں بھی جو کس نفرت آتے ہیں اس لئے کہ میرے جواز ان اظہار کی قیاد و انداز بن بہت سے شعرا کو کٹر کر رہا جس میں جہالت بھی تھا۔ لیکن یہ بھی ظہور جو صورت نظر آتی ہے وہ بھی عشق و عاشقی سے بہرہ ور ہے۔ چند اشعار دیکھو:

کیا رک کے اے کے ہے جو کھ اسی سے لگ چلوں

میں نہیں پر ہے ہو شوق و اپنے تئیں نہیں

مرفط صلیب کو مے من کے بعد باز کیا

ہو تھکتے نہیں بلکہ ہے تو سوائی کیا

جس نے پائیں بھی ہونے نہ اور چل کی رات

وہ نہم کیوں کہ بہا اہل کو گود دیا

اس صاحب سے کیا تھکا ملاقات نہیں اور

وہ نہ تو سو نہ رات و رات نہیں اور

جس اشعار دیکھیں گے ہیں جو جہالت میں مدد کے قیاد کر رہے ہیں۔ اور اصل تر اس کی سنی سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ اس نے خود عشق کی کھینچتے ہیں۔ تیغ میں جہالت کے منہ ان کی کا میں رہتے ہیں اور ان کے نصیب قرار میں نہ لکھی ہے انہیں شعر میں دہرائے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور وقتا ہائے کہ جہالت کے یہاں صاحب صاف صاف طریقے پر جہالت سے۔ وہ جہالت کے کھینچے میں جس طرح دشمن ہونا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے دشمنی کو ملوث حراج نہیں دیتے۔ یہاں تو ان کی بہت ہی عیب و مرادوں سے وابستہ ہوئی ہے۔ کوئی شاعر ان میں ایسی صورت نہیں دیکھی لیکن یہ عیب اس کی تصویر کے تحت سرا پائی گئی ہیں ایک لعل چاندنی اور محبوب ہر کی صورت میں ہو سکتے ہیں۔ جہالت ایک طرح سے اپنے حالات کو اپنی کرتے ہیں اور اپنی سیاست میں عیبوں کی تلاش اور اپنے شعر کا جزو بناتے ہیں۔ کافر کو اپنے احسانات میں شکر ادا نہیں کر سکتے اور ذہنی کی صورت سے کہ لے لیکن یہ بات سنی کی نہ مری ہو رہی کی تا مری ہو کر وہ جاتی ہے۔ یہی ہے کہ میرے کتب سے ہمتی کے ہیں اور جہالت یہ کھینچتے ہیں کہ یہاں اور ان کے اندر ان کے پسند و ناپسند

اور۔ حالانکہ یہ بیانات کلی طور پر درست نہیں۔ یہ ہے کہ ان کے یہاں اپنے اندر کچھ مل جاتے ہیں جو وہ خود بخود بخود سے ہے۔ یہ ہے کہ ان کی ہرگز ہرگز ہرگز کی جانشین اس کے کہ ان کی مشوروں کو جو ہیں کہ ادب اور طبیعت میں غریبوں کے علمی ملاپ کی خواہش ہو جن وقت ہے۔ چند اشعار دیکھیں:

دل ہے کہ ہنگامی جانے صاحب نہیں کر

وہ دن کے واسطے ہو کوئی شراب کیوں کر

کل واقف کار اپنے سے دو کجا تھا بہ بات

جہالت کے جو گھر رات کو مہمان ملے ہم

کیا ہائے کھینچنے کے کیا ہم پہ کیا سر

جو بات نہ تھی۔ مے کی رہی مے کے سر

گو وہ نہ ہو رہے تھکے ہیں تہذیب

کس کس سرے کی کہ تہذیب اپنی زبان پہ تھا

دل جوش کو خواہش سے تھارے در پہ آنے کی

وہات ہے لیکن بہت کہتے تھکے کی

نہ جواب لے کے قصہ دار چند شراب ادا

میں نہیں پہ ہنسی اور بعد از شراب ادا

ترک برداشی و تماش کن کیا ملا کہ مری

اد ہے شہر جو دھرا اور طرح شراب ادا

وہ افانگی میں ہے نہ کھ کھتے ہے دقا ہو

مری زندگی ہے صاحب پہ عکس صلیب ادا

جہالت میں پیچیدہ کا مل پر ملا کان کا یا ہے

جہالت ہم پہچان ملے کچھ دال میں کلا کلا ہے

جہالت نے ہر آشوب بھی کھینچ کر خوب کھینچے جس سے حلقہ دار کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ

جب انہوں نے مصحفی کی مفاہرت کی اور وہ ٹھکانے سے نکل کر صدمہ برداشت کر کے، لیکن ایسے کرم کے وجود مصحفی کے ان کی غائب ہو کر ان کی جگہ شاعر کی آہلی کر کے گئے۔ جس کی تعریفیں بعض انہوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

محدثوں نے ان کو اب "عزیز" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ یہی اور ہے جب ان کی جلی پر پناہوں کے تعلق کی بات کی گئی، انہوں نے "دراہم ہندی" کی تعریفیں کی ہیں۔ جو ان کی قیاد کا بیج بھی ہے۔ میری مراد "دراہم ہندی" کی کہانی "اردو" کے بارے میں ہے۔ "عزیز" کے نام سے یاد کرتے ہیں، ایک چلاک شخص ہے وہ ان کی صلاحیتوں کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کے لئے مصحفی کے آواز سے ان کا عقیدہ کیا ہے کہ اس طرح وضع ہے اس کے منصب کا تمام اہمیت ہوئے ان کے جان لوگوں کی پکڑیں اچھلا گئیں۔ اس سے دور رہتے تھے۔

ان کے حوالے میں "تفصیلی" کی رو سے بھی کئی کئی گز آنے والے تھے۔ ان کے انداز میں، حوالہ دیتے تھے۔ لیکن اس طرح کے حوالے کے لئے کہ ان کی مرے میں، یہ احتمال کے قائل ہوں، اور حوالہ دیتے ہیں کہ ان کے حکم پر ہی کی مزاروں کے قتل کے بارے میں سازشیں ان کے عقیدہ کی بنا پر ہیں۔ ان کا احتمال انہوں میں ۱۸۸۸ء میں ہو کر ان کے ایک شمارہ میں ان کے بارے میں لکھا ہے۔

"نیا کھنڈ" کے نام سے یاد کرتے ہیں، ایک شخص کی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی بڑی زار و بازو کہا گیا۔ ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شخصیت کے بارے میں ان کا حوالہ دیتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ ان کی زبان ان کی زبان کو بیان کرتے تھے، لیکن ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

ان کا ایک ایسے شاعر ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

اوں کا ذکر ہے اور انھیں ذی غم بنا دیا گیا ہے۔ اخلاقی و آداب کی کبھی تعین کی گئی ہے۔ تذکرہ نگار مسلمانان حسن میں، امر نے اس کا اظہار کیا ہے کہ میر حسن مولیٰ، مسکینی اللہ کی سرکار میں ملازم تھے۔ گویا ایک امیر تھے اور ان کے زانیہ و غلامان و امیر رہے ہوں گے۔ پھر نے اپنے بچہ کر کے "غوث سرگندہ" بنایا تھا ہے۔

"ظاہر مسکینی نفس، غراب مرزا مرزا محسن، ہوش علف، صحتی خواب مرزا علی خان، بدویر فضل و کمال ستارہ صاف و صاف، اندھ سب اور سب ان کا تاج خراج و بیان کا تاج۔ چرخا مرید اسی سرکار میں مثل میں من و طالب علی خان علی مریدان مسکینی ذکر ہے۔ جب کہ کتاہ شوی ملکی بھون اور دیوان متع تھا، ان امیر و نثار سے پایا کہ ہے۔"

ہوں میر حسن سے ابے کلام پر اس طرح کہتے تھے۔ مگر وہ مسکینی کے شاعر نہ ہو گئے۔ مسکینی نے ہوں کے ہوں متعہ و ایک متعہ کے کا ذکر کیا ہے "ذکر ہرم" کے بیان میں ہے اس مشاعرے کا ایک جگہ ہے بھی شاعری میں قابل۔ جس میں سعد نام شاعرین کی فہرستیں تھیں مگر پھر بعد از علی خان افغان و چین مرزا قاجار تھیں مگر انھیں نہیں۔ بعد ہر مسکینی ہوں کا انتقال کس حال ہوا اس کی صراحت کرتے ہوئے "تذکرہ شہرہ" میں اس طرح لکھا ہے کہ ہے۔

"میر تقی ہوں یا مکتوب شاعری ہوں۔ مکتوب سوز و گداز کی تھے۔ روزے پھر است کہ از اس

دار و دیوار تھے۔"

اس تذکرہ کا سال تصنیف پیرلی فہرست علیہ النور شہرہ کی الف ۱۲۳۷ھ اور جب ۱۲۵۱ھ کے درمیان ہے پتا چلے جاتا ہے جس نے ہوں کے انتقال کی تاریخ ۱۲۳۵ھ کے اس پاکر بتائی ہے۔

ہیں کا ایک ضخیم کلمات ہے جس سے ہمیں کچھ پتہ چلتا ہے جو ان کے خلف کتبہ خوں میں پائے جاتے ہیں۔ حسرت ہو جاتی ہے ہوں کا ایک انتخاب شاعری کا قرار سید نہیں جاسکتا کیونکہ ہے کہ۔

"ہوں شعر کے قریب کی آفریں کا تھے۔ ہوں کا سلسلہ مسکینی سے ملے گا۔ بہتان بہر تک پہنچا ہوا ہے۔ مکتوب کے نظائر، احوال، افکار، ارادے اور تہذیب کی عکاسی سے پھر شعری طور پر شاعر ہونے کے اور جویر تھی مگر وہ بہر حال اور مسکینی کے بقول کی شان کی حسرتی ہوا۔ غزل، مثنوی کے ساتھ مکتوب میں اوں نے نمایاں کی اس حال اور ہی جگہ مشکل سے ملے گی۔ اں کے افکار سادہ اور عام فہم ہوتے ہیں جس میں ہوں کی دلچسپی اور لطافت چلی جاتی ہے۔ افکار و بات، آواز کی مضامین، معنی، بدش، کجانی، تہذیبات و کثافت اور خوبی و ایمان و ایمان میں ہوں کا کام آپ ایشیہ آباد ہے۔"

• "تذکرہ غوث سرگندہ یا شہر تب، حقیق قریب ۱۲۵۱ھ" • "تذکرہ شہرہ" مادی طبع

• "انتخاب کلام ہوں" • "پہلیاں سب میں۔"

ہوں کی شاعری "مکتوب" "شہرہ" میں ہیں انھوں نے اپنی ادبی حیثیت کا اظہار کی کمال کے ساتھ کیا ہے۔ چہ ضرورتیں شعری "اسرار" "پہن" کے رنگ میں ہے۔ کلیا، ہوں کی اشاعت طبعی و عادی مکتوب سے ۱۸۳۵ء میں ادبی تھی۔ اس میں پیرا کی شاعری کی حسن و جمال کی صورتیں نمایاں کی گئی ہے۔ ہذا رات و احسان کی وضاحت میں بھی ذرا غم دکھائی گیا ہے۔ کثیری میں "اسرار" میں ہیں اور ان کے مسائل کا ذکر ہے۔

غزلوں میں ان کا رنگ مگر اس نظر سے ہے مکتوبی حراج و متعین کا انداز ان کی ہر غزل سے پایا جاسکتا ہے۔ کہیں کہیں غزلیں چنانچہ لکھی گئی ہیں۔ ایک غزل کے چند اشعار نقل کر رہا ہوں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہوں کے کلام میں بیاد و احساسات کی شہر آج کے عوار و افکار کے روح کی ایک عکاسی ہے۔ افکار و ملاحظہ ہوں:

آئے ہیں بہت دور سے عشق جہاں ہم
مرضی ہو تو ایک لا مگر دم لئے لکھ جہاں ہم

صدا ہے نہ مسکن ہے نہ مگر میں وفد
مگر کہلے ہیں مدد و مدد سے جہاں ہم

احوال جہاں بہر خدا کوئی بنا دو
ہاں آئے تھے کس واسطے جاویں گے کہوں ہم

جا مگر کس غم کمانے کی منزل ہے وہی ایک
کہہ جہاں وہی کرتے ہیں اسے مسلمان ہم

اسے فخر! سمجھو تو کا میں جا ہے
تک ہے کہ ہاں جاتے ہیں آنکھوں سے نہیں ہم

شیخ امام بخش ناسخ

(۱۸۵۲ء—۱۸۴۹ء)

شیخ امام بخش ناسخ کے سلسلے میں بعض اشخاص بھی تھے۔ اشخاص میں ہو گئی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم مولیٰ ہے کہ ان کے بیٹے تھے۔ ان کے آقا پیرا کوٹا کا تاجا ہے۔ والد کے سلسلے میں خدا بخش اور ہی قریب اور کا امام ہے۔ لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ ناسخ ان کے بیٹے نہیں تھے۔ یہ جگہ کی بات ہے کہ ناسخ کو اس سر میں جو کتابچہ اور کتبہ جس خدا بخش کی مراد ملی اس لئے وہ ان کے بیٹے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

زین میں داغ کے پڑا شعرا لکھ کر دیوں:

چھوڑ کر اپنی معنی کر تو بیخ اختیار
 جب مجھ کے متاسف کا ہے کم عذاب سے
 پادشہ آپ دہانہ ہو سراگ سال ہے
 ملے ہو ت ایک کام جو کو آسپا ہے
 جو دل ہی نوٹ کیا کیا ہو شعر ترپیا
 ہوئے ہیں طاری شکر سے کب شعر پیا
 عشق چشم باد کی ہر دم سے جگر
 شری ان لڑی ہے مجھ کو ہر دم کے کھار کا
 کسی کا کب کوئی روز یہ میں ساتھ رہا ہے
 کہ میرا میں سارے بھی جہاد ہے ہنس سے
 انہی تک جا سے بھلیں بچے نکلیں
 آپ نے دھوئے جو ہر ایک کے کلا سے ہاتھ پاؤں
 دفر ہیں ہم ایسے کہ نگ جانے جو چینی
 اگلے نہ اگلا ہوا زار گئے میں
 می لڑا رہا ہے کسی ہی دہی ہو سنگار
 خار چلے ہے تو ترع کو کھن سے کم جی

سعادت یار خاں بر قلین

(۱۸۰۰ء)

سعادت یار خاں نام اور دیکھو قصہ غزوان کے اندر طہاسر ایک خاص ہے۔ یہ جہاد کی فتوح کے ساتھ
 تواریخ سے چند داستان سے ان کی ہر افسانہ وقت بہت کم تھی بلکہ یہی چند داستان کے مختلف علاقے سے جوتے ہوئے دینی
 آگئے۔ طہاسر کو کسی صاحب حاصل ہوئے۔ ہاشوا جنگ کا خطاب بھی ما۔ ۱۲۰۳ میں شاہ عالم نے ان کے اسے ایک

سفر میں ہم بھی نکالی۔ جس کو تحصیل تعلیم نے اپنی کتاب "طہاسر" میں بیان کر کے طہاسر کا چند امراض سے بگیا
 امارت اور چارہ دہشت کے جہد میں اگلا اور ان کی تعلیم اور بہت سے غافل تکر ہوئے۔ انہیں کی بھی امداد ملی جسم امارت سے
 ہوئی۔ لیکن یہ گری کی بھی تعلیم ملی کی۔ طہاسر ۱۲۱۵ھ میں فوت ہوا ہے۔ شب شمع کی ہفتہ ۳ سال قبل۔ اپنی امداد ملی غیر کا
 حال خود بھیجے نے پس بیان کیا ہے۔

"..... عرابہ میرا من حکم اللہ اور طہاسر ایک خان اسکا دہشتک بہادر دینی وہ بھی تھا
 کہ بہادر کے لشکر میں اس زکر اور اپنے باپ سے تعلیم ہوا تھا۔ جب وہ ہندوستان میں
 آیا تو اسے اللہ تعالیٰ جل شانہ نے ثروت اور اوج سے فرمائی تو مجھے اور میرے بڑے بھائی یعنی
 نواب سید اللہ اور سولی اللہ یار بیگ تھے بہادر شاہ سے جنگ ہوئی کہ پانی میں اس بارہ
 بارہ برس کے تھے تو چار کھڑا مات ہوئی ہے سے اسکا اور لشکر سے باہر نہ کر سکے وہی چار
 باہر کر کے ہر ایک کی سے آگاہ اور آواز کرتے تھے اور تھیں۔ کے دھوئے اور نکلیں اور
 رہنے سے تعلیم کرنا تھا۔ میرے کے ہوتے ہی لشکر میں آکر اپنے اور باری امور اس کی اور
 کرنا تھا اور اس اس فراموش اور دہشت کے سب طرح کی موت کی اور دہشت آٹھ کر ہر ہر
 کی ہم دونوں کو قتل کرنا تھا اور سولی میں نہ گری کا اس سے پانی نہ ہا تھا کہ جس سے اسے
 خزانہ آگاہی تھی۔ سوائے ایک اور چاروں گری ہو گئیں اور کھار اور غم غیر کے کہ اسے
 کہہ تھے یہی حالات میں نہایت کم ہیں۔"

اس طرح دیکھنے کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ ایک انعام سے کے مطابق دیکھنے سے چند سال کی عمر سے شعر کہنے
 شروع کیا۔ کتب کا پہلا دیوان ۱۲۰۲ھ میں غزل اور غزل کا ایک نوٹی لکھیں شعر کا غزل سے بھی غزل بھی
 ہوئے۔ ان حالات میں جب وہ شاعری کم ہیں ہوتے تھے بھی شعر کہتے۔ میر خاں اور دیگر خاں مراحل طے کرتے رہے اور
 آخر میں ملازمت ترک کر دی اور نہایت پرہیز آئے۔ ۱۲۰۳ھ کو ۱۲۱۵ھ کے ہندوستان آگئے اور چند
 طہاسر لکھا۔ کے ہندوستان سے واپس ہو گئے۔ شمع خزانے کے ہضم میں تھے۔ لیکن انہوں نے امارت میں غفلت کی اور
 غفلت کی کالی قلم چپ کر لی تھی اور انہوں سے اپنے جہد کو کھول بھی کر لیا۔ لیکن غفلت میں رہے۔ ملک اللہ کے
 انتقال کے بعد مختلف علاقوں میں گھومتے رہے۔ شمع بنگال میں بکھرو۔ کو لپار آگئے اور خان دہلی۔ صریحاً ان کے زمست
 اختیار کر لی۔ پہلا زمست ۱۲۱۲ھ تک قائم رہی۔ اس دور کے لکے روانہ ہوتے چاہتے تھے لیکن نہ ہو سکے۔ اس کے بعد
 امانت آگئے۔ اس وقت میں کی عمر ۳۰ سال کی تھی۔ لیکن اسے کراؤ کہ اس کی عمر بڑی اور نہ تھی کہ ایک جہاد اور دہشت
 کی کہ اور دہشت پر چلے گئے۔ اس نے ایک کھار لکھا۔ کہ اسے کہہ تھے کہ اس کے ہر کتب میں آکھوں اور چلیں۔ اور

قرآنِ قرآن سے اور پھر دکان سے
 کمر مر رہے رشتہ نام سے بہت کا
 رشتہ کئی الی دھمکی کی یہ انکار ہے
 سہ چڑا تا ہے سہ انکا بیا کس واسطے
 وہ بچہ جانا تھا دھمکی میں چڑ
 اس کو قزاقوں نے تو قمار سے کیا
 تو ایسے دلی اس کی جہاد نے نکالی
 اور کہا ہے بچے کی جہاد تو دلی
 غلبہ کے ہاتھ سے لا یہ ناک میں ہے دم
 کو کھانے سے دھمکی کچھ ہی میں ہے علی کی قسم



انیسویں صدی عیسوی کا ادب

انیسویں صدی کا سیاسی منظر نامہ

[illegible]

یاد رکھئے کہ یہ کتاب ہے گناہ کا، میں داریں کے کلاخ میں آ کر کوئی گناہ نہ کرنا چاہئے، قرآن میں یہ ہے کہ عاقبت
نہایت میں نہیں اور میں گناہ کا میں داریں کے کلاخ میں آ کر کوئی گناہ نہ کرنا چاہئے۔

یاد کیا گیا۔ جنگ کے بعد صورت حال اور بھی خراب ہوئی۔ دانشجووں کو سرے سے خطرہ چاہی کہ جنگ کے بعد تعلیمی صورتوں میں جو طرزِ فساد پھیلے گا، اسے عامی طور پر تھوڑے دنوں کے بھی اندازہ کرنا چاہی لیکن انگریزوں نے اپنی سخت

پہنچیں مگر تھکے۔ وہ آواز اُٹھو مگر انہوں نے نہ کوئی جھنجھٹے کے لئے کی گئی تھی۔ لیکن ان طرحوں کے پیچھے
 جتنی ان کی سازش پہنچائی گئی تھی اسکا ہتھیار چار ہندوستان اپنے دربار میں منتقلی سلطنت کے زوال اور کھینچ کر اس
 دیکھا تھا اور ان کے دل میں ایک طرح کی جبرائلیں مروجہ تھیں۔ پچھلے کے لئے چاہت تھیں اور اس کی تلاش رہے تھے اس
 لئے اس مگر براہِ راست ہی کہ جس وقت کہ تھکے اور وہی طرح سے ان کا دل بدلتا تھا۔ ان کا کام کمزور اور بے
 کی جانتا تھا کہ اس کی صورت میں خود پر ہو گئی تھی۔ اس کی ایک ایک گارڈ اور اس کی اس نے کہا ہے کہ۔

انگریزوں کے سامنے سرحدوں کی جنگ یا ایک طرف سے کہ انوں کا کشادوں کی شہر علی
تو ملی نہیں تھی۔ یہ لائی کہ جب کہ اور نسل کی لڑائی تھی اور ایک دوسری جگہ سے جو کے کہ اور جگہ
کے لئے ایک انتہائی جنگ تھی۔ فوری سبب وہ جی کے لئے ہوتے کا تو اس تھے جن کے اور ایک
خوب چڑھا رہا تھا۔ کا تو اس چلانے سے پہلے اسے راست سے کٹ کر کشادوں کا قلعہ بنایا
کہ تھا لائی کا فکر قبول میں کی ہو جی کے جی کوئے اور سہو کی تھی۔ گائے پھر ان کے لئے مقدس اور
سورہ مسلمانوں کے لئے حرام تھا۔ یہی وہ جنگ تھی جس نے بعد عثمان بن احمد اور ان کی شہر اس
شہر آج تک لائی۔

[illegible]

ایک بحث پاٹھ کی جا رہی ہے کہ کیا جنگ کی کیفیت کو اتنی رعایتوں میں غائب کرنا جائز ہے؟ لیکن اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ اس کی وجہ ہے کہ ملک اور اس کے عوام سے حکومت کی اس بات کی راجح توقع نہیں۔ مسلمانوں کو بھی ٹھکرا رہے ہیں چنانکہ اسلامی کے عقائد اور اہل حق کے عقائد میں جہاد کا تصور درج ذیل روایات سے نکلتا ہے جو صحیح ہے البتہ اس کی ہر جگہ بھی اہل اسلام کے عقائد و روایات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ جہاد کا مطلب ہے کہ کفار کو ایمان دلانے کے لیے لڑنا ہے۔

”ہاں کہیں سے! لیکن حکمت کے اسباب میں درجہ اولیٰ شہا اختلاف ہیں اور مسلمانوں میں

تفرق ہو رہا ہے اور راجہ اس کے کہ جتنی سپاہیوں نے لڑا تھا، یہاں بھی، شکست کو فراموش کیا۔

۴۰ صاحبِ نورانی جیسا کہ فیہ لفظ تھا، طرحِ مگر چاہیں، کے پڑھتے، لکھتے، اور سناتے تھے۔

یہاں پر یہ حال تھا کہ جو زمین لاکھوں انگریزوں کے ساتھ تھی کہ ملی جھگڑتے کے لئے نفرت نہ رہا تھا۔

چھانکھیں۔ اس سلسلے میں اپنی حیرت تصویر (انٹرنیٹ) میں شیری کے سنے ٹیڈ کی ہے، جو تھی ریواں نقل کہہ رہا ہے:-

۱۹۴۸ء میں دلی سے تھوڑے دنوں کے بعد آئیں۔ اس مقام (A Thomas Hotel) نے جب ان کا نام لیا
 علاقہ میں مقیم کرنے کے لئے تمام بڑے چاروں کے اس وقت دلی کے لئے چاروں کو دلی سے لے کر
 ملک کا اعلیٰ شہر دارا پور میں مقیم کیا گیا تھا۔ اس کی عمر ستارہ پانچ تھی۔ محبت کے اہتمام سے وہ
 مکہ واپس آئے۔ ان کے بعد دارا پور میں مرزا محمد علی علیہ السلام کا مکان تھا۔ وہ تیس برس کا تھا۔ دارا پور
 کے مقام پر ایک مسجد میں تھا۔ دارا صاحب علیہ السلام فرماتے تھے۔

مرزا آغز علی خان قزوینی ان قواعد کو نقل کرنے کے لئے چاروں کو یہ قیادہ دیا کہ ہر شے کا اصل نام لکھ کر لے کر لے لے بھی آدھ قاسم پر ضرور لکھی گئی کہ عید کے بعد ان کی بادشاہت کا خطاب اور دیگر حقوق برقرار رکھے جائیں، جو اس کے اہلکار کو حاصل تھے۔ کچھ ایسی اور شہزادے کے بھی یہاں اس مسئلے میں ایجنہ معاذ، ۱۳۴۱ھ (۱۹۲۲ء) کو لے کر آئے، لیکن ان کو اور جلالی و شہزادہ کاغذدار کے پاس ایک نمونہ سے یہ مسئلہ پیش کر دیا گیا۔ اب یہ امر مشاہدہ کرنے سے ظاہر ہے کہ جو ان وقت کو بادشاہ جلالی کے لئے لکھے گئے تھے، وہ اس کا اورادہ قاضی کو دیا تھا، لیکن اس کا یہاں بھی اصل نہ ہو سکی۔

مرزا فخر اللہ یونانی کی موت کے بعد سنے جانے والے پہلے سے مختلف شرائط کی تھیں۔

اسے نہ بیاہیں۔ یا شاید کسی جگہ بڑا کہیں بیٹھیں۔ دیکھا کہ سنا کہلائے۔ کھڑے ہو کر دیکھا تھا۔ یہ وہ چارہ ہے
 یا نہ! لاؤ اسے کہیں رکھیں۔ گھر کے قریب وہ خانہ خرمی ہو کر کھانا کھا۔ اس کے ہاتھ بچنے کو اختیار دیکھا تھا۔

اسپیلڈو وٹارڈا میں برطانوی افکار اعلیٰ کی برقراری مسئلہ ہو چکی تھی۔ عظیم اقتدار کی روایت

علاوہ اسی کے کہ اس طرح کی تعلیمی و ترقیاتی کوششوں کے ذریعہ جو بھارت کے اندر اپنی بھارتیہ شناخت کا تقاضا ہے۔

جرم طاقتوں کے مرکز کے قبضہ سے نکلے لاسے کے ان نظامات کو مکمل کر کے لئے تھے۔ مطلق شمولیت کا وہ علم ہمیشہ

کے لئے نعم ہو چکا تھا۔ وہ اس فطرت کو گما فیما رہا کہ اپنے لئے پائل غواہ تیار ہو چکے تھے۔ لیکن کے

السرہانی نے خلیفہ سعدی کے مرنے پر اسی کو اقتدار کے تمام باہر کی کتابوں اور شکستہ روضہ کی رسوم

ہے وہاں ملک مہر دم ہو گیا اور ان کے ملک کو قوت پسندی کی سوچ سے ان کا پلٹا ہے کیا عا پودا حاصل والا دیا

ہمارے دیہات، علاقہ مرزا پور اور اسی نامی آخری سسٹم کا فیصلہ عدالتوں کی ایک آزاد پالیسی کے بغیر

وہاں پہنچ کر ان کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔

وہی ہے جو ان کے لیے ایک نیا عالم بنا دے گا۔

جواباً لہذا لکھا ہے: "الترجمہ کا معنی ہے کہ جو کچھ لکھا ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔"

”چون کہی سے تھوڑے تک احمد پڑھا، چوڑی کی کوئی ”قولی“ تو دل پر اسے نہ لگے اور اس کی دلی توجہ ”۱۲۰“ پر رہی۔“

● "200 سالہ سوانحیات" (1954ء تک) (انگریزی میں) کی تصنیف، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، 1997ء

(1) 证明: $\lim_{n \rightarrow \infty} \frac{1}{n} \sum_{k=1}^n f\left(\frac{k}{n}\right) = \int_0^1 f(x) dx$

"اور ان کے علاج، دلائل، حوادث و طرائق، عنایہ، تالیف، ہر ایک احوال کی پرکھت، یہ تحریریں قرطبی از طبع و مخبر و شریعت کا کتب خانہ ہے۔" چپ ۱۲۴۳ء مطابق اپریل ۱۸۰۹ء بمصر میں دیکھے دار ہیں۔

ما گاہ دیکھا کہ ان سے کہے:-

[illegible]

۱۲۱۲۔ جس مذہب کا کہنے کے واسطے یہاں لکھا گیا ہے، اس کا اثر ہونا لازمی سے کچھ ہی زیادہ ہے۔ البتہ

Complex شقیں نکلتی دیکھا اُن جیسا۔ بدلتی کُرف غالب کی ایک کارا زبانی بھی تھا

طرز بھول میں رجحان کھنسا

اسد اللہ خاں قیامت ہے

اسد پر یا ظن نے طبع داغ تازہ ڈال ہے

مجھے دیکھ بہار ایکادنی بھول پندر آ

طرب دل نے مرے ہر نفس سے غالب

سہار پر رشت چنے تھ بھول بدھنا

مجھے دم غل میں خوف گراہی نہیں غالب

محاسن طغر حمرانے تیرا ہے غام بھول کا

ایکے تنقید پر درو آتا ہے کہ جب تک مرزا اس روش پر کا حزن رہے ان کو کلام قولیت عام حاصل نہ کر سکا۔

نور کست خیال اور پور کیا مضمون کے سوانحی تحلیلیہ کرنے اور اپنا جو پر رشتہ کرنے کے شوق میں دیکھ تو اس جہ سے فارست ان

کی طبیعت پر غالب غشی اور بوجھ میں اپنی سے کہ وہ سنی کثرت کو الفاظ میں میں ادا کرنے پر تیار اور سنی آخری کے دریا

بہارینے کے غل میں لکے وہ غیر مالوسی کہیں اور پور پور سلیمین کی دلدل میں ایسے پھنس گئے کہ ان کے ذہن

میں افکار پیدا ہوا اور اس وجہ سے اعلیٰ صورتوں میں مضمون شعرا میں اُن کی کردہ گیار اُن کی تحقیر کرنے واسطے اس سے کہ

فراموشی کہ سچے ہیں کہ بھول تک آئے آتے غالب نے اُن کی مزاحمت میں کی تھی۔ غزل کی جو روایت دینی غنی غالب صرف اس سے

بہرہ دار سے شعر انصاف لادتی شعرا کے حکم سے انقباض تھے۔ غزل کی جو روایت دینی غنی غالب صرف اس سے

آتا تھا بلکہ اپنی خاموشی کے لئے ایک سوچا کچھ نظر پر مرثیہ کی تھا۔ عالم بروی نے ایک نظم میں یہی حکم

کے نام شعرا کے نام لے غالب نے ایک شعر کا اضافہ کر دیا ہے وہ مصلحتی اشعار دیکھئے۔

تنبیہم کہ در در گلو نکین

شدہ عصری شاہ دراسب خنیا

چہ اورنگ از معصی شہ قلی

چہ فردوسی آمد گوار میا

چہ قزوینی چہود صر صر کفنی

چہ نازقی آمد بد خنیا

چہ خنیا از در خانی گزشت

قلای چہ کتب خنیا شاہ کشت

کفنی چہ یار اہل در کفنی

مر چہ رشت چہ سیدی رحید

چہ اورنگ سیدی فرہاد ز کار

خن کشت چہ غرق خنیا کار

ز خنیا چہ لوبت چہ خانی رحید

ز خانی خنیا چہ خانی رحید

ان اشعار پر غالب نے ایک شعر کا اضافہ کیا ہے:

ز خانی چہ مرنی چہ خانی رحید

ز مرنی چہ خانی چہ خانی رحید

میں نے کیا جاسکتا ہے کہ غالب کو اپنی انفرادیت کا احساس تھا۔ یا احساس ظاہر ہے کہ بھول کے کتا سے پیدا

نہیں اور اقبال کا لفظ ظہور ان کا ذکر میں اور چار دیکھا تھا کہ:

ات بروی جہ مرثیہ ماضی غالب

شعر خود غنائی ان گرا کہ گرا قلی

غالب کو یہ شعری روایت جو چھوٹی کی کٹاٹاٹا کر تیار ہے کھینچ نکلتا ہے بلکہ ایک سوچا کچھ ہدف ہے

جو ان کے قادی کو بہت دکھاتا ہے اس کے ازالہ کیجئے کے طور پر غالب کے بیان ایک خاص قسم کے اشارے سے ہر

نکتہ کی تکرار کا خیال بچاتا ہے۔ مثلاً:

نیچے خیر مر نہ ستا کار کن اسر

مر کشت قمار روم و نور قمار

غالب نے اپنی جا بجا دینی سے دو سو دو کو کفار کے سرائیں کر دیا ہے

سائیں گرا ہے نام اس قدر جس داغ رضوان کا

وہ ایک گھڑت ہے دم بے طوروں کے طاقی لہال کا

بہت کلمات لہال کے کھڑے سے تعبیر کیا ہے:

انہی دام نقیبوں میں قدر ہمارے بچائے
دعا نکلا ہے اپنے عالم تقریر کا
کلمہ بیان آمد بقیں دل سے غنی گرم
تا رکھ نہ رکھے کوئی مرے حرف پر انگشت

شیخ محمد ابراہیم ذوق

(۱۸۸۸ء تا ۱۸۵۳ء)

شیخ محمد ابراہیم نام اور ذوق کلمہ غزل ۱۸۸۸ء میں پیر سوئے۔ ان کے والد کا نام شیخ محمد رمضان تھا۔ ان کا
لفظی تعبد شہ پور ضلع مظفر گڑھ تھا۔ ایک زمانے سے شاہ پور تحصیل بڑھان کا تعلیمی سرپرہ رہی سرکار سے خواہ ذوق کا
روانہ کار میں دل آئے تھے۔ ذوق کے اجداد مسلم تھے۔ لیکن ذوق اپنے آپ کو شیخ سمجھتے تھے۔ ان کے رشتہ داروں
کے بارے میں کہا جاوے گا کہ ذوق کے تعبد شاہ پور تعبد اور تعبد مظفر گڑھ میں باکرتے تھے۔ خواہ غزلی مرزا طرح نہ ہو
کے زمانے سے سمجھتے ہیں کہ ذوق سے تافانی لہستہ رکھے۔ انہوں میں بھی خواہ ذوق کو پیش کرتے تھے۔ ذوق نے
الدش محمد رمضان کو آپ کلمہ غزل نہیں کی گئی مراد میں ملازم تھے۔

ذوق کے ابتدائی احوال معلوم نہیں ہیں، لیکن ذوق کے روزی کے افسانے اس کی مطلق کے ماہیت کا کچھ

اتحاد دیتے ہیں:

چہرہ چری سے جھلا اور چہرہ کونہ
ہائے غلی کھینچا ، کھانا ، اچھٹا د کونہ

کہیں دو سوہم مطلق کہ ہم دہلیہ سادات میں
لپا کرتے تھے کاہن میں دہر اورا میں سے

”موسیٰ آواز“ آپ حیات میں لکھتے ہیں کہ ذوق کو لکھن میں چھپ چکی ، جس کے نام نہ ان کے چہرے
پر آتی تھے اور ان کی کہری سادوں رنگت پر چھلکے تھے اور کھیلے گئے تھے۔ سرور ذوق غالباً اپنے والدین کی تھا ۱۱۱۱ء تھے۔
ذوق کی ابتدائی تعلیم ہوں تو کچھ جاتی تھی۔ بعد میں وہ حافظہ سراسر شوق کے کتب میں داخل کر رہے تھے۔

لیکن انہیں چکا شاعر کی کہانہ ”نماہ ذوق“ انہیں احمد حسین نے لکھا ہے کہ ذوق طراویں پر جا کر دعا کی ، ان کا
کرتے تھے کہ انہیں شعر پڑھنا ہے۔ حافظہ سراسر شوق کے کتب کے بعد ذوق سادوں کی عداوت راق کے د سے میں
داخل ہوئے۔ لیکن ان کی ملاقات مولوی محمد یافر سے ہوئی۔ جس سے ان کے چھپنے کے ایک اور سادوں میں کلام حسین و شاعر

تھے۔ ذوق اپنی تعلیم محض نہ کر کے لکھن شعر کے روزیوں کی جڑ کر لیا۔ یہ کسی طرح ہو سکتی۔ لفظ سادوں میں آواز دہ کے
نہ کرے میں اس کی طرف اشارہ سوچو۔ جس کا ترجمہ یہ ہو سکتی ہے اپنی کتاب ”ذوق و غزل“ میں پیش کیا ہے۔
ترجمہ یہ ہے: ”

”کہاؤ غزل کوئی میں اپنی سلامیت کے اعتبار سے بہت مختار ہے۔ لیکن شعر پر خود دست حاصل
کرتے معلوم شعر پہاڑی رفعت کو پہنچانے کے ذریعہ زبان کے دستور و طرز کو جاننے کی وجہ سے
کے معیار اور کہا لکھنے اور سادوں میں جانے کے لئے اس نے معلوم شعر کی تفصیل کی ہے۔ خود صرف و
جو کہ لکھتا ہے اور اس کی مطلق کے اصول اور اس کے لکھنے اور اس کے لکھنے میں مشغول ہے۔“

ذوق نے اپنی شعر گوئی کے ابتدائی دور میں غلو بہت کچھ لکھا۔ ان میں پہلی بڑھ چتا ہے کہ لکھی
طرح یہ انہوں نے اپنی خاص دھڑل حاصل کر لی اور ان کا مطالعہ کتب سے یہاں بے تکلف
استعمال کرتے ہیں۔ ۱۱۱۱ء میں حسین آزاد سے لکھا ہے کہ عاظم ہوئی میں ایک قصیدہ لکھا تھا
تھے ان کی کہ لکھی اور اس کے نام کو ان میں رکھنے ہوئے اور اس خیال سے کہ اس پر ہر
اعترافات نہ ہوں شاہزادہ انصاری عبد بنو نے اپنے خط کے ساتھ اسے حضرت شاہ
عبد المعز کی خدمت میں بھیجا تھا کہ وہ اس کے سخت و حکم ، خودوں اور خود میں اسے ان کا
کر رہے۔ محمد حسین آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ ذوق کی خواہش تھی کہ وہ اپنی تفصیل طبع کی شخص
کریں۔ وہ درپسین اتفاق فراک میں کاٹھے بھیج دی گئی۔

طبع کی تفصیل اور اس کی سر کا مطلق صاحبہ حاتمہ دینی سادات اس کا یہ ہوا کہ وہ
صاحبہ دام جو شاہزادہ کی ملاقات کے ملا تھے۔ انہیں یہ شوق ہوا کہ اپنے بیٹے کو کتب علمی کی
تفصیل کرانے میں مولوی عبد اللہ کو شہ سرتوم کے ترجمہ اختیار تھے۔ وہی ان کو چھٹا ہے۔
مقرر ہوئے۔

ذوق سے یہ بھی ایک دن مولوی صاحب کے رفیق تھے چھٹا کی طبع کا شعور ہو گیا
تو صاحبہ صاحب نے ان سے کہہ دیا کہ ابراہیم احمد حسین میں شریک و باکرہ۔ چہا چہ کونہ
ہو گئی کہ اگر یہ کبھی مطلق انصاری کے سبب دہاں نہ جاتے تو وہ صاحب کا آواز انہوں نے مقرر
کر دیا تھا کہ ان کا سنی مقرر ہے۔ ”

ذوق نے چھٹی ڈیڑھ تھے ان کے لکھنے ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ ذوق کے استاد انہیں تھے۔ انہوں

۱۱ ذوق دہلی کے استاد انہوں نے اپنے سے ”محمود اور آفرین“ جو مولوی میں ۸

۱۲ مولوی ”ذوق دہلی“ اور ”دہلی“ کے مولوی محمد یافر محمد یافر میں ۱۳

تھے۔ جیسے میں نہیں نے نگہ افشانی کا کوئی موقع نہ تھا سے جانے کیا دیا۔ اس کتاب کا سب سے بڑا اکیلا یہ ہے کہ مومن
جیسے اہم شاعر کو کوئی ڈانٹ نہیں ہے۔ بالکل ای طرح جیسے تعلیم اندریں احمد کی "ادب شاعری پر ایک نظر" میں شاعر کا نام نہ دیا
پرایک حرف بھی نہیں لکھا گیا۔ یہ دونوں ہی امور محض کے تھیں۔ یہ کہہ دیتے ہیں۔ آزاد نے اپنی اصلاحیوں کی کہ
اور سب سے بڑا شاعر میں مومن کو نام لکھا اور ان کے ہاتھ سے جب شاعر کا نام ایک پریکٹس کے تحت مرتب کی تو انہیں
غائب اور میر کے ساتھ مندرجہ میں ایک جگہ دیا۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ آزاد نے یہاں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں
مارا کا نام نہ لکھا۔ چار دیا۔ یہ کہتے کہ نے کی کوئی نگہ افشانی کی کہ اس کے کام کا ایک بڑا حصہ آزاد کی اصلاح ہے۔ یہ کہتے یہ
بکٹ جلد دی ہے۔ ان کے متنبہ نے اس باب میں بڑا جو حکم افشا ہے اور یہ کہتے کہ نے کی کوئی نگہ افشانی کی کہ اس کے کام کا ایک بڑا
کے رنگ میں بڑا فرق ہے۔ اس حد تک کہ یہ کہہ سکتا ہے کہ آزاد نے یہاں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں
نہانے کی بعض کتابوں میں بھی شاعر کی افرا دیت پر زور دیا گیا ہے مثلاً "مجموعہ غزل" "مجموعہ غزل" "مجموعہ غزل" "مجموعہ غزل"
میں شعر اپنے تمام تر افادات کے ساتھ موجود ہیں۔ "مجموعہ غزل" میں شاعر کی افرا دیت پر زور دیا گیا ہے۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں
تو شعر سے عین اپنے تھے لیکن اس کا معنی یہ ہے کہ شعر ان کا مضاف ہے۔ یہ کہتے کہ نے کی کوئی نگہ افشانی کی کہ اس کے کام کا ایک بڑا
تو یہ امر حتمی جیسے لغت نے بھی اپنی کتاب "ادب شاعری" میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں
نہانے کی کہ تراجہ کرتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہے کہ شعر ان کا مضاف ہے۔ یہ کہتے کہ نے کی کوئی نگہ افشانی کی کہ اس کے کام کا ایک بڑا
یہاں شعر کا کیا ہے اور ان کی اس کو دیکھیں۔ ان کے ہاتھ سے آزاد نے یہاں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں

ایک نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ان کی اس کو دیکھیں۔ ان کے ہاتھ سے آزاد نے یہاں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں
کا یہ شعر میں جن دنوں کی کیفیت نمایاں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ شاعر کی طرز و طبع کی افرا دیت پر زور دیا گیا ہے۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں
تینوں دن سے "مجموعہ غزل" میں شاعر کی افرا دیت پر زور دیا گیا ہے۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں
کی کہ شاعر کے ہاتھ سے "مجموعہ غزل" میں شاعر کی افرا دیت پر زور دیا گیا ہے۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں
نہانے کی کہ تراجہ کرتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہے کہ شعر ان کا مضاف ہے۔ یہ کہتے کہ نے کی کوئی نگہ افشانی کی کہ اس کے کام کا ایک بڑا
یہاں شعر کا کیا ہے اور ان کی اس کو دیکھیں۔ ان کے ہاتھ سے آزاد نے یہاں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں

یہ کہتے کہ نے کی کوئی نگہ افشانی کی کہ اس کے کام کا ایک بڑا
یہاں شعر کا کیا ہے اور ان کی اس کو دیکھیں۔ ان کے ہاتھ سے آزاد نے یہاں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں

ادب کا تنقید کا یہ علم نہ دیا گیا کہ شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں
افرا دیت پر زور دیا گیا ہے۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں
نہانے کی کہ تراجہ کرتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہے کہ شعر ان کا مضاف ہے۔ یہ کہتے کہ نے کی کوئی نگہ افشانی کی کہ اس کے کام کا ایک بڑا
یہاں شعر کا کیا ہے اور ان کی اس کو دیکھیں۔ ان کے ہاتھ سے آزاد نے یہاں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں
نہانے کی کہ تراجہ کرتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہے کہ شعر ان کا مضاف ہے۔ یہ کہتے کہ نے کی کوئی نگہ افشانی کی کہ اس کے کام کا ایک بڑا
یہاں شعر کا کیا ہے اور ان کی اس کو دیکھیں۔ ان کے ہاتھ سے آزاد نے یہاں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں

نہانے کی کہ تراجہ کرتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہے کہ شعر ان کا مضاف ہے۔ یہ کہتے کہ نے کی کوئی نگہ افشانی کی کہ اس کے کام کا ایک بڑا
یہاں شعر کا کیا ہے اور ان کی اس کو دیکھیں۔ ان کے ہاتھ سے آزاد نے یہاں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں

نہانے کی کہ تراجہ کرتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہے کہ شعر ان کا مضاف ہے۔ یہ کہتے کہ نے کی کوئی نگہ افشانی کی کہ اس کے کام کا ایک بڑا
یہاں شعر کا کیا ہے اور ان کی اس کو دیکھیں۔ ان کے ہاتھ سے آزاد نے یہاں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں

نہانے کی کہ تراجہ کرتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہے کہ شعر ان کا مضاف ہے۔ یہ کہتے کہ نے کی کوئی نگہ افشانی کی کہ اس کے کام کا ایک بڑا
یہاں شعر کا کیا ہے اور ان کی اس کو دیکھیں۔ ان کے ہاتھ سے آزاد نے یہاں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں

نہانے کی کہ تراجہ کرتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہے کہ شعر ان کا مضاف ہے۔ یہ کہتے کہ نے کی کوئی نگہ افشانی کی کہ اس کے کام کا ایک بڑا
یہاں شعر کا کیا ہے اور ان کی اس کو دیکھیں۔ ان کے ہاتھ سے آزاد نے یہاں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں

نہانے کی کہ تراجہ کرتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہے کہ شعر ان کا مضاف ہے۔ یہ کہتے کہ نے کی کوئی نگہ افشانی کی کہ اس کے کام کا ایک بڑا
یہاں شعر کا کیا ہے اور ان کی اس کو دیکھیں۔ ان کے ہاتھ سے آزاد نے یہاں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں

نہانے کی کہ تراجہ کرتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہے کہ شعر ان کا مضاف ہے۔ یہ کہتے کہ نے کی کوئی نگہ افشانی کی کہ اس کے کام کا ایک بڑا
یہاں شعر کا کیا ہے اور ان کی اس کو دیکھیں۔ ان کے ہاتھ سے آزاد نے یہاں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں

نہانے کی کہ تراجہ کرتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہے کہ شعر ان کا مضاف ہے۔ یہ کہتے کہ نے کی کوئی نگہ افشانی کی کہ اس کے کام کا ایک بڑا
یہاں شعر کا کیا ہے اور ان کی اس کو دیکھیں۔ ان کے ہاتھ سے آزاد نے یہاں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں

نہانے کی کہ تراجہ کرتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہے کہ شعر ان کا مضاف ہے۔ یہ کہتے کہ نے کی کوئی نگہ افشانی کی کہ اس کے کام کا ایک بڑا
یہاں شعر کا کیا ہے اور ان کی اس کو دیکھیں۔ ان کے ہاتھ سے آزاد نے یہاں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں شاعر کا نام نہ لکھا۔ ان میں

انتخاب لہجہ ہمارے سے پارنگل کے تیل
دیا ہے نال جلاؤ کا دست سنبھل کے تیل

شہادہ محمد نصیر

(۱۸۶۰ء - ۱۹۴۰ء)

شہادہ محمد اپنے زمانے کے ادبی فیاض و علم کا شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ مدنی کے نامور ماہر تھے۔ ان کا شمار ہے۔
ان کا پورا نام محمد نصیر الدین احمد گونگا ہے۔ اسے عرب کہتے ہیں۔ ان کا رنگ چمکنا سا تھا۔ اس نے لوگ سناں گو
کہتے تھے۔ سید محمد ادریس صوف سے ان کا تعلق تھا۔ شاد و صبور، جوان و پیر کی کولاد میں سے تھے۔ جب ان کے والد کا انتقال
ہوا تو سید محمد بھی بڑے سادہ کے والد شاد و صوف رہ گئے۔ "ابو محمد" میں شاد و صوف کا لفظ ہے۔ ان کی نئی اور شرافت
مشہور تھی۔ محمد حسین تارا نے اس باب میں جو لکھا ہے اس کا ایک اقتباس ذیل میں درج کر رہا ہوں۔

"والد شاد و صوف نام ایک دانشمند تھے۔ کوئی غریب طلبہ کو اپنی خدمت میں لے کر لکھنؤ کی وزارت اعلیٰ میں لے جاتے۔

تھے۔ نیک نیتی کا اثر تھا کہ ہم نے غریبی کا عنصر بھی دیکھ کر کرتے تھے۔ شہر کے بھی گھر سب ادب

کرتے تھے۔ محمود و شاد و صوف میں پختہ پختہ و دل کو پختہ کرتے رہتے تھے۔"

شہادہ نصیر نے لکھا ہے کہ اسے تھے۔ کسی تذکرہ نگار نے ان کی بیواؤں کی ناموں کی تاریخ نہیں لکھی ہے۔ زائر
غریب و غریب نے اردو سے قیاس ان کی بھی لکھا ہے۔ وہ دار کبر و دیوانہ بن گئے۔ شاد و صوف کی تعلیم و تالیف ہوئی۔
اس سلسلے میں ان کے والد نے خصوصاً لکھی تھیں۔ ان کا نام "محمود" ہے۔ ان کی خدمت کے بارے میں ابھی نہیں۔ شاد
نصیر نے اپنے والد کی وفات کے بعد شعر گوئی شروع کیا۔ ایک ایسے شاعر کے مطابق شاد و صوف کا انتقال ۱۸۶۱ء میں
ہوا۔ ان کے متوفیوں میں شاد و صوف کی تاریخ کا نام آتا ہے۔ اپنی شعر گوئی کے آغاز میں ان کے خاکہ گروہ کے۔

غزل کے مطابق شاد و صوف کی طبیعت تھی۔ "محمود" اور "محمود" نے بہت جلد دلی کی ادبی ماحول اور ماحول میں
ان کے "محمود" کا نام کوچا دیا اور وہ "محمود" کا نام لے کر ہو گئے۔

غریب تارہ نے جس باب میں ان کی زندگی کا بیان ہے وہ پہلی نئی تاریخ شاد و صوف کے عہد و زمانہ اور ماحول کی ایک نگاہ
کے مطابق ان کی شاد و صوف کی تاریخ میں شاد و صوف کی طبیعت شاد و صوف کی سب سے بڑی بات ہے۔ شاد و صوف کے شاعر
وہ ان کی شہرت اور وہ شاد و صوف کی طبیعت شاد و صوف کی سب سے بڑی بات ہے۔ شاد و صوف کے شاعر
تھے جن۔

"محمود" کے عہد و زمانہ کا دور دورہ تھا۔ اگرچہ کمال کی قدروائی اور ماحول ان کی جامع

محمود دلی کی تاریخ میں شاد و صوف کے عہد و زمانہ کا دور دورہ تھا۔ اگرچہ کمال کی قدروائی اور ماحول ان کی جامع
تھی۔ ان کی شہرت اور وہ شاد و صوف کی طبیعت شاد و صوف کی سب سے بڑی بات ہے۔ شاد و صوف کے شاعر
وہ ان کی شہرت اور وہ شاد و صوف کی طبیعت شاد و صوف کی سب سے بڑی بات ہے۔ شاد و صوف کے شاعر
تھے جن۔

محمود دلی کی تاریخ میں شاد و صوف کے عہد و زمانہ کا دور دورہ تھا۔ اگرچہ کمال کی قدروائی اور ماحول ان کی جامع
تھی۔ ان کی شہرت اور وہ شاد و صوف کی طبیعت شاد و صوف کی سب سے بڑی بات ہے۔ شاد و صوف کے شاعر
وہ ان کی شہرت اور وہ شاد و صوف کی طبیعت شاد و صوف کی سب سے بڑی بات ہے۔ شاد و صوف کے شاعر
تھے جن۔

محمود دلی کی تاریخ میں شاد و صوف کے عہد و زمانہ کا دور دورہ تھا۔ اگرچہ کمال کی قدروائی اور ماحول ان کی جامع
تھی۔ ان کی شہرت اور وہ شاد و صوف کی طبیعت شاد و صوف کی سب سے بڑی بات ہے۔ شاد و صوف کے شاعر
وہ ان کی شہرت اور وہ شاد و صوف کی طبیعت شاد و صوف کی سب سے بڑی بات ہے۔ شاد و صوف کے شاعر
تھے جن۔

محمود دلی کی تاریخ میں شاد و صوف کے عہد و زمانہ کا دور دورہ تھا۔ اگرچہ کمال کی قدروائی اور ماحول ان کی جامع
تھی۔ ان کی شہرت اور وہ شاد و صوف کی طبیعت شاد و صوف کی سب سے بڑی بات ہے۔ شاد و صوف کے شاعر
وہ ان کی شہرت اور وہ شاد و صوف کی طبیعت شاد و صوف کی سب سے بڑی بات ہے۔ شاد و صوف کے شاعر
تھے جن۔

محمود دلی کی تاریخ میں شاد و صوف کے عہد و زمانہ کا دور دورہ تھا۔ اگرچہ کمال کی قدروائی اور ماحول ان کی جامع
تھی۔ ان کی شہرت اور وہ شاد و صوف کی طبیعت شاد و صوف کی سب سے بڑی بات ہے۔ شاد و صوف کے شاعر
وہ ان کی شہرت اور وہ شاد و صوف کی طبیعت شاد و صوف کی سب سے بڑی بات ہے۔ شاد و صوف کے شاعر
تھے جن۔

آخر میں چند اشعار شاد و صوف کی مختلف غزلوں سے منسلک کیے گئے ہیں اور ان کے ماحول

محمود دلی کی تاریخ میں شاد و صوف کے عہد و زمانہ کا دور دورہ تھا۔ اگرچہ کمال کی قدروائی اور ماحول ان کی جامع

تھی۔ ان کی شہرت اور وہ شاد و صوف کی طبیعت شاد و صوف کی سب سے بڑی بات ہے۔ شاد و صوف کے شاعر

وہ ان کی شہرت اور وہ شاد و صوف کی طبیعت شاد و صوف کی سب سے بڑی بات ہے۔ شاد و صوف کے شاعر

تھے جن۔

محمود دلی کی تاریخ میں شاد و صوف کے عہد و زمانہ کا دور دورہ تھا۔ اگرچہ کمال کی قدروائی اور ماحول ان کی جامع

تھی۔ ان کی شہرت اور وہ شاد و صوف کی طبیعت شاد و صوف کی سب سے بڑی بات ہے۔ شاد و صوف کے شاعر

وہ ان کی شہرت اور وہ شاد و صوف کی طبیعت شاد و صوف کی سب سے بڑی بات ہے۔ شاد و صوف کے شاعر

کے وسیلہ پر ان کے فن پر چھٹ کر اس میں بڑا اضافہ ہے لیکن ان کا انداز ہے کہ اس شعر سے وہ کس حد تک نترتے۔

تم سرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دھرا نہیں جوتا

مومن کا عشق حقیقی نہیں بلکہ کھڑائی ہے۔ اس کا شوق گوشت پرست کا ہے۔ جس کی اداسی کو دیکھنا محسوس ہے جا سکتا ہے۔ مومن نے گوشت کو اس کی سرشاری بھر دی ہے جو کہی ہو پکڑ لیں جانے کے لئے کافی ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ وہ مختلف شاعری میں اس کا خلاصہ سرگزشتور، ری، دہرا۔ جس سے بہت پہلے مومن پر ایک مضمون لکھتے ہوئے ان باتوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ چچا سحر کا اعداد کو کتابوں۔

مومن صاحب اسلوب شاعر ہیں۔ انفرادی اسلوب کا حصول آسانی نہیں ہے۔ اس کام میں ایک ایک خط کی بغیر عوامی لازی ہے۔ روایتی طریقوں میں جانا پڑتا ہے لیکن وہ کبھی سکتا ہے وہی صاحب اسلوب بھی ہو سکتا ہے اور لفظ کا جلد سخی اسے اپنی داہانے سے گزرتا ہے مومن اس امر میں بڑی طاقت کا شوق فراہم کرتے ہیں۔ لیکن مضمون کے ذریعہ ان کا اعداد ایک بار پھر لکھے۔

ہر چادر نقشیا میں مرتے دنیا
دعائی پرواز تیرا جاگے

مجھ پہ طغیاں اٹھائے لوگوں سے
منہ دیکھے منہ کے لوگوں سے

وہ ہر دم میں تم میں قرار تھا، تبھی یاد ہو کہ یاد ہو
وہ تیرا بختی وعدہ یاد کار، تبھی یاد ہو کہ یاد ہو

اپ پر سے لو لگائیں گے ہم
ہیں تیرے تھے ہر ایک کے ہم

تم کہیں جانے کی کچھ بنا ٹھکانہ کر لے
ہم نہ کل خواب ہم میں شب بھراں ہوں گے

مومن صاحب کے اسلوب شعری اور اس میں جتنیں ہوئیں۔ ایک مشکل اور پیچیدہ اور دور رسری ملی اور وہ ان کے بعد آتی ہے ہر کلام، بھلی قریح اور بھلی سوز کے یہاں نہ آتا اور ان کے انداز ہے نا کا پیچہ اور نہ لہجہ کا وہ ہم سے کم نثر کے عقائد اسلوب سے پہلے نہیں کھا سکتے بلکہ ان کا تہہ دراز غور تھا کہ ان کے جو کلمات اسلوب سے افضل اور اعلیٰ ہے۔

میرزا داہانے میں اگر مومن نثر کے عقائد اسلوب کی بھر پور کرتے تو یقینی اپنے صاحب کے کر جاتے ہوں
کی انفرادیت تو یہی ہے کہ ان کے اسلوب میں انہوں نے اپنی داہانے کی کوشش کی اور وہ میں اور شاہ نصیر
میں کی فراموش نہ ہوا۔

بائیں دیکھ کر مومن کی زبان سے وہ اپنے ارادوں کے اظہار میں ان کے عقائد کی توجیہ کھلی ہوئی ہے۔ وہ کسی
نہ کسی نا اوجھیں سے غفلت میں جوتے تھے۔ اصل وجہ کی غفلت سامنے دیکھ کر مومن کی تصویر کشی ہر جگہ موجود ہے، مگر یہ کتاب میں کہاں کی
میرزا داہانے کی اپنی دہرا ہے جس میں وہ رہے رہے ہوئے تھے۔ وہ جتنی دھن لے کر "مومن" پر اسے شمر مکتبہ
است "مومن" کی میرزا داہانے اور طغیاں مکتبہ چپ نہیں سکتا تھا اس لئے کہ میرزا داہانے کا قیام ان کی اپنی دنیا
قبر پر پڑا تھا۔ وہی مگر یہ نہیں سرشار تھے اور اس میں بھر پور ہوئے تھے۔ اگر وہ مکتبہ حقیقی کی طرف مومن جوتے تو
مکتبہ کے Idealist اس لئے اور اس کی غیر خیراتی فضا میں مکتبہ رہے۔ مکتبہ کے یہاں مکتبہ کی کیفیت کا شہادہ اس لئے
اور جہت مکتبہ طوط پر شاعر ہو گیا۔ اس انداز اسلوب صاحب ہی سے ان کی مکتبہ صرف ہے۔ ایک تاریخی نقطہ میں
اس کے اشارے بہت نمایاں ہیں۔ چچا سحر کا پیش کرنا ہوئی:

تا وقت است دلبر من از دیار من
از اور د قلم بہ حالت مراد دہرا ام

آں آہوئے حرم کھا، صحن بختی
از من دہرا است اسن از طوط دہرا ام

ہم رہا اور تو ام از پاں مرطی اور
تا مجھ راہ رشتہ و بھانیاں بھادہ ام

بھادہ ہم کشتہ از دانش من کز شہت
قول یاد چہ دل کہ بہ غریب دہرا ام

اسے سمجھ مار بہر رخ مر دہ بیاہ
دعائی کہ روئے از دم دھن ت دہرا ام

لے مجھ ام بہ یاد طوطی کہ نہ خفتن
نے مراد چاہی غرا لب اہ شہد اور

سوزم یہ دماغ بھر دیاں دل ظہور
ظلم یہ خاک و خوں مگر ایک جیکرہ ام
پرمردہ غیبی اللہ کی انہم کہ گاہ
ازہائے آزاد کی دلیلیں نہ چنہ ام
بازم یہ خطہ چاہی خود دہرہ ام ہنوز
ہم آنک دہر کئی ہزارں چنہ ام
ہرچہ قیامت شد و جاہم زخمی نہ رشت
مرد ہر صورت حال اطفال دہرہ ام

سازش و تخریب یہ دنیا کی رسید و رس
دہرہ چاک از قلم ہادی کشیدہ ام

مذکورہ نثر کے اشعار کے ساتھ یا شاعری شعر کی پڑھنے کے قابل ہیں جن کی تعلیمی ذہن میں سوسائے کے بڑی
مشق کے لیے دیکھ کر بڑی اہم ہو گا یا جان سکتا ہے:

صاحب میرا حال صحت ہو چو
بندہ خدمت ہے از ہوں میں
میرزہ دلی کہ ہواں آیا
بہرہ گزری میں بتا ہوں میں
خدا وہ ہے سرکشی کے لئے
شادی ہے سب دنیا ہوا میں
اک طہرہ شرع کے نام میں
چل رہا ہو گیا ہوں میں
مجھے پہچاننا میرے صاحب تک
کہ تمام مریض پا ہوں میں

تم بھی رہے گئے تھا صاحب
کھنکھ سارے سارے چا صاحب
کس پہ نکلے تھے کس پہ نہ تھا
رہت تم کس پہ تھے تھا صاحب
کس کو دیکھتے تھے کالیاں انکوں
کس کا شب ذکر خیر تھا صاحب
صاحب سنے اس ظلم کو آزاد کر دے
لو بدلی کہ بھوت گئے بدلی سے ہم

اسی کا سبب ان صاحبان دل اپنے عشق کو فراموش نہ کر کا ہر دور جس کے عشق نے شاعرانے اپنی عزتوں
میں پیش کر کے رہے۔ ان کے گوشت پرست کا مجرب ان کی دلوں میں غم کی آبی اور دلی کے عاتار بار بار پینٹائی اور
انداظنی عشق کی کوئی بنیاد قائم کی جس کو کبھی مانگنا نہ تھا تو ہر سر کی کامیابی پہ پچھتاؤں جا۱۲ اور پھر میں کم ہو جاتا۔
سوسائے تعلیمی اعلیٰ تہذیبیت میں کل خیلے کو نظر کش کر کے میں، مگر میں دو جرات نہیں بٹھانے کہ ان کے برابر پاس
ادب بھی ہے۔ یہ دہرہ غریب اور دلی ہادی ہر وقت سے اور بہت کچھ لکھ چکا۔

اس سوسائے تحریر میں چالی کا شعر پڑھ کر کے میں کوئی اور واقعہ لکھوں سے آزاد کرانے
کی کوشش کی ہے اور اپنی کتب پانی، نازک خیالی اور فنی خواہشات اخیر تمام ششماہی ہے۔ ان
کے خیال پر وہ دیکھنا رہا ہے عی نہیں دیکھتا بھی ہیں۔ انہوں نے قول کی قمر اور دہرہ
پراپی افراہمت کا رنگ چھکارا لی تو وہ ان کوئی صدمت دی ہے اور غنا اور دہرہ میں پہلی
دلہن شش پڑا انہیں کا ذکر ہر مدعا تو از ان اور وقت انہوں نے ان کے ساتھ کر کے ہو گیا
ہوئے کی دلی ہادی۔

لیکن یہی صدمہ ششماہی طرف ان کی شاعری میں کل بولنے لکھاری ہے تو دوسری طرف ان کی دنیا میں
کدوی ہے مگر میں اس پر نگاہیں اور نگاہیں کا ادھار ہوتا ہے اس طرح ایک بے تعلقی ہے کہ ہر دور کے ششماہی
انہی شاعری میں ہے۔ اس حد تک کہ ہر دل خالق کے جذبہ میں شریک ہو جاتا ہے اور اس کے اندر سے بھی پوری
طرح بانگ جاتے ہیں:

میں بھی کچھ خوش نصیب بنا کر گئے
تم نے اپنا کیا وہ نہ ہوئی

نہی۔ چنانچہ اس نے جس خاکساروں و مزدوروں اور مصروفیت لکھے میں بکارت کا مسئلہ کرنے کی کوشش کی جس کی تصویر دیکھنے کے لائق ہے:

”معدنہ کوئی کیا بلا ہو
ہے دیکھو کسی کا نام کیا ہو“

وہ کہانی جانتی ہے کہ اس مثنوی کی ہیئت اس لئے تھی ہے کہ اس کے نگار نگار کوئی مسئلہ ہوا ہے وقت کا چرچا۔ بعد اسلم تہذیب کی عکاسی بھی اس مثنوی میں ایک خاص انداز سے ہوئی ہے۔ جسم بدو و دیوت اسرار علی ہے۔ یہ خیالی واقعہ تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے ترقی یافتہ آدمیوں کو اس طرح شرم کئے کہ وہ ان کو نظر ہوجاتی ہے۔ تاہم اس کے اوتھری کی ہلکے جسم شراب کے نتیجے میں خمر کو سنا ہے تاہم یہ بھی بکارت کی شراب سی کی ہو یہ تخری ہیں جاتی ہے۔ یہاں سے کہتے ہیں کہ اس کے نگار نے چاہیے کہ وہ تھری تخری اور گویوں کی یاد دلاتا ہے۔ یہ ہونے بہتری کے سبب اندر و قسور سے تھوہاری نکلیں۔

اس ضمن میں یہ دیکھنا چاہئے کہ کیا حقائق کی ہیں۔ مثلاً احمد سہا۔ بکارت کا مطلب ہے اس شخص کو دیکھنے کی دینی چند بات کہ اس میں ہندو خاص ہیں۔ بکارت کو زیادہ انسان کے بیان پر ہوتی ہے۔ اس سے آواکس کا متعینہ و ان میں میں کارہوت ہے۔ اگرچہ ہندو چاہے کھیتی ہے۔ جو ہندو چاہی کھیتی آدم کا کارہ سے متوجہ ہوا ان میں ہندو والی دیکھتے ہے اور ہر ہندو کے کھیتی دلی سے ملتا ہے۔ اگرچہ کہ اس مثنوی کی ہیئت اس لئے لکھی ہے کہ اس میں ہندوستانی تہذیب کی کج چلی صورت خوب ابھرتی ہے۔

منیر شکوہ آبادی

(1813-1881ء)

ان کا پورا نام میرزا علی حسین شہرہ فوادانی ہے غوری نے جب گزرت کو زیادہ متوجہ کیا فوادان کے کہنے پر ان کے مانتے سے شکوہ آباد آگئے۔ انھیں کی دلا دیش سے شرف الہی بھی ملے تھے۔ انہیں شکوہ آباد کا سہارا دیا گیا کہ قندھار شاعرانہ انہیں بیرونی تہذیب کی عیوب و اذیات بھی دی تھی جو شاعر عالم کے اخلاق تک تاثر دیتی ہیں۔ ان کے مانتے سہا احمد حسن شاد تھے۔ جو قندھار کے مانتے میں معمولی جاگیر رکھتے تھے۔ ان کے مانتے سے منیر کے ہندو سید احمد مصطفیٰ بھی شکوہ آباد میں رہے۔

ان کا انتقال ۱۲۳۵ھ میں ہوا۔ منیر کی ولادت ۱۸۱۳ء میں ہوئی اور انھوں نے ۱۸۵۱ء میں عربی اداری کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ ان کے بڑے بھائی مولوی سید ابراہیم بھی تھے۔ ان کی ریاست کی تعمیر ہوئی۔ منیر کو بچپن آکر دیش کرانچین ایک نہ رہے جس جب میں کی شہرہ فوادانی کا تاج ہوا تو ان کا والد نے انھیں ہندو پارلور اور اپنے

لازم سے ہندو۔ اس وقت حقیقت شام رات کی ایک بیوی ہو چکی تھی اور وہ بیویوں کے استاد اور بچے لکھے چنانچہ منیر شکوہ آباد دلی سے بھی انہیں استاد بنایا اور سچ ہے کہ ان کے ہندو اقراب و ہر نہیں مل سکے۔ جب حالات خراب ہوئے تو منیر نے شکوہ آباد چھوڑ کر منیر علی وسطہ رنگ سے اہانت اور گئے۔ جو راج کے غائب تھے۔ کجاہر ہے کہ منیر نے منیر راج کی داد دینے کے لئے اسرار زبان تو پسلی کو شکل کی تھی اور حروف کات پر نگار بھی تھی۔ کیا ہوتا ہے کہ جب منیر ادب میں بہرہ ور اور سکندر کا نام تھا اس زمانے میں ایک طوائف سناؤ تو اب جہاں کے گل کی سازش میں اس پر ملو۔ منیر اور کلا ہائی کی مزا اور ہر ہولی۔ ۱۸۶۰ء میں نہا ہوئے۔ انھوں نے خیال کے قلم کی دیکھ کر کاظمی پر گہرا اثر ہوا۔ ایک طوائف نے منیر سے ان کے خطبات کا پڑھنا ہے۔ اس کی سوتے ہی انہوں نے ایک نذر بھی لکھا تھا۔ ایک چوک بات بھی سنا تھا۔ آئی ہے کہ منیر شکوہ آبادی اصل ہندو کے ہندو کے ایک خوب رہے تھے۔ چنانچہ ان کے قندھاروں نے انہیں ہندو کر کے بھڑا دیا تھا اور منیر ہندو اس قدر اسی طے کا قندھار منیر نے خود بھی جس حقیقت کے حروف دلاتے تھے انہیں شرم کے ٹکڑے دے دیا ہے اور اپنے احوال رقم کئے ہیں۔

منیر شہرہ فوادانی کے تھوہاری ہیں۔ ”تھوہاری عالم“ ”تھوہاری شاعر“ اور ”تھوہاری منیر“ ایک مثنوی ”سراج المصابین“ بھی ہے کہ ”راکھ“ ”کاپ زبان“۔ ان کے احوال کی تعداد میں ہزار بتائی جاتی ہے۔ ان کے مانتے ”امامین حق“ اور ”سراج المصیر“ ”تھوہاری منیر“ ہیں۔

منیر کے بیان استعارہ کلمات کا استعمال خوب خوب ہے۔ مثلاً ان اور منیر کی کچھ مثنوی اور اسات کے لئے ضروری لکھتے ہیں۔ اور اصل ان کے استاد شاکر جس طرح اشعار کہتے تھے ان میں کا منی رنگ و باب حسن نے بارے میں ان کے بیان بھی قابل قدر ہیں۔ ان کا جاتی ہے۔ مشکل رو بہ اور قافیہ میں شعر کہتے ہیں۔ منیر بکارت کا پہلو بھی ہے اور ان کے نکلن سہا شہرہ فوادانی اور منیر بھی ان کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے منیر کے لکھے ہیں۔ سچہ قندھار سہا شہرہ فوادانی کی منہ بہ منیر میں بہار خاص بھی ہے۔ ان کے ہندو شاعر دلا دیش

بچے نرم سے ہر شخص پائے اے منیر
ہر رنگ کعبہ مکمل وہ مستحضر تھا

میرزا کے قندھاروں میں منیر اپنی سہا
جہاں کی کھیتی میں سے انداز

عربوں نرم و رنج سے نکلا نہیں جاتا
پھر جانتے ہیں آ کے کناروں کے ہوا

دیا کرتا تھا ملکِ راج کو چاہے
دولتوں کو ہے ملکِ خدا سے غرض
کھڑت گوارِ دولتِ ہندوستان سے
صداغ بھی پکار رہے ہیں خدا ہے ایک

سے آگ بولنے کے بعد دنا چھوٹا چھوٹا ہے۔

جوان کے نکاح پر ایک قادیانی نے تو ایک بات جو حجت واضح ہو کر ابھرنی ہے وہ یہ کہ جلالِ نوح سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ان کا کلام تاریخ کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ ان کے لکھنوں جتنا ہے کہ جلالِ نوح کی طرح اعلانِ نراں سے وابستہ ہے۔ ان کے یہاں مکتوبی طرز کی شاعری شہر ہے کہ یہ تیار تھا اور وہ اس مکتوبی طرز سے اس کے ان کے اشعار ہم مکتوبی رنگ سے اگر قدرے مختلف نظر آتے ہیں تو یہ مکتوبی ہے۔ کچھ دماغ سے ہے کہ جلالِ نوح سے اس کی ایک اور چیز جو میر کے مقابلے میں ان کی شاعری میں یہ مکتوبی نہیں کیے اور طوالت میں غزل کا حراجی نہیں گزارتے۔ جلال کی شاعری کے طراز میں ان کو کچھ کے لئے ان کے چند اشعار نقل کر رہوں:

جانے تھا وہ دیکھ کی بھی تھوکی ہے

نکلیں پوچھتی ہو جس سے کہ حال اچھا ہے

مضیٰ کر اصرارت ہو دل کے پھلنے کے لئے

دل میں آئے بغیر کچھ مرا ملنے کے لئے

انکھ کا کہنے دو سرخسوں سے وہاں پتہ ہے

وہ پتہ انکو سینا ہے سنبھار سب سنبھلا ہے

دل بیتاب کو ہر کھ کے بہت دیکھتا ہے

کام اس سے بھی نکلی آتے تھے بیکار تھا

بہت بہار کی آمد سے غرض میں سرخ ہوا

شور سے دیکھیں انکھ کیا تھاں کرتے ہیں

خورد ہیں تے بگولے میں بھی ہیں انکو جڑ

نکسین انھوں کی کوئی بات نہی بھرتی ہے

اٹلی سا کرم چھوٹا پلم کا ہے ہم

یاد دل کا ہے کھرا ٹھیکہ دہال ہوا

ہم کو انھوں دکھا دو دیکھنے کی

پھر مڑ دیکھو جاں فشان کا

کسی نے کھل کے ہڑا بھڑا ہوا اپنا
تارے ٹوٹ کے چوڑے بن گیا بھڑا گیا

قبر پر میرے چڑھا جاتی تھیں غری
مات کے بار جو نہی گل نے ادا ہے کرتے

بچوں کے انکھوں نکل آتے کھنکھن کو وہ ابھر
کھلی رہا اسے بھی چوڑے ہوئے

غم نے وہ ابھر دیکھ کھلی سر مٹل
گل جانے کو سر پر ابھر آئے گل آئے

بدر عزم کے نہ بات سے کوئی چست آئے بھی
پھر اگلے نہ کہیں کھڑا تیار کوئی

داغ کو کہ مکتوبی نے ان کے کلمہ میں داغ اور اس کے رنگ کی بھی شاعری کی۔ حالِ تمبیوں کے بھی شاعر تھے لیکن ان کے قصیدے سات شہزادوں کے تھے۔ وہ بیانی طور پر غزل میں کثرتِ تشبیہ کے جاتے ہیں ایک غزل کے چار شعر صرف اس لئے نقل کرنا ہیں کہ اس پر داغ اور اس کے رنگ کی چھپ چھپاتی ہے

مکی حقی کہہ کے کہ لائی ہوں زلفِ یار کی بے

بھری تو یاد مہا کہ داغ بھی نہ ہا

بتوں کے عشق میں کہا ہوئی ہم سے بار خدا

کہ دل بھی تو نہ نکلتا نہ غرض بھی نہ ہا

پھر آئے مکتوبی ساقی میں کیوں نہ آنکھ اپنی

وہ سب نصیب ہیں خالی ابھی بھی نہ ہا

بالِ داغ بیاں میں وہ شہزاد ہیں

دیکھ کو بھول لے ہم کہ داغ بھی نہ ہا

نہر انڈی، دہلی آئی ہے میراں سے اکھ
کہ چلے تہتہ زبں حج تھ کہ ہوا بر باد
نالے کہوں نھر تانی ہیں لکنا تیں کالی
بہر کیا سہول طبعی میں جوں کو ہے عمل
سانہ آباد پرواز ہے شہا کی طرح
ہے نالے سولے لاکھن قسم سے کامل
جو یہ جھیں کے بیخ لگائے ہے بھروسہ
یکہ ہوائی ہے پریت پہ بچائے نعل

تفسیر: کہ عمارت حسن نے شہر میں بھی تھی اور تھیں بھی۔ اس طرح ان کے یہ قصیدے، پانچ شہروں میں
ہیں جو مولیٰ انور کا اصناف کے سلسلے میں ہیں۔ انہوں نے اعلیٰ و ذرا کی ہے اتحاد و یکا ہے۔

میں کا کہوئی زبان پر نا بھی دھڑکتے چہا کی جہ ہے کہ پانچ تہہ تصورات کیلئے ان کے یہاں سب
اصطلاحیں آئی ہیں۔ مگر یوں ہر قصیدہ ان کے مختلف ہے۔ وہ اپنی ترقی کا سامنا کرتا ہے ہر مضمون پر جہ کہ مولیٰ
اکرم کی شان میں ان کے قصیدہ ساز دشواریاں شہر اپنی مثالی آپ ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ ایک قصیدہ صرف اس وقت تک
مطلوبہ کی کافی تفسیر ہے۔ جس کا یہ تہہ ان ترغاض و ہم و چکا ہے:

گھر پہ یکہ نہ دنگیر را نعل

موسے سداش تو دلیلی قدم را

میں کا کہوئی کے یہاں اپنے تہہ کی سداش نہیں ملے۔ اس لئے کہ ان کے یہاں نہ پاؤ اور تھیں ہے۔

میر جہادی مجروح

(۱۸۱۹ء - ۱۸۶۳ء)

میر جہادی مجروح قاضی کاظم میر جہادی تھیں۔ ان کے والد کا نام میر حسین تھا جو شاعر بھی تھے اور انھیں نگار
کہتے تھے۔ یہ قاضی تھے۔ میر جہادی کا چچا ان مرثیہ کی ہے ان کی انصاف کے ساتھ نگار کے دادا بہادری مرثیہ
نہاں کی تہہ تھیں ان کی سداش کہ وہ عالم کے ہر دلی شاعر ہو گئے تھے۔ ان کا چچا نام میر فقیرت اور تھیں فقیرت
"میران مجروح" کا نام ملا شاعر تھیں۔ ان کی ہے۔ اسے جس ترقی کو وہ دیکھتے تھے ان کی یہ میر جہادی مجروح کی
تھے اس کا نام میر جہادی ہے۔ غالب نے انہیں اپنے تھوڑے دن کی ایسی دیکھی ہے وہ اپنے تھوڑے تھوڑے تھوڑے تھوڑے

تہہ ان کے تھیں میں قاضی کی موت میں ہوئی ہے۔

میر جہادی کے مطابق ۱۸۱۹ء کے اوائل میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ انہوں نے میر حسین
اور سہا سہا کے خاصا بہا۔ خصوصاً ان کے ہونے کے دن پر قدرت دیکھتے تھے اس کے مجروح نے ان سے خاص طور پر استفادہ
کیا۔ مجروح کا ہونا ان کی اہم قضاہ کے والد اور چچا دونوں ہی علمی اعتبار سے مخرم تھے۔ ابتداً مجروح نے ان
سے ہی استفادہ کیا۔

میر جہادی کے اساتذہ کا تعلق بہاؤن سے تھا۔ جہاں سے بعض اہل ادب و ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور مغل سلاطین
کے اساتذہ ان کی دہلی اور دار سے ہو گئے۔ ان کی خدمت مستقر ہو گئی۔ اس کی انھیں مشورہ دی کہ میر جہادی سے
سورہ لے سہنے ہو کرے "کچھ نکل" میں بھیجے۔ ان کی ایک غزل میر جہادی کی ہے جسے قاضی کاظم جہادی نے اپنے
نثر و عمر و عجم کی شہر کیا ہے۔ میر جہادی مجروح اپنی کے والد اور چچا نام پر تھے۔ ان کی قلمی نام کے میر جہادی کا نام
آئی جاتی ہے۔ اپنی بہت جاننے کے میر جہادی کا نام اس کی حاصل کرتی تھی اور اس کو شہر میں کتاب بھی ہوئے۔ وہ بہت
دانت ہوئے تھیں ان کے خلاف سازشوں کا ایک سلسلہ قائم کیا اور ان کی دہلی کی مدت کے بعد وہیں رہنے لگے اور
ان کا طریقہ یہ تھا کہ ان کی اپنا ہوا تھا جہاں یہ نہ کہ کوئی دانت لگے۔ مجروح نے یہ شادی کسی سیدہ ان کی سے ہوئی تھیں
سے اس میں تھیں چھ ہوئے۔

میر جہادی کے دلی میں شہرت تھی۔ انھوں نے اپنی ترقی میر جہادی کا نام اور غرض میر جہادی کے دلی تھیں یہ ایک
نگار دلی کی جہاں تھوڑے دن اور دیکھ کر دلی تہہ بہت دور کر کے ہیں لیکن میر جہادی کے قلم سے قریب ہیں۔ ان کے
یہاں غالب کا فکر بہت دیر کی اور تھیں لیکن وہ تھیں جو میر جہادی کا نام میر جہادی کا نام میر جہادی کا نام ہے۔
اس میں دانت سے کئی ان کا تھیں تھیں۔ یہ میر جہادی نے اپنی شہر میر جہادی کا نام میر جہادی کا نام ہے۔

شعر میں ہے مثال ہے مجروح

"حق غالب" ۱۸۱۹ء

لیکن میر جہادی غالب کی تہہ داری ان کے یہاں ملتا ہے۔ غالب کا کام میر جہادی کا کام ہے وہ تھیں میر جہادی
اپنی شہرت کے اعتبار سے میر جہادی کا نام میر جہادی کے لئے تھا، چلی کرتا ہے یہ میر جہادی کا نام میر جہادی کا نام ہے
کے یہ بھی تھیں تھیں۔ ان میر جہادی کا نام میر جہادی کا نام میر جہادی کا نام میر جہادی کا نام ہے۔
تھیں میر جہادی کا نام میر جہادی کا نام میر جہادی کا نام میر جہادی کا نام میر جہادی کا نام ہے۔

دل کی ہے جھپٹاں تھیں۔

اک ٹھکے سی رہی کہیں عکس

ہر طرح کی مصلحت کے لئے ہر اہل نقل و حرکت کو تیار کر دیا۔

یہ بڑے فائقہ کا فرمایا وہاں طرف کھینچا
رات بھر جھڑپیں لگیں، چہ نہیں اٹھا در دہا

(حافظ)

کھڑا ہے ہام پر چڑھا مہا کس چارہ ٹھیکس کا
مگر بھوکے ہوئے کھسکا کساں دیکھا داس کھینچی

دل کی رو صد حتم صاحب داس بھارا
درا کہ رات پتیاں خوبہ شد آشکارا

(حافظ)

کہاں پہنچا و طاقت ہے کہ ہم ٹھیک دکان کھولیں
خزانے کی خرچ دل میں لئے بیٹھے ہیں راز اس کا

شب تاریک و قیام صبح و گشتاب جہیں جاگن
کچھ راتہ حال : کھسکا داس سائل با

کہا چھڑا ہے بھوکے کو کھانے غم ہاں تو لے
اتھیری راتہ حالے کا عالم ، پلٹا دلا کا

آئینہ شکر ، جام جم است نگر
کافہ قیام صبح و رات ، دھواں کھنک دانا

خاتیا مسرت رہے آئینہ مسرت با رہ
بر زمین کو ہے چہ ہوئی کہ شکر ہم چہ

(نثار)

عاشق ہضم مرا با کھر با اٹھاں چہ کار
کھنک دھوم ، مرا دل و اٹھریں چہ کار

اسم : کھر نامہ نہیں بھاتا خیال میں
دست سے چلا وہاں ہی آپ اپنے حال میں

راتہ از ہونٹ کھنک دھوم تو بہت
دلے دشمن تو در لپک کر چٹاٹش

وہی دھنک ، وہی لڑکھو ، وہی ڈرک جہی
کھول نے کھنک دھوم ہے سر پہ میرا

یہاں مٹھوا امید ، چوں راتہ از اسرہ فہم
دھنک دھوم چھوڑ دھنک دھنک دھنک دھنک

جہاں کھنک ان کی ہیں ہے مصلحت ، مصلحتوں کے باخبر ہم
اب ایسے کی دھنک دھنک دھنک دھنک دھنک

ایسے درج کے عاویہ شاد کھنک دھنک دھنک دھنک دھنک
کھنک دھنک دھنک دھنک دھنک دھنک دھنک دھنک

ایسے گھبرا کو خود رو چلا دے ، دھنک دھنک دھنک دھنک دھنک
دھنک دھنک دھنک دھنک دھنک دھنک دھنک دھنک

چند کی دھنک دھنک دھنک دھنک دھنک دھنک دھنک دھنک
دھنک دھنک دھنک دھنک دھنک دھنک دھنک دھنک

چات و کف مولی و موی

افسانہ گوئی مجموعہ 2017 انچیا

مزید اہل علم ہندو اور دیگر مذاہب کی داستانِ عشق بھی یہ ہو رہی ہے۔ ان مذاہب کے ہادیوں کی بات میں قدرے حرج ہے۔ یہ بھی ایسا عجیب و غریب ہے کہ اس کے بعد دھرموت کی جیسا کہ وہ بے گناہانِ گندہ گندہ ہے۔ شاعر نے بھی روایتِ عشق اور حجاز کے عجیب و غریب حالات کو نظر سے ہوا ہے۔ شاعر کی یہی حالت ہے کہ قرائی حجاز کے عجیب و غریب حالات کو نظر سے

جس کے گھر سے میں ستر غم پر
 تم فرقت سے لے کر بڑھ گیا
 بے قراری دل ستائے تھی
 بے خبر تھی تو وہ فرقت سے
 دور دل چاہ بہت سنا تھا
 میں تو اس دور سے تھی آگاہ
 کاد روشنی وہ بہت آہیں
 سے لیتی تھی چلا کر تھی

یہ دہائی سنہ بیسٹ کر ۱۱ قمر
 اور خزاں ۱۲۱۱ امتداد آیا
 ایک غمِ چلم تر بھانے تھی
 بادل تھی جو گونجے آواز سے
 جیسے لفظ زمیں پہ تھا تھا
 دل کو کیا ہو گیا مرے اللہ
 کاد اب کی نکال کر آسمان
 دیکھو دل کی پہ کاد دھرتی تھی

میرزا علی صبا

 (π, MSE)

میں نے بھی ان تمام باتوں کا تجھ کو بتا دیا ہے۔ اللہ پر ہمارے بھروسے ہیں۔ یہاں کی تعلیم و تربیت اور اشیاء کے طور پر رہتی ہے۔

تاریخ پیدائش: ۱۹۵۵ء، تحصیل: بی۔ اے، ایم۔ اے، ایم۔ اے۔ سی۔ اے۔

نذیر اللہ، سید اہدیل شاد سے درج ذیل باتیں ہو گئیں اور انہیں علاحدہ رہنے کا حکم دیا گیا۔ ان کی رفاہ اور خوشحالی کے لیے دعا کی گئی۔

[illegible][illegible]

جس شخص نے مائیکرو انویکشننگ کی ہے اس کی تعریف میں کہیں کہیں "کتاب" اور "بہ" نہیں آئے۔ (۲۸)

شائروں کا ذکر کیا ہے۔ پھر میں نے "عقیقہ" سلطان باہا کھوسو" لکھی ہے، "نصیبی حریف قصبہ" اور "رقی چلیا"۔

میاں کا بیان پہلی بار غیظ و آگے نام سے مشہور ہوا، جو قاضی احمد علی کے بیٹے تھے جن کا نام سے سر
ہے۔ دہلی، علی گڑھ اور علی صبا آباد کے شاگرد تھے لیکن ان کے کلام کا رنگ بالکل سے ہوتا تھا ہے۔ ان کے کلام میں
ہاں اور سے نہیں۔ مثنوی اور آزاد کا ذکر ہے۔ خبر ان کی الفاظ بھی مستعمل کرتے ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے
باوجود محض دستان کے ایک ایسے شاعر قسم کے کہتے ہیں۔ یہی کہہ سکتا ہوں کہ ان کی دستانیت محض کے دوسرے شعرے
شعر ان کی مقصد میں دیکھا جائے۔

مبارکاتِ ظہور و فخر کہتے ہیں۔ نتیجہ میں اس کا احترام ان کے یہاں بڑھ رہا ہے۔ مفسرین کے خلاف یہ بات
الغرض سے کہتے ہیں لیکن اعلیٰ ان کے یہاں رہتا ہے۔

چونکہ ان کی صفاتی پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے آئین کا رنگ بھی ظاہر رہا ہے۔ آئین تو اصلاح و ایمان کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ لیکن مباحثے میں اس پر توجہ نہیں دینا بلکہ ایسا ہی البتہ صحت پر اُٹھتے ہیں۔ :-

”مبلغ اور حق کے فیصلے کو زبان کی اصلاح کا خیال خود سرکات کا ذمہ خیال رکھتے تھے لیکن اندیشہ کو فاقہ بخیر، ان کے منہ میں کشا گردان کے کام میں نظر آتی تھی، اس سے یہ لوگ محروم تھے۔ اسے عہد کے عام مذاق کے مطابق مبالغہ بھی خیر سے اخلاقی مقاصد نظم سکے تھے، جیسا کہ گوشت و سوغاتی پر نگاہ رکھ کر کہا ہے۔ یہ سوجھ بوجھ اس سے کہ ہم یہ جہاد یا ایکہ اور جہاد کے مقاصد کے، جو شعراء نے قصو کے باب پر موضوعات سے ہیں اور جن میں اس جہاد کی موافقتی پہنچی حریف جھٹکتی ہے، یہ لوگ افسوس اور اخلاقی مقاصد میں بھی بخیر سے نظر کرتے ہیں۔ انھوں نے اخلاقی مقاصد میں نظر نہ کیا کہ ثوابی اور باغیہ اور کسی سے تعلق نہ تھا۔ ان سے اس خیال کو اتنا توجہ نہ آتی ہے کہ وہ دنیائے دینی کی شکل میں کچھ نہ کہیں گے کہ ان سے انہیں نہ کہتے کہ اس سے کوئی افغانی حقارت نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس سے کہہ کر دنیائی کی رنگینیاں اور محفل برتن کی جگہ پر ختم ہو جاتی ہے۔“

کہیں معشوق کہیں عاشق کہیں کائنات کہیں

تفہیم کو مزید عمیق بنائے، روٹی مکمل رکھا

$\chi^2 = 16.4$, $\text{d.f.} = 10$, $p = 0.08$, $\text{NFI} = 0.99$, $\text{TLI} = 0.99$, $\text{CFI} = 0.99$, $\text{RMSEA} = 0.02$.

۱۔ ایک نیا ملک بنانا

جاتا ہے، لیکن قدرے سنبھلے۔

رواقی خیر آبادی کا قریباً نصف کے مشہور شاعر تھے۔ مغربی اس طرف دوسرے لیکن ان کے یہاں دکان سرقی نہیں، مگر ان کا لڑکھائے گئے لیکن۔

میں کا کردہ کی طرح ان کے یہاں نہیں گانا بھی کہتا ہے جس میں ہندوستانی صوفی کا لہجہ لگتا ہے۔

مغربی خیر آبادی کے کام میں قبول کیا ایک شفیق بن کر رہتا ہے۔ چونکہ وہ سلسلہ مصحفی تک پہنچتا ہے جس کے کی شاعر حتمہ نام کام کرتے تھے، اس سلسلے سے جھڑکی اس دھم کو پانتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دینی اور دینی شاہ سے ان کی روحانی نسبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قبول ان کے کام کا کل ایک حصہ ہے۔ انکی تمام باتوں کے بارے میں نہیں کیا جاسکتا کہ مغربی کے یہاں قدیم لکھنؤ کی دھم لگتی ہے لیکن ان کے یہاں پچھلے شاعر کی تعداد بہت کم ہے۔

ایک خاص چیز جو مغربی شاعری میں نمایاں ہے وہ ہندی ہے ان کا قتل ہے۔ ہندی کا قتل ہے۔ ان کا کاروبار رہا ہے انظر آتا ہے۔ ان کا شوق تھی کتب شاد و کتب پہنچتا ہے۔ انہوں نے ہندوستان کے بعض خوب بارے بھی اشعار تصنیف کئے ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی ماس کی کارفرمائی ان کی شاعری کو ایک اضافہ ملتی ہے۔ جس کا وجہ ہے مضبوطی میں ایک اہم شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کے چند اشعار بھی خطہ مست ہیں۔

لڑائی ہے تو اچھا مات خبر ہوئی ہر کر

ہم اپنا مد اور کر لیں تم اپنا مد اور کر

دور کی ہفتی منہا نہیں

دیکھ لیتے ہیں اچھے بھل کا کہ

مغربی اس نے سوالیہ افسانے

میں اتنا سے کہا خدا نہ کرے

جہاں سے میں نی کے سے اول تو چپ رہتا

بات جب لگو تو سرقی کر خدا کہتا

سرقی کی محبت میں دل صاف داتا

جب سر کو بھگاتا ہوں شیخ انور آج ہے

نہ وہ ہندی نہ شاپ وہ نہ وقت وہ نہ زمانہ

انہیں میری دعا سے غرض نہ دی گئے ان کی جگہ کا گانا

مرزا محمد خاں برقی

(۱۸۵۷ء۔)

ان کا پورا نام مرزا محمد خاں خاں خاں برقی تھیں کرتے تھے۔ ان کا مکمل نام بھی خاں خاں برقی تھا۔ ان کا نام برقی الملک کہلاتا ہے۔ یہ خطاب تھا جو ان کی تواب احمد علی شاہ کی سرکوسرے ملاقاتوں میں برقی خواب کے مصنفہ خاص تھے اور استاد بھی۔ ان کا انتقال ۱۸۵۷ء میں بنارس میں ہوا۔

برقی اپنے وقت کی بے حد اہم شخصیت ہے۔ ہوں گے ان کے لکے کتابوں کے شاعر ہوں میں ہلال اور میری تھے۔ میں کا کردہ کی طرح ان کی شاعری بھی برقی سے ملتا ہے لیتے تھے۔

برقی کی شاعری بانگمیں کی شاعری ہے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک اور صوفی سے انکی طرح جنت تھی۔ ان کا ایک دیوان بھی ہے اور ایک شریعت شہب بھی لکھنے کے عالی زاد پر قصیدہ کی تھا۔ اس میں بڑا دور نام لایا جاتا ہے۔

دیوان میں غزلیں بھی ہیں اور دوسری سہلیں بھی۔ انہوں نے نامعلوم سے تاریخ کی غزلوں کی ہے جن کے یہ شاعر تھے۔ ان کے یہاں لکھنؤ کی طرف سے اشعار لکھ لے دیں اور خوب خوب لے دیں۔ ان کی اس میں یہ نامور خاصیت دیکھنے سے۔ عادت لکھی نہ لکھتی لیکن ان کی ایک صاف تھی۔

کہا کہ لکھنے کے برقی کی شاعری تلفظ اور شمع سے ملتی تھی۔ ہند اشعار دلی میں بھی کر رہے ہیں۔ میں سے کام کے لکھ کا بخوبی انداز لگتا ہے:

دکھائی دیکھ سرق نے دانی بہار صمن

میراث زلف کا لفظ تمام ہو گیا

شوقی دیکھ میں دلدار اس پرستم ہے

میں سے لکھ میں میرے کاغذ ہو گیا

میرے عالم کو اور میرے جوش اشک نے

ہاتھ عالم پر غمت میں پائی میر گیا

دیکھ عارضی کو پہنچنے نے وہ چھان کر دیا

جاہر ہم سے ہونے کا پائی ہر گیا

جہاں جانی ہے بچے میں سر اسے پہتاں

تازک ہے شجر و جھڑک کا نہیں الف

کلام ان کے استاد کے صاحبِ چہرہ تر حسد دیکھئے ایک غزل میں کس طرح عارفی و معشری کے راجحی خدا خاں لاریں ہوئے ہیں اور اندازِ نگاہ کی وہاں ہے خدا کا ہے:

مرد بھیر کے ۱۰۰ کچے ہیں جس میں چاہئے
اس شرم میں لگا کے قربان چاہئے
یوں خاک میں پا کے نہ ادا کیا چاہئے
قدر کو تھکے دیکھتے ہیں میں چاہئے
آئینہ دیکھ لیجئے جو میری نگاہ سے
بھری طرف سے آپ بھی قربان چاہئے
یہ کہہ کے میرے ساتھ بلا رقیب کو
۱۰۰ سے کہیں کی جان نہ بچان چاہئے
میرے دغا ہوں اور افکار آپ میرا
کیا حق کہا ہے آپ کے قربان چاہئے
آگے سے گھر رقیب کا میں سر نہ ہو چکا
اب آپ کا قضا ہے تھکان چاہئے
البتہ بلا کے دوست کو دشمن بنا لیا
نادر تمہارا چھل کے قربان چاہئے

کہیں کہیں بخود بھولری انداز میں اس طرح شعر کہتے ہیں کہ مصیبت اچھڑ جاتی ہے:

میں موزر تھی نہ کوئی سونگار تھا
تم میں یہ مد رہے تھے یہ کس کا خوار تھا

یہاں دوسرا شعر اس طرح سامنے آیا ہے اور مطلب ہے۔ کہیں کہیں عمار کے گمراہ تھے کی وہی صورت نکلی ہے خدا کا طر چھڑا ہے:

دل چھانے مگی دندوہہ نظر دیکھ لیا
ہم نہ کہتے تھے کہ میں چور نے گھر دیکھ لیا
ای غریب کا ایک ہاں البتہ دیکھئے

۱۰۰۰ غزلیں تھا سر کو قہہ شمشیر رکھ دیا
تھا تو کیا کر میں ہم بوجہ گردن کا انداز لے

گھڑی طور پر بھولا کا کلام اس کے گھٹن پر ہوا اور آواز پڑی ہے نکلی ہوئی آواز دہی حسنِ معشوق نے سر ملے۔ لیکن بھولا ایک ایسا شاعر رکھتے ہیں جس میں جھوٹو پن کی گڑبگڑیں اس لحاظ سے ہیں کہ اشعار ایک خاص لہجے رکھتے ہیں، ان میں رکاوٹ کا یہ بھولا نہیں ہے اور یہاں تک ہے۔

بخود بھولا کا انتقال ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں ہوا ان کا چہرہ دکائی دے گا غریب ذاتی بھولا کی میں نہیں ہوا۔

شوق نیوی

(۱۸۶۰ء - ۱۹۰۳ء)

شوق نیوی کا اصل نام شوق نیوی کے ۱۴ سے مشہور ہوئے۔ ان کی ۲۱ رچ پیدائش ۱۸۶۰ء بمبائی ہوتی ہے۔ رومات ۱۹ نومبر ۱۹۰۲ء کو ہوئی۔ ان کی پیدائش صائب پور ضلع چنڈیاں اپنی خاندان کے بیان ہوئی۔ ان کا نام گھر میں اس کے رکھا گیا۔ کہیں کہیں ان کے نام کو دوسرا شعر لکھوا دیا گیا ہے۔ نیوی کی اصلیت ایک دہلی اس زمین میں ہے

شوق است محض طبع احسن ہم
ہر قریہ دوزخ بھی است مقام
شہ از ہے کیم ، او الخیر الہام
تاریخ توہم طبع اسلام

ان کا سلسلہ نسب حضرت ابو کریم بنی تک پہنچتا ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور ان کے والد نے ان کی تعلیم میں ذاتی دلچسپی لی، جس کا اثر خود استاد نیوی نے کیا ہے۔ ابتدائی میں عربی اور فارسی کی کچھ اہم کتابیں پڑھا دی گئیں۔ نتیجہ میں ان دونوں زبانوں پر خاص قدرت حاصل ہو گئی۔ لیکن پڑنے کے علاوہ علم کی کھجور انہیں غازی پور سے آتی جہاں انہوں نے مسلمانانہ ماحول میں فارسی پڑھنے سے تعلق نہ رکھ سکا۔ بھولے نے اپنی ابتدائی زندگی بھولا غازی پور کے جلسے میں اس غرض کا اظہار کیا ہے۔

”لو کہیں میں خدا نے طہیت الہی موزوں پہلی تھی کہ جب میں گھر میں نہ تھا تو
فی الہد یہ شعر میرا کر لیتا تھا۔ میں میں لکھتا تو شعر میرا کہیں نہ تھیں کہ میری طرف سے
تیرا کہتو۔“

والد مرحوم نے بہت بڑی کے لئے بہتر تہہ حروف لکھی اور ان کے بہت سے اشعار
تبع کر دئے تھے۔ جن کے آخر میں پائے پہلے تھی اور وہ اشعار تھے یاد کیا دئے تھے۔
میں جب کسی بہت سے ساتھ غرض تھی میں جا اور وہاں کے لائے بہت یاد دئے لئے پہنچتے

جس کو دیکھ کر ہم مدے خوب اگلی جہانوں کو
 بھر کے داغ یاد آئے جو دیکھا لالہ زادوں کو
 کبھی کہ نہیں سن کے جسے تم بولے ہے یمن
 قہ ساز کسی نولے بولے دل کی سدا کا
 دل شوق صیوں سے لگا نہیں اچھا
 ہو جاتا ہے بدنام زمانہ نہیں اچھا
 دیکھ کر عہد نئی بحر آیا شوق
 یاد آئی کسی کے گھر کی طرح
 شکایت کچھ نہیں کی تائیں نام ہم کس کا
 کریں فریاد کس کی جب ہی یہ فیصلہ خیر ہے
 دامن کبھی بھلتے ہیں کبھی ملتے ہیں وہ ہاتھ
 اے شوق ابھی ہوش میں آنا نہیں اچھا
 ان کی شاعری کے باب میں ڈاکٹر محمد شفیق الرحمن لکھتے ہیں:-

ان کے یہاں وجود و حقیقت میں دونوں ایک ہیں۔ اگر چہ اصطلاح کے اعتبار سے الگ
 الگ ہیں کیونکہ سدا کا ایک قطرہ ہو یا ایک معمولی گھاس ان میں سے کسی کی کوئی الگ حیثیت
 نہیں ہوتی بلکہ دونوں اسی میں ضم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کائنات کا خدا سے کوئی الگ وجود
 نہیں۔ چاہے آپ اس کا نام وحدۃ الوجود بھی یا وحدۃ الوجود و شہادۃ فرماتے ہیں:

ہو سکا تم جو کوئی دریائے وحدت میں چڑا
 بحر ہے پاؤں میں مٹا ہے پتہ کب کا
 ایک قل ہیں باب وحدت میں وجود و شہاد
 ہے یہی مسلک جناب شیخ حق آباد کا ۔

شرق نیوی نے پانچ شعر بیان تحقیق کی ہیں۔ "غیر از"، "سوز و گداز"، "درد و جدائی"، "صبح وصل"، "ہر" شاعر "اق"
 ان میں سے "سوز و گداز"، "غیر از"، "درد و جدائی" میں بحرِ شوقی، "سوز و گداز"، "غیر از"، "صبح وصل" سے مشہور

مشق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا قصہ اصلی اور تاریخی ہے جس میں محمد حسن اور شام سدا کے عشق کی کہانی رقم کی گئی ہے۔
 عاشق یعنی محمد حسن نے اپنے حالات بذات خود لکھے جس کو تاخیر عظیم آبادی نے اپنے خط میں نقل کر کے شہزادہ نواب مرزا
 جہاں بخش جہاں نادر شاہ بہادر کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔ اس واقعہ کو تاریخی حقیقت کی بنا پر علی میر و بلوی نے کچھ روایات
 کے اشکاف سے اساتذہ اپنی مشق "اشعۃ عشق" میں رقم کیا اور سر داستان میں صرف لکھی ہے:-
 "آخہ قصہ یاد کا کرد عہد محمد شاہ و ز عظیم آیا دہر و وضع و شریف ملبو و بیوتہ"۔

شکل ہا قرعہ طباہی باقر کھڑی نے اس کی تائید کی ہے۔ قصہ کا قوام کس ایتا ہے کہ:-
 "محمد حسن ایک غریب صورت لڑکا جو ان لڑکوں کا تھا جو چڑھ سنی کے محلہ جھولی چن رہی کارہے والا تھا
 اور شام سدا ایک نہایت خوب و اور پتی تھیں لڑکی تھی جو چڑھ سنی میں چنگ کے قریب محلہ سدا
 بازار کی ہاشمہ تھی۔ یہ محلہ مہاجروں سے آباد تھا اور شام سدا سی محلہ کے ایک مہاجرین کی لڑکی
 تھی۔ دونوں کا واقعہ تھا۔ عاشق نہایت حیرت انگیز ہے اور نہایت دلچسپ بھی۔ اسی بنا پر
 علامہ نیوی نے اس واقعہ کو سوز و گداز میں نظم کیا ہے۔"

یہ فیصلہ مغلظراً اقبال نے اس مشق کو مرثیہ کر کے شائع کر دیا ہے جس میں مشق کی مختلف جہات پر تحقیق اور
 تنقید کی روشنی ڈالی گئی ہے۔ واقعہ کی سچائی پر جتنے بھی ثبوت پیش کئے جائیں لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کسی ایسے مشق
 واقعہ کو مشق کی شکل دے دی گئی ہے۔ اس مشق میں جو پھر عقل و احساس میں دو واقعہ کی سدا کو مرثیہ لگاتے ہیں۔
 لیکن سچائی میں وہ دامن کا عنصر نہ ہو تو پھر شک سچائی شعر میں سن سکتی اس لئے اس مشق کی اپنی ایک اہمیت ہے۔
 شوق کی دوسری شکل اس بھی اہم ہیں اور مشق کی نگاہ سے ان کی دلچسپی ظاہر کرتی ہیں۔

شوق نیوی نے قطعاً اور با اطمینان بھی لکھی ہیں۔ شعر و شاعری اور واقعات کے سلسلے میں جلال سنان کا شعر کہ
 مشہور ہے۔ "ان امور کی تفصیل طویل ہوئی ہے اس لئے میں نہیں ختم کرتا ہوں، اس اصرار کے ساتھ کہ شوق نیوی کو
 بحیثیت شاعر و جگہ ابھی تک نہیں مل سکی جو ملنی چاہئے تھی۔ ویسے اپنی اور دیگر امور میں ان سے استفادہ کرنے والوں
 میں تو مولانا ابوالکلام آزاد تک تھے۔

سرور جہان آبادی

(۱۸۷۰ء - ۱۹۱۰ء)

بذرت درگ سبائے سرور جہان آبادی اردو کے اولین نظم گو شاعر میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کی قادرا کا کی

وہ داغ ہوں کہ لالہ برقی نکا ہوں میں
وہ اشک غوں ہوں میں کہ ہوں طوقاں طراز عشق
ہندانہ ازل ہوں میں اسے شمع انجمن
مجھ سے نہ پوچھ قصہ سوز و گداز عشق
نہ اور محو حسن قہر فزا مدام
میں اور ایک خمیہ بخور و نیاز عشق
بر آئینہ میں نکس ہے اس کے جمال کا
اہل نظر ہے شڑا مگر امتیاز عشق
وہ روشاں سوز محبت ہوں میں سرور
پہلو میں داغ عشق ہوں دل میں گداز عشق

نیم قریشی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:-

”سرور کی شاعری اس دور کا آئینہ ہے جب شعرا ادب کی پرانی قد ریں نوٹ دہی تھیں اور فکر و خیال کی نئی طرحیں بڑا دی تھیں۔ اس نئے دور میں بہت سے شاعر اور ادیب تصعب اور ناروا آزاد عشق کے سبب حقیقی جادے سے بہت دور جا پڑے۔ سرور کا کمال یہ ہے کہ وہ طرز قدیم سے لپٹے رہے اور نہ جدید کی رو میں خس و خاشاک بن کر رہے۔ سرور سچے وطن پرست تھے، ان کے دل میں ہر گرج محبت کی حقیقی ٹرپ تھی اور ان کے مزاج میں صحت و سرشاری کی دلدھانہ کیفیت تھی۔ ان کے کلام میں اردو اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اس لئے ان کا کلام جذبات نگاری کا بہت جانتا و مرقع ہے۔ ان کی ایک اہم خصوصیت حب الوطنی ہے۔ سن کی وطن پرستی اپنی انسانی تصور کی تر جمان ہے اور اس میں شاعری کا وہ لگتی لگتی کوئی مفہوم دیتے نہیں۔ ان کی قوم پرستانہ تکلیفیں بڑے مزہ کی ہیں اور سب حب وطن کے سچے جوش اور اپنی خیالات سے بہرہ ور ہیں۔ سرور کی تاریخ اور زندگی نظمیں شاعرانہ خوبیوں کے قلع نظر اس لحاظ سے بڑی قدر و عزت کی مستحق ہیں کہ انہوں نے ہندوؤں کے تاریخی واقعات اور مذہبی تصورات کو سنووی کے اعلیٰ کمال کے ساتھ چاند شعر پینا ہے۔“

سرور نے منظر کشی میں بھی ایک خاص کیفیت پیدا کی ہے۔ ان کے شاعریات ج سے تیز معلوم ہوتے ہیں فطرت سے حقیقت ان کی بعض نظمیں حسن ازل کے مقابلے سے بہرہ ور ہیں۔ مگر بڑی کے درمیان شاعروں کے اثرات اس

باب میں نمایاں نظر آتے ہیں لیکن یہاں بھی ہندی اور عذستانی ایک متضاد نہیں کیا جا سکتا۔ موسم بہار، نیم عمر کی آمد وغیرہ کے ایسے مرتقے ہیں جو بہ کشش معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی مذہبی شاعری ہندو اساطیر سے بھری چڑھا ہے۔ دیوی، دیوتاؤں اور تاروں، مذہبی مقامات ایسی شاعری کا ۲۵ تا ۲۸ ہاتے ہیں لہذا اس باب میں ہندو شاعری کا دامن وسیع تر ہو گیا ہے۔ یہی ہے حقیقت ان کی غزلی نظم کے چند اشارہ نگار ہا ہوں:

شعبہ سہرت وہ عجب تھی وہ عجب شمع تھی
کہ جب آکاش سے اتر آقا تو سگھڑ سن
نظر آئی تری صورت میں عجب حسن کی جوت
تو نے دیوی میں اپنے چو دکھائے روشن
ایک چکا چند کا عالم دم نکادہ تھا
گورا گورا تن نازک تھا سر پہ کندن
تھی چمک خوب ترے چاند سے دھاروں کی
کسی منور میں تھے یا تھی کے دئے وہ روشن
ترجمی یا کی کامیں تھیں کڑی دہوں بھری
لئے پھرتے کبھی دن میں جنہیں رام و بھمن

انہیں مرثیہ سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کے شخصی مرثیے ایک خاص کیفیت رکھتے ہیں۔ ان میں سچے جذبات کی ترجمانی ہے۔ ایسے شخصی مرثیوں میں لالہ لاجپت رائے کا مرثیہ سوانحی رام تیرتھ، چنڈے لکھ رام آریا اور داغ سے متعلق مرثیہ اہمیت کے حامل معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح خواب من الملک، کبھی ایک مرثیے میں خراج تحقیرت بھی کیا گیا ہے۔ گو یہ اس باب میں بھی انہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ کہہ سیکے ہیں کہ وہ گاہا بے سرور جہاں آبادی اردو کے ایک قابل لحاظ نظم و شعرا میں ایک ہیں جن کی اردو ادب کی تاریخ میں ایک خاص جگہ ہے۔

علی نقی صفی لکھنوی

(۱۸۶۲ء۔ ۱۹۵۰ء)

علی نقی نام اور صفی ٹکھن تھا۔ ایسی اعتبار سے بڑی سید تھے۔ سرور، علی کا وطن غزنی تھا، جن میں کچھ سید اور اہلین شواہ انکس کے زمانے میں دیلی آ گئے اور یہی وطن غزنی ہوا۔ صفی کے پردادا سید مسلمان علی نے لیچن آباد میں سکونت اختیار کی۔ ان کے صاحبزادے سید سلطان حسین مجدد صیور الدین حیدر علی مکتوا تھے۔ ان کے ساتھ ان کے بھائی

سائل دہلوی

(۱۸۶۷ء - ۱۹۴۵ء)

سائل دہلوی کا پورا نام نواب مراد الدین خاں اور سائل شخص تھا۔ سالہ ۱۱۸۰ھ بمطابق ۱۷۶۷ء میں پیدا ہوا۔ سالہ ۱۲۶۵ھ بمطابق ۱۸۴۵ء میں انتقال ہوا۔ سائل کے سبب نسب کی تفصیل پندرہ اسطرلوں سے اس طرح ہے۔ سائل بن نواب شہاب الدین احمد بن نواب قسب بن نسیا الدین احمد خاں بہادر میر درخشاں بن خیر الدین نواب احمد بخش خاں بہادر والی خیر پور پرنسپل کا بارہ بن مرزا عارف جاہلہ خاں۔ گویا ان کا شہاب پانچ بیٹوں سے نواب جلا آقا غلام کے ہر سے تیس ناکہ نام کی وضاحت اس طرح ہے:-

”وہ خود کوئی بہت بڑے عالم نہیں تھے۔ اپنے چچا زاد گویا کے بعد انہوں نے حسن احمد خاں دہلی نذری احمد مراد سے کچھ عربی پڑھی تھی۔ حدیث کی چند کتابیں مشہورہ علم دہلوی سید نے مرثیہ محدث دہلوی سے پڑھیں لیکن اس کے باوجود ہم کسی طرح نہ سیکھ سکتے کہ انہیں عربی علم یا مذہب سے کچھ ایسی بڑی پڑھنی تھی کہ انہیں ان مولویوں کا ہر مقابل خیال کیا جائے۔ بلکہ ان خاندانی روایات کے مطابق وہ بہت خوش اخلاق تھے اور سب علماء اور اصحاب نفس کا نام احترام سے پکارتے تھے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شہ نہیں کہ جہاں وہ جتنی بزرگی اور غم کے قد و نشان اور پرستار تھے وہاں اسی طرح کے سخت دشمن بھی تھے۔ کسی بڑے سے بڑے نام کی شوکت اور شہرت انہیں سرحد نہیں کر سکتی تھی اور اپنے جیہات کے اظہار میں کوئی گلی لہجے نہیں رکھتے تھے۔“

سائل کی پہلی بیوی نواب محمد حسن خاں نواب بڑوئی کی بہن تھیں۔ لیکن یہ شہ ازدواج کا حق نہ دے سکا۔ انہیں سے ایک بیٹا بھی تھا جو بچپن ہی میں فوت ہو گیا۔ اس کا نام معظم مرزا رکھا گیا تھا۔ سائل نے اپنی کنیت اور اسمت پر ہی بنیاد پر کوئی نہیں۔ ان کا بصرہ نکاح دارغ کی منہ بڑی بیٹی لاؤلی بیگم سے ہوا۔ حاصل یہ ہے کہ جنوں نے بیٹائی مرزا احمد الدین احمد خاں کی بیوی تھیں۔ ویسے یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ دارغ کی بیٹی سبلی الاولاد سے ایک تھی۔ ہم تو احمد لیکن اس کا بھی حکم میری طرف سے انتقال ہو چکا تھا۔ جب دارغ نے لاؤلی بیگم کو گور لیا تھا جس وقت وہی ہوئی، اس کے لئے اس میں بیوی تھیں۔ اسی زمانے میں ایک حادثہ بھی ہوا۔ سائل میرزا آباد گئے ہوئے تھے۔ وہاں کہنا ہے کہ ان کے کوہنے کی بی بی فوت ہو گئی۔ یہ دو بیویاں کچھ پہلے گئے تھیں۔ ان کی زندگی بھروسہ کوئی بھروسہ نہیں جو وہ طبع ہو جو تھی۔

سائل اپنی خاص زبان کی وجہ سے معروف ہیں۔ ان کی زبان کو مشہور و مذکور کیا جاتا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اردو نے اعلیٰ کا لفظ ان کی زبان سے حاصل ہوتا ہے جس کی طرف ناکہ۔ اس نے اشارہ کیا ہے۔ میں تو وہ دور دارغ کے

سید حسین اور سید فضل حسین بھی تھے۔ سید فضل حسین ہی صفی کے والد تھے۔ دو بیٹا دارغ کے لئے خاص ہیں۔ صفی ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولوی محمد الدین کا گوروا سے حاصل کی پھر ان کے استاد شیخ جانعلی ہرادی ہو گئے۔ اس کے بعد انگریزی تعلیم کی طرف راغب ہوئے اور انٹرنل امتحان پاس کیا۔ ان کے بعد مراد الدین کا درست کرتے رہے۔ ۱۹۲۳ء میں سیکرٹری ہو گئے۔ ان کی وفات ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔

صفی ایک شاعر کی حیثیت سے ممتاز ہیں۔ ان کے یہاں عاشقانہ مضامین کی کثرت ہے۔ زبان میں سادگی اور سلاست ہے لیکن مجموعی طور پر ان کا ادب قدیم شعرا کا رنگ ہے جس میں زبان و بیان کی صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ان کے یہاں تصوف کے اشعار بھی ملتے ہیں۔

صفی نے مولیٰ نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کی ایک نظم ”تنظیم لہجیات“ انگریزی سے ترجمہ ہے جس میں انہیں اشعار ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب اصلاحی زبان میں تھی لیکن صفی نے اسے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ صفی کی ایک غزل یہ ہے کہ ان کی نگاہ اپنی ثقافت پر بھی تھی چنانچہ انہوں نے مشہور مشہور پر نظمیں کہی ہیں خصوصاً میر کی اولاد آباد۔ ان کا کلام جب الرضی سے بھی مرشار ہے۔ ان کی انمول میں مناظر طہرت کی بھی عکاسی ملتی ہے۔ اس طرح وہ کئی لحاظ سے جدید شاعروں کی صف میں رکھے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے تصانیف بھی لکھے ہیں جو ان کے اہم حلقہ ہوتے ہیں۔ لغت و لغت پر بھی دسترس تھی۔ ایک غزل کے چند اشعار نقل کر رہا ہوں:

تو بھی بایں قفا مرے انداز میں ہے
جب تو یہ درد پیچھے تری آواز میں ہے
عشق حسن حسینوں کے ہر انداز میں ہے
کبھی چٹوں میں کبھی پردہ آواز میں ہے
ہولیں شور بچائیں نہ چمن میں کہہ دو
بستر گل پہ کوئی خواب کہہ نا میں ہے
نہ میراں چمن کے کوئی ولی سے پوچھے
وہ مصیبت جو شکست پر پرواز میں ہے
دل شکستہ درد میں زوئی ہوئی آواز ہے
میں ہوں اب کچھ قفس ہے حسرت پرواز ہے

جلیل ماسک پوری

(۱۸۶۷ء - ۱۹۳۶ء)

ان کا نام جلیل حسن تھا اور تخلص جلیل کرتے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۶ء میں انتقال کیا۔ یہ جانتا بھی تھے۔ انہوں نے امیر کے ساتھ حیدر آباد کا سفر کیا۔ پھر وہیں رہ گئے۔ حیدر آباد کی میں انہیں استاد السلطان ہونے کا شرف حاصل ہوا اور فصاحت و بلاغت کے قضاہ سے نوازے گئے۔ ان کے اصلاح دہندہ والوں میں میر محبوب علی خاں تھے، جنہوں نے جلیل القدر کے قضاہ سے نوازا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ جلیل امیر جلالی کے سچے شاگرد تھے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ ان کے کام میں نعت و مثنوی کا ایک خاص درجہ ہے جس پر امیر کا رنگ نمایاں ہے۔ معرفت سے ان کا کام نکلا نہیں۔ لیکن اس زمانے میں جو کلمہ کا مزاج تھا خصوصاً عورتوں کے سلسلے میں وہ ان کے یہاں بھی ملتا ہے، یعنی رنگ و مٹاؤ۔

بعضوں نے اس پر امیر ہی کہا ہے کہ جلیل کی زبان تاریخ کے مقابلے میں زیادہ صاف اور رواں ہے۔ لیکن یہ بحث طلب مسئلہ ہے۔

جلیل خرائج کے قطعی جذبات کی ترجمانی تو نہیں کرتے لیکن ان کے دل میں ان اول میں بہت سادہ ایسے اشعار ہیں جن میں خواتین کی آراکشی کے سامان کے نام درج ہیں پھر بھی مثالی حسن سامنے نہیں آتا اور وہ جذبات جنہیں ہم داخلی کہہ سکتے ہیں وہ کہیں نہیں ملتے۔ کیا کیا جائے کہ معرفت کے ہفت کے بعد بھی مثنوی شاعری میں عورتوں کا ہم جس طرح قوش کیا گیا ہے اسے بہر حال منجھوٹا ہی کہہ سکتے ہیں۔ جلیل امیر جلالی جیسے خجیر و شاعر کے حلقہ قوش ہونے کے وجود کھل کھیلے سے رکھتے نہیں اور اسی غارتی اصول میں رنگہ جاتے ہیں جسے عام طور سے مثنوی مزاج کہا جاتا ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

انہیں تن کے پیچھے کا عالم بھکا
مجھے ڈر سے ان کی کمر دیکھ لیتا

کھینچ کر پیلو میں بوسہ لے لیا
ان کا وعدہ میں نے خود پورا کیا

ایک بوسہ پہ بھی پوچھا کہ کسی نے دل کو
آج پہنچا ہے بہت عشق کے بازار کا رنگ

پوچھا کسی نے مجھ کو تو اس شوق نے کیا

ٹا کر رہے لیکن انہوں نے تسبیح میں اپنے وقت ضائع نہیں کیا۔ دراصل وہ سمجھتے تھے کہ تسبیح سے ان کی شاعری جلا نہیں پڑ سکتی۔ اس لئے وہ آخر وہی راہ چلنے کی سستی کرتے رہے۔ ان کے یہاں عاشقانہ خیالات ایک خاص ذائقہ کے ہیں جن میں ایک طرح کی تروتازگی ملتی ہے۔ ساحلہ ہندی ان کے یہاں ملتی ہے لیکن ایک خاص سب سے۔ مضمون آخری پر غماز و صرف کرتے نظر آتے ہیں کہیں کہیں مشکل زمیوں میں طبع آزمائی کی ہے اور ان میں مختلف اشعار تخلیق کئے ہیں۔ سائل تقریباً ساٹھ سال شاعری کرتے رہے۔ ماسک رام لکھتے ہیں کہ بلا ساحلہ ایک لکھ سے کم ان کا سرمایہ نہ ہوگا۔ لیکن ان کا بہت بڑا کارہمدان کی مثنوی "نور علی نوذ" ہے اس مثنوی میں نور جہاں عظیم کی حیات معاشقہ معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے مسائل بھی در آئے ہیں۔ پھر بھی یہ مثنوی نامکمل رہی۔ سائل کے کچھ منتخب اشعار ذیل میں درج کر رہا ہوں:

ہمارے چہ چٹا کیا ہے وفا کیا
جو دل آیا تو پھر اچھا روا کیا

معلوم نہیں کسی سے کہانی مری سنا لی
بھاتا ہی نہیں اب انہیں افسانہ کسی کا

بہشت خون دل روا ہوں میں لیکن ملتے سے
نہ خطرہ آتش پہ ہے نہ عہد جیب و ناک پہ

ایک محبت میں ہے اک خانہ صیاد میں قید
مگی و بلی کو میسر نہیں کیجائی کہی

بڑھ کر ہو کہیں خود سے۔ بجز جو پری سے
میرت اگر اچھی ہو تو اچھے ہو سبھی سے

تلا جو، دشمن ارباب دعا، عاشق کش
خط میں پیدا تھا کتاب رقم ہے تو کسی

آسمان نظر آئے ہر اک مشکل دنیا
دور دراز اگر جہاں جہاں کہیں کا

جلیل خاں تعلیم یافتہ تھیں۔ ان کی تعلیم کو غرضی تعلیم کا عری کا خلف شاہی انداز سے تھا اور ساری زندگی اس شعر میں لگی رہی اور انہوں نے آنکھ دہان چھوڑے۔ ان میں پانچ ہزار اشعار ہیں۔ علم کی کامیابی کا بیشتر حصہ صرف کے نکات سے ملتا ہے۔ عرفان و آگہی کا ایک نمائندہ ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے مرشد علی بیگانی کے ان پر کمرے اثرات رہے تھے۔ یہ گہنی توجہ کی بات ہے کہ ہندوستان کے محققین ان سے غافل رہے۔ خود ہمارے اہم محققین والوں نے کوئی تلمیذی مضمون یا کتاب قلمبند نہیں کی۔ اس طرح ان کے سارے دیوان غفلت کی صورت میں خود بخود لاچوری کی زینت بنے رہے لیکن حال ہی کی بات ہے کہ لاچوری کے محققین نے ان غفلتوں پر توجہ کی اور اسے مرتب کرنے کی ذمہ داری افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار شفیق مشہدی کو سونپی۔ غرض کہ ان دیوان مرتب ہو کر شائع ہو چکے ہیں اور ایک روپے میں ہیں۔

مجھے یہاں اس کا احساس ہوتا ہے کہ جلیل خاں کی شاعری کرتی ہیں وہ معمولی درجے کی چھٹیوں جہاں استادوں نے ان کی خاصی مدد کی ہوگی۔ یہ گمان اس لئے بھی ہوتا ہے کہ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ وہ اپنا شعر ہی سمجھتے تھے پائیں اور اس کی تمیزات کے لئے دوسروں سے رجوع کرتی رہی ہیں۔ پھر ایک اور جگہ ہے کہ وہ یہ ہے کہ خدا بخش خاں خود شاعر بن گئے۔ انہیں جمع کرنے کے علاوہ شعر و شاعری سے خاصی دلچسپی تھی لیکن ان کا کہیں کام ملتا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی خطوط لاچوری میں موجود ہے۔ ایسا تو نہیں کہ موصوف نے اپنا کام بھی اپنی بیوی کی کے کلام میں ضم کر دیا۔ یہ بھی ایک سہ ہے کہ قاضی عبدالودود جیسے محقق نے جلیل پر نہیں لکھ کر لکھا، وجہ کچھ میں نہیں آتی۔ گویا ضرورت اس بات ہے کہ محترم کی شاعری کے سلسلے میں محققین توجہ کریں اور تاریخی صورت سے آشنا کریں۔ ممکن ہے میرا یہ گمان سراسر غلط ہو۔ میں اس پر حیران نہیں کرتا۔ اس لئے کہ تحقیقی معاملات میں میرے علم کی شاید اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔

کلام کے سرسری مطالعے سے بھی جلیل کے شعور اور کیف کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اکثر اشعار دہاں اور گہری معنویت سے بہرہ ور نظر آتے ہیں، جن میں اجدادی پہلو بے حد نمایاں ہے۔ میں چند شعرا میں پیش کر رہا ہوں۔

بشمہ فیل ہائی دو تہو لے اس کو

اس گتہ گار جینہ کا جو دیوالا پنے

یکائی رب کی اور عبور رسول پاک

نقش دکھا رہے ہیں الف لام میم کا

ہا ہے نور کا جامہ بیانی، سبہ رحمت نے

اپ ان پر آیتہ تفسیر کا خطا لگایا ہے

ان اشعار کو اور جلیل کے معرفت سے متعلق اشعار کو پڑھیں تو اندازہ ہوگا کہ دوسرے کے مضامین بھی بلند ہوتے تھے۔ اس طرح ان کے یہاں بھی بار پائے ہیں۔ حضرت کے یہ اشعار بھی دیکھئے۔

پردہ وہ کیوں اٹھاتے نہیں کیوں ضرور تھا

آنکھوں میں تھا جو نور یہ کس کا ظہور تھا

جلوے یار سے ہر آنکھ کو روشن دیکھا

لاکھ آنکھوں میں اک صورت نورانی ہے

علم روش کو اپنے ذرا سنبھالے ہوئے

کلام کس سے ہے والاٹے طور ہوتا ہے

کیا قیامت ہے کہ مشرق بنا کر مجھ کو

اس نے دیار قیامت پہ اٹھا رکھا ہے

اسے عراق کی فرقی کے دکھا دیا کہ کتنے تیر۔

جلیل خدا بخش

(۱۸۶۸ء۔)

ان کے ۲۰۰۰ اشعار کم بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ان کا اصل نام وقیع خاں تھا۔ جلیل خاں اختیار کیا۔ کبھی تبھی راضی بھی تھیں کے ہی طور پر استعمال کرتی تھیں۔ چونکہ محترم ایک صاحب دیوان شاعر ہیں لہذا ان کا قدرے تفصیل سے گفتگو ہوتی ہے۔ جلیل خاں کے یہاں اس کا سونق نہیں ہے اور رخصت مانع ہے۔ پھر بھی چند بے حد اہم اشعار میں مرقوم کردہ ہیں۔

رشید خاں جلیل خدا بخش خاں (سوس خاں اور بخٹل جلیل لاچوری بیڈ) کی بیوی بی بی تھیں۔ ان کی پیدائش ۱۸۶۸ء میں ہوئی۔ ان کے والد خاں بہادر خاں العظمیٰ احمد کبر الہی تھے جن کا تعلق بنگال سے تھا۔ یہ کمر تھیں کہ ان کی شاعری خدا بخش خاں سے ہوئی۔ ان سے ایک شیادار ہوئی، وہ مرقد علی الدین خدا بخش۔

ان کے گھسے کے بار سے میں کی روایتیں ہیں۔ کہ جاتا ہے کہ ان کے پیر مرشد شاہ جمال الہی تھے۔ جو میں نے لکھا تھا کہ انہوں نے جلیل خاں کو لکھا لیکن کچھ لوگوں کا یہاں ہے کہ محترم مولانا مرشد علی بیڈی، بخندوی سے وابستہ تھیں۔ بخندوی بھی شاعر تھے اور حال تفسیر کرتے تھے۔ انہوں نے ترجمہ دی کہ وہ جلیل خاں اختیار کریں۔

تو چرخ خاک کوئے جمال ہے یہ جیلہ تیرا کمال ہے
 نہ ہو کہیں ۱۵۱۷ قمریہ تیرا ہر صاحب حال ہے
 بچہ ہے اک مرا جو سبک در ہے آپ کا
 اس پر نگاہ لطف جو بہر خدا علی
 شوہر مرا ضعیف ہے مجبور ہے شہا
 پرہاں نکلا ہے کوئی بھی اب اس کے حال کا
 افسوس تم نے رخ نہ دکھایا کسی طرح
 ارمان دہ طالب دیدار نے گیا
 دل کو شرار آد رسا نے جلا دیا
 پہلو کو کھج فدا کی کے دیاں بنادیا
 کون کہتا ہے کہ بھٹوں دشت میں عریاں رہا
 تار ہزاراں نہ تھا یہ آنسوآں کا تار تھا

جیلہ کوہستانی سے بھی دلچسپی تھی بلکہ خدا بخش حق صاحب نے اس کی تربیت کے کے لئے ایک اتالیقی بھی مقرر کر دیا تھا۔ اس سلسلہ کی بھی ایک کتاب "ستارہ طیبہ" ہے جو خدا بخش حق انیسویں میں موجود ہے۔ رسول خدا حضرت بھی ان کی ایک کتاب ہے اس کے علاوہ ایک مثنوی بھی ہے جو بے حد اچھے۔ نام ہے "حسن الطالب"۔ یہ حضرت حق کے سلسلہ کی ہے اور مثنوی چھپ چکی ہے۔ اسے بھی شیخ عطیدی نے مرتب کیا ہے۔ جیلہ کی وفات ۱۹۳۱ء میں ہوئی۔
 رفیعہ خاتون جیلہ کے سوانحی سننے کے امور "تذکرۃ شاد" از سید نعمت اللہ ص ۱۴۳ پر موجود ہیں۔ یہ کتاب کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ دیوان جیلہ جلد ششم بھی اشاعت کے مرحلے میں ہے اس کے مرتب شیخ عطیدی کی رائے پر اپنی مکتبہ نثر کر رہی ہیں۔

جیلہ صوم و صلوح کی پابند، تعویذ اور طریقت سے اجتناب ایک ایسی کار اور انکلام شاعرہ تھیں جن کے کلام میں حمد، نفی، حقیقت، تعبد سے ہر باحیات اور مثنوی کا گراں قدر سرمایہ موجود ہے۔ خصوصاً صوفی طور پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت عبدالقادر جیلانی فوت الامم اور اپنے مرشد

بے پناہ تعبد سے کہیں کہیں تو شریعت کے حدود سے بھی تجاوز کرنے لگی ہے۔ دیوان عظیم آبادی اس ممتاز ترین صاحب دیوان شاعرہ نے اپنی خودادبیات میں ان کے جو جو برکھائے ہیں ان کا اعتراف لازم ہے۔

جیلہ کے آنسو دارین اور درد منگھڑیوں کا ایک مجموعہ موجود ہیں۔
 ان کے دیوان میں سے ایک "خمرے دل ریش از جیلہ دریش" اور مثنوی "حسن الطالب" کی ایڈیشننگ اس خاکسار نے کی ہے۔

قزلباش ثاقب

(۱۸۶۹ء تا ۱۹۳۹ء)

ان کا پورا نام مرزا از کر حسین قزلباش تھا اور ثاقب تخلص کرتے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۸۶۹ء میں آترپ دیش کے ایک شہر اکیر آباد میں ہوئی۔ ان کے روزنامہ علی نامہ ملے ہیں، مرزا انکشاف مجددی اور آغا محمد علی۔ ان کا سلسلہ نسب حاجی علی قزلباش، معروف بہ علی قلی خاں شامل سے ملتا ہے، جن کا تعلق شاہ طہماس مغوی کے دربار سے تھا۔ ان کے اجداد میں سے ایک شخص تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے۔ چونکہ ہندوستان میں اس زمانے میں انگریز تجارت ہو سکتی تھی اس لئے انہوں نے باسابقہ کمیز یا دکانچا سنگھ اور ملین بنالیا۔ مرزا کے سلاطین میں کی لوگ مغلیں اور بارہ سے وابستہ رہے۔ ثاقب کے والد کا نام مولوی آغا محمد عسکری قزلباش تھا اور عرف مرزا محمد حسین۔ قزلباش کے والد سرکار برطانیہ کے ملازم تھے۔

لیکن بچپن ہی میں والد کا انتقال ہو گیا اور وہ بال و دھال کے ساتھ گھنوا آگئے۔ ثاقب اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ ابتدائی تعلیم انھوں میں ہوئی لیکن اعلیٰ تعلیم کے لئے عمر آگئے اور سیت جانس کالج کے طالب علم رہے۔ انھیں ان کی ملاقات میر حسن حسین علی سے ہوئی۔ جن کی صحبت کے فیض سے انھیں شاعری کا ادق ہوا۔ ثاقب کی زندگی میں کئی تشعب افزا آئے۔ یہ شاعری طور پر بد حال بھی رہے۔ شہادت کی لگن کا سبب بن گئی۔ لیکن اسی دہشتہ سے ادبا محمود آباد کے یہاں رسائی ہوئی جب ثاقب کا دربار میں کام ہوئے تو ٹھکانے چلے آئے۔ ۱۹۰۵ء میں راجا محمود آباد کی دعوت پر ٹھکانے پہنچے یہاں ان کی خودادبیات میں مددگار ملتا ہے۔ ان کی مدد و شرفی بنادے گئے۔ پھر مہاس مغوی نے ایک تذکرہ "اوراق گل" (۱۹۳۵ء) میں ان کے شائع کیا تھا، کے حوالے سے ان کی شکل و شکل اور ان کی شاعری کے بارے میں ایک اقتباس نقل کیا ہے، جو درج ذیل ہے:-

"ثاقب کتابی چہرے، چہرے جسم اور دماغی نہ کے ٹیک صورت، اخلاق و اخلاق دارین رسید و دیوگ ہیں، ہذا کئی اور طرفت کی گفتگو ان میں کوٹ کوٹ کر گہری ہے دوست و ادا، صاحب کی پابندی اور غلطی و محبت سے انان کی لڑیاں محبت ہیں۔ مر سے سے راست محبت و ادب

سہمہ تکبیر پاتے ہیں، اشتیاق روز یاد خدا اور فکر شعر و سخن میں مشغول رہتے ہیں۔

عاقب کے یہاں عام طور سے عشقیہ مضامین پاتے جاتے ہیں۔ یہ عشقیہ مضامین دلی محبت میں ایک نئی طرح کی بصیرت پائی جاتی ہے، جسے عرفان نامہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ عاقب کے یہاں شاعری میں ایک تنہید و کیفیت کا پتہ ملتا ہے، جس میں تصوف کی آغ بھی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عاقب اپنی طرح پر غالب سے قریب ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے یہاں شوق غالب کا خون بہہ نہ سکی اور ذوق فنی انہوں نے جس طرح دلی عشقیہ شاعری سے پرہیز کیا ہے اس سے ان کی اپنی کیفیت کا پتہ ملتا ہے۔ عام طور سے محبت کی عشقیہ شاعری میں ہوسنا کی کا پلاو ایک غالب مصرع کی طرح سامنے آتا ہے۔ عاقب اپنے آپ کو اس ہوسنا کی سے قلمبندی چھانے ہوئے ہیں۔ بعضوں نے عاقب کے کلام میں میر جیسے بھی عاشق کی ہے۔ گویا عاقب دو بڑے شاعروں کے مزاج کے بیچ کھڑے نظر آتے ہیں اور سب کی نکتہ ہے۔ میر کے حوالے سے ہی یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے یہاں سوز و گداز ہوگا اور واقفانہ رنگ ان کے یہاں پایا جاتا ہے۔ گویا عاقب ایک ایسے شاعر ہیں جو انصافی مزاج رکھتے ہوئے بھی اپنی شاعری کو بہت صریح اس شخصیت سے لگدنگ رکھتے ہیں جو خاص عاریت پر زور دیتی ہوئی ہے۔

عاقب کے کلام کے رنگ سے تعارف کے لئے چند اشعار جو غالب اور میر کے رنگ کے ہیں، پیش کیے جاتے ہیں:

اپنی قسمت سے گلزار جاؤں کہ دور چرخ سے
میں تو وہ اضمحضا کیا جو جیب دہا میں نہ تھا
دیوانہ جہاں دیکھ لیا دو سفر میں
بلاستا ہوں اتنی سست کہ شاید سرا گھر ہو
کھینچ لیا کیا جو چھکے جلا دے
تھا آشتیاں مگر ترے پھولوں سے دور تھا
کشتن بہار چھ تھا نہیں بنا لیا
میں کیوں ہوا امیر مرا کیا قصور تھا
غریب دلا رہا ہے مجھے اپنے گھر کی یاد
لیکن یہی کہ لٹ گیا دیوانہ ہو گیا

باغباں نے آگ دی جیب آشتیاں کو مرے
جن پہ کبھی تھا وہی ہے ہوا اچھے گے
زادہ بڑے شوق سے مگر دل تھا
میں سو گئے راحتیں کچے کچے
عاقب کی وفات ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔

مبارک عظیم آبادی

(۱۸۶۹ء — ۱۹۵۸ء)

ابن کا اصلی نام مبارک حسین ہے۔ مولفہ ۷۷۲ عرم ۱۸۶۹ء، جس کے دن درہنگہ کے قصبہ تان پور میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام سید فدا حسین تھا، شعر کہتے تھے اور دانش نگار کرتے تھے۔ مبارک مولوی حسن جان خاں صاحب حسن بھروی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ پھر حکیم عبدالحمد چڑیاں کے شاگرد ہو گئے۔ استاد ہی نے انہیں مبارک عظیم نام رکھنے کی تلقین کی۔

مبارک قدیم وضع کے شاعر تھے۔ داغ کا اثر ان کی شاعری پر بڑا گہرا تھا۔ شاعری اور سبب پاک ان کے کلام کی جان ہے۔ عاشق و معشوق کی روایتی جھل چھڑاؤ ان کی شاعری میں باد بہار بھرتی ہے۔ عشق کے علمی مرحلہ پیشہ جو دلی کی دستکوبی کی نصیحت کرتے رہے۔ دوسری طرف فریاد سے بھی ان کا کا آواز اور یہ باتیں کی راہ پر چل نکلے۔ داغ کے اثرات کی ایک سیر چھ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی جھل جھڑاؤ کی پاس اصلاح کے لئے بھیجی تھی۔ داغ نے اصلاح بھی کی اور مبارک عظیم کو مبارک ہونے کی سند دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسروں کے حلقے میں آنے کے باوجود مبارک داغ کے دائرے ہی میں گھومتے رہے۔ مبارک کے بارے میں عشق و کلمہ لکھتے ہیں:

”ان کے کلام میں داغ کی ہی زندہ دل پائی جاتی ہے۔ وہی بول چال، وہی روزمرہ، وہی لطافت زبان، وہی روانی..... اور وہاں اگر مبارک عظیم کے متعلق ناخدا نے سخن تاج اشعار نوع ناری یوں گہرا افشاں کرتے ہیں کہ — ان کا ساتھ میں شمار ہے، جو کہو یہ کہہ دیں اس کو سہہ سمجھا جائے۔ ان کا فرمودہ چھری گہرے جو سنانے سے نہیں مل سکتا..... میرا یہ دھڑکی ہے کہ جملہ عاشق شاعرانہ کلام میں موجود ہیں..... یہ شعر کہتے وقت ایسے خیال رکھتے ہیں کہ استاد (داغ) کا رنگ چاہتے نہ پاتے۔“

مبارک کے چند اشعار نقل کرتا ہوں۔ یہ بھی اشعار ہیں جو ”صنم“ میں پروفیسر عبداللہ انارکیل کے مضمون میں

تھے۔ نام تھا "غزل آرزو"۔ ایک استاد کے مطابق انہوں نے تقریباً تیس ہزار غزل کے اشعار کہے ہیں۔

آرزو استاد کی صنف کے شاعر ہیں۔ چنانچہ ان کی غزلیں بھی ایسے ہی تیز سے آراستہ ہیں جتنیں ہم کو ان کی مہر کہتے ہیں۔ ایک سنگ سے درست اشعار ان کی فنی دسترس کا پتہ دیتے ہیں۔ آرزو کی نگاہ ایک شاعر کی جیسے اس لیے نکات پورا کر لیتے تھے جن میں تازگی اور ہ کاری کا احساس ملتا ہے۔ بعض غزلوں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مصوف کی نگاہ استاد کے کام پر طریق احسن رہی تھی۔ چنانچہ لکھی نکات ان کے کلام کا طرز اعتبار ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے غزل میں تازگی اور جدت پیدا کرنے کے لئے کچھ نئے موضوعات کی طرف بھی رجحان کیا لیکن جسے اعتبار کہتے ہیں وہ محض نہ ہو سکا۔ اس سے پتا لگتا ہوتا ہے کہ مصوف محض پرانے شعرا کی تقلید نہیں کر رہا ہے۔ تھے بلکہ اپنی زمین خود بنانا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے یہ مقصد کام ہے، ایسی کوششوں سے ان کے بعض اشعار تازہ و بہ کار معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ صورت ہر جگہ نمایاں نہیں ہے۔

آرزو کی شاعری کا مرکزی نکتہ دہان اور عشق ہی ہے لیکن کتب اور نثر سے خالی نہیں۔ بھر بھی دوحسن نایاب ہے جو میر کے یہاں ملتا ہے۔ درد ان کے اشعار جمع کئے جائیں تو ان کی تعداد بھی خاصی ہو سکتی ہے۔

آرزو کے یہاں بعض ایسے اشعار کا پتہ چلتا ہے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فلسفیانہ ذہن بھی رکھتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی واضح فلسفہ یا فکر ان کے کلام سے کشیدہ نہ کرنا آسان نہیں۔ لیکن ان کا تصور دہان ان کے فکری میلانات سے غزل میں قدرے تازگی پیدا ہو سکتی اور عقل کا مطالعہ ان کی بعض غزلوں نے ان کے جمالی کیف کے ساتھ ملانی کیفیت کو بھی نشان زد کرنے کی سعی کی ہے۔ میرے خیال میں ان کے کلام میں ایسے نکات کم ہیں۔ بہر طور اردو شاعری کی تاریخ میں آرزو ایک امتیازی کیفیت کے حامل شاعر ہیں جو سمجھوں کے ساتھ چلنے کے باوجود اپنی فکر آپ بانی پر اصرار کرتے نظر آتے ہیں۔ ذہنی میں آرزو کی ایک غزل کے چند اشعار پیش کر رہا ہوں جس سے ان کے مزاج و بیان کا پتہ چل سکے۔

دن ان ہفتوں کا ہے کہنے کو ڈر سا پانی

بھگڑوں ادب مجھے پھر بھی ہے ادا پانی

آگھ سے بہہ نہیں سکتا ہے بہر کا پانی

پھوٹ بھی جائے گا جہاں تو نہ دے گا پانی

چلو میں پاؤں کہاں آس کا ٹھکانا پانی

جائیں بھڑکی ہوئی ہے اور تھیں نہ پانی

دل سے لگا جو اٹھا آگھ سے چکا پانی

آگھ سے آج بھنے ہوئے دیکھا پانی

مجھ سے ملنے کے لئے زنداں میں مصروف کیا

وصوفی تھی تھیں جس کو آنکھیں چم رہی تھیں

جان پاؤں سپید خانے میں تم کیوں آگئے

میں تو ہو کر پتی اس عادت سے مجبور کیا

بس کہ تھالی میں تھا شوق غزل خوانی مجھے

کر دیا شہسوار نے انگریزوں کا زندانی مجھے

جو مقامیں آج تک تھے برقرار فکر میر

پٹنے پٹنے سوچ جاتے ہیں یہ آسانی مجھے

آرزو و لکھنوی

(۱۸۷۲ء - ۱۹۵۱ء)

آرزو و لکھنوی کا پورا نام انور حسین ہے اور عمریت منجھو اور جھس آرزو والد کا نام میرزا کر ہے۔ وہ بھی شاعر تھے اور یاس ظفر کہتے تھے۔ آرزو و لکھنوی بارہوری میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت ۱۲۸۹ھ ہے۔ آرزو و لکھنوی کا سلسلہ نسب حضرت موسیٰ کاظم تک پہنچتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ مصوف کے اسلاف ہرات سے ہندوستان آئے اور ان کے مورث اعلیٰ سید جان علی جوہر اب جوہر علی خاں کے نام سے معروف تھے۔ وہ کے سوجہ اور ہو سکے۔ آرزو کی تعلیم پانچ سال کی عمر سے شروع ہو گئی۔ روایت کے مطابق سب سے پہلے قرآن پاک پڑھایا گیا، پھر فارسی کی تعلیم شروع ہوئی۔ گویا ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ پھر مولانا سید آغا حسین کی درگاہ سے وابستہ ہو گئے۔ خطاطی بھی سیکھی اور موسیقی بھی۔ لکھی بہ نگری سے بھی رجحان رہا ہوتا ہے۔

آرزو کی شادی اس وقت ہوئی جب ان کی عمر انیس (۱۹) سال کی تھی۔ لیکن ان کی بیوی کا انتقال بارہ (۱۲) سال کے اندر ہی ہو گیا۔ پھر آرزو نے دوسری شادی کی۔ لیکن یہ غلطی ان کے ساتھ نہ ہو سکی۔ ایک اور مقدمہ آیا۔ اس بار بھی سے شادی کی وہ نکاح عروہ میں اور دم جھس کرتی تھیں۔

آرزو نے ابتدا میں امید شخص اختیار کیا بعد میں وہ آرزو دین گئے۔ کہا جاتا ہے کہ آرزو کو تعلیم تاریخ سمجھنے میں کمال حاصل تھا۔ ان کی حد بھلائیق یادگار ہیں جن میں "قصائد آرزو"، "ایمان آرزو"، "شہن آرزو"، "جہان آرزو"، "لیکن آرزو"، "ان زبان آرزو"، ایک داستان اور میر خرو کے طرز پر بھی تصنیف کی۔ انہوں نے واسطی کی بھی تخلیق کی۔ انہیں

کس نے جیتے ہوئے بالوں سے چھٹکا پانی
 جھوم کر آئی گھٹ لومت کے برسا پانی
 پہلے دھوپ کا ہے روپ لڑکھن کا اٹھان
 دھیر دھلتے ہی اترے گا یہ چھٹ پانی
 کوئی سوائی گھنا تھی کہ جوانی کی اسٹک
 جی بہا لے گیا برسات کا پہلا پانی
 ہاتھ میں جائے گا چھٹا نہ کیجے کا چھوڑ
 آگ مٹی میں دلی ہے نہ کھٹا پانی

آرزو کا انتقال ۱۹۵۱ء میں ہوا۔

شفیق عہد پوری

(۱۸۷۳ء — ۱۹۳۳ء)

ان کا پورا نام سید حسن مرتضیٰ تھا۔ شفیق چھکے کرتے تھے۔ شرفی کام منظر سید ہے۔ ان کی ولادت ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں ہوئی۔ ان کے والد سید رفیع اور ادا سید کا مست علی مشق عدالت الایا مقرر ہوئے تھے۔ شفیق نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ان کا وطن موضع تھار پور تھا جو ضلع گلیاں میں ہے۔ پھر وہ اپنے والد کے ساتھ الہ آباد آ گئے۔ ان کے ایک اہم استاد علامہ شوق نبوی رہے ہیں، جنہوں نے انہیں حدیث کا درس دیا۔ پھر کلیم سوانا کوڑی خیر آبادی سے طب کی تعلیم حاصل کی۔ شفیق نو دس سال کی عمر سے اختیار احمد رکھنے لگے تھے۔ پہلے انہوں نے منٹن کلیم کیا اور سوانا شوقی کی ان اپر اپر کلیم بدل کر شفیق کر دیا۔ ابتدا میں وہ شوق سے اصلاح بھی لیتے تھے۔ پھر کوڑی خیر آبادی کی طرف انہیں ہونے کے بعد دھیرا احمد امیر بنائی سے شرفی ملنے حاصل کیا۔ شفیق یوں تو مختلف لوگوں سے اپنے کام پر اصلاح لیتے رہے لیکن بشمول کلیم عہد پوری اور شوقی اسکول سے متاثر رہے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ:-

”امیر بنائی بہ شوق نبوی کی شاگردی کے باوجود اس عہد کے شعر کے برعکس شفیق کا مزاج اور ان کی مشق صرف فزل گوئی کے دائرے میں مقید نہیں رہی۔ شفیق نے عہد جدید کی اور شاعری کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا اور ماحول کی شکایت کی طرف متوجہ رہے۔ مسائل کو بھی شاعری کا موضوع بنایا اور مختلف موضوعات مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور ملکی مسائل کو نگاہوں

اظہار سے حامل اور شوقی اسکول سے متاثر ہیں اسی لئے اس عہد میں جبکہ مجید ناصر اور مل کوئی اور عہد کا بھڑکا پانی ہونے لگا۔ شفیق کا میلان طبع نظم نگاری کی طرف زیادہ تھا کہ نظم نگاری کے میدان میں لعل حسن آزاد کی جدت طبعی ان کے یہاں نہیں۔ یہاں لئے ممکن ہے کہ آزاد کا تاجر جیسے جیسے نہیں تھا۔ شفیق کے یہاں انہوں کی حدت طبعی کا احساس اور قطعاً کے دائرے سے آئے نہیں، وہ بھی لیکن، پھر حال اپنے عہد کے نمایاں مقامات سے ان کی ادبی عملی کام سے ظاہر ہوتی ہے۔ باقیان اور طراہی کی جنگ ملک کی غربت مسلمانوں کی ہے مل اور اس کے نتیجے میں ان کا دل یہ شفیق کے اندر عرصہ عرصہ رہا ہے۔“

وہ تو شفیق ایک پرکوشا شعر تھے۔ ان کا ایک مجموعہ ”کائناتِ راضِ شفیق“ سنہ ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں نظم، غزل، قصیدہ اور ہاکی ہے۔ لیکن ”راضِ شفیق“ میں ان کا پورا کام نہیں ہے۔

شفیق کے سلیب میں شاعرانہ خصوصیات لکھتے ہیں کہ:-

”شفیق صاحب کی شاعری اپنی بعض خصوصیتوں کی وجہ سے اردو زبان میں نہ صرف ممتاز حیثیت رکھتی ہے بلکہ اپنی نظیریں رکھتی۔ الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی خاص ترتیب و ترکیب زبان میں مستحکم پیدا کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی اور ہر ایک بیان بھی عمدہ و موافق شعر کا درجہ بلند ہو جاتا ہے۔“ شفیق عہد پوری کے کلام میں بھی یہ سب خوبیاں موجود ہیں اور وہ بھرپور ہوا ہے۔ اس کے چمکنے سے دل پر چڑھنے کی ترقی ہے جو لفظ سے خالی نہیں ہوتی۔ ان کی زبان فصاحت، روانگی، سوز و گداز و مقام میں کی جدت تاہم میں ایسی خوبیاں ہیں جو اردو کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں پائی جاتیں۔ ان کی شاعری عاشقانہ ہے لیکن کہیں کہیں وہ اخلاقی اور دہشاد صفات کو اپنے رنگ میں ایسی سادگی و صفائی اور خوبی سے ادا کر جاتے ہیں جس پر غبار بلند پروازیوں اور نازک خیالات قربان ہیں۔ یہ خاص انداز شفیق رمضانی کا ہے۔ پھر ان کا کلام خسرت و ناکامی و قربانیاں و ہاکی سے بھرپور ہے:-

شرمندہ احساس مسخا نہیں ہوا
 اچھا ہے وہ ہمار جو اچھا نہیں ہوا
 لڑیا نہیں ہوئی کہ تار نہیں ہوا
 اک تم نہیں ہوتے تو کیا کیا نہیں ہوا

کس ناؤ و اداس سے ترے یونوں پہ جگہ ملی
شوقی نے جسم کو جسم نے حیا کو
آؤ کہ دم اٹھا ہے جو آنکھوں میں شب بھر
بچار نے وہ وہ کے پکارا ہے قضا کو
مرنا بھی شوقی من کا حیات ادوی ہے
ہوتا رکھے اللہ شہیدان وفا کو

شوقی کی وفات ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔



آؤ گے یو نہیں کل ملی تم آج ہو مجھے
ہونے کو تو کب وعدہ لڑا نہیں ہوتا
جس داغ کا مزاج ہو تو جس درد کا دریاں
اس کی بچی صحت ہے کہ اچھا نہیں ہوتا
وہ رنگ ہوں جو بار نہ ہو دامن گل پہ
وہ بھول ہوں جس بھول میں کٹا نہیں ہوتا
ہر شمع کی لو برق گل نہیں ہوتی
ہر داغ چراغ ہے پھٹا نہیں ہوتا
کھلتے ہیں شوق بھول بھی پھلتے ہیں شجر بھی
بان بارہ اک گل قضا نہیں ہوتا" ۵

شوقی پر کوشنری آبادی کا رنگ صاف نظر آتا ہے لیکن ان کا انداز بہ وقار ہے۔ غزلوں میں سادگی پائی جاتی ہے۔
جہاں پر کھنسی کے اثرات کا پتہ دیتا ہے۔ ان کے چند اشعار ذیل میں درج کرتا ہوں:

دکھانے کو جھٹک جس طہر پر وہ بے نقاب آیا
تلاش دیکھے سونے کی آنکھوں میں حجاب آیا
تا کہیں کیا کہ ہمد کیا کیا اور آیا کیا لے کر
جو نکلتا تھا نکلا ہم نے جو آتا تھا ہوا پ آیا
شجر بیکار ہے شہر ہی سہی
نہ ہوا سمجھ تو ہے جا ہی سہی
تا سرور کی نہ قول و تم آس
نہ طو مٹے کا وعدہ ہی سہی
نہ ہو دیوانوں سے لہجہ آوار
خیر آزادی مہرا ہی سہی

میر مستحسن خلیق

(۱۷۶۹ء - ۱۸۴۳ء)

میر مستحسن خلیق کی اہمیت یوں بھی ہے کہ میر حسن کے بیٹے اور میر انیس کے والد ہیں۔ یہ ایک انداز ہے کہ سلطان ۱۷۶۹ء کے قریب فیض آباد میں پیدا ہوئے اور انتقال ۱۸۴۳ء میں ہوا انہوں نے سولہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ ان کے والد ہی ان کے اشعار پر اصلاح دیتے رہے۔ لیکن بعد میں پھر مصحفی ان کے استاد ہو گئے۔ مصحفی ان کی ہادی عزت کرتے تھے اس لئے کہ ان کے جو ہر کو پچھانے میں انہیں دیکھیں لگی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مشاعرے میں قاضی نے ایک قول پر بھی جس کا مطلع ہے:

خلل آئید ہے اس رشک قر کا پہلو

صائب اجرت نظر آئے ہے ادھر کا پہلو

انہوں نے اس کا مطلع نہ تو پھر رکھا۔

جب والد کا انتقال ہو گیا تو خلیق ہی خاندان کے اخراجات کا بار اٹھاتے رہے اور زندگی مشکل سے گزارتی رہی۔ جب ان کی آمدنی دو چار سو روپے سے زیادہ نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر انعام ہے کہ یہ اس زمانے میں اپنا فرض فراموش کرتے تھے۔ اس پر مگر کے مطابق خلیق کھنکھوں پر لہجہ نیک رائے کے بچوں کے تعلق بھی تھے، یہ بھی ایک اوجہ معاش تھا۔ فیض آباد سے جب لوگ نکلتے تھے تو انہوں نے بھی یہی فیصلہ کیا۔ اب جو زبان شعرائے کرام تھے ان کے ان کی اہمیت بھی مسلم ہوئے لگی۔ یہ بھی ایک سواد نے انہیں ہم شعرا میں شمار کیا ہے۔ ان کی اہمیت کا اندازہ یوں بھی ہوتا ہے کہ یہ تعداد درجہ یکم کے شعرائے کرام سے ہے۔ "مجموعہ نثر" میں قدرت اللہ کامران نے ان کے کردار کی تعریف کی ہے۔ خلیق نے کچھ اپنے اور چار بیٹوں میں۔ یعنی انیس، انیس، انیس۔ یہ سب کے سب مرثیہ گوئی حیثیت سے بہتے ہیں۔

نیش ایک ایسے غرض قوی حیثیت سے بھی معروف ہیں۔ دہلی کی عوامی زبان پر بھی انہیں قدرت تھی۔ لیکن اس پر کہنہ کا رنگ بھی چڑھ گیا۔ وہ ناسخ اور انش سے متاثر ہوئے تو کی صورت اختیار گئی۔

ایک مرثیہ گوئی حیثیت سے ان کا اقبال نمایاں ہے۔ میر انیس نے ان کی زبان خصوصاً فصاحت اور زور و ملی کی تعریف کی ہے۔ ایک علامہ جو بہت مشہور ہے اس کا مطلع سوانح مصحفی نے بھی نقل کیا ہے:

بھرائی طبع کند ہے لہجہ بیاں گویا

دغای گئے کہ جو بر قی نہوں کیا

گزارنی بہار مر شتی اب کہیں گے سب

یاں بیجاں سے غلی بدوستان کیا

مرثیہ اور مرثیہ گو شعراء

ہماری اکثر اصناف دوسری زبانوں سے مستعار ہیں، لیکن مرثیہ ہی ایک ایسی صنف ہے جس کا خلق ہر تاجر اردو سے ہے۔ اس کی ابتدا بھی اور انجام بھی۔ یوں تو شخصی مرثیوں کی مثالیں خاصی ہیں لیکن دماغی مرثیہ (افتد کر بلاچ پیدا ہے۔ اس میں حضرت امام حسینؑ کی شان کی شہادت کا ذکر ہوتا ہے۔ مرثیہ کی روایت کی بڑی بڑی ہیں ہے۔ گویا اس کا مزاج ایک طرف تو دلی ہے دوسری طرف اخلاقی بھی۔ اس صنف میں متعدد اصناف کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً مشکوٰی کی طرح کی (افتد کر دی، اتھڑی کا کٹیف، اقصیہ کا مضمر وغیرہ۔ کہہ سکتے ہیں کہ کہیں کہیں اس میں درجے کی بھی جھلک پائی جاتی ہے اور اس کا بنیاد سے تعلق ناگزیر ہے۔ یہ بعد اہم صنف ہے۔ اور میر انیس اہم ترین مرثیہ گو کہے جاتے ہیں۔ میر انیس کے علاوہ مرثیہ گو اور ان کی دوسرے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

شید عقیقہ کے لوگ مجلس عزا منعقد کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں عزم کے بیچے میں مجلسیں ہوتی جاتی ہیں۔ میر انیس اور مرثیہ گو ہر نہ جس طور پر نگاہیں رکھتے جاتے ہیں۔ سوز غرائی ہوتی ہے، سلام اور فہ سے پڑھتے جاتے ہیں۔ انہیں مجلسوں میں ڈرامائی فطرت معرکے کی چیز ہوتا ہے اور وہ نئے دلانے کا عمل بنا لیتے ہوتا ہے۔ یہاں تک مرثیہ کے ادھائی کٹیف و تم کی کیفیتیں گرد ہا ہوں۔ دیکھتے ہیں اس کے نمونے کی ادب سے ہی لئے شروع ہو گئے تھے۔ پھر ایک زمانے میں اس کے عروج اور ارتقاء کی وہ صورتیں سامنے آئیں جو ادب کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔

ادبی نفاذ سے بھی مرثیہ کی بڑی اہمیت ہے۔ سرائی مباحث میں مرثیوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اب تو کربا اور دشا عری میں اہم حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی کیفیت استحباب سے کی ہو گئی ہے۔ ہر حال عقیدے کے قیام سے

کیا تو جہاں میں کوئی جھوٹے گا نہ دوسرا
 آیت جو ظلی جگر انگار ہے آئی
 جس گمزی تم کو نہیں پاتے ہیں ہم
 ہی ہی میں عرب کھراچ ہیں ہم
 غفلت میں فریق اپنی تھوہ بنا کھوٹ آیا
 ہم آپ میں نہ آئے جب تک کہ تو نہ آیا

میرزا حسن خان

(1990-1994)

میر طغیر کا نام میر مظفر حسین تغیر تھا۔ ان کی پیدائش کے سلسلے میں کوئی فیصلہ کن بات سامنے نہیں آئی۔ ڈاکٹر سیاح انڈیا نے اس کا اہلہ پر کیا ہے کہ ان کی پیدائش ۱۱۹۱ھ کے پہلے تیس ہو سکتی ہے۔ اس طرح ان کی پیدائش ۱۱۸۷ء سے ۱۱۹۱ء کے آس پاس ہوئی۔ والدہ نور حسین تھیں۔ ان کے آباؤ اجداد گجھوڑا علی گڑھ کا رہنے والے تھے۔ مگر خاندان ترک وطن کر کے کھنوجا آیا۔ لیکن کب اس کا پتہ نہیں ہے۔ طغیر کا خاندان سادات کا خاندان تھا۔ انہوں نے خود اس کا ذکر مشنوی ”مہراجن“ میں کیا ہے۔ ان کے والد میر عظیم کے مشہور دادو محمد اس میں خود کی زبیر بھی ہے۔ متعلق ہے۔

ضمیمہ کی ایک مثنوی ”مظہر الحجاب“ ہے جس میں انہوں نے اپنے حالات پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔
 ضمیمہ نے عتر گوئی کا آغاز دغول سے کیا۔ بھر مرہ کے علاوہ مثنوی، قصائد، لہجہ بھی کہے۔ ایک شخص غلام علی
 کے اصرار پر انہوں نے مرثیہ کو بنا شروع کیا اور پچیس پڑھنے لگے۔ ان کے مرثیہ جلد ہی اپنے اثر کی وجہ سے مقبول ہونے
 لگے۔ بھر وہ مسلسل مرثیہ ہی کہتے رہے۔ بعضوں نے انہیں دیر کے استاد کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ خود ضمیمہ مصنف کی راہ
 پر چلے اور ان کے شاگرد ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۸۵۵ء میں ہوا۔

مطہر کی مثنویوں میں ”مثنوی بیست“ بھی ایسی رکھتی ہے جس کا موضوع حضرت علیؑ کی ولادت ہے۔ ”معراج نامہ“ خضر الہیہ میں عید کے حکم سے تخلیق کیا گیا۔ مطہر کی عید کی تہنیت کی اور تہنیت پر جو دو رباعی لکھی گئی ہے ان کی شریفی اور نظر افسانہ کا بھی ذکر ملتا ہے۔ جنوں سید بہتیر میں صبر نے ”بیرہ“ بھی خوبصورت کیا ہے، جس میں خاندانِ رسالت کا احترام مل رہا ہے۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ بعض لوگوں نے مرے سے خواہے تو تمہیں کوئی نیکو کام بتا دیا ہے اور یہی بات ہے لیکن اکثر مسخ اثرات کو اس سے نظر ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

”خمسیر سے پہلے ادا کیا ہے واپس چلنا۔ چشم یک آنہوں نے مرچے کو پانچاٹھ فیٹل کی شکل دی۔ اب

”خلق ان اولین مرتبہ ظالموں میں سے ایک۔ چنانچہ انہوں نے مرتبہ میں مکالمے کی امتیاز
مخصوص کی اور ان کی حد سے اپنے زمانہ کی کام میں نہ صرف اور مالی تاثر پیدا کیا بلکہ افراد مرتبہ
کے مخصوصات و خواص کی ترہائی کا کام بھی لیا ہے۔ خلق کے مکالمے میں قہر و مل کے
اختیار سے سوزوں اور ظلم کی عمر اور اس کے مرتبے کے لحاظ سے نہایت مناسب ہوتے ہیں۔
خلق کے مکالموں کا سب سے بڑا وصف ان کی سردی، ڈیرا، ٹکلی اور ان کا قطری اعجاز ہے۔
اور ٹکلیوں کا سب سے بڑا یہ قصہ، بناوٹ اور ظلم سے جاری فکر تا ہے۔ حضرت عباس کے مرتبوں
میں حضرت سکینہ کے مکالمے، ان کی عمر اور کر بلا کے حالات کے پس منظر میں بہت مناسب
برخیل اور قطری معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے چوں کے سوچنے سمجھنے کے انداز اور ان کی خصوصیات
ذہنیہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔“

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ غش کے مریضوں میں رقصت اور بیٹی کی بڑی اہمیت ہے اور انہیں دو کیفیت نے
 انہیں جذبات و احساسات کا شاعر بنادیا ہے۔ حسن کا قلبی ان کے مریضوں کی اہمیت کو بوجھا رہا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ
 صبر و تحمل کی تصویر اچھا لکھ کر ان کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ چونکہ زبان و بیان پر کمال قدرت ہے اس لئے وہ اپنی اور مذکورہ
 جگہ احساس ہوتا ہے۔ اگر مریضوں میں دردناک تصویریں دکھائی دیں تو ان کے مریضوں کی طرف توجہ کی جا سکتی ہے۔ یہی
 وجہ ہے کہ انہوں نے رزمیہ صبر و تحمل کو پیش پیش کیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مسیح المیزان نے تحکیم علی لکھا ہے کہ:-

”ان کی خوددہی نے مالک انہیں اپنے معاصرین کے راستے پر چلنے سے باز رکھا، اس لئے مرثیہ کے پرانے نیا احوال شیخے میں محدود رہے۔ جنگ کا بیان انھیں مرثیہ میں بھی انہوں نے کیا ہے..... لیکن ایسے مرثیوں کی تعداد بہت کم ہے..... شہادت اور تین ان کے مرثیوں میں نہ جٹا لیے ہوئے ہیں۔“ ۴۹ •

اوپر لکھا ہے ان کی طرفوں کے بارے میں زبان کے حوالے سے جو کچھ کہا ہے اس کی تصدیق کے لئے سند درج
زیل اشعار کا مطالعہ کریں، جن میں ایک طرح کا پانگھون بھی ہے اور مضمون آخر میں نیز تخلیق کے اہتمام سے ان کی اہمیت بھی
چاہ سکتی ہے۔

عدت سے ہم رچے تھے جس گھر میں ہم اور یاد
اب رکھ کے قابل دو عکاس آنکھ بھر آتی

تک مرے غمخوار تھے۔ غمخیز نے طویل مہرے کہے جن میں بعض سو (۱۰۰) ہند کے بھی ہیں، بلکہ اس سے زیادہ بھی۔ انہوں نے واقعات شہادت کے بیان پر اتنا کر ضروری نہیں جانا بلکہ موضوعات کا سونچا ہوا کیا، مثلاً سرائیا گھوڑے کی تحریف یا تو اس کی کیفیت وغیرہ۔ انہوں نے جذبات نگاری پر بھی توجہ کی، زبان سادہ اور سلیس استعمال کی۔ بعض جگہ اخلاقی اسباب بھی دے۔ کہیں کہیں اگر استدعا ہے تو وہ بھی قریب القیم۔

ابوالفضل صدیقی لکھتے ہیں کہ ان کی زبان استاد صحت کی طرح صاف و شست ہے لیکن کہیں کہیں متروکات بھی استعمال کر گئے، جو بعد کے شعرا نے بالکل استعمال نہیں کئے۔
صدیقی کے کئی نکات کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کا تجربہ کچھ بڑھ چکا ہے۔

میر غمخیز کے یہاں غم و حسرت خیال اور مضمون، آفرینی کی افراط ہے۔ اپنا کلام شب قدری عناصر کا ظہیر نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں رزمیہ عناصر کی بھی کمی نہیں، جو میر کے سامنے ہوتے ہیں ان کی تصویر نگاریوں میں ہوتی ہے۔ غمخیز کے شاعر و دیر نے مرثیوں کو ارتقا کی کیفیت دکھائی۔ ظاہر ہے استاد کے اثرات میں کثرت و دیر یہ سب کچھ کر سکے۔ دیر کے یہاں جو تھریلی اور اسلامی امور کے شاعر نے ملتے ہیں، وہ غمخیز کی رہنمائی کا نتیجہ ہیں۔ کچھ کہہ سکتے ہیں کہ غمخیز نے اردو مرثیوں کو کسی حد تک نئی سمت دکھائی۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان کی شاعری ارق اور مخلصانہ اور اخلاقیات سے خالی نہیں ہے۔ صورت تو دیر کے یہاں بھی ملتی ہے، مگر طور و خمیر ایک اہم مرثیہ گوئی حشریت سے شایع کئے جاتے ہیں جو ظاہر ہے کہ ان کے بارے میں یا حساس ان کی شعری قابلیت کا نتیجہ ہے۔ ایک بندہ لکھتے:

وہ نور کا عالم وہ درشتائی و درازت وہ آکر وہ مرغانِ عریضہ کے حالات
وہ لنگرِ شبیر میں طاعات و عبادت تو صرف دعا و نوحی، کوئی محو مناجات

ہوتے تھے حجاز سے تھیں چہ نہ رہیں پر

یاں اخترِ امان چمکتے تھے زمیں پر

میرزا جعفر علی فصیح

(۱۸۵۲ء تا ۱۸۵۵ء)

فصیح کا پورا نام میرزا جعفر علی اور تخلص فصیح تھا۔ ۱۸۵۲ء میں فقیہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام میرزا بابا علی تھا۔ یہ خوشحال تھے۔ فصیح کی عمر بچہ وصال کی تھی تو ان کے خاندان، اہل دینی آئے۔ اس کے بعد کتبستان ہو گئے۔ خاندان سرائیا تھا۔ ان کے ۳ بھائی تھے۔ ان کی عمر بچہ وصال کی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۵۵ء میں ہوئی ہوگی۔

فصیح کے بزرگ امیرانی تھے اور لکھنؤ میں ان کا تعلق امیرانی صاحب سے قائم رہا ہے۔

فصیح شیخ امام علی خان کا بیٹا تھا۔ شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ لیکن انہوں نے شاعر سے بھی اصلاح لی۔ صبح الامیں اس امر سے انکار کرتے ہیں کہ وہ بھی ان کے استاد تھے، اس لئے کہ لکھنؤ فصیح سے چھوٹے تھے۔ فصیح نے کئی بار لکھے۔ "فہرست" "مصرعہ" "مثنوی" "غزل" "ہاوی" کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"آپ کے والد میرزا بابا علی خان کو لکھا اور ان کے تھے۔ شیخ الامیر کے زمانے میں لکھنؤ آ رہے اور حکیم مدنی علی خان کے یہاں ملازم ہو گئے۔ بارہ سال سے کچھ زیادہ عمر ہو گئی کہ والد رحمت کر گئے۔ علامہ فاضل حسین خان نے ان کی ہدایت کے لئے لکھنؤ پہنچا دیا اور مقرر کر دئے۔ لہذا وہ مقرر ہوئے۔ خاص کمبود کی نظر رکھتے ان پر تھی۔ غزل گوئی پر ان کو راجح یا کمرش کیا اور کہا کہ میاں تمہاری طبیعت مرثیہ گوئی کی طرف ہے اور تمہاری زبان فصیح بھی ہے۔ اس پر بھی تمہیں دیکھو اور مرثیہ کہو۔"

ایک مرثیہ گوئی حشریت سے :- یا ہاں محسوس کی پہلی ہے کہ ان کے یہاں جو اس وقت گدھا ہے، شاید انھیں اور دیر سے زیادہ۔ ان کی ایک نظر ادب سے بھی بڑا جاتی ہے کہ انہوں نے اپنے مرثیوں میں احادیث سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان کے مرثیوں کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ انہوں نے شہادت کے بلا کے توکل اور صبر کو ایک تصویر بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کی بحرین خوش ہوتی ہیں لیکن دہائی اور آج تک ہر جگہ موجود ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں بھی یہ بہت محتاط ہیں۔ اگر ایسے مرثیہ مثلاً سرائیا بزرگ، دھند اور شہادت مختلف مرثیوں میں تعلق ترتیب سے کرتے گئے ہیں۔ ان کے یہاں سرائیا نگاری کا بھی سلیقہ ہے۔ ایک مرثیہ کے سرائیا سے چند اشعار نقل کرتے ہوں:

آگے آگے فوق کے مہاس جاتا تھا بڑا سا منہ پر سرفی، ہوشم شیدا میں شجاعت کا نشانہ
مر پر شاہد مفید اور دوش کے اوپر مہاس مر سے پاؤں تک نظر آتا تھا عالمِ نور کا
چاند سا گویا تو منہ اور گرد نکلا خطِ سواد جس طرح امیر یہ میں سے نکل آتا ہے باد

مرثیہ گوئی میں خلاقی صلاحیتیں کم ہوتی ہیں، لیکن فصیح کے یہاں یہ عنصر موجود ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام سے دھندے ہوتے وقت لکھا، انہیں کرتے ہیں:-

جو بلا آئے اسے سمجھو کہ ہے فضلِ کریم جانو دولت و خدادی کو کہ ہے اجرِ عظیم

قید خانے کو سمجھا کر ہے جنات حیم جب ملے گرم ہوا چاند جنت کی حیم
روح راضی بہ رضا حکم خدا بزرگ ہے
دم شمشیر سے بھی راہ رضا نازک ہے

سوت سے عالم و مظلوم نہ پائیں گے اماں ملک الموت کے قبضے میں ہیں سب ہیں جوں
مراںساں کی ہے صومری کی طرح تھوڑاں ایک دن سب کو ای خاک میں ہونا ہے کہاں
غم دینا ہے جنت لذت کے پائندوں کو
چاہتے خالق اکبر کی رضا بندوں کو

چھٹو لعل دگیر

(۱۸۴۳ء - ۱۸۴۶ء)

دگیر کا چارہ نام چھٹو لعل تھا اور چھٹوں دگیر۔ بعضوں نے چھٹو لال اور چھٹو لال بھی لکھا ہے۔ لیکن یہ اصل بیت کے
مستند ہو گئے اور مرثیہ گوئی کی طرف مائل ہوئے۔ ان کا خاندان کاشتوں کا قبیلہ والد کا نام بھی دوہرام تھا۔ ان کی پیدائش
۱۸۴۳ء میں ہوئی۔ چھٹوں آپاد کے چچے والے تھے۔ چچہ دلی اور بعد میں کھنڈوا گئے۔

دگیر کھنڈ میں پیدا ہوئے اور میں تعلیم حاصل کی۔ ابتدا میں انہوں نے نوازش حسین مرزا خانی کے سامنے
زبانے ادب تیر کیا۔ ابتدا میں غزلیں کہتے تھے۔ ان زمانے میں ان کا قصص طرب تھا۔ لیکن جب مرثیہ کی طرف مائل
ہوئے تو چچا کی طرف ہٹ کر آ گئے۔ مرثیہ گوئی میں طرب سے بہت کچھ لکھیں دگیر ہو گیا۔ ۱۸۴۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔
علی اسد رشک کے قتل سے کچھ سال وقاعدے بعد آدھوتا ہے۔ قطعہ یہ ہے:

در کھنڈ غلہ با بیع شہدا گشت پائیں مرثیہ گو دگیر
تاریخ وفات او نو شتم اے رشک آہ غمخس مرثیہ گو دگیر

شیخزاد کے مطابق دگیر نے اپنا آبائی مذہب تبدیل کر دیا تھا اور مسلمان ہو گئے تھے۔ لیکن ہے کہ ایسا ہو لینا
دوسرے تذکرہ نگاروں باب میں خاموش ہیں۔

دگیر کے مرثیے موضوعات کے اعتبار سے مشہور ہیں۔ انہوں نے شہداء کے بلا کے علاوہ متعلقین شہداء کے
کربا کے مرثیے بھی تخلیق کئے ہیں۔ معجزات ان کے مرثیوں کا ایک حصہ ہیں۔ دگیر کی یہ کہانی اس سے ثابت ہے کہ ان کے
مرثیے بہت جلد ان میں شائع ہوئے۔ کلیات بھی چھپ گیا ہے۔ بقول سید جعفر بعض مرثیوں میں ۱۲۰۰ ماز اور پانچ سو
مرثیے کا آغاز نہیں ہوتا۔ دگیر کی شہید کے اصل موضوع کی طرف توجہ ہو جاتی ہے۔

دگیر نے خواتین کے چھوڑے ارمان کے طرز میں بھی مرثیے لکھے ہیں۔ "نکری طبع" میں شاعرانہ نظم آبادی تھکتے ہیں۔
"روہا تمیں دگیر کی جنت میں ڈال دیتی ہیں۔ انہوں نے دو خانہ آئی بندہ دتھے لیکن بدھشت اور پانی و
شہادت کے بیان میں اس افراط سے مسلمانوں کے مراسم اور خاص عمارت سے اور مستورات
اہل اسلام ارمان کے پیمانہ کی باتیں بہت دیکھتی ہیں کہ قہر ہوتا ہے۔"

بہر حال ان کے آپد مرثیے کا یہ بندہ دیکھتے:

آیا جو اکبر کے ہے رخصت کا وقت نیسے میں سب کے ہوا وقت کا وقت
جگ ہے ہوا ہوتا ہے لوقت کا وقت بانو پہ گویا تھا معصیت کا وقت
کتن تھی در غلہ جدائی ہوئی
آج میری بی بی پرانی ہوئی

ڈاکٹر سجاد ظہر ان دگیر کے مرثیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے خیالات اس طرح رقم کرتے ہیں:-

"دگیر نے مرثیہ میں رسول کے گھرانے کو اپنے ہند کے شہزادے کے ایک شہزادہ خاندان کی
صورت میں پیش کیا اور مرثیہ کے کرداروں کو گھریلو پس منظر میں اس طرح سامنے لائے کہ
ان کی سماجی زندگی، درخشاں زندگی، ہوادری و فاداری بھیت، ادب، لطافت، عروں، بخودوں اور بچوں
کی گفتگو، محفلات، رسوم اور خیالات کے ساتھ ان کے سامنے آتی ہے اور مرثیہ صرف ان کے ہارٹم
کی چیز نہیں رہتا بلکہ ان کی نظم بن جاتا ہے جو کرداروں کی تعلیمات، ان کے داخل اور احساسات
پیش کر کے ان کی زندگی کا عکس بن گئی ہے۔ شہزادے کے حال کے سراپائی میں دگیر کی
لڑاؤ توجہ دیا م صحت کے اندر کی زندگی کی طرف راجح ہے۔ رخصت کے تقابلی مناظر کے علاوہ
مرثیہ کی تہذیب و سماج کے اس پہلو کو انہوں نے ترقی دی جس میں جنگ شروع ہونے سے پہلے
کے حالات بیان کئے جاتے ہیں۔ جو بہت سے رخصت میدان کرنا میں دور و دوری الہا بیت،
زمانہ شام اور بدھشت کو انہیں کے جو مرثیے ہیں ان میں بھی جگہ پہلو لایا ہے۔"

میر بہر علی انیس

(۱۸۰۲ء - ۱۸۷۳ء)

میر بہر علی انیس اور مرثیہ کی آواز دیکھ جاتے ہیں۔ ان کی پیدائش کی جگہ ہریانہ میں ایک اندازے

• "نکری طبع" (حصہ دوم) شاعرانہ نظم، ادبی، تاریخی، ۱۹۷۰ء، ص ۷۷

کھڑے، پر لازم ہاجی تسلیل سے جان کی جانیں اور اس طرح کی جانیں کہ آنکھوں کے
سائے بیچ سفر کا نقشہ بھر جائے۔ میرا نفس نے جہاں جہاں سفر کیا کیا کیا، ان نکتوں کو طوطا
رکھا ہے۔"

ذیل میں میرا نفس کے بعض مرثیوں سے پتہ چلتا ہے کہ چارے ہیں:

تیار جان رہنے پہ چھوٹے بڑے ہوئے
تکواریں نیک نیک کے سب اٹھ کھڑے ہوئے

برجیوں الزام قاب دہب کے فرس دانوں سے
آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے گھیبانوں سے

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑی کی راہ سخت
پانی نہ، حیرانوں نہ کہیں سایہ دوست

راکب عبا کیل چاند سے جیروں پہ ڈالے ہیں
قوسے ہوئے سند نہائیں نکالے ہیں

گرموں جھکاوی تا نہ ادب میں خلل پڑے
قوسے ہوئے آنکھوں سے لکھیں گل پڑے

کھا کھا کے اوس اور بھی سبز ہوا ہوا
تھا سوتلوں سے دامن سمرا بھرا ہوا

تھیں ہلوں نے ہاتھوں میں پتھر اٹھائے ہیں
تیغوں کے ساتھ گزر گراں سراٹھائے ہیں

بچیں زمیں کی اس کے نکلنے سے مل گئیں
دلوں کوتاہیاں بھی کھڑی ہو کے مل گئیں

پانی جو تھما پہ خدا نیک دلت کی
ساحل سے سر بگتی تھیں سوکھیں فزات کی

میں کوئی حد پائی نہیں رہتی۔ اس لئے چند بات یوں ماننے آتے ہیں جیسے وہی سب کچھ ہوں۔ اس کو نقشہ بھی کیا جاسکتا ہے
لیکن عام تاریکی یا سائے ایسے چند بات کے اظہار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مرثیہ کے سارے کردار یا نکتہ یا مثالی ہوتے ہیں، جو کسی حال میں بھی اپنی خوبی نہیں چھوڑتے۔ میرا نفس کے
یہاں بھی مثال پسندی ہے۔ لیکن کردار نگاری میں جس طرح وہ ادب کا خیال رکھتے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے۔

میرا نفس ایک مہاری منظر نگار بھی ہیں۔ منظر نگاری میں ان کا کمال یہ ہے کہ ہر منظر آنکھوں کے سامنے تصویر کی
صورت اُبھر جاتا ہے۔ ایسی منظر کشی میں ان کی شاعرانہ قوت بھی خوب ساتھ دیتی ہے۔

انہیں کے یہاں رزمیہ عناصر کی کمی نہیں، بلکہ ایسے عناصر کی پیشکش میں وہ افریقہ کی منزلوں تک جاتے ہیں اور
ضرورت کے مطابق واقعات یا کردار میں تخفیف یا اضافہ کرنے میں قلمی ثبوت دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں مبالغہ کا استعمال
خوب خوب ہوا ہے۔ یہاں کی بھی بعض کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔ مجموعی اعتبار سے انہیں واقعہ اردو کے انتہائی ممتاز مرثیہ
نگار تصور کئے جاتے ہیں تو یہ کوئی گلا بہت نہیں ہے۔ سوائے مثالی نعمانی تکھے ہیں:-

"میرا نفس نے سینکڑوں جزاؤں مرچے کھئے ہیں اور ہر مرثیہ بجائے غزل ایک قصہ یا حکایت
ہے لیکن کوئی واقعہ یا نکتہ کھنکھاتا ہے۔ حال کے خلاف ہو۔ خون دھڑکی روایت کا سرے
سے نکلتا ہے نہ تھا لیکن جب میرا نفس نے اسی کمرے میں کھانا تمام لوگوں کو اس کی واقعیت
کا دھوکا دیا وہاں تک کہ اب وہ بھلا ایک واقعہ سلسلہ کے تمام مرثیہ گوئیوں کے پاس مختلف
جہازوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ اسی طرح میرا نفس نے جس قدر واقعات کھئے ہیں، ہر چہ
رفتہ انگیز اور موثر ہونے کے، واقعیت کے قالب میں اس قدر ڈھلے ہوئے ہیں کہ کہیں سے
ان پر حرف گیری نہیں ہو سکتی۔

مرثیوں میں جو مضامین قدر مشترک کے طور پر ہیں وہ یہ ہیں: آمادگی سفر، رواد کی
تکلیفات اور مصروفیتیں، قیام گاہ کا انتظام، دشمنوں کی روک ٹوک، معرکے کی تیاریاں، رزم
آرائی، درجز و درغیوں کا قتال و جدال، دشمنوں کی فتح، ہار، حرم کی شکست اور بچاؤ، شام کا سفر،
قید خانہ، دربار کی مہتری۔

ان میں سے ہر عنوان کے اندر کرنے کے لئے بلاغت کے خاص خاص طریقے ہیں۔
مثلاً سفر کی تیاری کے بیان کرنے میں بلاغت کا یہ اظہار ہے کہ سفر کے وقت جو چیز واقعات
اور حالات پیش آتے ہیں ان کی تصویر کھینچی جائے، سفر کی تیاری کی تصویر کی تصویر، ہزار سفر،
زاد سفر کا انتظام، نکتوں اور کھانوں کی تیاری، دستور اہل کے پردے کا انتظام، دستور اور

نیا خلق میں لوگو! کوئی ہوتا نہیں چار
ہے کون سی تعمیر کہ سب ہو گئے چار
زندہ ہوں، پھر مرنے کی طرح ہو گئی دشوار
کیوں بھائے ہیں سب، مجھے ہے کون سا آزار
حیرت میں ہوں باعث مجھے کھٹا نہیں اس کا
وہ آنکھ چمالتا ہے مرنے لگی ہوں جس کا

مرزا سلامت علی دبیر

(۱۸۰۳ء - ۱۸۷۵ء)

دبیر ۱۸۰۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے لیکن بچپن میں تپا میں اپنے والد مرزا غلام حسین کے ساتھ کھنڈو آ گئے۔ نسیر کھنڈوی نے "صبح بخانی" میں یہ اطلاع ہمہ پہنچائی ہے کہ انھیں قاری کی تعلیم مرزا کا حکم علی آبادی نے دی۔ ان کے جد اعلیٰ ملا باشم شیرازی ایرانی تھے۔ جس زمانے میں ان کے والد کھنڈو آئے ان کے حالات نہایت ناگفتہ بہ تھے لیکن فتح علی خاں معاون ہوئے اور ان کی مدد کی۔ دبیر کے بڑے بھائی مرزا غلام محمد نظیر دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کے بعض شعرا دبیر کے علاوہ مرزا محمد مظفر اور محمد طاہر دہلی نے شہرت حاصل کی۔ سیدہ منظر لکھتی ہیں کہ:-

"مرزا دبیر دہلی کے محفل علی آبادی میں متعلق لالہ زکریا میں ۱۲۱۸ ہجری الاوّل ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء

اگست ۱۸۰۳ء میں قولہ ہوئے تھے۔"

دبیر کو ہر فن اور قاری زبانوں پر کافی دسترس تھی۔ مولوی غلام علی خاں نے انھیں صرف شعر و منطق اور محنت کی تعلیم دی اور مرزا کا حکم علی سے جدا بیٹ۔ تبسیر اور نقد کی کتابیں انھیں ادب کے لئے ملاحظہ کی مجتہدہ زندہ دانی اور فدا علی سے رجوع کیا۔ بارہ سال کے ہوئے تو شاعری شروع کی تبسیر کے شاگرد ہوئے اور دبیر کا قصہ اختیار کیا۔ اس باب میں محترمہ خدیجہ لکھتی ہیں:-

"حیات دبیر کے مصنف افضل حسین نے دبیر کی مہمان نوازی کے بارے میں لکھا ہے مہمان نوازی مرزا صاحب کی تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ ذرا آدھہ در قطر آدھہ جہاں کہ دبیر ساقی اشتیاق سے نہایت مسرور و انسان تھے اور ان کے یہاں رہنے والے کی فراموشی تھی کہ اس کا ایک حق بھی بچا کے رکھتے تو انکی نسلیں انوشاہ بن رہتی تھیں۔ تبسیر الدین حیدر کی لکھنا کھلوں روپیہ سا لٹا دیا کرتے تھے۔ اسکے علاوہ ہند کے قواب عین سادہ بھی دبیر کو فرما کرتے رہتے تھے۔ اسکے علاوہ بھی دبیر کی آمدنی کے اور بہت سے ذرائع تھے۔ دبیر کو کسبہ روپیہ خرچ کرنے کی عادت نہ تھی۔ وہ اہل حق انسان تھے اور دوسروں کی ضرورت چوری کر کے خوش ہوتے تھے۔ تبسیر ان فن میں شاہد عظیم آبادی قرار کرتے ہیں کہ خلق و سلوک

کرتے تھے۔ مولوی فدا آبادی اور اہل عادت گھر سے رہتے تھے۔ اکبر سو فی الاون کو کٹر سے نکل گئے اور مکی شریف، تاجدار غیرت، دام کے گھر پہنچ کر چپے سے دے آئے۔ ایچ، دامدار، بیواؤں کو مستحیر سے دیکھ کر کہتے تھے۔ فدا خان، والوں کو شہر سے مقرر کر کے، اسکے خاناہ بھی خود دیا کرتے تھے۔"

دبیر کی شادی سید معصوم علی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، جو انتظامیہ خاں اللہ کی نوای تھیں۔ دبیر کے عہد تیز ادب مرزا بغفر نے بھی مرثیہ نگاری میں اقتدار حاصل کیا۔ ان کا انتقال ۱۲۹۷ھ میں ہوا اور مرزا ابوالادی ۱۲۹۷ھ میں انتقال کر گئے۔ دبیر کی ایک صاحبزادی تھیں، جن کی شادی میر بادشاہ علی سے ہوئی تھی۔

بحیثیت مرثیہ گو دبیر کا مقام بہت بلند ہے۔ ان کا موازنہ میر انیس سے کیا جاتا رہا ہے۔ ان سلسلے میں مثلی کا موازنہ سب سے زیادہ معروف ہے۔ لیکن عام خیال یہ ہے کہ مولانا نے انھیں کو قسیم تر ثابت کرنے کے لئے بہت کلو سے کام لیا ہے اور موازنے میں طرفدار کی ایک کیفیت نمایاں ہو گئی ہے۔ یہ بات اگر درست بھی ہو تب بھی یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انھیں دبیر سے ہر حال اہم تر مرثیہ گو تھے۔ یہ ادب بات ہے کہ یہ پہلو بھی ذاتی پسند کا نتیجہ ہے اس لئے کہ دبیر نے تمام نکات پر انھیں سے قصوں میں وہ دبیر کے سلسلے میں بھی پیش کرتے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ انھیں وہ دبیر کے زمانے سے آج تک چلتا آ رہا ہے۔ دراصل وہ تو ایسی شعرا مثلی کی آذان، الفاظ کے دروہست، جذبات نگاری، اختصار نگاری، کردار نگاری میں بے مثال رکھتے تھے اور وہ تو ان ہی کے پس بیان کرنے کی وہ طاقت ہے کہ ایک طرح سے مشعر کہ نصیرت کی حامل ہے۔ لہذا وہ تو ان میں کسی کو کٹر اور بیشتر کہنا آج بھی آسان نہیں۔

دبیر کے مرثیوں میں مضمون آخری اور مشکل پسندی سامنے کی بات ہے۔ وہ قلمی تشبیہات خوب خوب اختراع کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ایسی تشبیہات کی کثرت ہے جو غیر معروف ہیں۔ کہیں کہیں دبیر اپنے علم ذہن کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں اور اس مظاہرے میں خیالات کی نزاکت ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ ان کے یہاں تقصیر اور معنوی مسنوں کی بھی کثرت ہے۔ وہ کوئی بھی مضمون ادا کر رہا اس میں ایک طرح کی کثرت ہی موجود ہوتی ہے۔ کہیں کہیں ان کے یہاں قلمی تقصیر کا بھی احساس ہوتا ہے۔ وہ میر شاعری کی حیثیت سے ان کے یہاں قلمی تو ہے ہی لیکن اسلوب بھی حاملہ ہے۔ مولانا مثلی انسانی نے انھیں کی خصوصیات کا نام کی نظری ترتیب دروزرہ کا حسن، مضامین کی نویت اور الفاظ کی برکتی، تشبیہات و استعارے کی جدت اور واقعات، جذبات نگاری پر زور دیا ہے۔ لیکن دبیر کے مرثیوں میں کسی نہ کسی حد تک یہ عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ ہم دانش کی بات الگ ہے۔ بہر طور یہ دونوں مرثیہ گو یاں بالکل اپنے فن کے ماہر ہیں جن کی مثال اور دوسری کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ آج بھی مرثیہ گو ہے جس کا سب سے پہلا فن ہے کہ انھیں دبیر سے برا مرثیہ نگار پیدا ہوا۔ جب جس کی جگہ دی جس فن میں شاہد عظیم آبادی بھی ہیں اور جوش بھی لیکن دبیر کا کمال ان کے یہاں نہیں ملتا اور نہ تو انھیں کا۔ لہذا اور مرثیہ نگاری میں دبیر کی عظمت کا اعتراف ہیٹ کیا جاتا رہے گا۔ ابراہیم صدیقی

اور صبح تک لیلیٰ زہرا لقب ہوئی

$(\rho|q_{\mu} \rightarrow p|k'')$

رشید ۱۸۹۶ء میں نواب صفور علی خاں کی تحریک پر راجپور گئے اور مجلس بن گئی۔ پھر وہاں پہلی مسلسل جات رہے۔ رشید عظیم آباد بھی آئے اور باؤلی کے امام بازار میں عشرہ نور مجلس میں حصہ لیا پھر مجلس بنوئیں۔ یہ ۱۹۰۱ء کی بات ہے۔ انہوں نے ستر حیدر آباد بھی اپنے ہی امور کے لئے کیا۔ رشید کی مجلسیں جامعہ طور سے بہرام اللہ کی ڈیڑھ گجھن ہوتی تھیں۔ رشید انجمن خانہ عمریہ سے بھی وابستہ ہوئے تھے لیکن پھر اس سے علیحدہ ہو گئے۔ ان کی شہرت بطور خاص ماہی پور، عظیم آباد اور حیدر آباد میں ہوتی رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان جگہوں پر مجلسیں میں سر جے چڑھتے اور ان جمعیوں وصول کرتے۔ پھر اسے صاحب رشید ایک پرگنہ جڑے جڑے لیکن عربہ نگار کی حیثیت سے انہیں جس طرح کی کامیابی حاصل ہوتی وہ قابلِ لحاظ ہے۔ یوں بھی چونکہ ان کا تعلق مشعلی اور انہیں کے خانوادے سے تھا اس لئے ان کی عزت و شہرت میں مزید بڑھ چکا ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ انہوں نے دیوبند میں روایات میں توسیع کی۔ پھر انہیں کی بڑی توانائیوں نے انہیں کی خاص بات تھی۔ رشید بھی اس امر میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ چوں کہ ان کے سارے عمریہ و فنیہ ہیں لیکن خاص طور سے بہرام اللہ، صفائیں اور صفائی، سامانیم، رشید کی غزل گوئی میں ان کے عہد کی روایات کا پورا تقابلی ہے۔ کوئی گہری نگاہ ان کے یہاں نہیں ملتی پھر بھی حکام کی مداخلت کی بنا پر ان کے اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ باغیوں سے بھی ان کا شغف تھا۔ نظام حیدر آباد بھی ان سے متاثر ہوئے۔ وہ مسلسل سفر کرتے رہے اس لئے کہ اب آہل کا قہر میں اور یہ کہ قہر بعض امور کے سلسلے میں جعفر رضا نے قہر بانی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

”نرشد نے اپنے دو یہاں اور دو یہاں دونوں کی شعری روایات سے فیض حاصل کیا تھا اور دونوں کی جڑ ہی پر فخر کرتے تھے۔ جہی وہ اپنے کو طرزِ سخن پر انھیں کا وارث کہہ کر اس کے رنگِ سخن سے اپنے کو وابستہ کرتے تھے وہاں اپنے کو پہلے محض خارج اور مسدوق کا تحسین بھی کہہ کر فخر کرتے ہیں۔ غرضی بیت میں انھں کے جھجھکے، جیادے کو ذکر کر کے بھرا جاتا ہے، م پلٹے ہیں۔

نہایت دوست فوج خلق تین چار کوس
دور رو کے دیں میں تالہ قرآن لائے کوس

نغم سحر کی صوفی بیان آستانہ ہوں
روقی ہوئی روانہ تھی شب چڑھنی تھی اوس

ظاہر خدا کی شان تھی سمجھتے تھے اس تھا
روٹی تھی روح قاطعہ جنگل اہل تھا

کچھ کچھ صمیم رخصت شب آمد سحر
کچھ کچھ گلوں کی باس عیاان پر فطر

دیکھا چودھری درخت تھے کوہ سیاہ تھے
 یا جا بہر جا مسافروں کے دور آہ تھے

نامک زمین شرق ہوئی جلوہ گاہ صبح
شب کی سیاہی پر ہوئی غالب سیاہ صبح
جزیرہ لگا کے پڑھا بادشاہ صبح
توبہ بھی بلند ہوئی دن میں آہ صبح

خونِ شفق میں غرق نہ پاؤں وہیں تھا
خورشید صبحِ صحرِ قتلِ حسینِ تھا

خداوند ہوں میں ذکر کہ فرصت کی صبح ہے
 قرآن کی قسم جی صوفیہ کی صبح ہے

۔ صبح کرو بلا نہیں جنت کی صبح ہے
 خالق گماہ ہے کہ صفا ہے کی صبح ہے

تس کو خوش و خوش کے تخم سے ایک ہے

”مورخین“ کا سال تحقیق ۱۹۲۰ء ہے، اس میں اکبر الہ آبادی ہیں۔ اس میں حضرت امام حسینؑ کی ولادت اور حضرت محمد مسلمؑ نے جس طرح نام تجویز کیا اس کی تفصیل درج کی گئی ہے اور دوسرے تاریخی حقائق سامنے لائے گئے ہیں۔ جابر حسین لکھتے ہیں:-

”فقیہ نظر مرثیہ اپنی تاریخ اور موقوفاتی پمپلا کے لحاظ سے منفرد ہے۔ شاعر نے یہاں ترقی کو قبول دیا ہے اور متعدد واقعات نامہ میں حمیدی و بدویوں میں جوش کی ہیں۔ اس سے شاعر کی دانشوری اور علوم انسانی کی گہرے کا پتہ چلتا ہے۔ مرثیہ شروع سے آخر تک قاری کا لحاظ کی سحر کار کی ہے سب اپنی گرفت میں لے چکا ہے۔“

بہار حسین آبادی کا ایک مرثیہ ”افزون رہا“ ہے۔ یہ ۱۹۲۰ء میں تحقیق ہوا۔ یہ بہار کے مرثویوں میں سب سے طویل ہے۔ اس میں سیاسی، سماجی اور ثقافتی امور بھی در آئے ہیں۔ انسانی اور موقوفاتی اعتبار سے بھی اس میں بعض اجتہادات نمایاں ہیں جن کی تکثید فی جابر حسین نے کی ہے۔

بہار حسین آبادی نے ایک مرثیہ ”کیا ہے سخن“ تحقیق کیا۔ دراصل اس کی اہمیت اس لئے ہے کہ اس میں روایتی انداز بیان سے انحراف کیا گیا ہے اور مرثیے کو تیار تک و آہنگ بننے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسلامی تاریخ کے بعض واقعات کو سطر طریقے سے پیش کرنے کی صورت ملتی ہے۔ یہاں بھی مرثیہ نگار کے اجتہاد کی خبر ملتی ہے۔

۱۹۲۲ء میں حسین آبادی کا ایک مرثیہ ”خاصان خدا“ کے نام سے تحقیق ہوا۔ اس مرثیے میں بھی تاریخی واقعات حقائق کے ساتھ پیش کئے گئے۔ جابر حسین نے اس کا اظہار کیا ہے کہ مجمل منظری نے مرثیہ نگاری کے میدان میں بہار حسین آبادی کی خدمات کو ایک نئی کتاب سے منسوب کیا ہے۔ دراصل اس مرثیے میں اس کا احساس دلایا گیا ہے کہ خاصان خدا اللہ ہذاک حالات سے گزرنے کے باوجود دنیا کی آلائشوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔

ایک سال بعد موصوف کا ایک مرثیہ ”سراپہ حسین“ کے نام سے چھپا ہی بندوں پر مشتمل تحقیق ہوا۔ اس میں انسان کے اضطراب کی تکفینیں بھی ظاہر کی گئی ہیں اور روحانی ترقی کی صورتوں سے بھی آشنا کیا گیا ہے۔ یہ مرثیہ اپنے تسلسل صورتوں کے باعث بھی قابل لحاظ ہے اور اس کی نگری مبنی صورتیں چلتی ہیں۔

۱۹۲۶ء میں بہار حسین آبادی نے مرثیہ ”قصر جنس“ تحقیق کیا۔ یہ ۵۰ بندوں پر مشتمل ہے۔ اس مرثیے کے ذیلی میں جابر حسین کی رائے ہے:-

”قصر جنس اس لحاظ سے نادر اور اہم مرثیہ ہے کہ اس میں شاعر نے خود کو مکمل اور زور بولان سے روز کا مشورہ دہشت کا ایک مظلوم راجائی انداز میں پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ انہیں رسول خداؐ اور سچا کہرام سب کے سب کہیں طرح اس ان جنس میں حسرت، باس کی تصویر نظر آ رہی ہے۔“

ان کے اس سرسے سے ہوں عشق کے سبب ملک مضامین کا رئیس عشق کی طرف بھی تھکا کر خیال جا رہا ہے۔ مہربان اور حسین انہیں میر عشق کا شاگرد کہتے ہیں اور شہر جو ان کے خاص شاگرد اور سوانح نگار ہیں، انہیں مہربانیں کا تھکا جاتے ہیں۔ جن کے بیان پر مجدد سکر کے درام یاد سکیت، آغا محمد باقر اور ابوالفتح نے بھی ان کو انہیں کا شاگرد بتایا ہے۔

سب سے قطعی طور پر معلوم نہیں کہ وہ اصلاح کے لئے اپنا کلام کہیں کے سامنے پیش کرتے تھے، ہمارے نزدیک یہ کہنا زیادہ صحیح و مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی طور پر اصلاح دے چاہے جس سے بڑھتے ہوں لیکن ان کا قول اور ان کا کلام بتاتا ہے کہ وہ خاندان عشق اور انہیں دونوں کی شعری روایتوں کے وارث تھے۔ ان کی خصوصیات کو اپنے کلام میں جگہ دیتے تھے اور ان پر نظر کرتے تھے۔“

گویا پیارے صاحب رشید اور مرثیہ نگار کا عشق کے عشق میں ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں۔

بہار حسین آبادی

(۱۸۹۳ء - ۱۹۲۹ء)

ان کا اصل نام شاہ محمد باقر تھا اور انھیں بہار کرتے تھے، ان کا اصل حسین آباد (عظیم آباد) تھا جہاں ان کی ولادت ۱۸۹۳ء میں ہوئی۔

موصوف کا مرثیہ کوئی سے گہرا رشتہ تھا اور اس فن میں ان کے امتیازات کو تفصیل سے قلم بند کیا جاسکتا ہے۔ قدیم مرثیہ گوئیوں کی اختصاں کی نہ صرف ان کی خبر تھی بلکہ، اپنے اختصاں میں مزید ترقی پیدا کرنے کے خواہش مند تھے۔ ۱۹۲۰ء سے مرثیہ کہنے لگے تھے۔ (ای سال ان کا ”مورخین“ شائع ہوا۔ یہ پہلا مرثیہ تھا۔ اپنے وقت میں اس کی تحریک و حسین بھی ہوئی۔ لیکن مرثیے کو ہندوستان میں شہرت حاصل نہیں ہو سکی۔ اس کے بعد سے وہ قوت سے مرثیے کہنے لگے اور ہر مرثیے میں کوئی نہ کوئی امتیاز پیدا کیا۔ لیکن انہوں نے ایک بات یہ ہے کہ مرثیے کی محنت کن ہیں ان کے ذکر سے خالی ہیں اور کہیں ذکر آیا بھی ہے تو مجدد رواہی میں، حالانکہ ان کے مرثویوں کی تعداد یوں تو سات بتائی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہت سے مرثیے مخطوطے کی شکل میں آج بھی ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں، ان کے سات مرثیے ۱۹۵۶ء میں بہار فاؤنڈیشن، عظیم آباد سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی اشاعت میں جابر حسین نے دلی دلچسپی لی اور ایک اہم کام سرانجام دیا۔

میں ذیلی میں موصوف کے مرثویوں پر ایک سرسری نظر ڈالتا ہوں۔

جہاں میں نصر علی خود اناس ہے آج سرور کا جو محل تھا مقام ہاں ہے آج
قہار قدسیوں کا مانتی لیاں ہے آج بحال زندہ ہے جوں پہ وہ جہاں ہے آج
ملک خوش ہیں پھرے کا رنگ فتح فتح ہے

نہ حسن ہے در و دیوار چہ نہ دولت ہے

میں بہار کے کسی بھی مرثیے سے مثالیں نہیں پیش کر رہا ہوں اس لئے کہ اس کی پوری اہمیت کو سمجھنے کے لئے مکمل مرثیے کا مطالعہ لازمی ہے، یہاں اس کا کوئی موقع نہیں۔ لیکن اس وقت میں نام میرے ذہن میں آ رہے ہیں جن کے یہاں مرثیاں میں اجتہاد کے پہلو نمایاں ہیں۔ پہلا نام شہ عظیم آبادی کا ہے دوسرا جوش ملیح آبادی کا اور تیسرا بہار حسین آبادی کا۔ شہ عظیم آبادی نے تو ایضاً بلا اس کا اعتبار کیا تھا کہ وہ انہیں دوسرا ملک مرثیے کی طرح ڈال رہے ہیں جو تھا کئی سے زیادہ قریب ہے۔ لیکن یہ دعویٰ تھا جس پر تعمیلی مکتوبیں جوئی کی۔ جوش ملیح آبادی نے "حسین اور انقلاب" سے ڈھنگ سے لکھا اس کے بعض قیچہ جدید رنگ سے ہمکنار ضرور ہیں۔ بیاد نے خیال اور نگاروں ہی سطحوں پر اجتہاد کی کوشش کی ہے۔ مرثیے پر جو مستند حضرات کام کرتے رہے ہیں انہیں بہار حسین آبادی کے مرثیوں پر نگاہ رکھنی چاہئے اور یہ واضح کرنا چاہئے کہ جس طرح موصوف نے مرثیوں کو یاد رنگ دینے کی کوشش کی ہے وہ کہیں تک مستحسن ہے۔ مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس ہے اور میں اس ضمن میں کوئی فیصلہ کن بحث نہیں کر سکتا۔ لیکن بہار کے روئے کی حسین ضرور کرتا ہوں۔

بہار حسین آبادی کا انتقال ۱۲۲۹ھ میں ہوا۔



فورٹ ولیم کالج

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اردو بشر کے ارتقاء کی نظر میں جو دور آبادی صرف اہم ہی نہیں بلکہ اردو کے حراج و میلان کی تبدیلی کا اس طرح باعث ہوا کہ اسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

واقعہ جو کہ ویلزلی نے جولائی ۱۸۰۰ء میں ایک کالج کے قیام کی تجویز کی تھی جسے گورنر آف ڈاؤن میں کوئٹور کرنا تھی اور منظور سے پہلے ہی اس کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ پھر کالج کا ایک دستور بھی مرتب کیا۔ عجیب بات ہے کہ فورٹ ولیم کالج کا افتتاح دراصل ہندوستان کی سکرانی سے گہرا تعلق رکھتا ہے اس لئے کہ ۱۲ مئی ۱۸۰۰ء کو نپو سلطان کی شہادت ہوئی تھی اور انگریز اس کی فتح کی یاد میں گویا فورٹ ولیم کالج کا افتتاح ہوا۔ اس واقعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کالج کے قیام کے پیچھے نگرینوں کی نیت کیا تھی؟ اور پھر اس کی طرح ہندوستان کو ہمیشہ کے لئے زیر قبضہ رکھنا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے اس سے اندازہ کیا کہ ہندوستان کی ترقی کے لئے کیا راستہ ہے؟ ہم پر حقیقتاً یہاں ترقی کے تیلو کی موٹر کارروائی جو بھی تھی۔ بہار فورٹ ولیم کالج کا قیام سیاسی مقصد سے خالی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے قیام کے فوراً بعد اس کا دستور عمل بھی مرتب ہو کر سامنے آیا جس کی پہلی فتح یہ تھی کہ بنگال میں ایک ایسے کالج کی بنیاد رکھی جائے جہاں سے مولانا دین کوادب کے ساتھ ساتھ سائنس کی بھی تعلیم دی جائے اور ہندوستان میں حکومت برطانیہ کو کامیاب طریقے سے کام انجام دینے میں معاون ہو۔ چنانچہ بنگال اور راز پور جہاں کے قیچہ جوہر دہرائے گئے تھے ان کے لئے فارسی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی (اور اردو) بنگال اور راز پور میں مال و چنگی کے شعبوں کے لئے اور بنگال کے تھیکیداروں اور تجارت کے معاملات کے لئے بنگالیوں کے

انہوں نے اپنے پیشے کو ترک کر دیا اور تعلیمی کیمپ کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک ایسے کاروباری تاجر بن گئے۔ لیکن انہیں انھیں نصیب نہیں تھا۔ ۱۸۲۰ء میں ہندوستان آ گئے۔ نومبر ۱۸۲۷ء میں انھیں ایک اسٹینٹ سرجن کی جگہ مل گئی۔ یہ ملازمت ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے تھی۔ بکھرہ سورت آ گئے جہاں نو چیلوں کے لئے طبی خدمات انجام دینی تھیں۔ لیکن ہندوستان سے بیکل جوں کے بعد اٹھا بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ ہندوستان کا قیام یا سستی اس وقت ہو سکتا ہے جب یہاں کی زبانوں سے کئی واقفیت ہو جس لئے کہ ایک نیک راجے کی زبان اردو اور ہندی تھیں۔ ان کا چاہنا یہی ہے کہ۔

۱۸۳۰ء میں انھیں اردو ہوئے ہی میں سٹینٹ سرجن کر لیا تھا کہ ہندوستان میں میرا قیام خواہ اس کی نوعیت سے جو بھی ہو، اس وقت تک نہ ہوتا میرے لئے خوش گوار ہو سکتا ہے اور میرے آکاؤں اہل کے حق میں مفید ثابت ہو سکتا ہے، جب تک کہ ملک کی سرحد زبان میں پوری دستگاہ میں نہ حاصل کر لوں۔ جہاں عارضی طور پر مجھے قیام کرنا ہے۔ چنانچہ اس زبان کو سمجھنے اس زمانے میں ضروری (Maoon) کہتے تھے۔ سمجھنے کے لئے میں ہم کر چکا تھا۔

ظاہر ہے وہ ہندوستان کی زبان کو سمجھنے کی طرف مائل ہوئے۔ اسی سبب ایک طالب علم کی حیثیت اختیار کی۔ رفتہ رفتہ وہ صلاحیت بھی حاصل ہوئی کہ استاد کی صفت میں آئے اور ایک طرف سے محقق بھی بن گئے۔ انہوں نے اپنے لئے کی گرامر کا بطور خاص نظر میں رکھا۔ یہ واقعہ ۱۸۳۷ء میں ٹیمپل ہند کی قلمی اور اس میں زبان کی سادہ بات سے زیادہ پیچیدہ تھا۔ ہم حال انہوں نے مزید صلاحیت کے لئے دوسرے ذرائع بھی اختیار کئے۔ یکم نومبر ۱۸۳۸ء میں دہلی جی دتے کے ساتھ شکر گڑھ چلے آئے۔ اس موقع پر انھیں ہندوستان کے کئی علاقوں کو دیکھنے کا موقع فراہم ہوا۔ اس سفر میں انہیں احساس ہوا کہ برصغیر ہند میں اردو کی حیثیت مسلم ہے اور انھیں اس فیصلے میں دیر نہ لگی کہ اس زبان میں مزید استعداد حاصل کی جائے۔ ان کا یہ فیصلہ بلا تاخیر نہیں تھا۔ انہوں نے طب کا پیشہ ترک کر دیا اور کھوسوئی سے زبان و ادب کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ذاتی دلچسپی اور مطالعے سے انکی صلاحیت بھی بڑھ گئی کہ یہ اردو کے سلیف میں ایک اہم شخصیت بن کر ابھرے۔

انہوں نے ذاتی مطالعے سے اردو کے باب میں کافی معلومات اخذ کر لیں۔ کئی کرسٹ کو اس کا احساس ہوا کہ ہندوستانی زبانوں میں خصوصاً اردو اور ہندی میں لغت کی جگہ کی ہے۔ چنانچہ مختلف مؤلفوں سے توجہ لیا شروع کی لیکن ان تمام اساتذہ سے بچنے کئی کرسٹ کا وہاں اس طرح بھی کام کر رہا ہو گا کہ اگر یہ سب تک کہ مقامی زبان سے بخوبی واقف نہیں ہوتے، حکومت پر ان کا تمام مقبول نہیں ہو سکتا۔ لہذا اس کی استعداد کھیلنے پر ضروری ہے کہ دورانیہ کی زبان اردو سے واقف ہوں۔ لہذا ابتدا میں اردو یا ہندی کے لئے کام ہونے میں ان کی محنت زمین میں یہ پالسی بھی کام کر رہی ہو گی۔ یہی لگ اور سوچے فہم کی بھی تھی یہاں سے اردو زبان کے قاعدے کے اسکا کتبہ روشن ہو گئے۔ اس زبان سے انویسٹ انگریزوں کے مفاد میں تھی۔ چنانچہ کئی کرسٹ نے ۱۸۵۷ء میں باضابطہ چھٹی کے نوکھو فیض آباد میں پڑھ کر

تعلیم دہلی کی خاطر ہندوستانی کی واقعیت لازمی قرار دی تھی۔ ہندوستانی شعب کے پہلے صدر پروفیسر جان ٹھکر سٹ تھے۔ ان کے بعد کئی دوسرے غیر ہندوستانی اس شعبے کے سربراہ رہے۔ اکثر ہندوستان نگار لکھتے ہیں کہ۔

”کالج کا قیام ۱۸۴۴ء میں ۱۸۰۰ کو ہوا لیکن ۱۸۳۳ء میں شروع ہوا۔“

یہ ہے۔ اس سے قبل کالج کی دوسری کاروائیاں ہوتی رہیں مثلاً کالج کونسل کا قیام، پروفیسر کا

تقرر، فیس اور چھتہ وغیرہ کی بحالی۔“

ابتداء میں ہندوستانی یعنی اردو شعبے کے مشیروں کے نام میں میر جہا د علی حسینی، انارکلی چرن، ستر، برہمچاری، غلام اکبر، نصر اللہ، میر حسن، غلام اشرف، بلال الدین، محمد صادق، رحمت اللہ، غلام غوث، کنند لعل، کاشی راج، وحید بخش، حیدری وغیرہ چرچا۔ کچھ مشیروں کے سیکرٹری ہونے سے سید جعفر، محمد تقی مبارک، بی بی الدین اور اسد علی خاں بحال کئے گئے۔ کچھ اور لوگ بھی اس شعبے سے وابستہ تھے خصوصاً پڑھا کما کے لئے۔ مثلاً اسد علی شر اور اللوال جی کوئی۔ بعد میں رام موہن چٹو پڑے، دانشور چٹو پڑے، سنگھ پڑا اور سہائی رام کا تقرر ہوا۔ کچھ اور لوگ بھی اس قافلے میں شریک ہوئے جیسے محمد صادق، میر منصور علی، غلام بخش، غلام سبحان اور دسواہی کمال اللہ خاں۔

فوریہ دہلی کالج میں کتبوں کی تعداد گیارہ جزا تھیں سو تریس (۱۱۳۵۳) تھیں۔ ایک عہدہ سلیکٹ ٹیچر کا بھی تھا جو طلبہ کو ان کے گھر جا کر پڑھایا کرتے تھے۔ کچھ شخصیں ایسے تھے جو باقاعدہ ٹیچر نہیں تھے لیکن گل کرسٹ نے ان سے کچھ کتبوں کی تصنیف و تالیف کا کام بھی لیا۔ مثلاً میر جہا د غلام (حسن اختلاط) باسٹ خاں (تصنیف و تالیف) قوام (دل ربا) غلام حید (گل پرچم) شا کر علی (الف لیل) کنند لال (تصنیف و تالیف) روپ (کلا کام) محمد بخش (تصنیف و تالیف) جانی مرزا غل (مترجم ہوجی) خمال چند لاہوری (مترجم گل بکوا) مرزا علی الف (گلشن ہند) بی بی تارا کن جیاں (دو بی ان جیاں)۔

ڈاکٹر جان گل کرسٹ

(۱۸۵۹ء-۱۸۶۵ء)

اوپر کی صفحوں میں اس امر کا اظہار کیا گیا ہے کہ کئی کرسٹ کالج کے شعبہ ہندوستان کے پہلے صدر تھے۔ کئی کرسٹ کالج یا کالج جان پاتھو وک گل کرسٹ تھا۔ ان کی پیدائش ۱۷۵۹ء میں انڈیا میں ہوئی تھی۔ یہ شہر اسکات لینڈ میں ہے۔ ابتدائی تعلیم کے باب میں اطلاعات مختلف ہیں، لیکن یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ابتدا ہی سے کئی کرسٹ کی دلچسپی طب میں تھی۔ چنانچہ وہ طبی پڑاؤ اکثر فائدہ پہنچاتے تھے۔ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ انہوں نے جارج میر تھکنے کی ہسپتال میں داخلہ لیا اور بعد ازیں انہیں ڈاکٹر کی حیثیت سے گئے۔ قیام وہاں اپنے پیشے سے مطمئن نہیں تھے۔ انھیں ہندوستان کے بارے میں اطلاعات بھی تھی کہ یہ ملک ملازمت کے واسطے سے اکثر بے لگاہ و اس ملک کی طرف متوجہ ہوئے۔

۱۱. "میرزا محمد علی خان" (۱۲۸۵-۱۳۵۵)

میرامن دہلوی

(۱۷۳۲ء - ۱۸۰۶ء)

میرامن کا نام میرامن ہی تھا اور تخلص تخلص۔ اس شخص نہیں نام کا حصہ ہے اور وقت ان کا پانچھٹھ صرف تخلص تھا۔ کریم الدین نے اپنے تذکرہ "طبقات شعرائے ہند" میں میرامن کا نام میرا مان لکھا تھا جو بقول رشید حسن خاں غلط ہے۔

میرامن نے اپنے کچھ حالات "باغ و بہار" کے پہلے حصہ میں اور چھاپی دوسری کتاب "تبیخ غریب" میں درج کئے ہیں۔ اس شخص کی بات یہ ہے کہ اس نے فریاد کوئی اور ذریعہ ان کی زندگی کے باب میں ابھی تک سنا ہے نہیں آتا ہے۔ لہذا میرامن کے حالات کے سلسلے میں خود ان کا بیان ملاحظہ ہو۔

"پہلے اپنا احوال یہ عاصی گناہ گار میرامن ولی اللہ بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ تاج محل بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پشت بہ پشت جانتھائی بچا لاتے رہے اور وہ بھی پرورش کی نظر سے تھے رہائی جتنی چاہتے فرماتے رہے۔ جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایات سے سرفراز کر دیا مال اور مال کر دیا اور خانہ زاد میردانی اور منصب (در قدیمی زبان مبارک سے ترمایا۔ چنانچہ یہ لقب و دشنامی دشمنی داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی (کر سارے گھر اس گھر سے آیا اچھے گھر سے نکلتے تھے) ظاہر ہے (عمیاں راجہ جیاں) اسب سوریہ میں جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا اور احمد شاہ دہلوی نے گھریار تاراج کیا۔ ایسی ایسی جاہلی کھا کر ویسے شیر سے (کہ وہ خن اور ظلم بھری میرا ہے اور تول مال و جین کڑا ہے) حلا وطن ہو اور ایسا بہار کہ جس کا تاجدار بادشاہ تھا فارغ ہوا۔ میں نے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہے۔ کتنے برس ہلکا، عظیم آباد میں رہا۔ کچھ جی، کچھ گڑی، آخر وہاں سے اپنی پاؤں اکڑے دروازہ گارنے موافقت نہ کی، عمیاں و اٹھال کو چھوڑ کر تین چھاگشتی پر سوار ہوا، اشرق البلاد نکلتے میں آب و دانہ کے زور سے آجیچا۔ چھڑے بے کاری گزری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلا کر اپنے چوہے نے بھائی میر کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب ۱۰ سال کے وہاں رہا لیکن ناپاؤ پناہ دیکھا۔ جب مٹی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور جان گل کر سست صاحب بہار (دام اقبال) کے رسائی ہوئی۔ ہارے حال کی خبر سنا ہے جو اس سال ہر دو کا اس کا تھوڑا سا ہے، سنا ہے کہ وہ کچھ بھٹے دوسری نہیں ہو

یہ ہے ورنہ یا گھر و عیال قدر دان کو کرتے ہیں خدا قبول کرے۔"

میرامن کی مرتبہ کتاب "باغ و بہار" سے پانچواں حصہ ہے کہ میرامن کا خاندان مجددیوں سے ہے کہ گرجا تھیر والی تک منصب داروں میں تھا۔ لیکن یہ صورت حال یہ قرار نہ دینی اور سونٹاں جاٹ نے ساری جاگیر ضبط کر لی۔ احمد شاہ دہلوی نے الگ ہی جہاں، پھر عالمگیر خاں کی وفات کے بعد دلی کا تخت منظر صحن سے محروم ہو گیا۔ ایسے میں میرامن عظیم آباد آئے لیکن یہاں بھی کوئی اچھی صورت نہ نکلی۔

بعض شہادتیں بتاتی ہیں کہ میرامن نے ۱۷۷۷ء میں دلی چھوڑا تھا اور ان کا انتقال ۱۸۰۶ء میں ہو گیا۔ اس لئے کہ فرسٹ ویم کالج کی خدمات کے سلسلے میں ان کا ذکر ۱۸۰۳ء کے بعد درجے میں شامل نہیں۔ لیکن یہ کوئی حتمی بات نہیں۔ تمام امور کو سمجھتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:-

"اس بحث سے زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ میرامن ۱۸۰۶ء تک بقید حیات تھے۔ البتہ بلا غلو یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس میں اس کے قریب قریب ان کا انتقال ہو گیا ہو، کیونکہ اگر زندہ ہوتے تو گھر سے کر تھیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھ سکتے تھے۔ کالج میں درس کے قائل و غلطے تو گھر چھوڑ کر کالج کے لئے تاجر کے اہل تھے اور نہیں تو کسی انگریزی کو پڑھا سکتے تھے۔ لیکن ان کے بارے میں ایک لکت پر طرح سے خاموشی ملتی ہے تو اس سے یہی باور کیا جاسکتا ہے کہ کالج سے سکھ دینی کے بعد دو یا دو عرصہ نہ بچا، بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ زیادہ عرصہ جتنے یا کم، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرامن باغ و بہار سے زندہ ہے، اس لئے تاریخ ادب کے لحاظ سے باغ و بہار کی تکمیل کے بعد میرامن نے اپنی بھاکا ساہاں کر لیا تھا۔ بحیثیت مصنف (یا مترجم) میرامن کی موت ۱۸۰۳ء میں اس میں مضمر ہے کہ میرا باغ و بہار کے پانچواں اور کا نام انجام نہ دے سکا۔ اس لئے باغ و بہار کے بعد اس کی زندگی کے بقیا ایام کی گنتی یہ ہو رہی ہے۔"

رشید حسن خاں نے اپنا مکمل اردو مولوی عبدالحق میرزا میرزا کے تحت انجمن ترقی اردو جس سے "باغ و بہار" کو مرتب کر کے شائع کیا۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۴۲ء میں چھپا اور اس کی اشاعت ۱۹۹۹ء میں ہوئی۔ انہوں نے واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ میرامن کا اصل ایک تخلص تھا اور دہلوی کے رہنے والے تھے۔ لیکن یہ دلی شاہ جہاں نام نہیں لکھا اس کی تفصیل سے باہر کی قلم کار کی یہی بات ہے۔ شہر کو دلی کہا ہے۔ جس محلے میں وہ قیام پر تھے وہ سید داؤد ہے۔ چنانچہ وہاں

مرزا رجب علی بیگ مردود۔ اور زمانہ تالیف کیسی ہے؟

مرزا غالب۔ ”اسی اصول و اقوال اس میں اشرف زبان کیاں؟ ایک تک بندی اور اختیار خانہ تاج ہے۔

اگر یہ کہ فرضی نہیں ہے تو پھر یہ انداز کا مشکل ہو گا کہ غالب کی اردو ستر کی سیاست و دہائی کا رشتہ کس سے قائم ہوتا ہے۔

”بارغ و بہار“ کے بارے میں ایک علامہ بھی یہ بھی ہے کہ جو قصہ اس میں درج ہے وہ بھی اصلاً میر خسرو سے منسوب ہے اس لئے موصوف اقرانے اپنی مخالفت کے دوران اس قصے کو ہراسنے کی ضرورت محسوس کی کہ اس سے طبیعت بے باک و صحت نصیب ہوتی ہے لیکن یہ صرف میر اس کا بیان ہے اس کی تردید محمد شیرانی نے کی تھی اور رشید حسن خاں اس تردید کو قبول کر رہے ہیں۔ لیکن میر اس اگر ایک سچے آدمی تھے اور کوئی غلط روایت ان سے منسوب نہیں ہے تو پھر اتنا بڑے گا کہ انہوں نے جو کچھ اس باب میں لکھا ہے اس کی کوئی نہ کوئی غائب دہر ہوگی۔ ویسے رشید حسن خاں صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ ”بارغ و بہار“ کا واقعہ ”نور طرز مرصع“ ہے۔ میر خسرو کا لکھا ہوا قصہ چہرہ وہ لکھن ”ایک زمانے سے مقبول رہا۔ عطا حسین خاں نے ”نور طرز مرصع“ کے نام سے اس کا ترجمہ کیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ۔

”یعنی یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ بارغ و بہار ترجمہ نہیں۔ میر اس نے اصلاً ”نور طرز مرصع“ کو سامنے رکھا ہے اور قصے کو اپنی زبان اور اپنے خاص انداز میں لکھا ہے۔ مذہب حقوق نگاری سے ترجمہ کیا ہوا داستان قصہ ہے۔ اسے سب نے ترجمہ ہی کہا ہے مگر اس ترجمے (یعنی مذہب عشق) کو سامنے رکھ کر پڑھ دیا فکر شمس نے اس داستان قصہ کو اختیار اور خاص قرار دیا۔ اظہار کے سانچے میں احوال کر پیش کیا ہے اور ان کی کتاب ”تھوڑا سا کونکری غصہ ترجمہ نہیں کیے گا، کسی نے کہا بھی نہیں ہے۔ اسے تعلیف کیا جاتا ہے اور وہ ہے بھی تعلیف۔“

”کنج قوئی“ میر اس کی دوسری کتاب ہے۔ عا حسین دہلوی کا عشق کی تعلیف ”عشقانی محسن“ کا بارہ ترجمہ ہے۔ پہلے پہلی یہ کتاب ۱۸۰۵ء میں کلکتہ سے ناگری لکھی میں شائع ہوئی۔ پھر پوری کتاب اردو رسم خط میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں جالیس ابواب ہیں جن کا مطلقاً اختلافات اور عبادت سے ہے۔

یہ کتاب ۱۸۰۶ء میں ”بارغ و بہار“ کے اختتام کے بعد میر اس نے لکھنی شروع کی۔ کتاب کے آخر میں ایک قطعہ ہے جو تاریخ فتح ثوہانی سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی سے اس کی تاریخ عشق ہے کہ کب مکمل ہوئی۔ ترجمہ یہ اس کا دلاہ ہے کہ میر اس کی فارسی پر کبھی قدرت تھی اور ان کی ستر کا عشق حرام کیا تھا۔ یہ صرف ”بارغ و بہار“ سے ہی نہیں بلکہ ”کنج قوئی“ سے بھی ظاہر ہے۔

میر بہادر علی حسینی

میر بہادر علی حسینی فوت ولیم کالج کے پرنسپل نے عہدے پر سر لڑا تھے۔ ان کی زندگی کے حالات اب بھی پندہ خطا میں ہیں۔ ویسے کہا جاتا ہے کہ یہ دینی کے رہنے والے تھے اور ان کی ذاتی میر اس سے تھی۔ ان کے آباء و اجداد کے بارے میں بعض کتابوں میں ہے کہ میں جزو دار قیاد اور ان کے اسلاف نے عہد مظہر میں ترک وطن کیا تھا اور ہندوستان آ گئے تھے۔ انہوں نے دلی کے داروگر راجا مسکن پایا تھا۔ لیکن بعض مصادر سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی زندگی کا جو حصہ بہار میں گزرا اور اس کے بعد دہلی میں لکھنے میں۔ منصور علی حسینی نے ”میر عشق“ میں لکھا ہے کہ۔

”جہاں میر صاحب قبلہ و کعبہ تھے وہی عظمی سید میر بہادر علی حسینی قرعہ کی کہ دینی تھائی اپنے غصے و کرم سے اس جہاں میں حرات و حرمت نکادے۔ ۱۸۰۱ء میں انٹرملہ ایلام میں وارد ہو کر پھینڈ پٹی لڑی و درسد میں سنجی بہادر کے کفر ترقی بددوی میں مرزا زہرا۔“

”فوت ولیم کالج میں ان کا تقرر ۱۸۰۶ء میں ہوا۔ محمد متین صدیقی نے اپنی کتاب ”میر کرم اور اس کا عہد“ میں اس کی وضاحت کی ہے کہ شیشوں میں جھنکی کا کام مرزا کرم سے تھا۔ وجود ترقی کا خیال ہے کہ ۱۸۰۳ء میں جب مکی کرم سے چلے گئے تو حسینی ملازمت سے الگ ہو گئے و ان کا انتقال ہو گیا۔“

جادو بہار نے روکے کا حوالہ دیتے ہوئے قلمبند کیا ہے کہ وہ دسمبر ۱۸۰۸ء میں کالج سے سکد مش ہو گئے لیکن یہ تمام باتیں اپنی جگہ پر ہیں۔ پھر بھی ان کی معینہ تاریخ وفات کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

حسینی کی تصانیف میں ”کتاب تلخیص“، ”اخلاق ہندی“، ”تاریخ آسام“، ”زر لکھن کرمست“ اور ”عقبات ہندی“ (دو ہند) ہیں۔ حراجہ انہوں نے قرآن کے ترجمے میں حسینی کی معادلت کی تھی۔ ”تاریخ تلخیص“ اشرفی خلاصہ ہے عمر العین کا۔ ”اخلاق ہندی“ ہندو پیدائش کے فارسی ترجمے پر مبنی ہے۔ ”ہندو پیدائش“ سنسکرت میں تھی یہ نقل تاج الدین کی فارسی کتاب ”مطرح القلوب“ کا ترجمہ ہے اور ”مفرح القلوب“ سنسکرت کی ”ہندو پیدائش“ کا ترجمہ ہے۔ یہ اخلاقیات کی اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کا مولف دشمن گہر کے ”قویاں ذہن“ سے کیا جاتا ہے۔ ”تاریخ آسام“ بھی شہاب الدین تاجش کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ ”دراکھل کرمست“ اور اصل مکی کرمست کی قواعد کا اردو خلاصہ ہے۔ ”تھلیا بند ہندی“ (۱۸۰۶ء) میں کہانیاں ہیں۔ غرض یہ کہ حسینی کا اردو کا اثر ہے کہ ان کی اہم اہمیت ہے۔

یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ افسوس نے "تذایب القزانی" کی ترتیب میں مصداق کی تھی اور مرزا رفیع سودا کو کلیات عرب کیا تھا۔ ان امور سے اندازہ ہوتا ہے کہ نثر کے ساتھ ساتھ شاعری سے ان کی دلچسپی کم نہ تھی۔ بحر بھی افسوس کو ادب میں مقام ایک نثر نگاری کی حیثیت سے ہے۔

حیدر بخش حیدری

(۱۷۶۸ء - ۱۸۴۳ء)

حیدر بخش حیدری ۱۷۶۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۸۴۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے والد کا نام سید ابو الحسن تھا۔ اوائل عربی میں حیدری کو سہاسی پریشانیاں بھگنی چیں، اس لئے کہ ان کے والد تقریباً بنگلہ دست تھے۔ وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ بنارس منتقل ہو گئے اور اس طرح حیدری کا دوسرا وطن بنارس ہو گیا۔ جب نواب علی گڑھ ایم خاں خلیل بنارس کی عدالت کے ناظم تھے۔ موصوف نے حیدری کی سرپرستی قبول کی اور ان کی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کیا۔ پہلے بیل روہ قاضی میر الرشید کے مدرسے میں تعلیم حاصل کرتے رہے پھر ان کے استاد مولوی تمام حسین قادری پوری ہو گئے جن سے انہوں نے فقہ وحدیث کا درس لیا اور علوم اسلامی کے سلسلے میں کسب فیض کیا۔ جب سید میر بخش حیدری تعلیم سے فارغ ہو گئے تو نواب علی گڑھ ناظم خاں نے انہیں دفتر عدالت میں ایک جگہ دے دی۔

حیدری کو ابتدا میں سے تصنیف و تالیف کا بڑا شوق و لائق تھا۔ انہوں نے "قصہ ہر واد" کے نام سے ایک کہانی تصنیف کی اور اسی کہانی کے ساتھ نکلنے چلے آئے۔ کمال کرسٹ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی کتاب انہیں دی۔ فلوکرسٹ ایک باوقوف آدمی تھے انہوں نے حیدری کی صلاحیتوں کو بوجھ لیا اور انہیں فن کی حیثیت سے کالج میں جگہ دے دی۔ جب اہلادبیت سے شکایت ہوئے تو بنارس واپس آ گئے، جہاں ان کا انتقال ہوا۔

حیدر بخش حیدری شاعر تھے لیکن ان کی دنیاوی دلچسپی نثر سے تھی۔ کئی مشہور کتابیں انہیں زمانہ و نکتے کے لئے کافی ہیں مثلاً "قصہ میر واد"، "لیلیٰ جملوں"، "مکاتب بیکر"، "تاریخ قادری"، "مکاشفہ جہا"، "توابع کہانی"، "آرائش محفل" اور "گل منظر"۔

"لیلیٰ جملوں" دراصل امیر خسرو کی عشق کی کاترجمہ ہے۔ "توابع کہانی" کی اصل قادری ہے۔ اس کا ایک قادری ترجمہ حیدری کے سامنے تھا جسے مشکرت سے مولانا ضیاء الدین بخش نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا اور قادری کا خلاصہ سید محمد قادری نے اعلیٰ تحریر میں لایا۔ حیدری نے اسی خلاصے کو اردو کا قاسب دے دیا لیکن یہ ترجمہ بہت مقبول ہے اور حیدری نے اسے محکمہ ہر واد ہے۔ "آرائش محفل" اصنافِ تم غانی کے فارسی قصے کا خلاصہ ہے۔ راجہ جوگ کاسی نام سے افسوس نے "آرائش محفل" بھی لکھے لیکن حیدری کی کتاب کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ وہ ترجمہ ہے جو حیدری نے لیا۔ ملا حسین رام نے کاشی

شیر علی افسوس

(۱۷۳۶ء - ۱۸۰۹ء)

میر بہادر علی تھنی کے بعد شیر علی افسوس ۱۸۰۸ء میں دوسرے مصر فنی مقرر ہوئے۔ ان کا پورا نام مصر شیر علی جعفری افسوس تھا۔ سید علی جعفر علی خاں کے بیٹے اور سید غلام مصطفیٰ کے پوتے تھے۔ ان کا نسب سید حضرت راقی سے ملتا ہے۔ افسوس کب پیدا ہوئے اس امر میں بڑا اختلاف ہے لیکن اندازاً آٹھ لاکھ پوری کے بعد دہلی منتقل ہوئے۔ ۱۸۳۶ء درج ہے۔ لیکن قلب علی غصہ فانی نے ان کی تاریخ پیدائش ۱۷۴۷ء متعین کی ہے۔ وہ نسب و نور و علم کا بیٹا سے دایستہ ہوئے اس وقت ان کی عمر ۶۵ سال کی تھی۔ ظاہر ہے ان کی یہ عمر اعلیٰ ہوئی تھی۔ نساخ کے تذکرے میں ہے کہ آخری ایام میں افسوس ملک میں نور و لہر کا بی کی میر فنی گری میں مقرر ہوئے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک نثر نگار تھے بلکہ شاعری میں بھی ان کو ملک تھا۔ انہوں نے میر حیدر علی جہاں اور مصر سوز سے اصلاح لی تھی۔ افسوس کی دو کتابیں بہت مشہور ہیں "آرائش محفل"، "میر واد"، "باغ ورو"، "آرائش محفل"، "کوشی بجان"، "جنت ارضی" کی فارسی کتاب "خلاصۃ النوار" کا ترجمہ سمجھا جاتا ہے لیکن بعض لوگ اس خیال کو رد کرتے ہیں۔ اس کی تکمیل ۱۸۰۵ء میں ہوئی۔ اس کتاب میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں کا حال تفصیل سے تصدیق کیا گیا ہے۔ ان کا طرز بیان ویسا کیونہیں ہے جو میر اس کی "باغ ورو" کا ہے لیکن اس میں ادبیت پائی جاتی ہے۔ سلاست اس کی خوبی ہے۔ عربی اور فارسی الفاظ سلاست سے استعمال کئے گئے ہیں۔

"باغ ورو" "سہری کی" "گشتان" کاترجمہ ہے اور یہ منظوم ترجمہ ہے۔ ایک تحریر "نوال رسم خط" بھی ہے۔ دراصل یہ گل کرسٹ کے دہالہ "رسم الخط" کا خلاصہ ہے۔ افسوس نے اپنا کلیات ۱۸۰۳ء میں مرتب کیا تھا۔ لیکن وہ ایک نثر نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ تذکروں میں ان کے حال سے تصدیق کئے گئے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان سے کلام میں میر، قائم، سوز اور سودا کا الگ الگ انداز ہے۔ انہوں نے پہلے میر سوز سے اصلاح لی پھر بعد میں جہاں کے شاگرد ہوئے۔ "ذبح ان افسوس" میں خراہوں کا انداز عداوت ہے۔ اس باب میں جاوید نبال لکھتے ہیں:-

"وہ ان افسوس کا پسیدہ عقلی نسخہ ۲۶۸، اور اسی پر مشتمل ہے۔ افسوس کا یہ بیان شائع ہوا تھا لیکن زمانہ و نکتہ میں۔ حتیٰ شعرا میں نساخ نے افسوس کے حال میں لکھا ہے کہ وہ افسوس ان کا نظریہ سے مزین ہے جس سے وہ بہت ہوتا ہے کہ افسوس کا یہ بیان شائع ہو چکا تھا کہ اس کے مطبوعہ حکام کی کوئی کافی شاخ ہی محتاج ہر کئے۔ افسوس کے وہ بیان کے چند خطی نسخے رہ گئے ہیں۔"

کا ترجمہ ہے، احمد مرزا احمدی کی کتاب "تاریخ" کا ترجمہ "تاریخ" ہے۔

اس کی اولیٰ نوعیت سے چھپتا ہے کہ سید حیدر علی حیدری کس حد تک ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کی زبان سلیس اور رواں ہے۔ احمد مرزا کا ترجمہ استعمال ہے۔ اس کے پیماں ملائی کٹائی بھی پائی جاتی ہے۔ مگر مگر حیدری میر اس کی دہائی کے رہے کو نہیں پہنچتے۔

کاظم علی جواں

مرزا کاظم علی جواں بھی فورٹ ولیم کالج سے تعلق رکھنے والوں میں ایک تھے۔ شاعر بھی تھے لیکن شاعری کی وجہ سے اہم سمجھے جاتے ہیں۔ اسلم قریشی کا بیان ہے کہ جواں اور مظہر علی خاں دو دونوں کا انتخاب نومبر ۱۸۰۰ء میں ہوا۔ انتخاب نکھو میں ہوا لیکن مرزا کاظم علی جواں ۱۸۰۱ء میں نکلتے آئے۔ پھر دوسرے ہی دن "گلستان" کے باب میں انہیں کام سپرد کیا گیا۔ واضح ہو کہ جواں ملازمت کی تلاش میں نکھو آئے تھے۔ کچھ دنوں تک عظیم آباد میں قیام کیا۔ کئی اسکات کی سفارش پر کالج کا منتفی مقرر کیا گیا۔ یاد یہ قابل گمان ہے کہ جواں کو اصل نام حسن علی خاں تھا لیکن اس نام سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ جواں کی پیدائش اور وفات کی تاریخوں پر اختلاف ہے لیکن ۱۸۰۲ء تک وہ پتہ نہ مل سکتے تھے۔ ان کا انتقال نکلتے ہی میں ہوا تھا۔ ایک اندازہ کے مطابق ۱۸۳۰ء اور ۱۸۳۵ء کے درمیان ہی ان کا انتقال ہوا۔ وہ نگارین دار نے نے فورٹ ولیم کالج کے بعض کاغذات کی بنیاد پر ان کی تاریخ وفات ۱۸۱۶ء بتھیں کی ہے۔

جواں کا قلم لحاظ شاعری کا رہا۔ "گلستان" تک ہے۔ جواں نے اس کے دیباچے میں بعض احوال رقم کئے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ مغل گرسٹ کی ہدایت پر ہی انہوں نے یہ کام کیا تھا۔ اس ناکامی کے سلسلے میں جاوید خیال کا یہ بیان قابل ذکر ہے:-

"گلستان" نامی شکر کے مشہور شاعر کا بی اس کی تصنیف ہے۔ شکر کے میں اس کا نام ابھی گمان شکل معلوم ہے۔ حال اس کے اسی دارے کو لاہور والی شہرت اور مقبولیت ہوئی ہے۔ جواں نے اس مقبول و معروف ڈرامہ کا ترجمہ شکر کے سے نہیں کیا۔ فرخ میر بادشاہ کے ایک لونی سردار موٹی خاں کی فرمائش پر نواز کشمیر نے برج کی زبان میں لکھا، جو بہت مقبول ہوا۔ نواز کشمیر نے ترجمہ بہت اور دو جوں میں کیا تھا، جس کا ترجمہ مرزا میں تھا۔ اس دشواری کا ذکر جواں نے خود کیا ہے:-

"گلستان" کا ترجمہ سلیس اور رواں ہے لیکن کہیں کہیں عبارت کو بھی بدلنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جواں کی

دوسری اہم کتاب "گلستان" تھی ہے۔ اس کے ترجمے میں اللہ وال بی نے معاونت کی تھی۔

جواں نے قرآن شریف کا ترجمہ بھی کیا تھا لیکن اس کی عبارت بہت زیادہ تھی اور تقریباً پہلو بھی لے ہوئے ہے۔ جواں نے "تاریخ قریش" کا بھی ترجمہ کرنا چاہا تھا، جو مکمل نہ ہو سکا۔ لیکن یہ بھی تاریخ کبھی کا ہی حصہ تھا۔ "تاریخ قریش" نہیں ہے۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ جواں شاعر بھی تھے اور انہیں اس پر فخر بھی تھا لیکن ان کا واحد شعری سرمایہ "پروا" ہے۔ "پروا" ہے۔ یہ نہیں چلتا کہ انہوں نے اپنی شاعری کا کوئی دیوان مرتب کیا تھا یا نہیں۔ جواں نے میرا دوست کے کام کا انتخاب بھی مرتب کیا تھا۔

مظہر علی ولا

(۱۷۶۱ء - ۱۸۱۶ء)

یہ کام مرزا مظہر علی الخاں مظہر علی خاں ولا ہے۔ یہ مظہر علی خاں کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا شمار دلی کے شرف میں ہوا تھا۔ ان کے والد عیسا علی خاں ولا مرزا اور بیوی سودا کے استاد بھی رہے تھے۔ دود نے بھی ان کی شاعری اختیار کی تھی۔

ولا کی تاریخ پیدائش یقیناً نہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۷۶۱ء کے قریب دلی میں پیدا ہوئے۔ والد کی وفات پر سیف الدین بخشی الکتب ملت کلی خاں بہار، مظہر جنگ کی وفات میں آئے اور بہت دنوں تک ان کے ساتھ رہے۔ پھر مرزا جواں علی خاں ولا شاد کی سرکار سے وابستہ ہوئے۔ لیکن وہاں کی چشمکوں سے عاجز آکر ۱۷۸۰ء میں نکھو آئے۔ پھر ان کی ملاقات آصف الدولہ کے مشیر راجا لکھنہ رائے سے ہوئی اور ان کی وساطت سے نواب احمد اللہ کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ آخر میں انہیں کئی اسکات کی مدد سے فورٹ ولیم کالج میں جگہ ملی اور نومبر ۱۸۰۰ء میں وہاں کے فنی ہو گئے۔ ان کی وفات ۱۸۱۶ء میں ہوئی۔

ولا کی تصانیف میں جملہ محققین "امام احمدی اور کام نکلتا" "تاریخ لکھنوی"، "جہانگیر شاہی"، "ترجمہ چہارم محکم" اور "تاریخ شیر شاہی" ہیں۔ ان میں سے پہلی دو کی ندرت کم ہے۔ "تاریخ لکھنوی" کی ندرت کم ہے۔ یہ تصانیف کی کتاب ہے۔ سال تصنیف ۱۸۰۱ء ہے۔ "امام احمدی اور کام نکلتا" ۱۸۰۱ء میں برج بھاشا سے ترجمہ ہوئی۔ اس کا ایک حصہ مغل گرسٹ نے "جہانگیر شاہی" میں بھی چھاپا تھا۔ "جہانگیر شاہی" کا قصہ راجہ بکر راجہ کے زمانے میں شکر کے میں لکھا گیا تھا، پھر برج بھاشا میں ترجمہ ہوا تھا۔ ولا نے برج کی زبان میں اردو میں ترجمہ کیا تھا اور اس ترجمے میں اللہ وال بی نے معاونت کی تھی۔ فارسی و قبل نامہ جہانگیر کی کا ترجمہ ہے۔ "ترجمہ چہارم محکم" شیخ سعدی کے چند سے کا ترجمہ ہے اور یہ ترجمہ معلوم ہے۔ سال ۱۸۰۲ء میں "پروا" کی جلد دوم کے ساتھ شائع کیا گیا تھا۔ "تاریخ شیر شاہی"

اور اصل "تخت اکبر شاهی" کے تیسرے خطبے کا دور تو یہ ہے۔ اس میں دبداد شاہ و شیر شاہ اور بھائیوں کے عہد کے واقعات قلمبند کئے گئے ہیں۔

ولہا کی ایک شاعرانہ حیثیت بھی ہے۔ ان کا کلام کسی ایک صنف میں بند نہیں۔ "دیوان ولہا" کی تدوین ۱۸۱۰ء میں ہوئی تھی۔ لیکن ولہا کی دہریگی میں یہ دیوان شائع نہ ہوا۔ لاکڑ عبادت بریلو کے اے پاکستان سے شائع کیا ہے۔

للولال جی

(۱۷۶۲ء - ۱۸۲۳ء)

انکا پورا نام للولال جی کوئی تھا۔ ان کا سن دلاوت ۱۷۶۲ء کے آس پاس بتایا جاتا ہے۔ اسے سوام چندر سنگھ نے اپنی کتاب "ہندی ساریتہ کا ایتھس" میں ان کی تاریخ پیدائش ۱۷۶۳ء لکھی ہے۔ لاکڑ جی ساگر وار شیعے نے ۱۷۴۷ء متعین کیا ہے۔ یہ شیعہ بھاکھا کے میرٹھی تھے اور انکا تقریر ۱۸۰۲ء میں ہوا تھا۔ ارارٹنے کے مطابق یہ ۱۸۲۳ء تک کالج سے وابستہ رہے۔

للولال جی کی اہمیت جدید ہندی نثر کی وجہ سے ہے۔ لیکن انہوں نے بعض کتابیں اردو میں دوسروں کے اشتراک سے لکھیں یا آزادانہ طور پر بھی۔

ان کا ایک کتاب "الفاظ ہندی" ہے۔ یہ کتاب اردو اور ہندی دونوں خطوں میں شائع ہوئی۔ اس میں ایک سو ساکتیں ہیں۔ برٹن بھاشا کے قواعد کی ایک کتاب اردو میں ہے جو ۱۸۱۱ء میں شائع ہوئی۔ ان کی دوسری کتابیں "پیرم ساگر" "لال چندر کا" "راج جی" "بھوہ اس" "نیرہ چن"۔ لیکن یہ سب ہندی میں ہیں۔ چند کتابوں کی تالیف کرتے ہیں دوسرے اردو میں کے ساتھ انہوں نے معاونت کی۔ دو کتابیں ہیں "چالی بھجوری" "لکھنوا" "سبھا سنجی" "ادھول" اور "تھلیا اترائی"۔

نہال چند لاہوری

نہال چند لاہوری کی پیدائش دہلی میں ہوئی تھی۔ لیکن کل کرست ان کا وطن بارہوت تھا۔ یہ پندرہ سال کی عمر میں لاہور ہجرت کر گئے۔ لیکن وہ ہے کہ انہیں لاہوری کہتے ہیں۔ وہ ۱۸۰۲ء میں ٹکٹہ آئے۔ ڈاکٹر گل کرست نے انہیں فورٹ ولیم کالج میں عازمت دے دی۔

ہندوستانی لوگ کہتے ہیں "میں بکوالی" کی ایک اہمیت ہے۔ اس کی شہرت و مقبولیت بھی یہی ہے۔ اسے

حضرت اللہ علیہ السلام نے قرآن میں بھی لکھا تھا۔ لاہوری نے اس کا ترجمہ اردو میں کر دیا اور اس کا نام "مذہب عشق" رکھا۔ واضح ہو کہ "گلزار نسیم" چندے دیا نظر نسیم میں بھی "مذہب عشق" مشکوئی میں لکھا ہوا ہے۔ لاہوری کی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ انہیں اس کتاب پر ایک سو پچاس (۱۵۰) روپے انعام بھی دیا تھا۔ اس کی زبان اہل اور دواں ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۸۱۳ء ہے۔

نہال چند لاہوری کب پیدا ہوئے اور ان کا انتقال کب ہوا، تفصیل نہیں ملتی۔

شیخ حفیظ الدین

مولوی حفیظ الدین فورٹ ولیم کالج کے ممتاز مصنفین میں ایک ہیں۔ ان کے والد کا نام شیخ جمال الدین تھا اور دادا محمد اکبر تھے۔ ان کے خاندان کے احوال میں یہ ہے کہ ان کے جد اچھی حرب سے ترک وطن کر کے حیدر آباد آئے۔ لیکن ان کے پروردگار شیخ حسن نے حیدر آباد سے تعلق ہو کر بنگال کا ایک مشہور بنایا۔ گوڑہ کا علاقہ انہیں بھولا بھلا۔

حفیظ الدین کے والد شیخ بدل الدین ایک علمی علم آدمی تھے۔ انہیں مدرسہ عالیہ کاندھل میں درس کی حیثیت حاصل تھی۔ حفیظ الدین نے بھی یہیں تعلیم حاصل کی تھی اور عربی قرآن میں کامل دستگاہی ادارے سے انہیں حاصل ہوئی تھی۔

ذہب تعلیم سے فارغ ہوئے تو ۱۸۰۳ء میں فورٹ ولیم کالج میں لادری کے مدرسہ ہوئے اور انہیں چالیس (۴۰) روپے ماہیہ کرکھواٹے ملے۔ انہوں نے ابو الفضل کی کتاب "عیان افش" کا اردو میں ترجمہ کیا اور اسے ٹھکر سٹ کر پیش کیا۔ عیاں ٹھکر سٹ نے "عیان افش" کو کالج کونسل کے سربراہ کی ایک خط لکھ کر انعام کی سفارش کی۔ اس خط کے چند خطوط میں صراحت ہے۔

"میں انجائی مسرت کے ساتھ ایک مندرجہ ذیل اور مشہور کتاب "عیان افش" کا ہندوستانی

ترجمہ کالج کونسل کے ملاحظہ کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ فارسی شیعہ کے مولوی حفیظ الدین نے

اس کا ترجمہ کیا ہے۔ مزہم کی درخواست انہیں احوال کے لئے کافی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ

اسے اچھے کام کے لئے کونسل انہیں انعام ضرور دے گی۔"

مگر کرست نے اس کا بھی اظہار کیا تھا کہ اگر حفیظ الدین کی یہ سہ افزائی دہلی تو ذرا لطف لیل "کا بھی ترجمہ کریں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ "عیان افش" پر چھ سو روپے کا انعام ملا۔ اس کا پتہ نہیں جاتا کہ حفیظ الدین فورٹ ولیم کالج سے کب سکونش ہوئے لیکن وہ ۱۸۱۵ء میں دہلی میں موجود تھے اور پندرہ سو روپے تکٹہ کے لکھی تھے۔ ڈاکٹر سنجی لکھتے ہیں کہ ان بیان سے پتہ چلتا ہے کہ کالج کے ان کا تعلق ۱۸۱۵ء سے قبل متعلق ہو چکا تھا۔

"عیان افش" کے علاوہ کوئی دوسری تصنیف دیکھ کر حفیظ الدین کی یادگار جو سامنے نہیں آئی۔ لیکن "عیان

والفعل "زندہ" ہے اور اس طرح ان کا نام بھی مولوی حفیظ الدین نے اس کا ترجمہ ۱۹۰۳ء میں مکمل کیا۔ "حیدر والفعل" "الکھیا دوسرا" کا ترجمہ ہے جسے فارسی میں ملا حسین آباد کا مکتبہ اشرف نے لکھا، جو "انوار السیاق" کے نام سے مشہور ہوئی۔ "عز وافر" اسی کا ترجمہ ہے، جو ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد اس کتاب کی دوبارہ بھی ترتیب سامنے آئی لیکن یہی ترتیب دینے والے غلام اکبر مرزا کی جگہ غلام قادر لارستانی سینہ کاظم علی تھے۔ ایک ایسا حتمہ بھی سامنے آیا اور اس مقدمے کے ساتھ یہ کتاب ۱۹۱۵ء میں دوبارہ شائع ہوئی۔

 $(\rightarrow \text{IAF})$

نبی تارائن کا اصل نام رائے نبی تارائن تھا۔ ان کے والد مسودت تارائن تھے اور دادا بھی تارائن۔ مسعود
محققین نے اس کا اہتیار کیا ہے کہ نبی تارائن کا نقلش فوت اکرم کالج سے تھا۔ لیکن جدید ترین تحقیق یہ بتاتی ہے کہ وہ اس
کالج سے کبھی وابستہ نہیں رہے تھے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی لکھتے ہیں کہ:-

”کالج سے باقاعدہ نو مسلم کی طرف کوئی مبہم اشارہ بھی کیا جو اس بات کی قوی دلیل ہے کہ وہ کسی وقت بھی کالج کے کارڈ میں سے نہیں نکال دیا جائے گا۔“

ایک اور مسئلہ میں خلیفہ نقوی کی تحقیق اچھلی اچھلی اہم ہے:-

”ایک اور غلط فہمی جو زیادہ عام اور مقبول ہے وہ یہ کہ نئی نثر ان کے شاعر بھی تھے اور جہاں انھیں کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نئی نثر ان کے ”دیوان جہاں“ کا بڑا چمک نظم میں لکھا ہے اور دوسری تصانیف میں بھی موقع بہ موقع طبعی زو اور شعرا شامل کئے ہیں، لیکن نثر انہوں نے ”دیوان جہاں“ میں خود کو شاعر متعارف کرا کے شعر گوئی سے اپنے شغف کی نگاہ ہی کی ہے اور نہ کسی دوسرے عنصر کے ذریعے سے ان کا بڑا چمک شعر کہنا ثابت کیا ہے۔ اس طرح یہ بات بھی بے ثبوت کہیں پہنچتی کہ وہ جہاں انھیں کرتے تھے۔ ”دیوان جہاں“ کے دیباچے میں انھوں نے آخری سے پہلے شعر میں اپنے ہمکن نام ہی کو بطور نظم پیش کیا ہے۔ یہی مقطع بعینہ ”ہمارے عشق“ کے دیباچے میں بھی شامل ہے۔ کسی دیگر مجبوری کے بغیر انھیں کی موجودگی میں ہم کے استعمال کی کوئی مستول توجہ نہیں کی جاسکتی۔“

یہ بات بھی شاہ جلالؒ کو آخری عمر میں حضرت امیر اہل تشیع کی تحریک سے متاثر ہوئے اور اسلام قبول کر لیا۔

لیکن یہ تو اس بات پر مبنی ہے، اصل ان کی تعریفیں ہیں جن کی اہمیت ہے۔ اس کا تعاقب میں "چار ٹکٹوں" کا "مجموعہ" ہے۔

”ایوان جہاں“، ”آفتاب طبعی“، ”نوبہار“، ”بارغ عشق“ اور ”حبیباۃ الخلیلین“ ہیں۔ جن کی اہمیت سے کسی کو بھی اندازہ نہیں۔
 ”چاند کھن“ ایک نوجوان تصنیف ہے۔ یہ قصہ ہے جو پڑا بھی ہے۔ اس تصنیف پر جن میں انعام بھی ملا۔ ”بہار عشق“
 بقول حنیف نقوی ۱۸۸ کی تصنیف ہے۔ شاید یہ داستان ہے لیکن اس کا کوئی نسخہ ابھی تک دریافت نہ ہو سکا۔ ”نگار حسن“
 بھی ایک داستان ہے۔ اس میں یوسف و زلیخا کا قصہ بیان ہوا ہے۔ ”ایوان جہاں“ کسب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اس
 لئے کہ یہ تذکرہ ہے لیکن اصلاً یہ مختصر کوشش ہے۔ اس میں بلائے اختصار سے ۱۲۹ شعرا کے کام کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ”آفتاب طبعی“ کا ایک ہی نسخہ ہے جو حنیف نقوی کی ملکیت ہے۔ اس میں کچھ ابتدائی قصص اور قصائد نقل ہیں۔ ”نوبہار“ فارسی میں
 منظر کا ترجمہ ہے۔ ”بارغ عشق“ انیسویں صحت کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کا ایک ہی نسخہ ہے جو انجمن ترقی اردو ملی میں ہے۔

مواہد شاور فیع العرب کی فارسی تعریف ”تجلیہ اللہ للعلوم“ کا نقل اردو ترجمہ ہے۔ اسی کتاب نے یہ جملہ بھی پیدا کی ہے کہ جیسا کہ ان مسلمان ہو گئے تھے۔

نئی پٹائی کا استعمال ۱۹۷۵ء میں ہوا تھا۔ یہ تاریخ سید محمد نے تاریخ کی ہے۔

مرزا علی الحنفی

 $(\text{GMAFF} = 1244)$

مرزا آصف کی برادری کا جو بیٹا تھا اس کے مطابق ۱۶۹۰ء اور ۱۶۹۳ء کے درمیان بولی میں ہوئی۔ مرزا اہل لطف کے والد کا نظریہ ایک خاں تھا جو استراہاد کے رہنے والے تھے۔ زور شاہ کے ساتھ ۱۶۱۲ء میں ہندوستان آئے اور کئی مقامات پر گئے۔ ان کی تعلیم دینی میں ہوئی۔ انہیں ادب کا بڑا ذوق تھا۔ اسی سبب سے ان کے کرسٹ انجیل نوٹ و لہجہ بولی کے مصنفین کی صف میں آئے۔ لیکن تین صدیوں کے بعد ان کے لکھے ہوئے خطوں کی صف میں جگہ دینی ہے۔ *** انہیں شعرا کے اور لوگوں کا ذکر و تحریہ دیکھنا کا کھوسا تھا۔ لطف نے ابراہیم خاں کے ”تذکرہ نگار ابراہیم“ کو سامنے رکھا اور اس میں اچھے طرح کالی افسانے کے پھر اس کا نام ”گھٹن ہند“ رکھا۔ واضح ہو کہ تذکرہ ”گھٹن ہند“ ایک عربی کتاب اہل ادب کی نگاروں سے جو اہل رہا، لیکن ایک حادثے نے کالی بلی پلٹ دی۔ حیدرآباد کی مولوی نوری حسن طوفان بہا ہوا۔ کافی ٹکھنا ہوتے ہوئے، لیکن نامعلوم کسی ”گھٹن ہند“ کی ایک جلد سیلاب میں بہتی ہوئی ایک جگہ آئی اور ایک صاحب نے حکمت ہوئی۔ بعد میں مولوی حیدر الحق نے اسے تصدیق و اہتمام سے مرعوب کیا۔ پھر اس تذکرے کو انجمن ترقی اہل ہند نے شائع کر دیا۔

الحکم کی ایک حقیقت ثمار کی بھی جیسے انہوں نے اپنا ایمان بھی مرتب کیا تھا۔ شیفت نے اپنے تذکرہ ”گلشنِ سلسلہ“

• بحوالہ اکثر صحیح ہے۔ "توریت" = "الحکم کا نکتہ": ایک مطالعہ، ۱۹۷۱ء، ص ۱۷۱

[illegible]

محمد اکرام علی کی ولادت عیدہ حکم کے قول کے مطابق ۱۸۷۲ء یا ۱۸۷۳ء میں ہوئی۔ تین نام ہیں: مولیٰ، سائیں ولادت ۱۸۷۵ء اور رخ کرتے ہیں۔

اکرام علی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ جب بیس چھ ہی تھے کہ ان کے والد مفلوج ہو گئے۔ اب ان کی پرورش بچانے کرنی شروع کی۔ تعلیم نے جب فراغت ہوئی تو ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم ہو گئے اور فزٹ و لیم کالج کے قیام کے بعد ان کی ملازمت وہیں منتقل ہوئی۔ چار چھ سال کتب خانے میں ان کی ملازمت کا زمانہ ۱۸۹۶ء قرار دیتے ہیں جبکہ رام پور سکینہ ۱۸۹۳ء مقرر کرتے ہیں۔ اکرام علی نے ۱۸۹۱ء میں ایک اردو اخبار بھی جاری کیا تھا لیکن اس بارے میں مزید معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ کالج کی ملازمت میں موصوف ترقی کرتے گئے اور ممدو العبدور ہو گئے۔

مولوی اکرام علی کی شہرت ان کی کتاب "اخوان الصفا" کی وجہ سے ہے۔ اس میں اکیاون (۹۱) رسائل ہیں۔ یہ اصل چوتھی صدی ہجری کی تصنیف ہے اور عربی میں ہے جسے موصوف نے اردو میں منتقل کیا۔ یہ تقریباً ۱۸۱۱ء میں سامنے آیا۔ پیچھے علی اس کی چھاپائی ہوئی اور یہ کتاب نصاب میں داخل کر دی گئی۔ اس کتاب میں حیوان اور انسان کی برتری کے بعض سوالات جنوں کے بادشاہ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں۔ دراصل جانوروں کے ساتھ انسان کا جبر و ملالاد رویہ رہا۔ یہ اس کے خلاف پر مقدم ہے۔ ہر جانور اپنا بیان دیتا ہے۔ بعد میں ڈاکٹر دہریس نے اس کا ترجمہ مکمل کیا۔ لیکن یہ ترجمہ کچھ مشکل تھا چونکہ کچھ کچھ ٹکڑے قریباً پیش پر اکرام علی نے اس کی تصحیح کی اور زبان کو سوار اور نکھارا۔

مولوی اکرام علی کی دوسری کتابوں میں "مستطین اسلام" کی بھی اہمیت ہے۔ اس کتاب میں بارہ سو سال کے مستطین اسلام کے حالات درج ہیں۔

مرزا جان پیش

(۱۷۶۹ء - ۱۸۱۷ء)

ان کا پورا نام محمد علی خان ہے مگر مرزا جان سے مشہور ہوئے۔ شاعر تھے اور پیش نظمیں کرتے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۷۶۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ بھول ڈاکٹر ظہیر مرزا جان پیش ۱۷۶۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۵۵ سال چار چھ سال ان کی پیدائش ۱۷۶۹-۱۷۷۰ء کے درمیان آتے ہیں۔ قاضی عبدالودود کے مطابق ان کا انتقال ۱۸۱۷ء میں ہوا۔ اور انہیں گھر کے ان کی وفات ۱۸۱۷ء میں تعین کی ہے۔ ساری زندگی دہلی میں رہے اور ملا سے ان کی محبت رہی۔ زبانوں کے جانے اور سمجھنے کا انہیں بڑا شوق تھا۔ عربی اور سنسکرت زبانیں دیکھیں۔ ملافت پر بھی نظر تھی۔ پیش نوید میر درد کے شاگرد تھے۔ اس کے علاوہ انہیں ساعلی اور دہلیت اللہ خاں کی شاگردی کا بھی شرف حاصل تھا۔ مرزا جان پیش جہاں

میں انہیں میر کا شاگرد بنایا۔ لیکن تبارک اس کی تردید کرتے ہیں۔

ظہیر نے غزلیں بھی کہیں اور دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔ لیکن بحیثیت شاعر انہیں کوئی امتیاز حاصل نہیں ہوا۔ اس باب میں دوسرے امور کے ساتھ ڈاکٹر سراج الدین کی تفصیل ملاحظہ ہو:-

"ظہیر نے اپنا دواں بھی مرتب کیا تھا۔ جس میں غزلوں کے علاوہ دوسری اصناف سخن کے نمونے بھی شامل تھے۔ لیکن شاعر کی حیثیت سے انہیں کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہیں۔

تجفیں بعد ان کی واحد تصنیف ہے۔ برٹش راولپنڈی ہفت روزہ نظر سے اہمیت رکھتی ہے اور جس کی بدولت تاریخ ادب میں آج بھی ان کا ذکر قائم ہے۔ علی ابراہیم خاں کے مشہور ترجمے "مکرم اور ابراہیم

کا اردو ترجمہ" ۱۲۱۵ء مطابق ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوا۔ ظہیر نے بھول خود اس کام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ پہلی جلد "سلاطین بادشاہ" امرائے عالی وقار اور شعرائے صاحب وقار کے

لئے جوڑم آور اور مصاحب و یار ان تھے۔ مخصوص کی جگہ تھی اور دوسری جلد میں اشعارے مکناں و غیرہ و "شعری" کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب اس تذکرے کی صرف پہلی جلد دستیاب ہے۔ دوسری جلد

کا تاحال کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے۔ یہ جلد اول صرف (۶۸) شعروں کے ذکر پر مشتمل ہے۔ ظہیر نے اس میں علی ابراہیم خاں کے قرائم کرد و حلاصت اور کلام دونوں پر اہم

اضافے کئے ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰۶ء میں انہیں ترقی اور دہلی کی جانب سے مولانا غیاثی کی تصحیح اور مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ لاہور سے شائع ہوا تھا۔ دوسری مرتبہ ڈاکٹر علی

الدین قادری لاہور نے اسے مکران ابراہیم کے ساتھ ۱۹۳۳ء میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس سے چھپ کر شائع کیا۔"

محمد اکرام علی

(۱۷۷۵ء -)

مولوی محمد اکرام علی کے مورث اعلیٰ کا وطن کامل تھا لیکن ان کے ایک بزرگ شیخ کمال الدین سلیمان ترکہ وطن کر کے دہلی آئے اور یہیں سکونت پر رہے۔ ان کے بزرگوں میں شیخ جمال الدین سلیمان کا شیخ مشہور ہوئے جو بھول تھیں احمد صہبائی باغ فرید ولدین کے والد ماجد تھے۔ وہ جہاں میں اسی خاندان کے ایک فرد شیخ محمد رحیم جیتا پور آئے۔ محمد اکرام علی کا سلسلہ نسب اسی خاندان سے ہے۔ دینے نام جیتا پور کی ان کا شجرہ حضرت عمر فاروق سے وابستہ کرتے ہیں۔

دارشاد کے درباریوں میں بھی تھے۔ لیکن یہ انہیں مری کی بات ہے۔ جب جہاں دارشاد کا انتقال ہو گیا تو وہی سے منتقل ہو کر ڈھاکہ گئے۔ نواب سید احمد علی خاں کے معاصرت میں گئے، پھر کلکتہ آئے۔ یہاں فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوئے۔ مرزا جان بخش کے سپرد یہ کام تھا کہ ترتیب دی ہوئی کتابوں پر نظر ثانی کریں لیکن انہوں نے ”بہار دانش“ کے نام سے فارسی قصے کو اردو میں نظم کیا۔ ان کی ایک کتاب ”مفسر البیان فی مصطلحات ہندوستان“ ہے جو ۱۸۳۹ء میں فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔

مولوی امامت اللہ شیدا

(۱۸۳۶ء۔)

مولوی امامت اللہ کا تعلق شیدا تھا۔ ان کے حالات کی خبر نہیں۔ جن بھی نہیں معلوم۔ فورٹ ولیم کالج سے وابستہ نہ ہونے تو ان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہوتا۔ ۱۸۵۰ء میں انہوں نے ”اخلاق جلالی“ کا اردو ترجمہ کیا اور نام رکھا ”جامع اخلاق“۔ انہوں نے تو اسے صرف ڈھکوارہ نظم کا چاند چھپا یا۔ یہ کتاب بھی ۱۸۵۰ء میں منظرِ معلوم ہوئی۔ اس کا نام ”ہدایت الاسلام“ رکھا۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے قرآن شریف کا بھی اردو ترجمہ کیا تھا۔

شیدائے ”تعلیمات القرآن“ کے لئے کمانڈوں کے ترجمے اور ترتیب میں معاونت کی۔ شیدامری وفاداری کے جید عالم سمجھے جاتے تھے۔ جس طرح بھی تھے اور ان کا تعلق شیدا تھا۔ ان کا خاندان لدھیانہ سے تھرتھرت کر کے کلکتہ آ گیا۔ شیدائے نہیں کے مدرسہ عالیہ سے تعلیم حاصل کی۔ پھر ان کے علم و فضل کی اتنی شہرت ہوئی کہ وہ فورٹ ولیم کالج کی ملازمت میں آ گئے اور شعبہ ہندوستانی سے وابستہ ہو گئے۔ ان کی مشیت ایک مترجم کی تھی۔ ۱۸۳۶ء میں کلکتہ میں انتقال ہوا۔ ان کی مندرجہ ذیل کتابیں معروف ہیں:

”ہدایت الاسلام“ (دجلہ) یہ مصنف ہی کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں اسلام کے احکام و قوانین ہیں۔ اس کی ایک ہی جلد شائع ہوئی تھی۔ دوسری جلد شائع نہیں ہو سکی۔

دوسری کتاب ”جامع اخلاق“ ہے۔ دراصل یہ مولانا جلال الدین خلیق دہلوی کی ”اخلاق جلالی“ کا ترجمہ و تالیف ہے۔ یہ کلکتہ سے شائع ہوئی۔

ایک اور کتاب صرف بحقوق اللہ کے موضوع پر ہے۔ لیکن نظم میں ہے۔ یہ کتابیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں، جن کی وجہ سے شیدائی اولیاد میں ایک جگہ ہے۔

شیدائے کا عمر علی جواس کے شعر اک سے قرآن شریف کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا۔ اس کے علاوہ ”تعلیمات القرآن“

حمید الدین بہاری

پورا نام حمید الدین بہاری ہے۔ ان کا تعلق صوبہ بہار سے تھا۔ گل کرسٹ کے وقت ہی میں وہ فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوئے۔ انہیں کی تاریخ ۱۹ اگست ۱۸۵۳ء کی جاتی ہے۔ انہوں نے ”خوان الہام“ کے نام سے دعائیہ سہ فہرست پر مشتمل ایک کتاب لکھی۔ اسی کتاب کی وجہ سے یہ معروف ہوا۔ اس میں کہنا چاہئے کہ انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ کتاب چوبیس (۶۴) ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کو ایک خواں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ طعام خانہ کے باب میں ”مطلبات“ بھی ہیں، یہ آخری باب ہے۔ ایک فرہنگ بھی اس کتاب کا جزو ہے۔ شاید یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہو سکی ہے، لیکن میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا ہوں۔ اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔

مرزا محمد فطرت

مرزا محمد فطرت کا نام مرزا محمد تھا اور تعلق طبرٹ کرتے تھے۔ ان کا وطن بھولہ تھا۔ اس زمانے کی ایک کتاب سر جان مرلے ہیڈ نے لکھی ”توقدیر اور ترقی“ انہوں نے اس پر نظر ثانی کی۔ یہ کتاب ۱۸۵۲ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اس میں ہندوستان کے دین کن کے بارے میں کچھ معلومات درج ہیں۔ لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے ولیم جیکب کے اشعار اک سے ”انگل“ کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کے دو ایڈیشن ۱۸۵۵ء اور ۱۸۶۳ء میں شائع ہوئے۔ فطرت نے اس ترجمہ میں ایک پارہ لکھا تھا کہ وہ لدھیانہ تھی۔ فطرت نے جیسا بھی ترجمہ کیا تھا اس سے بعد میں مسلسل اشتقاق کیا جا رہا ہے۔

تاریخی چمن مترا

(۱۸۶۲ء۔ ۱۸۳۷ء)

مترافورت ولیم کالج سے ۲۱ برسوں تک وابستہ رہے۔ ان کی ولادت ۱۸۳۷ء میں ملتان میں ایک گاؤں میں ہوئی تھی۔ ان کے بزرگوار پارسیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں عربی فارسی پر خاصی دوسری تھی۔ اردو زبان پر بھی کامل عبور تھا۔ جب میر تقی میر افسوس کا انتقال ہو گیا تو جن کے چاہنے ہوئے۔ ایک زمانے تک انہیں فراموش کیا گیا لیکن آہستہ آہستہ انہیں یاد کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ مترا کی اہم ترین ”تعلیمات القرآن“ بھی جاتی ہے، جسے فارسی اور اردو دونوں کے علاوہ درج ذیل میں بھی شائع کیا گیا تھا۔ گل کرسٹ نے اس پر ایک مقدمہ لکھا تھا۔ ”تعلیمات القرآن“ انہوں نے ۱۸۵۱ء میں مکمل ہوئی تھی لیکن ایک سال بعد شائع ہوئی۔ اس میں ایک حواشیہ (۱۰۸) حکایتیں ہیں جن میں خدائی کا ایک شعر

ہے۔ اسی بنا پر اس کا سرائے "گلستانِ ہمدی" "بہارستانِ جامی" اور "قدوس نامہ" وغیرہ سے کیا جاتا ہے۔ زبان سبیل اور ہائیم ہے۔ ایک دوسری کتاب "پادشہ کیچکا" ہے۔ یہ بھی ایک ترجمہ ہے اور مستحکم سے ہے۔ یہ اخلاقی کہانیاں پر مشتمل ہے۔ تاریخی چرن سترانے کچھ روک کی کتاب کھڑی ہو لی کی کہانیوں کو مکمل کیا تھا اور گیان چند کے مطابق "نکایتِ شکت آواز" (دو جلد) بھی تھکبند کی تھی۔ اس کے علاوہ سرسوف نے ایک کتاب "خلاصۃ الحساب" لکھی۔ یہ بھی فارسی کی تھکبند کا ترجمہ ہے جس کے مصنف روشن علی انصاری جو پوری تھے ایک اور کتاب "مکملۃ اربعین" ہے۔ یہ ہمدی کی اصل کتاب ہے، جو پنجویں درجے کے بچوں کے لئے تریب دی گئی۔ ایک اور کتاب کھڑی ہو لی کی کہانیوں نے متعلق انہوں نے مکمل کی۔ دراصل اسے پہلے روکب نے تریب دیے اور شروع کیا تھا لیکن ان کا انتقال ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تاریخی چرن کا کچھ کے علاوہ دوسرے امور سے بھی دلچسپی لیتے رہے اس ضمن میں ڈاکٹر مسیح احمد لکھتے ہیں:-

"لیکن تاریخی رجحان بھلا چارہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۳۳ء میں دو کاشی کے کثرت تھے۔ ظاہر ہے کہ ۳۱-۱۸۳۶ء میں کاشی آئے وقت انہوں نے وکول یک سوسا کی سے مستحق دے دیا ہو گا، کیوں کہ اس زمانے میں کسی انجمن یا سوسا کی کے سکریٹری کے لئے اس طرح میں مستقل حکومت اور ضروری تھی، جہاں اس کا دفتر ہوتا تھا۔ ۱۸۳۷ء میں کاشی میں تاریخی چرن ستر کا انتقال ہو گیا۔"



سرسید اور ان کا عہد

یوں تو سرسید کے جدید تعلیمی رویے کی تحریک سے اس عہد کے دانشور عام طور سے ان کی حمایت کر رہے تھے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ ان کی دینی اور مغربی فکر کے درمیان مسلسل ان سے برسرِ پیکار تھے۔ جن لوگوں نے ان کی ہمدانی کی ان میں کچھ خاص کے نام بیٹ کے لئے یاد رکھے جاسکتے ہیں جیسے شاہنواب حسن الملک، مولوی چوان علی بٹلی نعمانی اور الطاف حسین حالی وغیرہ۔ ان مسکوں کی فکر اس مسئلے کے دوسروں کی تھیں آگے آئی ہے۔

سرسید احمد خاں

(۱۸۱۷ء — ۱۸۹۸ء)

سرسید احمد خاں کی پیدائش ۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء میں دہلی میں ہوئی۔ ان کا شجرہ نسب امام تقی علیہ السلام سے وابستہ ہے۔ ان کے والد کا نام سید مفتی تھا۔ ان کے دادا سید اوی شاہ عالم پادشاہ کے شاہی لشکر تھے اور وہ اکبر شاہ خانی کے وزیر تھے۔ سب کے سب صوفی اور بزرگ تھے۔ سرسید کی تائید ان کا تعلق دل امی خاندان سے تھا، جن کے پیر شاہ خاں علی نے ان کا نام احمد تجویز کیا۔ ان کے ایک بڑے بھائی کا نام محمد رکنا جاچکا تھا۔ چار سال کی عمر میں ہمدان کی رسم ادا کی گئی۔ ان کا بچہ را خاندان مذہبی تھا۔ سید احمد کی پرورش و پرورش میں اس ماحول کا خاص اثر تھا۔ ابتدا میں سید احمد کی دیکھ

کئی تاسکس پر حکام کی نگاہ پڑے۔ دلچسپ بات ہے کہ اب تک یہ کتاب ہندوستان میں لکھی نہیں ہوئی تھی۔ انگلستان میں اس کتاب پر تبصرے ہوئے۔ یہ بات بھی یہاں پڑھ سکتی چاہئے کہ غدر کے دوران موصوف نے انگریز افسروں کی جان بچائی تھی اور کئی سرے میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا جس کے صلے میں انہیں انگریزوں نے جاکیر دے کر رکھا تھا لیکن سید احمد نے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اصل میں مسلمانوں کی ہجرتی ان کی نگاہ میں مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ ذاتی دولت یا مادی اور صاحب ثروت بننے کی کوئی فکر نہ تھی۔

سر سید یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں ان کی پسماندگی کی بنیادی وجہ تعلیم کی کمی ہے۔ وہ ہندوستانی خصوصاً مسلمانوں کو برطرح کی تعلیم سے بہرہ ور کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۹ء میں مراد آباد میں ایک مدرسہ قائم کیا اور ۱۸۶۳ء میں عادی پور میں "ماتعلک سوسائٹی" قائم کی اس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف علوم کی کتابیں اردو میں تھیں کی جائیں تاکہ جدید تعلیم سے عوام و خواص بہرہ ور ہو سکیں۔ ۱۸۶۳ء میں موصوف نے یہاں ایک اسکول بھی قائم کیا۔ لیکن یہ ادارہ سر سید کے خواہشوں کی تعمیل نہیں تھے۔ ان کے سامنے تو یہ پ کی تعلیم کا اہل معیار تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی آنکھوں سے ہر پ کے اور سرے رکھیں اور ان کے تمام تعلیم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ وہ ایک سرکاری وظیفے کا سہارا لے کر ۱۸۶۹ء میں اپنے دونوں بیٹے سید احمد اور سید محمود کے ساتھ انگلستان روانہ ہو گئے۔ انگلستان میں ان کی پڑھائی ہوئی۔ سر سید وہاں جب تک رہے یہی کام کیا کہ وہاں کے تمام تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی اور وہاں آئے ہی ایک موشر مار "تہذیب الاطلاق" جاری کیا۔ دراصل وہ لندن سے شائع ہونے والے "مگزین" اور "ایکٹیکلر" کے ادارہ کو اپنا نا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۲۳ دسمبر ۱۸۷۰ء میں "تہذیب الاطلاق" کا اجرا علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پر ہوا۔ اس میں ایسے مضامین بھی شائع ہوئے کہ ان پر کفر کا تو فی سوار کیا گیا۔ سر سید کا قیام لندن میں ایک سال چلے بیٹھے مگر تقابلاً مسلمانوں میں نئی تعلیم کے فروغ کے لئے ایک کمپن بنائی جس کا نام تھا "کمپنی خواجہ گزرتی تعلیم مسلمان"۔ اس کی ایک ذیلی کمپنی بھی تھی جس کا نام "تحریک اجماع" تھا۔ اس کمپنی کا کام چند اگلا کر تقابلاً انہیں سر سید نے ایک ذمہ دار کے قیام کے سلسلے میں خود سے چند اصولی کرنے میں بھجک مضمون نہیں کی اور ہر کس دنا کس کے سامنے ہاتھ پیچھا نہ لگے۔ یہ سب اس لئے اور ہاتھ اگلی گڑھ میں یا ضابطہ ایک جدید کالج قائم ہو۔ جو کہ اس خیال کے معاون تھے۔ ان میں دو مالک علامہ شبلی اور مولوی نوح صاحب تھے۔ اس ذیل میں نو ممبرن منتخب کیے گئے۔

"آفر علی امت" اور "مصلحت" کی ایک کمپنی تیار ہو گئی اور مولوی محمد آسین ہو گیا۔ تقابلاً کے طریقہ پھر بھی نہ تھا مگر یہ کارواں برکھو آ کے قیام ہوتا گیا۔ آج ہم اس کارواں کو بھی گڑھ تحریک اور سر سید تحریک کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسے علی گڑھ تحریک اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا مرکز علی گڑھ تھا اور سر سید تحریک اس لئے کہ اس کے دامن میں سر سید تھے۔

بہان کے لئے ایک خارجہ شخص جو اس کی کیا کرتی تھیں۔ چنانچہ جس تک وہ سید احمد کی دیکھ بھال کرتی رہیں لیکن حسب ان کا انتقال ہو گیا تو ان کی والدہ مزین النساء نے اپنی نگرانی میں ان کی پڑھائی شروع کی۔ لیکن وجہ ہے کہ والد کا اثر ان کی شخصیت پر سب سے زیادہ ہے۔ ان کے ذہن پر فرید الدین کا بھی ان پر اثر پڑا کہ انہوں نے ان کی تربیت میں کافی دلچسپی لی۔ ابتدا ہی میں انہوں نے اسٹیشنر شپ کی تقریریں سنیں اور شریعت سے رے۔ شاہ غلام علی کی خانقاہ سے رجسٹ فاس بھی اور شاہ ولی اللہ کے مکتوبات سے دلچسپی لیتے رہے تھے۔ نتیجے میں اپنی مختلف اور بوجہ۔

خوب فرید الدین ایک ذہنی حیثیت شخصیت تھے اور بہت رسوم والے۔ ان کا تعلق انگریز افسروں سے بھی تھا اور نام نہاد بادشاہوں سے بھی۔ چنانچہ سید احمد بھی ابتدا ہی سے بادشاہ کے یہاں اپنے والد کے ساتھ حاضر ہوتے رہے۔ پھر حسب انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہاتھ پاؤں پھیلائے تو سید احمد کو انگریزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا خاص موقع ملتا رہا۔ آخر میں انہوں نے انگریزوں ہی کی سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔

ابتدائی تعلیم کے بعد مولانا حمید الدین اور دوسرے اساتذہ سے سید احمد نے فارسی عربی، حساب اور طب کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے پاس نواب ترین العادین دیکھنی میں ماہر تھے۔ وہ بھی انہیں چاہتے رہے۔ ان کے ادب ذوق کفر، رائج رہنے میں غالب و مہجانی اور آزاد و دیر کے نام اہم ہیں۔ جن سے ان کا رابطہ تھا۔ لیکن سیاسی اور معاشرتی معاملات کی تفہیم میں داجار اہم ہونے والے وہ مروجہ تحریک کی تحریک ہوئی کہ ان کی سرگرمیاں اور سید احمد پر غوی کی تحریک خاصا اہم ہیں۔ اب تک سید احمد کے یہاں پیشین کا سلسلہ تھا لیکن ۱۸۳۱ء میں جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو یہ سلسلہ بند ہو گیا اور پھر انہیں معاش کی فکر لاحق ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کی کیا وجہ تھی۔ وہ صدر امین کے دفتر سے وابستہ ہوئے۔ پھر عجب فتنی ہو کر آکر آگئے۔ انہوں نے ان دوران منصبی کا امتحان بھی پاس کیا اور پھر ۱۸۳۱ء میں بین پوری میں منتقل ہو گئے۔ پھر ان کا جائیداد بچے پر دسکری ہو گیا۔ اپنے بھائی کے انتقال کے بعد وہ اپنی آگئے۔ اپنی کے قیام کے دوران انہوں نے اپنی مشہور کتاب "آفر اعلیٰ" شائع کروائی۔ پھر وہ ملازمت کے سلسلے میں بھڑک آ گئے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات نے سید احمد کو بے چین کر دیا۔ سادہ ہندوستان میں برادری اور زیادہ مالی کا مظہر تھا۔ مسلمان انگریزوں کی نگاہ میں اپنی تھے اور ان کے جان و مال کے گرد مسلسل خطرہ منڈالتے رہے تھے۔ سید احمد ان دنوں مراد آباد میں تھے۔ انہیں احساس تھا کہ وہ تقابلاً مسلمانوں کی اب غیر نہیں ہے اور وہ انگریزوں کے ہاتھوں اسی طرح بچنے نہیں گئے۔ ظاہر ہے انگریز یہ سمجھتے تھے کہ اس عبادت کے پیچھے مسلمانوں ہی کا ہاتھ ہے۔ سر سید اس قلعہ کو دور کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۹ء میں "اسپاہ ہند" انہیں دراصل سر سید چاہتے تھے کہ اس کتاب سے غلامیوں کا ازالہ ہو جائے۔ وہ اپنے طور پر جہاد کی وجہ یہ سمجھتے تھے کہ سرکار اور رعایا میں رابطہ نہیں ہے۔ ہندوستانی انہیں مجبوراً ہاتھوں کے ہاتھ اور انگریزوں کے قوانین ہندوستانی اور مردان کے خلاف ہیں۔ انگریزوں کی مشکیاں اپنی سرگرمیوں سے ہندوستان کو مزید

آزاد نے بہ حیثیت سرکاری "انجمن پنجاب" کی قائل اور خدمات انجام دیں۔ وہ ادھر ادھر جلسوں میں بھی شریک ہوتے اور نگہداشتے۔ انہوں نے عورتوں کے مسائل سے بھی دلچسپی لی اور عصمت فروشی کے خلاف جدوجہد کرتے۔ مسٹر پیرس نے انہیں ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء کو کلکتہ تعلیم میں ایک حیدر دیا جہاں انہوں نے غنی تارنما ہند اور دوسری کتابیں مرتب کیں۔

محمد حسین آزاد عارضی طور پر علیحدہ احسن گورنمنٹ کالج میں عربی کے معلم بھی مقرر ہوئے جہاں وہ بعد میں مستقل ہو گئے۔ جب ان کی تنخواہ ۱۵۰ روپے ملنا نہ ہوئی۔ ٹکار ہے لاہور میں ان کی ادبی و سماجی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے اخبار "ہائے پنجاب" بھی جاری کیا۔ اسی کالج کی علامت کے درمیان انہوں نے "حق اہل لارنس" بھی اہم ترنما لکھ دی۔

محمد حسین آزاد عظیم کوئی کے اولین مشرق کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے کہ انہیں کے زمانے میں غزلی کی جگہ تھیں لیکن کاہان ہوا۔ "انجمن پنجاب" نے اس باب میں ترغیب دینی شروع کی۔ انہی انہوں پر اعلانات دئے جانے لگے۔ مخصوص موضوعات پر تھیں لیکن دینی تھیں۔ انہوں میں حالی کی بعض تھیں "برکھادت" "حب وطن" "معارضہ و انصاف" وغیرہ انہیں کی تحریک پر وجود میں آئیں۔

۱۸۷۷ء سے ۱۸۷۹ء کے دوران محمد حسین آزاد نے اپنی سب سے اہم کتاب "آب حیات" لکھنے کی راہ ان کی زندگی اور ادبی حیثیت کو جاواں جانے کے لئے کافی ثابت ہوئی۔ ۱۸۸۰ء اور ۱۸۸۳ء کے دوران انہوں نے "تیر تک خیالی" بھی لکھی تھیں "آب حیات" میں اضافے کرتے رہے۔ اسی سال ان کی بیٹی ام اسکیدہ شہیدہ انتقال ہوئی جس کا ان کے ذہن و دماغ پر کافی اثر پڑا بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ اسی حادثے کی وجہ سے ان کا دینی فرائض بڑھ گیا۔

اوپر میں نے لکھا ہے کہ انہوں نے معاشرت کرتے رہے تھے لیکن ایک مرحلے میں ان سے شک ہو گئی اس حد تک کہ آزاد پریشان ہو گئے۔ جب آزاد نے امر ان کا سفر لکھا دیکھا اس نے ان کے سامنے اتنا عام یہ تھا۔ شہر و سر انہوں نے اس کی ایک قسم دیکھی جس کا ذکر انہوں نے یوں کیا ہے۔

"شیراز میں چھوٹی چھوٹی دیکھی تھی کہ ان سے لوگ مراد و راز میں دھڑکتے ہیں۔"

ایک قسم کی مٹی ہے جس کی کان شہر کے پاس ہے۔ اس میں خوشبو کے اٹھانے کی قدرتی تاثیر

ہے۔ اسے پھولوں میں برسا کر صاف کرتے ہیں اور گلیاں بنا کر بیچتے ہیں۔ شہروں میں بچے لے

جاتے ہیں گلی گلی اس کا نام ہے۔ مجھے گلستان کا سبق یاد آیا۔

میں خوشبوئے در حمام روئے۔

پھر پھر محمد حسین آزاد ۲۲ جولائی کو لاہور واپس آ گئے۔ ۱۸۸۷ء میں ملک کنور چک کی تاجپوشی کے پچاس سالہ جشن

اس کی تکمیل میں شہنشاہ ہو گئے۔ طوطا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جب خود کے ہنگاموں سے آزاد کو دہلی چھوڑنے پر مجبور کیا تو حکام ذوق کو انہوں نے جان سے تڑا اور عزیز رکھا۔ شیخ ابراہیم ذوق نے ۱۸۵۳ء میں انتقال کے بعد آزاد تکمیل آغا جان خٹن سے مشورہ غنچ کرنے لگے جس کا سلسلہ کم و بیش دو دس جاوی رہا۔ انہیں اپنی تحریروں میں آزاد نے خود کو کھینچ ذوق بنی لکھ ہے۔ آزاد کی شہادی افساد و انہیں برس کی عمر میں گھوڑوں کے ایک سوڑاگر مرزا محمد علی کی بیٹی آغا خانی بیگم سے ہو گئی تھی اور ۱۸۵۵ء تک وہ دو بچوں کے باپ بن چکے تھے۔ اس وقت ہلاکی کی عمر سات سال اور چھوٹی بیٹی کی عمر دو برس تھی۔

محمد حسین آزاد نے ۱۸۵۳ء میں کالج کی تعلیم مکمل کر لی تھی اور اپنے والد کے ساتھ کام کرنے لگے تھے لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے ایک نئی صورت پیدا کر دی۔ مولوی محمد باقر گرفتار ہو گئے۔ چونکہ آزاد کو اپنے باپ سے بہت محبت تھی لہذا وہ ان سے ملنے کے لئے جہاں تھے۔ اسی طور پر انہیں سوانح نگار کر ان سے ملاقات کرنے کی کوشش نکالی لیکن ان کے والد آغوش شہید کر دئے گئے۔ باپ آزاد سے مردمانی کی حالت میں دلی سے عہد کر کے تھوڑے گئے جہاں ان کی ملاقات پیر انیس دو سو وغیرہ سے ہوئی۔ پھر اپنی گرفتاری کے خوف سے آزاد نکل کر پی چلے گئے جہاں انہوں نے ایک فوجی اسکول میں پڑھنا شروع کیا۔ پھر وہاں سے نکلی آ گئے۔ اس کے بعد پنجاب میں سکونت پانے ہوئے اور وہاں محکمہ جہاد میں ملازمت کی۔ اس کے بعد لاہور چلے آئے یہاں سے ایک اخبار "مجمع انجمن" نکلتا تھا اس سے وابستہ ایک پریس بھی تھا جہاں وہ ملازم ہو گئے۔ یہاں کچھ سکون حاصل ہوا تو اپنے اہل و عیال کو سونی پت چکراؤں بنالیا۔ اس کے بعد وہ لاہور منتقل ہو گئے اور وہاں پرنٹنگ پریس میں شریک ہو گئے۔ جب ان کی تنخواہ تیس روپے مقرر ہوئی۔ ۱۸۶۲ء میں ان کا توالہ تھان ہو گیا جب وہ مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد وہ اخبار "تالیق" پنجاب کے نائب مدیر مقرر ہوئے۔ انہیں یہاں تعلیم کے رجحان پیدا نہ تصور اور نئے تصور سے غرق آگاہی ہو گئی یہ بعد میں ان کے ذہن و دماغ کی تشکیل کا باعث بنی ہوئی۔ جب "انجمن پنجاب" قائم ہوئی تو آزاد اس سے وابستہ ہو گئے۔ ان دنوں وہ انگریزوں کو اردو پڑھاتے تھے۔ انہوں نے اردو خوشی کی حیثیت سے ڈاکٹر لکھنؤ کے ساتھ بھی کام کیا۔ انہیں انہوں نے بہت سے مقالے لکھے۔ گویا ۱۸۶۵ء سے ۱۸۶۸ء تک ان کے تقریباً پچاس مقالے سامنے آچکے تھے۔ محمد حسین آزاد کو رحمت ہو گئی اور "انجمن پنجاب" کے دہلے سے کافی شہرت بھی نصیب ہوئی لیکن ان کے کچھ دشمن بھی پیدا ہو گئے۔ گویا یہ ایک طرح کا جادو تھا اس لئے کہ انہیں بھی لوگوں نے باغی ثابت کرنا شروع کیا لیکن انہوں نے مدد کی اور اس طرح معاملہ رفع دفع ہوا۔

محمد حسین آزاد نے باغی ثابت کرنا شروع کیا لیکن انہوں نے تا شتم۔ جزاک۔ جہد۔ محنت جیسے مقامات کی سیر کی تب وہ اس بدنامی حکومت تھی۔ آزاد رو دیا۔ آوری تک پہنچے اس کے بعد وہ خٹن کے سامنے رہائش ہوئے۔

لسانیت نے ان کے دعوے کو رد کر دیا ہے کہ اردو کا آغاز برج بھاشا سے ہوا ہے۔ انہوں نے شعرا کے ادب میں بہت سے ایسے کچے بیان کئے ہیں جو تحقیق کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ مولوی صیب الرحمن خیر والی نے تو یہ کہہ دیا ہے کہ۔
 ”آزادی قوس کی بلند پروازی نے غلطے پیدا کر اڑائے ہیں۔“

اگر کاظمی عبداللہ اور دیگر کتاب ”محمد حسین آزاد بہ حیثیت محقق“ سائنسہ جتوہ اندازہ دیکھا مطلقاً نہ کام کاج ضمنی صاحب نے ان کی قیمن سو سے زیادہ فروگزاشتوں کا احاطہ کیا ہے۔ یہ کتاب اندازہ حقیقت اردو، چند نے جاری کر دی ہے۔ کاظمی عبداللہ نے اپنی باتوں کی ابتداء اس طرح کی ہے۔

”اکثر یہ آزاد کی شاعری کی معترف ہے مگر یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ وہ محقق کے مریدان تھے۔ اقلیت سمر ہے کہ وہ صرف ایک بڑے فنکار پر دانی نہیں بلکہ بڑے محقق بھی تھے۔ اس کتاب میں یہ کھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حق کس کی طرف ہے۔“

ایسا بھی ہے کہ کہیں کہیں آزاد کا ذاتی تعصب بھی نمایاں ہو گیا ہے مثلاً انہوں نے اپنے استاد ذوق کا حال ساتھ (۶۰) صفحات میں بیان کیا ہے جب کہ مومن خاں مومن پر ایک حرف بھی نہیں لکھ۔ جب ادوار احمد سے تنقید ہونے لگی تو رائے نشین میں مومن کو کچھ دے دی گئی۔ کہیں کہیں کتاب کے لحاظ سے طوالت اور اختصار کا احساس ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ پر ہیں لیکن کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ آزاد عیسویں دہائی کی ایک دہائی سے تب بھی ادبی معلوم ہوتی ہے۔ ان کی مرقع نگاری بھی اہل در سے کی ہے۔ طیل الرحمن اعظمی نے مجھ سے ایک بار یہ کہا تھا کہ کوئی گراں دل دھڑیر پڑھتے پڑھتے زبان بھول ہو جاتا ہے تو ”آب حیات“ انھار لیتا ہوں جاری کہورے دور ہو جاتی ہے۔ آزاد کی تمام کتابیں اپنے طرز کی ہیں۔ یہ آج بھی پڑھی جاتی ہیں۔ ان کے اسلوب کی دلکشی دہائی کی زبانیت، لطافت کو ہر جگہ احساس ہوتا ہے۔ کہیں کہیں مستندہ کو کچھ مسئلہ ہے تو کہیں حکایت کا پیمانہ اور اختیار کیا گیا ہے، کہیں نازک خیال اس طرح پیش کی گئی ہے کہ کتابہ و یاد کہیں مطالعہ کی وہ کیفیت سامنے لائی گئی ہے جو دوسری جگہ نہیں ملتی، کہیں محاکات سے کام لیا گیا ہے تو کہیں متنازعہ مدائح کا رد عمل استعمال ہے۔

لیکن یہ طرز ادب بھی بھر پور ہے۔ پاک نہیں اس لئے کہ تمام کتابوں میں ایک ہی طرح کا انداز اختیار کر دیا گیا ہے۔ بہر طور محمد حسین قادری نے انہیں پہلا صاحب طرز کہا ہے نیز محمد اعلیٰ حسن انہیں نیکارا قرار دیا تھا ہے۔

آزاد کی ایک حیثیت شاعری کی گئی ہے اور یہ حیثیت مسلم ہے۔ اس لئے کہ وہ نظم کے اولین شاعروں میں ایک سمجھے جاتے ہیں جنہوں نے اپنی مسائل سے اس صنف کو متغیر بنایا اور نظم نگاری کے لئے ایک مہم فضا قائم کی۔ ذوق نے ان کے شاعرانہ حراج کی آبیاری کی تھی۔ ان کے شعور کو پختل کرنے میں ان کا خاص رول رہا ہے۔ لہذا ان کی شاعری کو کسی نہ کسی حیثیت سے اعتبار ملنا ہی تھا۔

کے موقع پر انہیں شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔ زندگی کے تقریباً بیس سال محمد حسین آزاد جنوں کی زندگی بسر کرنے رہے۔ تعلقہ وقت سے حالت سدھرتی۔ طوطی معالجہ ہوتا لیکن پھر دیوانگی دانہں آجاتی۔ آخر وقتوں میں وہ عالم دیوانگی ہی میں رہا نہایت سے واپس ہو گئے لیکن زندگی میں عجیب طرح کی بے دلی رہی۔ ابھی ان پر چوتھی کیفیت طاری ہی ہوئی تھی کہ ۱۹۰۵ء میں ان کی شہر کا انتقال ہو گیا جب وہ اور مضمحل رہتے تھے۔ آزاد کی چھاری طول پکڑی تھی۔ تقریباً بیس برس دو بار رہے۔ آخر ۲۴ جنوری ۱۹۱۰ء میں لاہور میں ان کا انتقال ہو گیا اور انہیں مزارِ جناح کے قریب دفن کیا گیا۔

محمد حسین آزاد کی کتابوں کی تفصیل اس طرح ہے: ”آب حیات“، ”تیر جگہ خیال“، ”دور بار بار کبریٰ“، ”خون و ناز“، ”فارسی“، ”نگارستان فارسی“، ”دیوان ذوق“، ”نظم آزاد“، ”تذکرہ علماء“، ”کائناتِ عرب“، ”تغیث آزاد“، ”ذرا دے اکبر“، ”سیر اہل ان“، ”تغیث شہزاد“، ”جاوہرستان“، ”مکتوب آزاد“، ”پناہ آزاد“، ”دور و نزدیک آزاد“۔

اس فہرست کی ابتدائی سات کتابیں ان کی زندگی میں شائع ہوئیں اور بقیہ ان کی موت کے بعد۔ ”تغیث شہزاد“ تو ہزار یاد تصنیف کے ذیل میں آتی ہے۔ یوں تو ابتدائی ساری کتابیں ہی اہمیت کی حامل ہیں لیکن ذرا مختصر کر ”آب حیات“ پر بات نہیں چاہئیں۔

اب تک شعرا کے جو تذکرے سامنے آئے تھے ان کا اختصار سب سے بڑا نقص تھا۔ پھر حرفِ جنی کی ترحیب اسے اور بھی ناقص بنا دیتی تھی۔ حالاتِ زندگی سرسری طور پر لکھے جاتے تھے۔ کام کے محبوب، دشمن کو بیٹے و بیٹے میں سمیٹ دیا جاتا۔ غرض کہ ابھی تک کسی ادبی تاریخ کا تصور نہیں پیدا ہوا تھا۔ تذکرہ کی یہ ساری خامیاں آزاد کے ذہن میں تھیں اور وہ انہیں دور کرنا چاہتے تھے۔ پھر یہ بھی تھا کہ اب تک اردو زبان کے باب میں کوئی ایسی نگشتہ اس طرح نہیں ہوئی تھی جس طرح آزاد چاہتے تھے۔ ”آب حیات“ لکھتے وقت یہ سارے تصورات ان کے ذہن میں رہے ہوں گے۔ چنانچہ ”آب حیات“ وہ پہلی کتاب ہے جس میں ادبی تاریخ کا جواز فراہم ہوتا ہے نیز تفصیل اور مدلل تاریخی ادب اردو لکھنے کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

”آب حیات“ کا مستندہ تفصیلی ہے۔ اس میں بھی فارسی کے اوقات کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کامل لحاظ ہے۔ پھر اس میں شاعروں کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ اس باب میں علامہ حسن قادری لکھتے ہیں کہ۔

”آب حیات میں شاعروں کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں خصوصاً شاعرانہ نوک جھونک

ذاتی رجحانیں اور سیرے و انحطاط کے لطیفہ کوشش و تلاش سے درج کئے ہیں۔ ان میں ایسی باتیں

بھی ہیں جو علامہ آزاد نے کتابوں سے دیکھ کر لکھی ہیں اور انہیں بھی جوان کو اپنے استاد

پر کرکوں سے یاد پڑ چکی ہیں۔“

یہی ہے عربی جمعی پر جس نے امام احمد بن حنبلہؒ کی فکر سے غور عربی سے شروع کیا تاکہ ابورضیٰ بن علیؒ کی تفسیر اور تفسیر
ابو قلینہؒ کی ایک چھانٹ

غزوات کی فہمی وادنی زندگی، جنگی جہازوں کی تعمیر و ترقی، اس زمانے میں طلباء اپنے اساتذہ کے گھروں کی خدمات انجام دیتے تھے۔ ان کے حوصلے انہیں کھانا، مکان، ٹرانسپورٹ یا خدمت دہی بھی مہیوی عہدالتق کے گھر کا کام کاج کرنا شروع کیا اور دوسرے طلباء کی طرح یہ خدمت کرنے کے لئے مسجد میں پڑے رہتے۔ یہ اس طرح کے کام سے بچہ دل برداشتہ بھی تھے۔ ایک موقع پر ان کی ملاقات پولیس کانسٹیبل سے ہوئی۔ ان ہی کے واسطے سے ۱۸۸۵ء میں غزوات احمدیہ کانٹری کمیٹی قائم ہو گئی۔ جب یہ رجسٹر ہوئی کے لئے تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور انہوں نے کسی صورت سے والدین کا تکلیف حاصل کیا۔ چونکہ غزوات احمدیہ مسجد بنوا رہے تھے چنانچہ مولوی عبدالخالق کے صاحبزادے مولوی عبدالقادر نے اپنی صاحبزادی کی نکاحیت ان سے کر لی۔ غزوات احمدیہ کے خدمات کے واسطے ان کی اپنی خاتون کو جب وہ بچی تھیں انھوں نے پھرے تھے۔

بہر طور نذیرا ہوتے آٹھ سال یعنی ۱۸۳۵ء سے ۱۸۵۳ء تک وہ علی میں گزارے۔ والد کے انتقال کے بعد انہیں حصولِ معاش کی فکر چرے ہوئی تو وہ دیگر کجمرات (مذہب) پہنچنے اور ٹیکل صاحب سے ملاقات کی۔ یہاں چالیس روپے پر انہیں دیوانی کی ملازمت مل گئی۔ ویسے وہ اپنی اس ملازمت سے خوش نہیں تھے۔ پھر ایک کاتبہ میں فوٹی انکمپنر عمارت ہو گئے۔ یہاں بھی انہیں انتہائی رعب و ہراس میں دو سال ۱۸۵۷ء میں بھارت روانہ ہوئی اور وہ کسی طرح واپس آئے۔ اس کے بعد انہوں نے کئی فخر کی ملازمت کی۔ بعد ازاں کے لئے ۱۸۷۰ء میں روانہ ہوئے۔ اس کی تفصیل نور الحسن نقوی نے لکھ دی ہے۔

مولوی صاحب نے اعظم گڑھ کی طبی نگاشتی سے دو سال کی دھتے لی اور پہلی اپریل ۱۸۸۷ء کو دوبارہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ ۷ مارچ کو مولوی صاحب منزل مقصود پر پہنچے اور نواب حسن الملک کی کوٹھی پر قیام کیا۔ وہ اپنے مہراؤ بے دادا احمد حسن اور بیٹھوی رفیع الدین کو بھی لے گئے۔ ان دونوں کو بھی مولوی صاحب کی فائض میں ملازمتیں دی گئیں۔ مولوی صاحب کی تھوہارہ سوچا نہیں روئے فقرہ دہلی اور اس کے سپرد یہ کام ہوا کہ مختلف مقامات کا دورہ کر کے دھاتر کا سناٹہ کریں اور ان کی کارکردگی کی مفصل روریکو اور کارکردگی کریں۔ مولوی صاحب نے یہ کام جری عبت سے انجام دیا اور اس کے صلے میں نورانی پٹی پائی، یعنی ناظم جندوہست سے ناظم جندوہست و معدوہست و دھاتر دھاتر ہو گئے۔ سرسار جنگ مولوی صاحب سے اسے جڑھے کے اپنے دونوں بچوں کی تعلیم اس کے سپرد کی اور مولوی صاحب نے بھی حق ادا کر دیا۔ جندوہست قدامت کے دوران انھوں نے کم سن سرکار نظام کی تعلیم کے لئے کچھ

آزاد نے شاعری کے رموز و نکات سے خوب خوب بحث کی ہے۔ بعض اصغر پر کلچر لکے ہیں جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ قدیم عاشقانہ شاعری کے دلدادہ تھے۔ وہ نچرل شاعری کے ظہور و نمو میں بھی۔ انہیں احساس تھا کہ وہ درجے کا مہاشاعر شاعری کو پختہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ خود بخود کی صنعت گری بھی شاعری کا مہیب ہے۔ اس پس منظر میں وہ نگہیں کھینچتے رہے۔ ان کا چناؤ مناسب ہے:-

”وہ کیا؟“ مضامین جانشین کا شکندہ ہیں جس میں دہل کا کچھ لکھ، بہت سے حسرت دار ہاں، اہل
سے زیادہ ہجر کا ردنا، شراب، سہاقی، بیچارہ خزاں، تلک کی فصاحت اور اراقیل، مندوں کی
خوشامد ہے..... افسوس ہے کہ ان مہر و دوا نروں سے ذرا بھی شکفا چاہیں
تو قدم نہیں اٹھا سکتے! اگر کوئی، یعنی سرگزشت یا علمی مطلب یا اخلاقی یا مقبول الفہم کرنا
چاہے تو اس کا ہاں نہ ملے گا۔..... اہل مہر و دوا طوں میں جو کچھ
موجود ہے وہ بڑے بڑے آج تک بڑے بڑے صحرا الہیان فہمیں نے شمار کرکے اور
صبح کو شام کر کے پھا کیا ہے...“

بہر طور احمد حسین آزاد کی شاعری کی اہمیت اس لئے ہے کہ وہ ایک نئے طرز کے تنبیہ گزراں اور چہ اودیہ اردو نظم
 بہان کا احسان ہے۔ نمک ہے کہ ان کی نظموں میں گہرائی اور سنجیدگی نہیں ہے، بعضوں نے انہیں رد بھی کر دیا ہے لیکن یہ بھی
 سچ ہے کہ ان کی شاعری ”شب قدر“ ”اولو العزمی“ ”حب وطن“ ”ادب العاصی“ ”ابر کرم“ ”سجاع امید“ ”غواب اس“
 ”نظم مرصع“ وغیرہ جہاں قریف کی مستحقِ تمغہ ہیں اہاں ان میں کچھ سبب بھی لگا گئے ہیں لیکن ان باتوں سے ٹھہر
 حسین آزاد کی ادبی اہمیت پر کوئی اثر نہیں پڑے اور بعض اوقات کی خاطر انہیں اردو ادب کی دو دشمن دستار دیکھنا چاہئے۔

ڈیٹی نڈیرا

$$\langle \rho | \hat{q} | \sigma \rangle = \langle \rho | \hat{q} | \sigma \rangle$$

شہس اعلیٰ پٹی پر ہر احمد کی پیدائش ۱۶ ستمبر ۱۸۳۱ء کو ستر میں ہوئی۔ یہ جگہ کہ ان افضل مقررہ تحصیل تھیں اور شیعہ بھڑو میں تھیں۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت شاد علی قادری گنگوہی کے خلفائے ایک بزرگ عیدالغور اعظم پوری سے جاتا ہے۔ ان کے دادا کا شیعہ نام علی شاد بڑے بزرگ تھے جنہوں نے مولوی سعادت علی خاں صاحب کو قبول و اعتراف اہل حق محمدیہ خاں رامادہ دار کما تھا۔

نہرہ احمد کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہو رہی تھی کہ ان کے والد مولوی سعادت علی نے انہیں خرقہ تعلیم دینی شراب کی ان خاص طور سے قادی کی کہ اس طرح ابتدائی میں انہوں نے بی بی رقبہ جنا بازار اور سرختر شہر کی ختم کر لی۔ پھر اپنے والد

دوسرے بھی تصنیف کئے۔

ذریعہ احمدی کے دو دفتر مشرقی و جنوب مشرقی، دو دفتر کی پانچویں مشرقی و جنوب مشرقی، میان کی و صاف کوئی، حاضر و غائب، ہر نظر و ہر وقت پر کافی توجہ دی گئی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہیں مدینہ کے کی بڑی آگاہی تھی۔ لیکن انہیں جو چیز متذہباتی ہے، وہ ان کی ناول نگاری ہے۔ ان کے ناول "مراۃ العروس"، "جنت العیش"، "توبہ المصوح"، "توبہ جنت"، "ایمان الوقت"، "ایمانی" اور "رویا کے صادق" صرف اہم ہیں بلکہ ان پر مسلسل بحث و تکرار کیا جا رہا ہے۔

اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ لکھنے کا پہلا ناول نگار کون ہے؟ جواب سید حسنا ہے کہ پہلے ناول نگار ذریعہ احمدی ہیں۔ یوں تو محمود الحسنی نے ایک ناول "عقہ عقیر" لکھ کر کیا ہے کہ وہ لکھنے کا پہلا ناول ہے۔ لیکن بات آگے نہیں بڑھی اور اب تک ذریعہ احمدی کی اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔

ناول "مراۃ العروس" ۱۹۶۸ء میں تیار ہوا۔ اس کے بعد ہی کئی کتابیں فصاحت کے سلیسے کی شائع ہوئیں جو دوسروں کی تھیں۔ "مراۃ العروس" امور خانہ داری اور لڑکیوں کی تربیت کے موضوع پر ایک اصلاحی ناول ہے۔ اس اصلاحی ناول کے مضامین اور دوسری پڑے۔ ذریعہ احمدی جس طرح عورتوں کی اصلاح چاہتے تھے وہ اصلاحی ہوئی یا انہیں چاہی یا نہ تھی۔ اس کتاب بہت مقبول ہوئی۔ وہ شائع ہو کر ناول یوں تو ۱۹۶۸ء میں تیار ہوا لیکن اشاعت ۱۹۶۹ء میں ہوئی تھی۔ اس ناول کے دو کردار اکبر کی اور امتری اب بھی زندہ و کرم ہیں۔ حکومت نے اس کتاب پر ایک جرمن روپیہ کا انعام دیا تھا۔ اس سے احمدیہ لکھنے کے اس زمانے میں اس ناول کی کیا اہمیت رہی ہوگی۔

"مراۃ العروس" کو اگر تاج کے قلمی پیمانے پر لکھنا چاہیں تو باقی ہوئی۔ اس میں آئینہ دل کر رہا ہے اور وہ بھی ایسے جو ہر حال میں ایک جیسے رہتے ہیں۔ اگر ہم انگریزی ناول نگاری کی ابتدا کو ذہن میں رکھیں تو چارہ سون کا ناول "پھیلا" یا "اور چور پھاؤ" انگریزوں میں آ جاتا ہے۔ یہ بھی اخلاقی ناول ہے اور اس کا تعلق بھی عورتوں کے کردار و اطوار سے ہے جس میں ایک ملازمہ اپنی محنت و عزت کے لئے اپنے مالک کے برے سے بڑے قدم کو شہوت سے روکنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور آخر میں اس کے اوصاف سے متاثر ہو کر مالک اس کو کرائی سے شادی کر لیتا ہے۔ لڑائی ذریعہ احمدی کے ناول کو اسی پس منظر میں دیکھنا اور پڑھنا سکتا ہے۔

"مراۃ العروس" کے بعد ۱۹۷۲ء میں "نول" جنت العیش" شائع ہوا۔ اس ناول میں تعلیم پر خاص زور دیا گیا ہے اور تعلیم بھی اخلاقی۔ اس کے علاوہ خانہ داری کی تربیت بھی دی گئی ہے۔ امتری خاتم تعلیم لکھنا کو کام کرتی ہے، مدرسہ قائم کرتی ہے لیکن جس آراء جو دوسرا بد زبان اور بد طریقہ ہے اس کی کاپالبت ہو جاتی ہے۔ اس ناول پر بھی سرکاری طور پر ذریعہ احمدی کو پانچ سو روپے بطور انعام دیے گئے۔

"توبہ المصوح" ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ اب تک ان کا قلم اس فن میں کچھ متزلزل ہو چکا تھا اس لئے قلمی حیثیت

سے "توبہ المصوح" کچھ متزلزل ہے۔ لیکن قلم کا تمام بار اٹھاتا ہے۔ تصور عالم خراب میں مشرق کا نقشہ دکھاتا ہے۔ یہی طرز اس کی زندگی میں اصلاحی انقلاب لے رہا ہے۔ اس ناول کے جن کی کردار تصور تعلیم اور عالم دین ایک دلچسپ معلوم ہوتے ہیں اور ان کی اعتبار سے اہم ہیں۔

"نول جنت العیش" ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ یہ اس ایک سے زیادہ شمار ہیں کے سلسلے میں گویا انہیں پیش کی گئی ہیں۔ ایک سے زیادہ شمار ہیں کر دیا گیا ہے۔ محلی طور پر لکھنے کی تربیت کے سوا کہ بھی اٹھائے گئے ہیں۔ "نول جنت العیش" میں ایک نام "عشرت" بھی ہے، اس وقت کوئی مقبول ہوا اس کی وجہ سے کہ اس میں ملبی بیوی اور دوسری بیوی کے باپ میں جیسے تھیں اٹھائے گئے ہیں وہ دلچسپ ہیں۔

میرے خیال میں "ایمان الوقت" ذریعہ احمدی کا سب سے اہم ناول ہے۔ اس ناول کا ہیرو ایمان الوقت ہے جس نے حالات کو سمجھتے ہوئے انگریزی و شیعہ انقلابی۔ انگریزوں کی طرح بات کرنے لگا رکھنے کے وقت، انگریزوں کی طرح لباس تبدیل کرتا۔ یہ لڑکی اسی طرح سہلی گئی۔ لیکن اس نظریے کا حریف جو تین سالہ جو اس کا بھائی تھا ہے وہ اپنے تمام امور کو غلط قرار دیتا ہے۔ بعضوں نے ایمان الوقت کے کردار میں سرمد کی شبیہ کو کر کیا ہے یعنی اس میں سرمد کے نظریے کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ وہ لکھنے کے سلسلے میں کو معلوم ہے کہ لڑکی ذریعہ احمدی کا ہیرو "ام" کرتے تھے۔ انگریزی کی تہذیب کے خلاف یہ کتاب اہم سمجھی جاتی ہے۔ ایک طرف سرمد جیسا تو دوسری طرف اکبر الہ آبادی (حیت الاسلام) دونوں کے نظریات آتے آتے سامنے ہیں۔ یہ ناول اپنی اعتبار سے غیر اہم نہیں۔

ذریعہ احمدی کا آخری ناول "رویا کے صادق" ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ کتاب ہر اصل صادق کے والد کے ایک خط کی صورت میں ہے اور خط کے کھولتے وقت یہ سن گئے ہیں۔ اس کا اختتام یوں ہے:-

"ایک دن صادق کے والد کو ایک خط موصول ہوا ہے۔ یہ خط کیا ہے پوری کتاب ہے۔ علی گڑھ کے ایک طالب علم سید صادق نے صادق سے رشتے کے لئے پیام دیا ہے اور ساتھ ہی اپنے مذہبی عقائد تفصیل سے بیان کر رہے ہیں۔ احمدیہ لکھنے کے کہ جدید تعلیم نے اس کے مذہبی عقائد کو محو کر دیا ہے۔ گاؤں کی تعلیم سے مدد کو شہر سے ہو گئے تھے۔ اس خط کے پڑھنے میں اس کا جوئی ہو گیا ہے۔ میر حال لڑکی کے والدین کو یہ رشتہ قبول کرنے میں دہل تھا۔ لیکن صادق اپنی پہلی کے زویہ میں باپ سے کھلتی ہے کہ اس نے خواب میں دیکھا ہے کہ یہ رشتہ ہو کر رہے گا۔ انجام کار شادی ہو جاتی ہے۔"

ذریعہ احمدی کے والدوں کے اثرات اور درس دہے، اس حد تک کہ برعزت میں اصلاحی تجویزیں قارئین سے نکلی جانے لگیں۔ صرف "تعلیم آباد" میں شاد "تعلیم آبادی" نے "سورۃ النبی" نام کا ایک ناول مرتب کیا۔ جس کا دوسرا اثر پھرا

لیکن یہ جائیداد بھی ایک نہیں پہنچ سکی اور عام طور سے حالی نے تنگ دستی کی زندگی گزاری۔ یوں بھی حالی تو (۹) برس کی عمر میں یتیم ہو گئے جبکہ ان کے والد کی عمر صرف چالیس برس کی تھی۔ اب ان کے سر پرست بھی بھائی بہنوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ اللہ کے اظہار کے بعد معاشی حالت اور بھی تر گئی ہوگی۔ لیکن اسکی ناممکنہ صورتوں کے باوجود حالی کی علمی پیاس نہ بجھ سکی۔ یوں تو حالی نے اپنی تعلیم خدایے کے ساتھ حاصل نہ کر سکے اس لئے کہ معاش کا مسئلہ ہمیشہ سامنے آتا تھا۔ بھر بھی وہ کسی نہ کسی صورت اپنی علمی پیاس بجھاتے رہے۔ لیکن خواب مصطفیٰ خاں شیخو سے ان کی ملاقات نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ وہ روزی اور میں ملازمت دلائی۔ چونکہ شیخو بھی حالی کی طرح غالب سے متور و متشنج کیا کرتے تھے اس لئے دونوں میں ارتباط کا ایک ذریعہ یہ بھی ہوا۔ ویسے شعر و شاعری کی طرف حالی کا میلان ہمیشہ تھا لیکن شیخو کی صحبت نے ان کے اس ذوق کو مزید پھیل گیا۔ وہ اس معاملے میں غالب سے زیادہ شیخو سے متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں:-

”... در حقیقت مرزا (غالب) کے مشورہ و صلاح سے مجھے چند سال غائبہ نہ ہوا بلکہ جو کچھ غائبہ ہوا وہ خواب (شیخو) مرحوم کی صحبت سے ہوا۔“

ان کا احساس یہ بھی تھا کہ جمہور سے اور پادری القافہ و تحورات اور عاصمات خیالات سے شیخو اور غالب دونوں بھڑکے۔ لہذا ان کی شاعری میں یہ صورتیں نہیں تھیں۔ گویا شیخو کی صحبت نے ان کی عقلی نشو و نما میں قابل لحاظ اثرات قائم کئے۔

حالی کی شادی ان کی اپنی ماسوں زاد بہن اسلام النساء ۱۲۵۵ء میں ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر سترہ سال تھی۔ ان محترمہ کے سلسلے میں حالی کا بیان ہے کہ وہ تیز مزاج خاتون تھیں، بھر بھی حالی کے چہرے نے صاحبزادے خواجہ حسین کی شادی بھی اپنے ماسوں کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ گویا حالی کی بیوی اور بہو بھی بیچینی تھیں۔ لیکن دونوں اکثر و بیشتر بخیر بنی ہوئی تھیں مگر حال اپنے کمرے میں بیٹھے پڑھنے لکھنے میں مشغول رہتے۔

گویا حالی پر حال میں اپنی علمی صلاحیت اور زبان و ادب کی خدمت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ جس کا ایک نتیجہ یوں سامنے آیا کہ ۱۹۰۲ء میں انہیں شمس العلماء کے خطاب سے نوازا گیا۔ اس موقع پر مولانا شبلی نے بھی انہیں مبارک وادی۔ بحر حال کو نظام حیدر آباد نے جھلی سار مارا۔ مگر یہ تقریب میں مدعو کیا گیا جس کا موصوف کا قیام چھ مہینے تک رہا۔ وہاں ان کی شان میں سپاندام بھی پیش کیا گیا اور مظلوم ستائش سے بھی نوازا گیا۔ اس سلسلے کی ایک نظم جوشی عبد اعلیٰ ایڈ نے تصنیف کی تھی، وہ ملاحظہ ہو:-

حالی نے اپنی پت میں ایک لائبریری بھی قائم کی ماسوں کے علمی شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔ سر سید کی قرابت نے ان کے متعلقہ ذوق کو اور بھی نکھارا۔ ان کے اصلاحی مصلحت میں سرشت اور چوٹی آئی۔ انہوں نے بھی سر سید کے اخبار

حصہ دیکھ چند چڑھائی کے ناولوں سے سکتے ہیں کہ انہیں جس پر ڈپٹی نذر احمد کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ ”اصلاح النساء“ (رشید النساء) ”نسبت خورشیدی“ (افضل حسین عظیم آبادی) اور ”مصلح خانہ“ (سجاد عظیم آبادی) پر نذر احمد کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

آج ناول کا فن کافی ارتقا پذیر ہو گیا ہے۔ داخلی اور خارجی احوال کے بیان کے لئے اسکی طرح کی تکنیک سامنے آچکی ہے۔ مغرب کے ناولوں میں برقی جاتے والی فنی رموز سے آگاہی عام ہے۔ ایسے میں اردو ناول نے بھی قدمیں لی ہیں لیکن نذر احمد کے ناولوں کی جگہ اس لئے محفوظ ہے کہ یہ وہی وہی ہے جس سے آج کا ناول درست بن رہا ہے۔

ڈپٹی نذر احمد ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو ہمیشہ فعال رہی ہے۔ جس نے زندگی کے افسانہ حالات کا جواں مردی سے متاثر کیا اور اپنی علمی زندگی کو پروان چڑھانے میں ہر طرح کی کاوش کی۔ ان کی جگہ اردو ادب میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہے۔

نذر احمد پر آخر عمر تک خالی کا عمل ہوا۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۰۵ء میں انہوں نے وفات پائی۔

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱۸۳۷ء — ۱۹۱۴ء)

اردو کے پہلے نظریہ ساز نقاد عظیم سوانح نگار اور اہم شاعر الطاف حسین حالی سے کون سا وقت نہیں؟ موصوف کا نام نامی کئی حسینیوں سے اردو تاریخ کا ایک سیر کی باپ ہے۔ ان کا پورا نام خواجہ الطاف حسین تھا اور شخص حالی کرتے تھے۔ ان کے اپنے قول کے مطابق ان کی پیدائش ۱۸۳۷ء میں ضلع کراچی کی مشہور جگہ پانی پت میں ہوئی۔ خاندانی اعتبار سے بھی انہیں عظمت حاصل رہی ہے۔ ان کا سلسلہ نسب ۳۳ واسطوں سے حضرت محبوب انصاری سے ملتا ہے۔ لیکن ان کی والدہ سید تھیں جن کا شمار ۳۶ واسطوں سے حضرت رسول ﷺ تک پہنچتا ہے۔ والد خواجہ ابن دانش تھے اور والدہ سیدہ امت الرسول عرف بابی بی بی تھیں۔

حالی نے نواب عبدالملک سید حسین گجراتی کی ابا پاپے حالات قصیدہ کئے تھے۔ ان خود نوشت میں ہے کہ:-

”خدا شہد الدین ہیں نے انہیں محمد اور سیر حاصل دیات پر گت پانی پت میں اور معتقد پاداشی سوار تھہ پانی پت میں بطور مد و معاش کے اور بہت سی زمین امروہوں آبادی قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے ان کو عطا کی اور منصب قضا و صدارت و تشخیص خر و پا زاد اور تولیت حرارت اعلیٰ جو سوار پانی پت میں واقع ہیں اور خطابات حمیدین ان سے متعلق کردیا۔“

حالی کی غزلیں میں غری اور تنگ کا ایسا احساس ملتا ہے جس کی مثال دوسری اکثر قاعدوں نے کی ہے۔ حالی نگینہ ایسے شخص تھے جو اپنے جذبات پر پورا غور و خواہش کرتے تھے۔ *Sustain* کر سکتے تھے۔ لہذا ان کے یہاں جوانی کا یہاں غلامی کا یہاں محنت کا یہاں محبت کا یہاں جذبات ہیں اور کوئی ایسا شعر نہیں کہتے جس کی مراد میں اظہار قیامت کو پا کر جائیں۔ ظاہر یہ بات عجیب سی لگتی ہے لیکن یہ سچ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو رکھنے میں نکال کی انکار دی دکھائی ہے۔ لیکن اگر کچھ دوسری نگاہیں لیں تو یہ کہ حالی کے یہاں مصطفیٰ اور ملامت میر کی ہے، طرف اور کثرت کے تیرہ توبہ کے ہیں، حق و کذب و عمو و صمیم اور مہذب و سادگی و شیعہ کی ہے۔ ظاہر ہے اس کو اپنے شعر میں دشواری دیتی ہے اور ایک طرف کے ساتھ ان کا احساس ہوتا ہے لیکن یہ بوریات ہے کہ ان کے یہاں غزلوں میں ایک خاص قسم کی تہذیب ملتی ہے جس کا اندازہ لوگ ان کا شعر لکھیں۔

پہلی عالمی جنگ میں مطابق بات ہوئی کہ دو مشن و حاشی کے جذبات کو ہر کے ہیکر میں اٹھانے میں تھرتھرتا ہے۔
 اعتبار سے کام لیتے ہیں، ان اقلیات پر کوئی ضرب نہ چڑ جائے۔ اپنے آپ پر یہ نغمہ شعر کی گفتگو میں رکاوٹ ہو سکتی ہے
 لیکن ایسا ہوا نہیں۔ ذہنی میں چھ اشعار اٹھ کر دیوں جن سے ان کی غزلوں کی عمومی کیفیت کا اندازہ لگا یا جاسکے:

تم کو جزاء عظیم دی گئی ہے کہ لاکھ ضبط

الوقت ۱۰ رات ہے کہ چھپایا جا جائے گا

مجموع جس پر مرد ہے ہیں دو بے واسطہ ہی کہہ اور

عالم میں تھکے لاکھ سہی تو عمر کہاں

میں نے اسے اپنے ہاتھ سے لے کر اپنے گھر لے گیا۔

ہم سب طاقتور نہیں ہیں

لنعم حالی کی طرف توجہ کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ انہوں نے اکثر صفوں میں طبع آزمائی کی۔ مثلاً اردو، فارسی، لغتوں، تاریخ، تفسیر و ترمیم، ہندو وغیرہ۔ ان تمام صفوں میں ان کا تصور ہی ہے جو ان کی شخصیت کے عینی مظاہر ہے۔ رباعیات میں انصاف انداز ہے تو قصبات میں بھی یہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ یعنی اخلاقیات، نظم حالی کا ہر حال میں قیادی تصور ہے۔

عالی سے مراد مجھے کے سلسلے میں یہ بات واضح کی کہ ہماری دنیا میں تو حضرت امام حسینؑ اور شہداء کے بعد صاحبِ پرہیزی چاہئیں لیکن انہیں بہت کڑھل کر کہہ دینا کا نقصان پیدا کرنا مقصود نہیں ہونا چاہئے۔ لہذا انہیں نے انھیں مراد مجھے کہے۔ ان مردوں کی حقیقت گواہیت اہم ہے۔ مرزا غلام علیؒ اور حکیم محمد رضاؒ کے سلسلے میں ان کے شخصی مراد مجھے شایکار کا رجحان دیکھتے ہیں۔

"سیدنی حالی" (ہجوۃ الاسلام) حالی کا وہ شاہکار ہے جسے محمدی فراعہوش نہیں لکھا۔ مجھے تو ایسے لوگ ملے

”مفتدیب الاخلاق“ شمس احمد لکھی مضامین لکھتے، جن کی کاغذیں زیادہ تر سماجیات اور معاشیات کے علاوہ مذہب و تعلیم سے تھیں۔ انہوں نے اخلاقی قیامت اور اقتصاد پر بھی مضامین لکھ کر دیکھے۔ ملحد سوالوں کی زبوں حالی کا ان کا احساس رہا تھا چنانچہ ان سے بھی نظم و اثر میں موضوع بنایا۔ لیکن میں ان امور پر توجہ کرنے سے پہلے حالی کی ادبی خدمات کے باب میں ان کی کتابوں کی ایک تفصیل پیش کر دوں:-

۱] "مسعود شریف" (۱۹۳۳ء) [۲] "تراتیق مصمود" (۱۹۶۷ء) [۳] "چرخ محلی پر مصطفیٰ رائے" (۱۹۷۲ء) [۴] "شہزادہ اسلام" (۱۹۷۴ء) [۵] "مذکرہ روحانیہ" (۱۹۷۵ء) [۶] "طبقات شریعت" (۱۹۷۴ء) [۷] "اصول قاری" (۱۹۶۸ء) [۸] "سپاس اللہ" (۱۹۷۳ء) [۹] "سوانح عمری حکیم بہار خسر" (۱۹۸۲ء) [۱۰] "حیاتِ جدی" (۱۹۸۲ء) [۱۱] "مقدمہ شعر و شاعری" (۱۹۸۳ء) [۱۲] "ایانہ رغائب" (۱۹۹۶ء) [۱۳] "حیاتِ چاند" (۱۹۹۱ء) [۱۴] "مضامینِ حالی" (۱۹۰۶ء) [۱۵] "مقالاتِ حالی" (۲ جلدوں میں) ۱۹۳۳ء میں انجمن شرقی اردو نے شائع کیا [۱۶] "مکتوباتِ حالی" (۲ جلدیں) اسماعیل دہلوی نے ۱۹۲۵ء میں شائع کیا [۱۷] "مکتبِ حالی" ۱۹۵۰ء میں اسماعیل دہلوی نے ہی تیار کیا [۱۸] "مرثیہ غالب" (۱۹۶۹ء) [۱۹] "مذکرہ از اسلام" (۱۹۷۹ء) [۲۰] "مذہباتِ ہند" (۱۹۸۵ء) [۲۱] "بحرِ قلمِ حالی" (۱۹۹۰ء) [۲۲] "ارپنِ حالی" (۱۹۹۳ء) [۲۳] "چپ کی راڈ" (۱۹۰۶ء) [۲۴] "بھاریاتِ حالی" (۱۹۲۲ء) [۲۵] "تکلیفِ نظمِ حالی" (جلد اول دوم) (اس میں ۹۳ قصعات، ۲۲ غزلیں اور ۱۵ رباعیات ہیں۔ بارہ ترکیب بجاورد، چپ کی راڈ، بھی شامل ہیں۔ ۱۹۳۳ء)

حقیقت شاعرانی کی کئی حقیقت ہے۔ دو ایک فرنگوں میں۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ جدید نظم کے بانی ہیں اور عربیہ بھی خاص انشاء کا نگار ہے۔ ہمدرد و تنقیدی بیانیوں انہیں کے نام ہے اور سوانح نگاری کے اولین سہارا بھی سمجھے جاتے ہیں۔ گو مختلف قسم کی اولیات اُن کے حصے میں ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ جو بانی خورشید انہیں حاصل تھا وہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہے۔ تجرید سرسید، دانش کی دانش، اصلاحی اور اخلاقی نقطہ نظر اور بھی مقوم ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے غزلیوں کی شہنی کیفیت کو پورا پورا انداز سے دریافت کر لیا۔ وہ تمام سرمدیہ شاعری پر اصلاحی نظریے ڈالنے لگے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کچھ ردی اور سرمد حسن عسکری بھی انہیں داوے دے دیے ہیں۔ جہاں ایک طرح کی تکلف پائی جاتی ہے۔ ہر جگہ کہ یہ تکلف میر کی نہیں ہے، بلکہ میری ایک نئی کیفیت کا احساس ہوتا ہے انہوں نے خود کہا کہ:

عالمی شخصوں میں شیخوہ کے مستطید ہوا ہے

تاریخ و سیرت مولانا محمد تقی عثمانی

پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے بیواں میریت کی تلاش بے حقی ہوگی اس لئے کہ ان کی سکنے جگہیں نہیں جانتی۔

لیکن ان کی غزوات کا سبب صحیح تو ایسے اشعار کی کمی نہیں۔ یہ بات صحیح لینے کی ہے کہ ہر موافق سے یہ بات ان اور اعتدال صحیح اور غیر موافق سے لے کر ان کے لیے یہ صحیح ہے۔

جنہیں یہ پوری نظم شروع سے آخر تک اذہر ہے۔ اس میں مسلمانوں کی معاشی، تمدنی، تہذیبی اور اخلاقی ترقی پر اظہار خیال بھی ہے، پھر انہیں ایک مختصر صورتوں سے نکلنے کی ترغیب بھی۔ ان کا مافیہ کیا تھا اور حال کیا ہے؟ یہ سب اس مسدس میں موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ ترویج اقوال خیر الہیہ کی

بہت اہم سے تم نے کی آج حالی

کہ یوں کفر کی تم نے بنیاد ڈالی

کہ مومن سے جس مہینیت نکال

یوہاچے میں کرتے ہو یہ خیر و برکت

خدا کی بھی اب چاہئے کچھ تو رحمت

دھشت اے ہندوستان اے ہندوستان بے عزت

رو پٹکے تیرے بہت دن ہم بولیں سیمیں

حالی کی بعض نظمیں بہت مشہور ہیں۔ مثلاً "مناجاتِ یحییٰ" اور "چپ کی داغ"۔ یہ دونوں نظمیں حالی کے شعور اور فکر پر دل ہیں۔

اس میں معلوم ہے کہ اسلام میں یحییٰ کا کیا درجہ ہے۔ لیکن ہندو تہذیب کے زیر اثر اسے کس کا کیا ہے دیکھا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ لگاؤ مشکل نہیں۔ ظاہر ہے کہ یحییٰ کے سلسلے میں حالی کا موقف ان کے تین احرام اور حدودی ہے، جس کو انہوں نے نہایت علمی Pathetic طریقے پر بیان کیا ہے۔ "چپ کی داغ" میں غور تو اس سے غور تو اس کے موضوع پر خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، ان کی مضمونیت کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ موضوعات اور تہذیب کے لحاظ سے حالی جدید نظم کے بانی ہیں۔ جن کے یہاں موضوعات بہت نئے سوال کے گرا بھرتے ہیں اور مہم کے پیچھے جواب یہ ہے کہ جب تک معاشرہ اور ملت نہ ہونے لگی ہیں تو کتنی۔

حالی کی تہذیب کو تہذیب کے اندازہ ہوگا کہ ان کا کینہیں خاصہ بڑا ہے۔ ایک طرف تو انہوں نے مولود شریف اصفیہ کی تو دوسری طرف بعض مناظرے پر بھی کتابیں اور مقالے قلمبند کئے۔ پھر سوانح میں "حیاتِ سعدی" "یادگار غالب" "حیاتِ جاوید" بھی کتابیں لکھیں۔ تنقید میں "مقدمہ شعرو شاہری" "ساتھ توئی، جو ہر زمانے کے لئے تقدیری مشکلِ جاوید ہے۔ ان کی بعض کتابوں میں "قرہانِ موسم" "تاریخِ محمدی پر مصلحتاً رائے" "شاہدِ الہام" "عجائبِ انسا" اور "تذکرہ صحابہ" کی حواشی اچھی سے ظاہر ہے کہ ان سمجھوں میں ایک اسلامی تصور موجود ہے، لیکن ہندو کے جو مصلحت

نے دنی کی شریف صورتوں کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ اس میں ایک بڑی جگہ اور اس کی بنی کا قصہ ہے اور پھر شاہ کی کی گفتگو مکالمے کے طور پر سامنے آئی ہے۔ فی الحقیقت اس کی قدامت پرستی پر منحصر ہے۔ یعنی اس کتاب میں ایسے قصوات ہیں جنہیں ہم فرسودہ کہہ سکتے ہیں۔ تو حیاتِ دھند تفری، جامانہ علاقہ دلیور کی اصطلاح کا چندہ کار قرار ہے۔ اسے ایک ناول کے طور پر بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

حالی کی سوانح نگاری کی طرف رخ دیکھتے تو ان کی خواتین کا حال مزید روشن ہوگا۔ "حیاتِ سعدی" اور دلی کی پہلی یا نہ سوانحِ عمری ہے۔ یہ ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔ انہوں نے انیال ہے کہ اس میں بڑا بچہ ہے، وہ سوانحِ نگاری کے فن پر دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ حالی نے "سعدی" کا انتخاب کر کے دراصل مسلم معاشرے کے ایک دم کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ "سعدی" کی حیثیت جو کچھ دلی سے اس سے ہم آشنا ہیں مثلاً جہاں دو شاعر تھے، انہیں رو جاتی بیٹھا بھی۔ لہذا حالی کی نگاہ ان پر بڑی قربان کے مزاج کے ہیں مطلق ہے۔ یہ سوانح دو حصوں میں منقسم ہے اور اپنے آپ میں دو طرح نکلتا ہے۔ اس میں بعض ایسے قصے بھی درج کر دئے گئے ہیں جن کی حیثیت انسان سے زیادہ دیکھ کر ہے لیکن پھر بھی ہر ناماز اور تہذیب کا گما ہے۔ بہت ہی حکیمانہ ہے۔

"یادگار غالب" حالی کے سوانحی سلسلے کی دوسری اہم کتاب ہے۔ یہ ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئی۔ حالی دراصل غالب کے ایسے سوانح نگار ہوئے جیسے ڈاکٹر جانسن کے لئے باویل۔ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ "یادگار غالب" "تذکرہ ہندو کی جاتی" تو غالب کی تعلیم کے بہت سے گئے تہذیب جاتے۔ حالی نے غالب کو ایک فریق کے طریقے سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ غلطی اور ہمدردی صورت میں۔ وہ کہتے "یادگار غالب" کو غالب کے ماضی کا دفتر کہہ دینا بھی صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ غالب کی شخصیت کے ہر ذوق کا آسان کام نہیں تھا۔ پھر یہ بھی کہ غالب ایک مشکل پسند شاعر تھے جن کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن کی تشریح و توضیح آج بھی آسان نہیں ہے۔ حالی نے ایسے اشعار کی تشریح کر کے ایک طرح سے غالب کی راہ ہموار کی۔ غالب کی دستِ اشرافیہ، روحِ غم اور برداشت کرنے کی کیفیت، ان کا نظریہ اخلاقیات سب ہمہ "یادگار غالب" کا جزو ہے۔ حوالہ یہ ہے کہ غالب کی نفسیاتی اہمیت بھی اہم رہی ہیں۔ کیا جاسکتا ہے کہ آج بھی غالب کی تفہیم میں یہ کتاب ہموار حواہن ہے اور یہ اندازہ لگاؤ مشکل نہیں ہے کہ اس شاہکار تنقید کے اثرات غالب کی حواہن میں کیا کچھ کر رہے ہیں۔ دوسری سوانحی کتاب "حیاتِ جاوید" بھی اہم ہے۔ ایک دیکھ لے لکھ ہو:-

"حیاتِ جاوید" حالی کے سوانحی سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۰۱ء میں نامی پرنس کا پتھر سے شائع ہوئی۔ اردو کی فہم ترین سوانحِ عمریوں میں سے ہے۔ یہ کتاب صرف سرسید احمد خاں کی لائف ہی نہیں بلکہ انیسویں صدی کی تمدنی تہذیب، ادبی، تعلیمی اور سیاسی زندگی کی تاریخ ہے۔ حالی کی دونوں سوانحِ عمریوں کی طرح "حیاتِ جاوید" میں بھی سرسید کے کردار کا ماحول پر توجہ دیا گیا ہے۔ لیکن "حیاتِ جاوید" کی ترتیب میں انہیں ماضی میں رکھ کر اور مشکلات کا سامنا تھا اور "حیاتِ سعدی"

اور بزرگوار غالبؒ سے مختلف تھے۔ کیونکہ مذکورہ بالا دونوں شخصیتیں تقاضا کرتی تھیں اور سرسید کی زندگی معاملات اور واقعات کے جھوم میں گھری ہوئی تھی۔ ایسی نادر حالت میں کسی ایسی سوانح عمری کا مرتب کرنا جس سے واقعات و حقائق واضح بھی نہ ہونے پائیں اور لطافت و پیدائش بھر جوا مشکل امر تھا۔ اچھی اس نگارش کا اظہار حالی نے ریاچہ میں خود کیا ہے۔

حالی کی ایک حیثیت تنقیدی نظر سے سزا کی ہے۔ اس کی کتاب ”مقدمہ شعر و شاعری“ دراصل ایک مقدمہ ہے۔ جو ان کے دیوان کے ساتھ ۱۸۹۳ء میں کانپور سے شائع ہوا۔ یعنی یہ شاعری کا مقدمہ ہے۔ ”مقدمہ شعر و شاعری“ میں ایک طرف وہ مباحث ہیں کہ ادب کا مقصد سے کس حد تک تعلق ہے اور زندگی سے اس کا رشتہ کیا ہے؟ حالی نے ادبی اور مقصدی امور پر زور دیا ہے۔ مسلسل تنقید کا موضوع ہے۔ لیکن اس کے دوسرے رخ پر بھی کچھ ایسے ہیں جو کم فکر سمجھ نہیں۔ انہوں نے سادگی، اصلیت اور جوش کی تعریف کی اور انہیں شاعری کے اہم عناصر سے تعبیر کیا۔ ثولید و بیانی اور وہام کو غیر ضروری قرار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ مثنوی یا دوسرے لوگوں کے حوالے ان کے یہاں جس طرح ہیں وہ ان کے محدود علم کو متنبہ ہیں۔ پھر حقیقی پر انہوں نے جس طرح روشنی ڈالی ہے وہ بھی قابل اعتناء نہیں۔ اس باب میں میں نے ایک تفصیلی مضمون لکھ چکا ہے جو میری کتاب ”معنی سے مصافحہ“ میں شریک اشاعت ہے۔ یہاں چند نکات پر اکتفا کرتے ہوں۔

سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ حالی کے یہاں ہر معاملے میں شائستگی کا پہلو مقدم رہا ہے۔ ان کے یہاں اغراض و مقاصد نہیں ہے۔ لہذا ان کی بولیقت میں (اگر ان کی بولیقت ہو سکتی ہے) توازن کی جڑی اسی ہے اور یہ توازن ان میں جید ہوتا ہے کہ وہ تمام انسانی احوال کا اخلاقی رویے کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ چنانچہ جہاد و رنج اور لکھنے سے ان کی گہری واقفیت ان کے اپنے اخلاقی رویے پر حاوی نہیں ہوتی اور وہ ایک ایسے شعور کے ظہور و ابراز جانتے ہیں جس کی ضرورت انسانی زندگی میں ہمیشہ رہتی ہے۔

اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ حالی جس طرح تجزیس کی بحث کرتے ہیں وہ اپنی تمام تر کمزوریوں کا گویا جید کھولنے ہیں اس لئے کہ ان کی واقفیت کلچر سے نہیں تھی اور ان کا علم لاؤریکا لے لیکر محدود تھا۔ لیکن حالی نے تجزیس کی جس طرح بحث کی ہے وہ اپنے دائرے میں اہم ہے۔ ٹھیک ہے کہ وہ Imagination کے خزانے میں نہیں دیکھ سکتے اور ان کی باریکیوں پر لگا نہیں ڈالنے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ آج ان اصطلاحوں پر جس طرح بحث ہو رہی ہے یا ہو سکتی ہے وہ عظیم المرین احمد کے زمانے کی تحدید سے بھی بہت آگے ہے۔ اس لئے کہ تجزیس میں امور سے مبراہت ہے ان کی تفصیل تو کلچر کے یہاں بھی نہیں ملتی۔ نئے علوم نے اس تصور کا دائرہ بہت وسیع کر دیا ہے اور جیسے جیسے بحث آگے بڑھتی جاتی ہے حالی کے ابتدائی تصورات کا استحکام باقی رہتا ہے۔

حالی نے جہاں اخلاقی پہلوؤں پر زور دیا ہے وہاں زندگی سے ان کی وابستگی کا اتنی ہی شدت سے اظہار کیا

ہے۔ اس سے ایک نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ حالی تو ادب و شعر کو زندگی سے اس طرح جڑے ہیں جیسے ادب سے ہر مخالفت ہو لیکن محاسنات کے اکبر سے پن سے حالی کے نقطہ نظر کا کوئی قطعی نہیں اس لئے کہ حالی انھیں اور یہ شعر کی نہ صرف تیز کر سکتے تھے بلکہ یہ جانتے تھے کہ زندگی کا دھن عمل شعر و ادب میں کسی حد تک باقی ہے اور یہاں نقصان دہ ہو سکتا ہے۔

نواب محسن الملک

(۱۸۳۷ء — ۱۹۰۷ء)

نواب محسن الملک کا اصل نام سید مہدی علی تھا۔ پھر خدا سن علی کے صاحبزادے تھے۔ ان کا خاندان سادات دارہ رہا۔ گویا ایک شیعہ خاندان کے قرو تھے۔ ۱۸۳۷ء میں ۱۲ سالہ تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم بھی ہوئی۔ شیعہ فلسفی میں ملازمت ہوئی پھر مسزہم فکر کے وسیلے سے ترقی کی۔ غور کے بعد چنگا رہی ہوئے اور سرحد دار بھی۔ ۱۸۶۱ء میں تحصیلدار بن گئے۔ مکی و زمانہ ہے جس میں انہوں نے اردو کی اور اہم کہ میں تلمیذ کہیں ایک کا نام ”قانون مال“ اور دوسری ”قانون نوچندانی“۔ یہ علوم کیوں انہوں نے شیعہ مذہب ترک کر دیا اور ایک مرحلے میں بنی ہوئے کا اعلان کیا۔ ”معاذ اللہ“ حقائق ایک کتاب ”آیات بیضا“ بھی تلمیذ کی۔ ۱۸۶۷ء میں مرزا پور میں آئے پھر کلکتہ ہو گئے۔ حیدرآباد کے مرسلار بنگ نے ان کی خدمات حاصل کیں اور تب ان کی تنخواہ وارہ سو (۱۲۰۰) روپیہ مقرر کی گئی۔ پھر کچھ عرصہ وہ پلہ (۱۸۵۰) آگئی۔ انھیں نواب منیر نواز جنگ کا بھی خطاب ملا۔ ۱۸۷۶ء میں راجہ منیر نواز جنگ پور میں آئے۔ پھر ترقی کرتے کرتے پلہ نکل کر پلہ ہو گئے۔ جب سربراہی صاحب پر نواز ہوئے اور نکلے اور نکلے جڑور رہے قرار پائی۔ انہوں نے معدنیات کے تعلق سے کچھ مطالبات اٹھائیں۔ اسی زمانے میں برصغیر کے وزیر سترگبلا اسٹون سے ان کے تعلقات قائم ہو گئے۔ اب حکم سرسید کی تحریک زور پکڑتی تھی۔ ابتدا میں سرسید سے الگ تعلق رہے لیکن پھر آہستہ آہستہ ان کے قریب آتے گئے۔ سرسید بھی ان کی صلاحیت اور عظمت کو خوب سمجھتے تھے۔ یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ مہاراجہ نے اپنا بیٹا زندگی سرسید کے ساتھ ہی گزارا۔ ۱۸۹۸ء میں سرسید کو علی کے انتقال کے بعد کوئی گڑبگڑ کے سرکاری منتخب ہوئے ان کا انتقال ۱۹ نومبر ۱۹۰۷ء کو ہوا اور انھیں سرسید کے قریب ہی دفن کیا گیا۔

نواب محسن الملک نے کالج کی اس وقت خدمت کی جب اس کی مالی مشکلات بہت بڑھ چکی تھیں۔ ایک لاکھ روپے کا ٹھکانہ چکا تھا اور کالج فرقیوں سے زوب کیا تھا۔ نواب محسن الملک متحرک رہے اور چلے آگئے۔ نتیجہ میں اس کی حالت کچھ مدھری بلکہ یکہنا زبانی دوسرے ہو گا کہ ساری مشکلاتیں حل ہو گئیں اور قرض بھی ادا ہو گیا۔

محسن الملک کی خدمت کا اعتزال مولانا حالی نے اس طرح کیا:

ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا علم خوار

مر کر کے ہم قوم کے کام آ گیا آخر

مہدی کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا
اس کو بھی وہی قوم کا غم کھایا آخر
یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں قوموں کے فدائی
وینا کو قاش یہ وہ دکھایا آخر
مہدی کے لئے قوم حزاوار ہے ساری
سکرام ہے کشمیر سے تا داس کھاری

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ محسن الملک نے حیدرآباد کے زمانہ قیام میں ریاست میں غازی کی جگہ اردو
کو سرکاری زبان بنانے کی تجویز دی اور کامیاب بھی ہوئے۔ پھر ان کے وہ مضامین جو "تہذیب الاخلاق" میں شائع
ہوئے وہ اپنی سادگی اور فصاحت و بلاغت نظر کی وجہ سے عام مسلمانوں کے لئے بھی بہت صبر ثابت ہوئے۔ مولانا حالی تو
کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتے تھے کہ ان کی تحریروں سے مسلمانوں میں جوش پیدا ہوا اور وہ جذبہ عمل سے بھی سرشار
ہوئے۔ مولانا شبلی بھی ان کی تحریروں کی تحریروں کا اعتراف کرتے تھے۔ محسن الملک کے خطوط کا ایک مجموعہ "مجموعہ رسائل" کے
نام سے شائع ہو چکا ہے۔

عبد المجید سالک

(۱۸۳۵ء - ۱۹۵۹ء)

عبد المجید سالک کی پیدائش ۱۸۳۵ء میں بنگالہ میں ہوئی۔ لیکن ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ اس کے بعد انہوں
نے اسلامیہ کالج، الہ آباد میں داخلہ لیا اور پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کے علاوہ ڈیگڑی ٹیچنگ فاضل ہوئے۔
سالک کی کئی ادبی جہتیں ہیں مثلاً وہ صحابی بھی تھے، شاعر، نثر نگار اور مقرر بھی۔ ان کا تعلق ریڈیو سے بھی رہا تھا۔
سالک نے ۱۳ برس کی عمر سے شاعری شروع کر دی تھی۔ زیادہ تر وقت صحافت میں گزرا۔ ۱۹۱۲ء میں انہوں
نے ایک ادبی ماہانہ "قانون نیل" کا اجرا پھان کوٹ سے کیا۔۔۔ سبھی جانتے ہیں کہ وہ بچوں کے رسالہ "پھول" کے ایڈیٹر
رہے اور "تہذیب نسواں" کے بھی۔ یہ عرصہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۳۰ء تک ہے۔ اس دوران انہوں نے ادبی ماہنامہ "کلیکٹا" بھی
مرتب کرنا شروع کیا تھا۔ اسے سید امتیاز علی خان نے لاہور سے نکالا تھا۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۷ء تک سالک مشہور روزنامہ
"زمیندار" کے ایڈیٹر رہے تھے۔

جنگ آزادی کے مرحلے میں ایک سال کے لئے انہیں قید کی سزا بھی پیشکش پڑی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں انہوں نے
روزانہ "انقلاب" کا اجرا کیا تھا اور ۱۹۳۹ء تک وہ اس سلسلے سے وابستہ رہے۔

اگلے اس کاظم کا انتظار کرتے رہتے تھے۔

موسم کشمیری مسائل سے بھی الجھتے رہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۳ء تک رہا تھا۔ ان کے اخبار "انقلاب"
کو کشمیر میں پابندی لگادی گئی تھی۔ جب انہوں نے "کشمیری مسلمان" نکالا تو اس پر بھی کشمیر کا بھی اجراء کیا اس پر بھی کشمیر میں
پابندی لگادی گئی۔ وہ اخبار کشمیر میں نہیں آسکتا تھا۔ انہوں نے "مظلوم کشمیر" کا بھی اجرا کیا۔ اس پر بھی کشمیر میں پابندی لگی۔
سالک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انگریزی میں تو دستیں رکھتے تھے غازی اور عربی کے بھی ماہر تھے۔
انہوں نے پنجابی میں بھی شاعری کی۔ ان کے دسے میں ہے کہ "گشتگو کے"۔ صرف آداب سے واقف تھے بلکہ جہاں
کسیں بھی ہوتے اپنی قوت گوئی اور اثرات سے لوگوں کا دل سوا لیتے۔ انہوں نے انھار کے مسائل پر آزادی کے بہت
سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور غرض میں جو کچھ بھی لکھا اس میں گہرائی اور گیرائی نظر آتی ہے۔ لکھنا ہے۔ دراصل ادبی
اعتبار سے وہ حالی اور اقبال وغیرہ سے متاثر تھے اور اردو کے مکالمے سراج پران کی نظر تھی جس کے اثرات ان کی غزلوں میں
دیکھے جاسکتے ہیں۔

انہوں نے ایسے ہی عرصوں کو استعمال کیا، جنہیں تک سک سے درست کہا جاسکتا ہے۔ جہاں ان کی غزلوں
میں کھانگیاں اور ان کی روایت پائی جاتی ہے۔

سالک ادب میں زندگی کے تمام تر پہلوؤں کی نگاہ رہی چاہے تھے اور ان کا موقف تھا کہ ادب زندگی ہی کے
لئے ہے۔ ہندوستانی زندگی سے قریب رہے لیکن اس کی انجمن ہندی کو بھی قبول نہیں کیا۔

"اپنی صحافتی اور ادبی زندگی کی غایت مصروفیت کے بعد وہ انجمن حمایت اسلام کے جرنل ٹول میں رہے اور
پاکستان قلم پیکر بورڈ کے ممبر بھی۔ موصوف نے ان کی زندگی کے بارے میں ایک کتاب لکھی انجمن حمایت اسلام کی۔

سالک کی اکثر کتابیں ۱۹۲۷ء سے پہلے شائع ہوئیں۔ ۱۹۳۹ء کے بعد ۱۹۵۹ء سے پہلے کی کتابیں "چترا"
اور "نیا چاند" ہیں۔ دراصل یہ تقویری تحقیقات ہیں جن کو ترجمہ سالک نے کیا۔ "چترا اور دیگر انشائے" بھی اس زمانے کی
کتاب ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "راہ و معرزل" ہے، جس کا دوسرا ایڈیشن ان کی موت کے بعد شائع ہوا۔ ۱۹۳۷ء کے بعد
انجامت پر نہ رونے والی کتابوں میں ایک سرگزشت بھی ہے جہاں ان کی موعظہ حیات ہے۔ "انگار اقبال" ان کی مشہور کتاب
ہے، جس میں اقبال کی زندگی کے احوال سامنے آئے گئے ہیں۔ خاکوں پر مشتمل ایک کتاب "ایمان کہن" بھی ان کی
بانگ رہے۔ انہوں نے خلافت پر بھی ایک کتاب لکھی۔ نام ہے "مسلم خلافت ہندوستان میں"۔ یہ کتاب ایک تحقیقی سند
کے طور پر پیش کیے سے منظر شدہ ہے۔

میں نے یہ تمام اس دور میں لکھی کہ ان کا ایک ایڈیشن "آف انڈین لٹریچر" لاہور چارم (صفحہ ۶۳ تا ۶۴) اور ۱۹۳۷ء
سے اخذ کئے ہیں۔ ویسے "انڈین لٹریچر" نے ۱۹۳۱ء میں ایک خاص نمبر نکالا تھا اور انجمن "تجدد" نے "انجمن
ترجموں" میں ان کا ایک خاکہ پیش کیا ہے۔ جہاں سے یہ حقائق گہرا ہیں۔

کا انتقال ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء کو امرود میں ہوا۔ ان کی کتابوں میں "الخطاب فرانس" اور "انجیل یمن" ہیں، جو ترجمہ ہیں۔ "تہذیب الاخلاق" کے مضامین ادب ہیں۔ انہوں نے سیاسی مضامین بھی لکھے اور سماجی بھی۔ ان سب میں مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون "پختہ پیل علوم جدیدہ" میں اپنے تعلیمی مقاصد واضح کئے ہیں۔ دینے دینے اور نظریات قرآنی مدارس کی حرکت کے سلسلے کا ایک مضمون ہے۔

عام طور سے اقدار الملک کی تحریر میں تعلیم کی پالی جاتی ہے۔ ان کے مضامین دلچسپ اور قابل لحاظ ہیں۔ کہیں کہیں انگریزی مطالبے کا بھی پتہ ملتا ہے۔ ان کے یہاں غزرواں ہے اور ایک طرح کی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ بقول سید جعفر:-

"مرسید کا مضمون اپنے دور کے تمام باشعور افراد کو موت غمزدہ رہا تھا۔ مرسید کے مقصد اور ان کے نصب العین میں راقی ہر گزیر اور جاہلیت سے جو بوجھنی کہ تہذیبی حیثیت سے مرثا اور بر باشعور فرد اس کی طرف تھپتھپا جاتا تھا۔ جو ان کی صحبت سے مستفید ہو کر وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ اقدار الملک ان لوگوں میں سے ہیں جن پر مرسید کی صحبت کا ہر دھچکا گیا تھا۔ مرسید سے ان کی پہلی ملاقات مراد آباد کے قلعہ کے زمانے میں ۱۸۹۶ء میں ہوئی تھی۔ جب "سائنکھک سوسائٹی" قائم ہوئی تھی تو انہیں اس کا ممبر بنا دیا گیا اور مرسید سے پرنس کا انتظام ان کے سپرد کر دیا۔ جب "تہذیب الاخلاق" جاری ہوا تو اقدار الملک مرسید کے مضامین کا اپنے مضامین کے ذریعے سے پرجا کر رہے تھے۔

مرسید کی تحریروں میں خلوص و صداقت کا ہر ذرہ تھا، اور ان کے بلند مقام میں جو حکمت تھی اس کے اثر سے شاید ہی کوئی ذی حس مصطفیٰ محفوظ رہ سکا ہوگا۔ مومن الملک، حالی، چراغ علی اور اقدار الملک کے مضامین مرسید کی آواز ہزار گنت معلوم ہوتے ہیں۔ "سراج کوثر" میں ان کے نام نے مرسید اور اقدار الملک میں بعض وقت جہاں اختلاف رائے ہو جاتا تھا، اس کے دفاع کرتے ہوئے لکھا یہ اختلاف رائے کا سوال تھا اختلاف طبائع کا نہ تھا۔ مرسید اور اقدار الملک دونوں آزادی اختلاف رائے کے ہاں جو ایک ہی ذہب کے انسان تھے۔"

مولوی چراغ علی

(۱۸۳۶ء - ۱۸۹۵ء)

مرسید کے حواج اور رفیق مولوی چراغ علی تھے۔ ان کی پیدائش ۱۸۳۶ء میں ہوئی۔ یہ کشمیری تھے۔ ان کے اجداد

"سائنکھک صاحب نے تعلیم ہند کی حقیقت کو تسلیم کرنے کے باوجود زبان اور ادب کی تسمیر کو بھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ تہذیب ہند و تمدن اور مسلم تمدن کی دو قسموں ان کے ذہن میں تھی جس کی تقابلی میں ہندوستان کی ایک سیاسی جماعت نے اپنے تمام زرائع صرف کر دیے تھے لیکن دو جہتوں کو اس طرح سے ایک تمدن بھی نہیں سمجھتے تھے جس طرح سے ہندوستان کی ایک اور سیاسی جماعت نے ان دونوں کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس بڑک سیکے پر ان کے خیالات ضرورت اور مصلحت کی بجائے حقیقت پر مبنی تھے۔ وہ ہندو مسلم تمدن کو الگ الگ مصادقات تصور کرنے کے باوجود انہیں ایک دوسرے کے محض متداثرات سے آزاد نہیں سمجھتے تھے۔"

سائنکھک کا انتقال ۱۹۵۹ء میں ہوا۔

وقار الملک

(۱۸۳۷ء - ۱۹۱۷ء)

وقار الملک کا حقیقی نام مشتاق حسین تھا۔ ۲۳ مارچ ۱۸۳۷ء میں امرود میں پیدا ہوئے جو علی میر خاں میں ہے۔ ان کا خاندانی سلسلہ مجدد المومنین سلسلے سے ملتا ہے۔ عبداللہ شاہ جہاں کے وزیر کے ستارہ تھے جن کا نام سید اللہ تھا۔ انہیں کی رسالت سے زیادہ میں رسائی ہوئی تھی۔ کئی چھ مہینے کے تھے کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کے نانا اور علی نے ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ ۱۸۸۵ء میں جب مراد آباد میں تحصیل کا مدرسہ قائم ہوا تو مشتاق حسین رجسٹر داخل کر دئے گئے۔ وہاں چار سال تک ان کی تعلیم ہوتی رہی۔

یوں تو ان کے نانا انہیں انجینئر بنانا چاہتے تھے۔ لیکن غم مصائب کی وجہ سے وہ مزے تعلیم جاری نہیں رکھ سکے اور ایک مجموعہ کی نوکری کے بعد ۱۸۶۰ء میں انکم ٹیکس کے دفتر سے وابستہ ہو گئے۔ پھر ۱۸۶۵ء میں برائوں کے ذہب مراد آباد ہوئے۔ سید جعفر لکھتی ہیں کہ سید والد الملک کے جگہ خالی ہوئی تو مشتاق حسین علی کو کہ چلے آئے۔ یہاں مرسید کے ساتھ کام کرنے لگے۔ ان کے خیالات سے مستفید ہوئے گا انہیں اچھا موقع ملا۔ چنانچہ ۱۸۶۶ء میں "سائنکھک سوسائٹی" کے ممبر بن گئے۔ ۱۸۶۷ء میں ایک مدرسہ "منہج انقلابی" قائم کیا۔ ۱۸۶۹ء میں ایک یونانی خلافت لکھا۔ ۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۹ء تک حیدر آباد میں ایک کام کرتے رہے۔ حیدر آباد میں ان کی عوامی خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے محبوب علی خاص عاشق خشم نے انہیں ۱۸۸۵ء میں خان بہادر کا خطاب عطا کیا اور ۱۸۹۰ء میں حکومت حیدر آباد نے وقار الملک کے خطاب سے سرفراز کیا۔ جب وقار الملک حیدر آباد سے علی گڑھ واپس ہوئے تو کالج اور سوسائٹی کی خدمات میں بدستور مصروف ہوئے۔ یہ زمانہ مشتاق سید جعفر نے "مقالات شیرانی" کے مقدمہ "ادھر چاہت" سے منسلک کئے ہیں۔ ان

انگریزی کتابوں کے اردن کی قاضیت کی سب سے بڑی قاشگاہ تھیں مضامین ہیں۔

یہ طور پر بات صاف طور پر کہی جاسکتی ہے کہ مولوی چراغ علی نے انہیں مقاصد کے لئے کام کیا جو ہر سید کے لئے خاص اہمیت رکھتے تھے۔ بعض جزائی احکامات کو منسوخ کیجئے تو ان کے رد ان کے ایسے ہر رد تھے جنہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

امداد امام اثر

(۱۸۳۹ء — ۱۹۳۲ء)

سید امداد امام نام کا مجلس اثر خطاب شمس العلماء اور نواب بہار گاہ ۱۸۳۹ء کا موطع مسالہ اور پھر شائع ہونے تک پیدا ہوئے سال کے والد کا نام شمس العلماء سید عبد الدین بہادر قادری سیاحی حسن بلگرامی شاگرد سلیم بلگرامی "کاشف الحق" معروف ہے "بہارستان خرم" کی تقریظ قلمبند کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"حضرت مصطفیٰ یعنی جناب شمس العلماء حکیم سید امداد صاحب جو عظیم اکبر جناب شمس العلماء سید وحید الدین خاں بہادر دینی سید امام علی اسی سید بنیہ اللہ انہی سید احمد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ نسبت نسل حضرت زید شہید فرزند ارجمند حضرت امام زین العابدین علیہ السلام ہیں انہی ائمہ اربعین علیہم السلام علیہم الصلوٰۃ کے ساتھ رکھتے ہیں۔"

امداد امام اثر کی باضابطہ تعلیم مدرسہ اسکول اور کالج میں نہیں ہوئی بلکہ محسوس ہے کہ ان کے والد نے پرنسپل نہیں ان کی تعلیم میں دلچسپی لی اور درس دیتے رہے۔ پھر انہیں بیرونی لوگوں کی صحبت بھی نصیب تھی۔

امداد امام اثر کا انگریزی حکومت نے رد پار خطاب سے مرفور اڑ کیا۔ پہلی بار ۲۴ مئی ۱۸۸۹ء میں انہیں شمس العلماء کا خطاب دیا پھر ۱۹۰۹ء میں نواب گاہ۔

موصوف کی تشریح تفسیرات منہ راجد ہیں:

- (۱) "کاشف الحق" (۲) "معراج العکلا" (۳) "نسانت اہل" (۴) "کتاب الاثر" (۵) "کیا ہے زراعت"
- (۶) "نواک دارین" (۷) "مصباح العظم" (۸) "معروف بہ مناظر العاصب"
- (۱) "معراج العکلا" میں ۶۰ غلیظوں کے افکار و نظریات درج ہیں اور وقت آنکھ میں ان کے احوال زندگی۔
- (۲) "نسانت اہل" میں تو جیادنی طور پر ایک عالم ہے لیکن ان میں حکایات و نجومہ غلط و فیرہ ہیں۔ جغرافیہ اور تاریخ کے باعث بھی درج کئے گئے ہیں۔
- (۳) "کتاب الاثر" پھولوں اور ان کی قسموں پر ایک مکمل کتاب ہے۔ اس میں اشجار و اثمار کے فوائد سے

رواں سے مختل ہو کر بنیاد رکھے تھے۔ ان کے والد کا نام مولوی محمد علی تھا۔ چونکہ یہ میرٹھ میں ملازمت کرتے تھے اس لئے وہیں مقیم بھی ہو گئے تھے۔ والد کا انتقال ۱۸۵۶ء میں ہوا جب چراغ علی کی عمر کم از کم دس سال کی تھی۔ ابتدائی تعلیم کا کوئی واضح نظم نہ ہوسکا۔ حالات کے جبر کے تحت انہیں ملازمت حاصل کرنی پڑی لیکن وہ ترقی کرتے رہے اور صوبہ دار تک کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۸۹۵ء میں ہوا۔

مولوی چراغ علی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اسلام کے خلاف لکھنے والوں کے خیالات کو رد کرنے میں میٹر رس نکل قلمبند کرتے رہے۔ انہوں نے ایک یادری کی کتاب محمدی کے دو مجلیات "تخلیقات" کے نام سے ایک کتاب قلمبند کی اور یادری کے جاذب کو گمراہ کن قرار دیا۔ لیکن ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ مرزا قادیانی کی کتاب "میراج احمدیہ" کے سلیب میں مصروف نے ان سے تعاون کیا۔ وہ کچھ شے نہیں آتی۔

مولوی چراغ علی زیادہ تر انگریزی میں لکھتے تھے اور ان کے انگریزی اسلوب کی اکثر و بیشتر تعریف کی جاتی تھی۔ سید عبد اللہ لکھتے ہیں کہ:-

"مولوی صاحب کی اکثر کتابیں انگریزی میں ہیں اور باوجودیکہ ان کی انگریزی تعلیم یا قاعدہ نہ ہوئی تھی مگر یہ بڑے اہل قلم کی انتہا پر یادری کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ان کے مضامین انگلستان کے بلند پایہ رسالوں میں شائع ہوتے تھے اور ان کی تصانیف پر انگریزی رسالوں میں نہایت عمدہ رد و جواب لکھے گئے۔ انہیں جبرانی اور سرائی زبان سے بھی واقفیت تھی۔ اسی زبان وائی کا قیہ تھا کہ ان کے مضامین لسانیاتی تحقیق کے اعتبار سے بڑے عقائد ہوتے تھے، جن میں تحقیق و جست نظر اور تحریر کی پوری پوری خوبیاں موجود تھیں۔ انہیں نے انگریزی میں جو کتابیں لکھی ہیں ان کے نام یہ ہیں:-

(1) Critical Exposition of the popular jehani

(2) Reforms under Muslim Rule

(3) Mohammed-The true prophet

ان کی اور کتابوں کے نام یہ ہیں:-

"تخلیقات" اسلام کی دینی رکتیں "تذکرہ قوموں کی تاریخ" "انجانی باجرہ" "دار یہ قلعہ"

و تحقیق یا ازادہ۔

ایک اور کتاب لکھنے کا ارادہ تھا شمس کا نام "العلوم الجہدہ اسلام" تجویز ہوا تھا مگر موت نے فرصت نہ دی۔ "مراسل چراغ علی" کے نام سے ان کے کچھ رسالے بھی طبع ہو چکے ہیں۔ جیسا کہ پیچھے ذکر کیا ہے مولوی صاحب "تذکرہ جہدہ الاطلاق" کے اہم مضمون نگار تھے اور دراصل ان کی

بھی بحث کی گئی ہے اور بعض پیروں کی تصدیق میں بھی دلی گئی ہیں۔

(۳) ”کیمیائے ذراعت“ کے بارے میں ستر محمد حسین صاحب رقم طراز ہیں:-

”یہ کتاب ضرور اس قابل ہے کہ ہر شخص جس کو ذراعت سے تعلق ہے اور خصوصاً وہ لوگ جو اس فن میں دلچسپی رکھتے ہیں اس کو اپنے پاس رکھیں اور اس کے مسائل پر جو ہندوستان کے کسان سے ضروری تعلق رکھتے ہیں حل کرتے ہیں۔“

(۵) ”غلامدارام“ ایک مذہبی کتاب ہے جو دینی تعلیم میں لکھی گئی ہے۔

(۶) ”مصباح العظم“ میں شیخی عقیدہ کے پس منظر میں مذہب امامیہ اور آل محمدؐ سے تعلق رکھنے والی امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۷) ”کتاب الجواب“ المعروف ”بالمناظر المصائب“ مذہب امامیہ کے پس منظر میں بعض سوالات کے جواب میں غلامدارام نے مختصر کو حجت صاحب کا سامنا کرنا اعلان کیا ہے۔

امدادام اثر کی ”کاشف الحقائق“ مختلف حسین حالی کی ”مقدمہ شعر و شاعری“ کے آس پاس لکھی گئی۔ یہ دو حصوں میں ہے۔ پہلی جلد ۱۸۹۶ء میں طبع استاد آف انڈیا سے شائع ہوئی اور اس کا نام ”بہارِ سخن“ رکھا گیا۔ اس میں مختلف اقوام جہاں کی شاعری کا ذکر ہے نیز اخلاقی و مذہبی و معاشرت سے بھی بحث کی گئی ہے۔ مصروف جان، دانی اور عرب کی شاعری بھی زیر بحث آئی ہے نیز مختلف نکات مثلاً شاعری کی تعریف، موسیقی سے اس کا تعلق، مصوری وغیرہ بھی زیر بحث آئے ہیں اور اس پر تفصیل و باطنی گفتگو کی گئی ہے۔ مصروف کو اس کا احساس تھا کہ مصوری ایک قسم کی شاعری ہے۔

ان امور پر امدادام اثر نے ”موضوعات گفتگو“ کی ہے پھر Objective اور Subjective شاعری کے نکات واضح کئے گئے ہیں، یہ بحث اثر کے اولیات میں سے ہے۔ لفظ ”موضوع“ کی گفتگو کرتے ہوئے اثر نے اس کا احساس دلایا ہے کہ الفاظ کا استعمال جو ایک ہر جہت سے اعلیٰ معلوم ہوتا ہے اچھا شعر نہیں بنا سکتا۔ وہ شاعری کو ایک امر طبعی کہتے ہیں اور اس کا احساس رکھتے ہیں کہ زمانے کے لحاظ سے انداز شاعری میں تبدیلی آتی رہتی ہے اور اس کے اغراض بھی بدلتے رہتے ہیں۔ شعریت کے کئی وجوہ و نکات زیر بحث آئے ہیں جن کی تفصیل دلائی ہے۔ اس کے بعد اثر نے روم، مصر، بغداد، فارس، کے ادبیات کو زیر بحث لایا ہے اور ان کے اہم شعرا پر خصوصی توجہ کی ہے۔ امدادام اثر نے ایرانی ادبیات سے بحث کرتے ہوئے اردو شاعرانہ پر بھی ایک نظر ڈالی ہے۔ کامیابی اور پیچیدگی پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو شاعری کے حراج کو مدعا قرار میں لایا ہے۔

یورپ کے مجدد ہیانت کے علاوہ عربوں کی فہم شاعری پر شرح وسط سے روشنی ڈالی ہے۔

”کاشف الحقائق“ جلد دوم میں حکم فارسی اور فارسی شاعری کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے نیز فارسی اور اردو کی اشعار شاعری کا بھی تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ غزل، مثنوی کے باپ میرزا کاکی، غزل، شیرازی، شعرا،

اردو نثر نگاروں میں جہانگیر صاحب پر بھی توجہ کی گئی۔ اس کے بعد سید محمد بخش حیدر، جہانگیر صاحب، میرزا حسن، حافظ الدین احمد، شیر علی، خسرو، نبیل، جہانگیر، کاشمیری، جہاں الملوی، کوکی، ظفر علی، اور احمد کریم علی ہیں۔ ولی کوٹوالی، الدین، شاعر کہا گیا ہے اور ان کے کلام میں درد، مودا، مصروف، جعفری، مذوق، آتش، سماج کے رنگ کی اجاگریت کی گئی ہے۔ سودا اور میر پر بطور خاص توجہ کی گئی ہے۔ میر کو سلطان احقر لکھتے ہیں۔ ذوق اور غالب پر بھی اچھی گفتگو ملتی ہے۔ آتش پر نکات ڈالی گئی ہیں۔ تصدیق سے بحث کرتے ہوئے فارسی تصدیق نگاروں میں خاں، رودی، خروسی، سلال، انوری، رحمانی، سعدی، وردگانی، پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سودا پر تفصیلی نگار ڈالی گئی ہے۔ فارسی کے قصیدہ نگاروں کا بھی ذکر ہے اور اس باب میں اردو کے بھی شعرا زیر بحث آتے ہیں۔ مثنویوں کے ذیل میں اردو اور فارسی مثنویوں کی نظر رکھی گئی۔ میر حسن پر غندہ بھی توجہ کی گئی ہے۔ سرے کی بحث میں امدادام اثر میرا بھی کے مرثیوں کو نمایاں کرتے ہیں۔

”کاشف الحقائق“ میں ایک طرف تصدیقات سے بحث ہے تو دوسری طرف اس میں ادبیات کا کلیہ منظر نامہ بھی ہے۔ نقدی تنقید کی صورت میں کچھ اردو صاحب سے ملتی ہے۔ مثلاً اپنے کیف و کم کے اعتبار سے اس کی آواز بھی اہمیت ہے۔ حیرت ہے کہ حالی پر ان کے مقدمے کے ذیل میں مسلسل اور سوا اثر گفتگو ہوتی رہی ہے لیکن حالی کے یہاں ”کاشف الحقائق“ اور امدادام اثر ضمنی طور پر بھی زیر بحث نہیں آتے۔ یہ اردو تنقید کا کوئی بھی ہے اور ایہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ امدادام اثر تصعب کا شکار ہے جن دوران کا ذکر ہمیں حالی سے پہلے ہے۔ اس کا احساس دونا ہے۔

میں نے ترقی اردو بورڈ دہلی کے لئے ”کاشف الحقائق“ کی دونوں جلدیں اولیات کی تھیں۔ اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے اس کے مقدمے کو ایک الگ کتابی صورت میں شائع کرنے کی کوشش کی اور کچھ اضافہ کے ساتھ ایک کیشل پبلیکیشن ”دہلی“ نے ”کاشف الحقائق“ ایک مطالعہ ”شائع کر دیا۔ اس کے بھی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ تفصیل کے لئے ان کتابوں سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

امدادام اثر کا دوسرا قسطی قسط ان کی دوسری تصنیفات جن کی فہرست دی جا چکی ہے متنوع اور اہم ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا کوشش اور اس سے پہلے ان کی تعلیم کی ضرورت ہے۔

امدادام اثر شاعر بھی تھے۔ ان کا سرمایہ شاعری بھی وسیع اور محترم ہے۔ اسے موصوف کی پینٹلس کے حوالے سے دیکھنا اور سمجھنا چاہئے۔ ڈاکٹر اختر قادری نے امدادام اثر پر تحقیق کی تھی۔ مقالہ چھپ چکا ہے داتا بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔

امدادام اثر کی وفات ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں آجکلہ ”دہلی“ میں ہوئی۔ ”میرا لکھنؤ“ (۲) صفحہ ۲۹ پر ان کی تاریخ وفات کا شعر اس طرح ہے:

وحید الدین سلیم

(۱۸۵۹ء - ۱۹۱۸ء)

مولانا وحید الدین سلیم کا خاندان سیدوں کا خاندان کے دادا ہجرت کر کے پاک پٹن میں آئے۔ وہیں ان کے والد فرید الدین کی ولادت ہوئی۔ لیکن پاک پٹن سے پہلے پانی پت آ گئے۔ مولانا سلیم کے دادا نے پہلے پانچ اپنا وطن بنایا اور پھر انھوں نے سکونت اختیار کی۔

مولانا وحید الدین کے والد فرید الدین ایک متقی آدمی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سید غوث علی شاہ کی دعا سے حاجی فرید الدین کے یہاں تریخ دادا پیدا ہوئی اور وہ ان کے یہاں لڑکیاں ہی پیدا ہوتی تھیں۔ بھائیوں میں وحید الدین بڑے تھے۔

وحید الدین ایک شاعر بھی تھے۔ پہلے مفتوں تھیں کرتے تھے پھر سلیم۔

سلیم کی پیدائش کی تاریخ کے بارے میں بڑا اختلاف ہے۔ لیکن اکثر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے انتقال کے وقت ان کی عمر ۵۹ سال کی تھی۔

ابتداء میں سلیم نے قرآن شریف حفظ کیا۔ انھیں خطا کرنے والی استیلائی ایک خاتون تھیں۔ بعد میں انہوں نے میر تقی میر کی سوانحی سے فارسی چمکی۔ ان کے والد کا انتقال ان کی مغربی میں ہو گیا۔ ان کی والدہ حضرت غوث علی شاہ کی خدمت میں آ کر تھیں اور حضرت کا کہہ چکا کرتی تھیں۔ مولانا ان کے حالات بہت غراب تھے۔

سلیم ہر قدم پر اپنی ذہانت کا ثبوت دیتے رہے۔ بارہ تیر سال کی عمر میں وہ اپنے ساتھیوں کو نڈل اور انٹرنس کی سطح کے سوالات حل کر کے دیتے۔ کمرہ دار سے شعر و شاعری بھی شروع کر رکھی تھی۔ جب وہ مفتوں تھیں کرتے تھے تو ان کا نام یہ تھا کہ مسلسل اشعار کہہ لیتے۔ انہوں نے ایک بار ایک سو شعر پر مشتمل ایک قصیدہ لکھا اور جب انہوں نے اسے لوگوں کو سنایا تو ان کو بہت داد دی گئی۔ یہ قصیدہ ”قد کر خوشی“ میں موجود ہے۔

سلیم نے ۱۸۸۲ء میں نعل کا امتحان پاس کیا۔ پھر وہ قاضی ہوئے۔ یہ بھی کیا جا چکا ہے کہ انہوں نے ۱۸۸۰ء میں نیک کاٹش کی کچھ دواؤں تک ڈاکٹر بھی چمکی۔ یہ بالکل عجیب ہے کہ انہیں مغربی علوم کی اعلیٰ تعلیم کا ثناء و حور پر عمل نہیں ہوئی لیکن انہوں نے ذہنی رابطے سے غلط طبیعات، کربا اور باطنی میں خاصی مصلو مات فراہم کر لیں۔ انہوں نے انگریز کی کتابوں کے اردو ترجمے بھی کئی اکٹراپے کیا۔

سلیم کی تعلیم جب ختم ہوئی تو وہ الہ مشرق کے استاد ہو گئے۔ پہلی بار ۱۸۸۷ء کا واقعہ ہے۔ پھر ۱۸۹۰ء میں راجہ دھارم دتھ کر کے رام پور آ گئے۔ پھر واپس آئے اور ۱۸۹۳ء میں علی گڑھ۔ انہوں نے پانی پت میں سب

والٹریری اسٹینٹ ہو گئے اور ۱۸۹۹ء مارچ ۱۸۹۹ء تک ان کے ساتھ کام کرتے رہے۔ یہی تاریخ سرسید کی وفات کی ہے۔ ایک صحافی کی حیثیت سے بھی وحید الدین سلیم حروف رسمے ہیں۔ وہ ”معارف“، ”علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ“، ”مسلم گزٹ“، ”ریسندہ“ وغیرہ کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔ ۱۹۱۷ء میں دارالترجمہ، حیدر آباد سے وابستہ ہو گئے۔ ان کی مشہور کتاب ”وضع اصطلاحات“ کی بنیاد پر مبنی۔ اس لئے کہ ”وضع اصطلاحات“ کی ایک کئی کئی نسخوں جس کی مرکزی حیثیت میں مولانا سلیم تھے۔ پھر وہ چندہ دکانیہ کی ایک ممتاز دکان و باندوب اند کی جگہ پر قارئین ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہ دکان ہے کے طلباء جو علمی ذوق پیدا ہوا وہ سلیم ہی کی دین ہے۔

داصح ہو کر سید اشرف حیدر آبادی نے ایک کتاب ”ادوات سلیم“ شائع کی تھی۔ اس سے پہلے ۱۸۳۸ء میں محمد اعلیٰ پانی پتی نے ”افکار سلیم“ نام کی ایک کتاب شائع کی۔ ”مغنی سلیم“ دو جلدوں میں اعلیٰ پانی پتی ہی نے مرتب کی جو ۱۹۱۷ء میں انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع ہوئی۔ ان کی کتاب ”وضع اصطلاحات“ انجمن ترقی اردو ہند نے ۱۹۳۰ء میں شائع کی تھی۔

۱۹۱۷ء کی بات ہے کہ مولانا کے راجوں میں درود ہوا لیکن یہ درود کچھ عجیب قسم کا تھا۔ اس کا علاج دیکھنے کے ذریعہ ہو سکتا تھا۔ جس کے لئے دور آج کی لائے گئے لیکن کوئی لافقت نہ ہوا۔ پھر وہ صبح آج کے جہاں ۲۹ جولائی ۱۹۱۸ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ اور وہیں ان کی آخری قیام گاہ ہوئی۔

یوں تو وحید الدین سلیم کی ساری شہرت ان کی کتاب ”وضع اصطلاحات“ کی ہیں۔ یہ ہے۔ لیکن وہ ایک قابل لفظ شاعر کی حیثیت سے بھی جانے اور جاننے جاسکتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ نظم کے شاعر تھے۔ ان کی غزلیں بھی ریلد کتنی ہیں اور غزلوں کے بھی انہوں نے عنوانات مقرر کئے ہیں۔ ان کا پانچویں تھا کہ لفظ میں جو حروف آئیں ان میں تاخیر نہ ہوا۔ الفاظ ناگوس نہ ہوں، تو بعد صرفی کے خلاف نہ ہوں، اور ان امور پر انہوں نے کافی توجہ کی۔ ہجرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں کچھ غزلیں الفاظ استعمال کئے لیکن ایسے غزلیں الفاظ بھی جائز محفل استعمال کی وجہ سے نفع بخش بن گئے ہیں۔ جیسے جنت، چوہ پت، بھینڈی، بھانجیا، بڑب، وغیرہ۔ ویسے وہ سادگی اور سادگی کا بھی خیال رکھتے تھے۔

ان کی شاعری میں ہندی الفاظ بہت استعمال میں آئے ہیں۔ جیسے لگن، اچھوڑے، ایشیت، پرہت، سہوار، پ، سہوار، لیرہ، مگر بڑی الفاظ اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسے وہ اردو ہی کے الفاظ ہوں جیسے تھیں۔ ہونچے، لیرہ۔ انہوں نے بعض بے حد کسباب خنواں بھی لکھی ہیں۔ ویسے ان کی معارف نظمیں سندھ کے کھانڈے و سمنڈ و بار غلام، گوش ثقیل وغیرہ عام ہیں۔

لیکن ایک بات یہاں یاد رکھنی چاہئے کہ وحید الدین سلیم پانی پتی بنیادی طور پر سہریات سے لکھتے تھے۔ ان کی تمام تر شعری اور نثری تخلیقات میں سہریات حوالہ کی کارکردگی صاف نظر آتی ہے۔ وہ ماہر سہریات نہ تھے لیکن اس سے

ان کی ایک اور تعریف بجا سمیت کی جا رہی ہے وہ "جدید اردو شاعری" ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔ دراصل حالی کی "مقدس شعر و شاعری" ان کی نگاہ میں رہتی تھی۔ مگر نامک دمام سے گئے کسی کما یک لحاظ سے یہ کتاب بہ حالی کے "مقدس شعر و شاعری" کا ترجمہ ہے۔

سرور کا اگلا یہ ادبیات مردود کے بنیاد گذاروں میں ہیں۔ دوسری شخصیتیں جو اس کی تائید کی ضمانت دہی ہیں، دو جی الہامی قادری زور، عبد المجید صدیقی، نصیر الدین شاہی اور عبدالقدیر صدیقی۔ اس ادارے سے کئی گراں قدر کتابیں شائع کیں۔ خود سرور کی صاحب نے بعض ایام کام اس ادارے کے ادارے کے۔ ان کی مشہور کتاب "مرد و مشنری کا ارتقا" بھی وہیں سے شائع ہوئی۔ ایک مختصر کتاب "مرد کی ادبی تاریخ" بھی ہے۔ سران اورنگ آبادی کے کام کا انتخاب "سراج خلق" شائع کیا اور ایک الگ کتاب "سراج اور اس کی شاعری" قلمبندی۔

سرحدی "پبلک اسٹامینٹ رکن مخلوقات" کے حاملہ کے رکن بھی تھے۔ یہاں سے انہوں نے اپنے ناطی نامی "پھولی بن" "مضامین کی" "قہر بہ کلیم" "مرتبہ کر کے شائع کر دیے۔" "مٹی مرچہ رائے سہتہ کی ہاض" "مستاب غنی" "مرتبہ کی۔" جب وہ کشمیر میں تھے تو وہاں کے ادیب سے بھی انہوں نے دوپٹے کی اور چکر کٹائیں شائع کیں۔

عبدالقادیر سرمدی ایک محقق، صاحبِ نظر، کھادور اور درو کے علوم کی حیثیت سے، ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گے۔ ان کی نظر ایک طرف تو عصری ادب پر تھی تو دوسری طرف قدیم سراپے پر بھی ان کی نگاہ رہی تھی۔ انہوں نے گلشن سے لے کر مکتوبات تک کا سفر آزمائی طے کیا تھا۔ ان کی کتابیں ان کی محنت اور علمی صلاحیت کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ تاریخ سے انکی دلچسپی ایک اگے گام حوالہ ہے جس پر جہت کو نظر رکھنا چاہیے۔ انکی بعض کتابیں آج بھی جاری رہنائی کر رہی ہیں۔

مہدی افادی

(,1991—,1992)

مہدی النادری کا مکمل نام مہدی حسنا ہے۔ ان کی پیدائش ۱۹۶۸ء میں گورکھپور میں ہوئی۔ ان کا گھرانہ شیواجی کے ایک سحرزادہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کے والد علی حسن تھے، جن کا انتقال ۱۹۸۹ء میں ہوا تھا۔ انجانی مذہبی آدمی تھے اور سچے سے بھی مشرف ہوئے تھے۔ لیکن چوتھے کے اعتبار سے کورٹ انجیلو نے یس تھے۔ جبکہ ۱۰ مہر دل عزیز بلکین ان کا شمار دوسرے شہر میں ہوتا ہے۔

مہدی کی ابتداء کا عقیدہ مگر ہی پر مبنی لیکن بڑی تیزی سے انہوں نے حدود کے علاوہ وادیاں اور انگریزوں کی زمینیں آباد کرتے ہوئے اصل کی روچھیں تھے اس لئے ان کے لئے یہ کام مشکل نہ سمجھا۔ زندگی میں انھیں شیبہ و خراڑ سے گزرنا پڑا۔ سب سے پہلے انھیں محارم کے پھر تحصیلدار کے عہدے پر فائز ہوئے۔ پھر تو یہ صاحب اپنے آپ میں واقع تھا لیکن یہ ان کے حراج کے مطابق

عبد القادر مری

$$(\mu, \sigma^2) = (\mu_0, \sigma_0^2)$$

عہد القادری کے والد حاجی محمد سرور تھے، جو خزانہ عہد حیدر آباد میں ملازم رہے تھے۔ ان کی دوسری بیوی سے سروری ۱۹ اگست ۱۸۶۰ء کو پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم مولوی محمد حفیظی سے حاصل کی، جو ان کے علاقائی بھائی تھے۔ سنی باطنی اسکول سے دینی اور عربی کا امتحان پاس کیا پھر جامعہ عثمانیہ میں داخل ہوئے۔ ۱۸۷۲ء میں ایم اے اور دینی کرا۱۸۷۹ء میں ایل ایل بی کیا۔ ایم اے میں ان کے ایک ہم جماعت شیخ العزیز قادری زاد بھی تھے۔ اس وقت وہاں کے صدر شعبہ اردو وحید اللہ بن سلیم بنی بقی تھے۔ ان کے بعد مولوی عبدالحق وہاں کے صدر ہوئے۔ سلیم بنی بقی کی سفارش ہی پر وہ جامعہ اسلامیہ میں کچھ رہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۳ء تک رہا۔ پھر اپریل ۱۹۴۲ء میں مسعود بن تہ رسانی میں پروفیسری بھی مقرر ہوئی اور شعبہ اردو کی صدارت بھی لے لی۔ ۱۹۴۸ء میں پھر حیدر آباد واپس آ گئے جہاں انہیں صدارت کی کرسی پر فائز کر دیا گیا۔ ۱۹۶۱ء میں سکندرش ہوئے۔

۱۹۶۲ء میں محی الدین قادری نے ورکے انتقال کے بعد سری نگر میں پوسٹ گریجویٹ شعبے میں جلد سائنس اور
۱۹۶۳ء میں سری نگر آ گئے۔ لیکن اب وہ بیمار بنے۔ لکھنؤ، الگ رام تلکے میں کراہے۔

”ہمارے گویا راجہ ہمارے گھر کے لئے روات ہوئے۔ راستے میں بدلی اور، جسوں میں قیام

تہا اور ہر مارچ کو ہر نگرینے کے لئے وہ اپنے خود بینی مجھے باہمی راست دل کا دورہ پڑا جو بیک

نہایت محبوب اور مہربان ہے۔ ۱۹ ابرامات سہارے میں کسی بچے اللہ کو چارے سے بچا..... جہاں ہر نگر

کے قریب ایک دیوان سے قمرستان میں انھیں سیر و خاک کھا گیا۔ *

سرور کی ایک ذی علم آدمی کا نام ہے۔ انہیں چھٹے چھانے کا شوق ابتدا ہی سے رہا تھا۔ سلیم صاحب کی نظر ہم نے ان کی ملازمتوں کو دیکھی تھی اور یہ بالکل درست ہے کہ انہیں کی تربیت نے انہیں تعلیف و تالیف کی طرف متصرف مائل ہی کیلئے فعال بنایا۔

سرمدی کو کوشش کا لحاظ نہ رکھتے ہیں۔ وہ انکار کر دیتے ہیں کہ سرمدی صاحب نے ان کی انگوٹھیں کم ہوتی جاتی ہے یعنی "وینا کے افست"۔ یہ کتاب ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ سرمدی صاحب نے انجی کتاب میں کربا و پرہیزگاروں کو انکار صرف کیا تو "در اصل" ان کی انگوٹھیں مغربی اربابوں پر بھی تھیں۔ نیز جنس اور چال پالی انسانے ان کی انگوٹھیں دے دیتے، چنانچہ انہوں نے دوسری زبانوں کے انسانوں کو بڑی قسم افراد سے اردو میں ختمی کروانے اور ان کی اشاعت کا انتظام کیا۔ ان کے جاو بجا کہیں ہیں: "جنسی انسانے"، "عاطفی انسانے"، "انگریزی انسانے" اور "فرانسیسی انسانے" (امروز احمد)۔

نہ تھا۔ لہذا اپنی غلامی سے کبھی مطمئن نہیں ہوئے۔

مہدی افادی کی جن شادیاں ہوئیں۔ پھری بی بی عظیم الشان تھیں جو عظیم مہدی کے نام سے معروف تھیں۔ انہیں کی سہالی سے ۱۹۳۸ء میں ان کے حضرات اور مکاتب شائع ہوئے۔ مکاتب میں عظیم مہدی نے وہ خطوط شائع نہیں کئے جو ان کے نام تھے لیکن ۱۹۶۵ء میں "مجموعہ محبت" کے نام سے ڈاکٹر محمود ائیں نے وہ خطوط بھی شائع کر دیے ہیں۔ مہدی افادی بقول فیروز احمد:-

"علی گڑھ تحریک کے ابتدائی زمانے میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال اس وقت ہوا جب اس تحریک کے ادبی مقاصد کے خلاف ایک نیا ادبی میلان ابھر کر سامنے آیا۔ بالخصوص اس طرح ان کی فکر و نظر کا سادہ و سستہ میں رہتا ہے ایک کا تعلق اپنے عہد کی اس فکر و تحریک سے ہے جس میں وقت اور زمانے کی اور زندگی اور ادب کو روح و صحر کا ترجمان بنانے کی کوشش کی۔"

لہذا مہدی افادی کے تصورات ایسے تصادات کے ذریعہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو اس تحریک کا اثر ان کے ذہن پر پڑا ہے تو دوسری طرف جو جو اس سے اختلاف کی نوعیت بھی ابھرتی رہی۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ انہوں نے خود محسوس کیا تھا کہ تاریخ کی تسلسلہ کا ذریعہ "تہذیب الاخلاق" کا پیدا کردہ ہے۔ تحریک کا اثر خود ان کی شخصیت کی تعمیر کا ایک حصہ ہے۔ چونکہ جذباتی احساسات ان کے دل کو مسلسل متاثر کرتے رہے تھے اس لئے عقل پسندی کہیں کہیں رہ جوتی نظر آتی ہے۔ یہ تصورات اور دلائل کی کوشش کا آئینہ ہے۔

ہر طور مہدی افادی کے مضامین جہاں روشن خیالی کا تصور فراہم کرتے ہیں وہیں جذباتی احساسات سے سلب نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان میں ایک طرح کی کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ موصوف کا مضمون "اردو لٹریچر کے ماحر رش" ہمیشہ پڑھا جا رہا ہے جس میں سرسیدؒ، زاہدؒ، حالیؒ اور شبلیؒ کے افکار و سلیکے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح ملک میں تاریخ کا معلم اول میں شبلیؒ کے تصورات کو کم سے کم "اعمال میں سینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شبلیؒ کو اس نے اپنے کے مصنفین میں کس حد تک امتیاز حاصل کیا۔ مہدی نے حالیؒ کے عقلی و ذہنی کی بڑی داد دی ہے لیکن کہیں کہیں اپنے خیال کو جھجکے بنانے کی کوشش نہیں کی۔ ایک مضمون شبلیؒ پر مبنی ہے وہ بھی قابل مطالعہ ہے۔ ایک "لگ مضمون" میں حالیؒ کی ماحر رش چھٹک پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔

مہدی کی نظر میں عقل کے معاملات پر رہی تھی۔ چنانچہ ایک مضمون "فلسفہ میں و عشق و یونانیوں کے عقل و غیر" سے "معرب کیا گیا ہے جس میں محبت Define کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ محبت کے لوازمات کو جوڑنے کی و عقلی سے تعبیر کرنے کی کاوش ملتی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

"محبت کتنی ہی پاکیزہ روش ہو، اس خیال سے خالی نہیں ہوتی کہ کوئی اس کی کافر وائی کا شیدائی

ہو اس کی افکار و خیالات اس کا سربراہ نہ بن سکتا ہے، مبنی سے اس کے دل کو صاف ملتی ہے اور جن سے وہ چھتے جی بھی دست بردار نہیں ہو سکتی۔ اور اگر کہے رہے گی۔ کیونکہ یہ اس کی فطرت میں داخل ہے۔ شان سے آجکل خود نہ گرائے لیکن اگر اتفاق سے گرجائے تو وہ دل میں خوش ہوگی۔ یہ اس کی فطرت کا راز ہے جسے وہی خوب سمجھتی ہے۔ وہ ہوائے ہوائے آجکل میں دماغ اس سے بچنے کا ابعاد غائب کر ملاحظہ نہیں بلکہ وہ چاہتی ہے کہ نظر بھرا کر دیکھے! محرم کا جائزہ نظر ہی ایک طرح کی راد حسن ہے جو ہزار پارہائی کے ساتھ بھی وہ آپ سے لے کر ہے گی۔"

اور اصل یہ Erolie تصورات ہیں جن میں عقل کی کسوٹی پر نہیں پڑھا جاسکتا، خیالات کا رشتہ سرسیدؒ کی تحریک سے جوڑا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک سچائی ہے کہ ادب کی بساط کا ایک بڑا حصہ محبت و عورت اور اس کے لوازمات سے عبارت ہے۔ مہدی افادی اپنی نیرنگیوں کی وجہ سے آج بھی پڑھے جاتے ہیں اور یہ ان کی خوش فہمی ہے۔ مہدی افادی کا انتقال ۱۹۶۱ء میں ہوا۔



ذریعہ کی۔ سچائی ٹھیکو نے ۱۸۲۳ء میں کالج کے قیام کی سفارش کی اور ۱۸۲۵ء میں کالج قائم ہو گیا۔ لیکن اس کے مقصد میں
 ہوئے۔ جلد ہی کالج کے ترقی کی اور ۱۹ جولائی ۱۸۳۶ء میں یورو ٹمپ کے طلبہ کی تعداد ۱۳۰ تھی اور ایک سال مزید گزرنے
 کے بعد ۲۰۳ ہو گئی۔ ۱۸۳۹ء میں دوسرے مضمونات کے ساتھ ساتھ برٹش رینجمنٹ کالج میں ملازمین نے ایک
 انگریزی شعبے کا اضافہ کر دیا۔ یاد رہے کہ ۱۸۳۵ء تک سرکاری و غیر سرکاری مدرسوں میں مشرقی علوم اور زبانوں کی تعلیم
 دی گئی زبانوں میں ہی ہوتی تھی اور انگریزی زبان کی حیثیت ثانوی تھی۔ لیکن ۱۸۳۵ء میں گورنر جنرل لارڈ ہیلنگ نے یہ
 سلسلہ ختم کر دیا اور اب ہل دس سال انگریزی تعلیم کے لئے مخصوص ہو گئے۔ لیکن لارڈ آکھنڈ جب گورنر جنرل ہوئے تو
 انہوں نے دیہی زبانوں میں بھی تعلیم کی اجازت دے دی۔

۱۸۴۱ء میں، بڑوں اس کالج کے پرنسپل ہوئے اور پھر دیہی زبانوں اور انگریزی کے امتحانات بھی الگ الگ
 سطح پر ہونے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس سے اردو کو خاصا فائدہ ہوا۔ مغربی علوم سے دلچسپی کی وجہ سے دیہی زبانیں اکتساب
 کر سکتے تھیں۔ پھر یہ ہوا کہ انگریزی متنکرت اور عربی کی معیاری کتابیں اردو، بنگالی اور ہندی میں ترجمہ ہونے لگیں۔
 ایک انجمن بھی قائم ہوئی جس کی مجلس انتظامیہ میں مسزنی، مکاف، بی کرانت، دانی سیاریوٹا، ڈی بیلسن کوسٹن اور کاناٹھ
 ٹیلور اور ایف جیڑس تھے۔ جیڑس انجمن کے سربراہی بھی تھے اور دہلی کالج کے پرنسپل بھی۔ اس انجمن کا مقصد ۲۰ دہلی کالج
 دیکھ کر انیسویں سو سال کی بھی چار سو سال اس ادارے سے ۱۸۹۸ کتابیں شائع ہوئیں۔ تفصیل یوں ہے:-

- ۱۱۔ "دیکھ کر سو سال" نے تقریباً ۱۸۹۸ کتابیں کھسکا کر شائع کیں۔ ان کتابوں میں چودھری پر تقریباً
- ۱۵۔ خوب سے کتابیات، طبیعات اور کیمیا پر ۲۰، باطبیات پر ۱۰، قانون پر ۱۰، جغرافیہ پر ۵، نظم و نیت
- پر ۱۲ کتابیں کتابیات، طبیعات، دھرمیات، صرف دیکھ کر طبیعات اور مشاہیر کے تذکرہ
- سے متعلق ہیں۔ ان کتابوں نے کوئی بار اور دہلی میں مغربی علوم کے فروغ کی راہ ہموار کی اور
- پہنچے طور پر ایک کتاب کا باعث بنیں۔"

جیڑس نے دیہی زبانوں کے ذریعہ مغربی علوم کی ترویج و اشاعت کا بے حد اہم کام سر انجام دیا اور جب وہ
 انگلستان چلے گئے تو ڈاکٹر اسٹراپر گھرانہ کے جانشین ہوئے۔ انہوں نے بھی علمی، سوسائٹی، مخصوصی و دلچسپی لی اور نصاب تعلیم
 کی اصلاح کی، "انٹرنیٹ" بنائی، "ایڈیٹ کیا۔ جس سے کوشاں نصاب کیا۔ ایک پریس بھی قائم کیا اور ایک ہفت روزہ
 "قرآن السعدین" جاری کیا۔ ان کے بعد ٹیلر ہیڈ ماسٹر ہوئے جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں جاکر دہلی گئے۔ مسز ٹیلر
 نے ۳۲ سال اس کالج کی خدمت کی۔ اس ضمن میں مولوی حیدر الحق لکھتے ہیں:-

"مسٹر جیڑس، ڈاکٹر سپر ہیڈ ماسٹر ٹیلر یہ کالج کے ٹیچر پرنسپل ایسے گزرے ہیں کہ انہوں نے
 کالج کی کئی خدمت کی اور اس کی ترقی و اصلاح میں دل سے کوشش کی۔ طلبہ اور اساتذہ ہر

دہلی کالج

سر سید نے سائنس کا مفہوم سائنس کی ترقی اور وہ چاہتے تھے کہ شعر و ادب کے ساتھ سائنسی تعلیم کا جدید نظام
 قائم کیا جائے۔ انہوں نے اپنے طور پر بہت کچھ کیا لیکن جی بات یہ ہے کہ شمالی ہندوستان میں دہلی کالج کی خدمات
 نہایت وسیع اور اہم ہیں۔ ہم یہ جان چکے ہیں کہ فورسٹ ولیم کالج کا قیام اس لئے عمل میں آیا تھا کہ انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی
 کے محض اہمیت سے نہ رہیں بلکہ ہندوستانی زبان و سرائے دلچسپ سے آکھیا ہو کر ہندوستان میں برطانوی سامراج کے استحکام
 کی کوششیں کریں۔ لیکن انگریزوں کی ایسا غایت نے بھی ہندوستانیوں خصوصاً اردو سرائے کی ترویج اور اس کے حوالہ کی
 تشکیل میں نمایاں رول ادا کیا۔ لیکن دہلی کالج کے قیام کا بنیادی موقف علمی اور سائنسی تھا۔ اس ادارے کے قیام سے اردو
 کے وسیلے سے اکثر مغربی علوم سامنے آ گئے۔ ریاضی، سائنس، فلسفہ اور جیت وغیرہ کی تعلیم شروع ہوئی۔ اس کالج کے
 اثرات کے تحت طبعیات، کیمیا اور ریاضیات، جہنم و سیاسیات، تاریخ، سوانح، جغرافیہ، صحافت، تیز و ریاضیات، خاصاً اردو صرف
 کیا جانے لگا۔ اس لئے دہلی کالج کو انگریزی ہندوستان میں نشا و نشانی کا پہلا ذریعہ سمجھا جاتا ہے تو یہ سمجھنا غلط نہیں۔ دہلی کالج
 کے قیام کے بعد ہندوستان کی مختلف زبانوں کے علوم کی کتابوں کا معاملہ سامنے تھا۔ ظاہر ہے کہ اب تک دیہی زبانوں میں
 مختلف علوم کی کتابیں مکتا تھیں، لہذا اس کی طرف توجہ کی گئی۔

دہلی کالج کی ابتدا دسبر قادی الدین سے ہوئی۔ یہ ۱۸۶۳ء میں دہلی میں قائم ہوا اور قادی الدین خاں کے
 سرپرستی میں تھا۔ قادی الدین خاں نے ۱۸۶۳ء میں دہلی کالج کے قیام میں بڑا رول ادا کیا۔

کا پڑاؤ تھا اور شہر والے بھی اس کا ادب کرتے تھے۔ خاص کر مشرقی شیعہ کی اصلاح اور اردو زبان میں مغربی علوم کے ترجموں کے متعلق مسٹر بھروسہ اور ڈاکٹر پیر گھڑے جو بے ریا کوشش کی اور موت کا تلوار تہہ رہے۔“

[illegible]

”دہلی کا کالج“ دونا کفرنا نسلچین سوسائٹی اور صحیح فوائہ العام قیوں اور اوروں کے سرگرم اراکین میں وہ سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں تھے۔ زمانہ طالب علمی میں ہی انہوں نے صحت اور فہانت اور علوم کے ذریعے اساتذہ اور کالج کے بھتیگیوں کو اپنا گروہ کر لیا تھا۔ چنانچہ کالج سے فارغ التحصیل ہوتے ہی ۱۸۵۸ء فروری ۱۸۵۹ء کو انہیں شیعہ علوم مشرقی میں پھیت استاد ریاضی کے رکھ لیا گیا۔ انقر کے وقت کھواچا چاس دو بیہ باہور فقرہوں تک مارچ ۱۸۵۹ء میں بلا حاکر سو روپے ماہوار کر دی گئی۔ فقر کے بعد ان کی معصوم قیوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ مارچ ۱۸۵۹ء میں انہوں نے ”فوائہ الناصرین“ کے نام سے ایک چند روزہ اخبار نکالا۔ پھر دسمبر ۱۸۵۹ء میں ایک ماہوار سالہ جہاد کیا۔ ابتدا میں اس کا نام ”خیر فوائہ ہندو“ تھا مگر بعد میں اس کا نام ”حیت ہندو“ رکھ دیا گیا۔ یہ دونوں چرچے دہلی کالج سے شراوع ہوتے والی اصلاحی تحریک کا ایک اہم جزو تھے۔ ان کے ذریعہ نام چہتر نے علم و ادب کی عالمی قدر خدشات

غرض یہ کہ اردو شکر کا نیا مزاج مرتب ہوا۔ مسلمانین لکھتے جانے لگے۔ روشنی خوانی عام ہوئی اور اس طرح مضمون ادب نے ایک نئی کمرہ ملی۔ رام چندر نے بھیجی جی سے لکھنے لکھانے کی طرف مائل تھے لیکن رمانی سوانحیات کی طرف ان کی توجہ سے اردو کا دلہن وسطی ہو اور وسطی تر علاقے میں کام کرنے کا جواز پیدا ہوا۔ بچوں کو ساری زندگی رام چندر مسلمان سے جو جتنے رہے انہیں مذہب کی تبدیلی ایک اور پہچان کا باعث بنی۔ یہ دھوکے دہندہ دست درک کر کے یہ سائیت اختیار کر لی۔ ان کے ڈراموں و مافقیں یہ بات آتی رہتی تھی کہ جیسا کہ مذہب یا دور متاثر ہے۔ پھر وہی اور وہ قول ہے جو ہندو عقیدے میں ایک سلسلہ ہے اس سے بھی ان کی ٹیڈیست قد دے پر مشغول رہتی تھی۔ انگریزوں کی صحبت پھر خیاالات نے انہیں جیسا کہ مذہب قبول کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اس لئے کہ نئی روشنی و جین سے جو نئی ٹیڈیست ان کا ڈراموں کے ماننے اور چاہنے والوں پر پڑا۔ رام چندر اور رام چندر کو موقع پر ملی کا ایک بکچر بھی سمجھا گیا۔ خود رام چندر ۱۸۷۷ء کے بعد انگریزوں سے کچھ نہ کچھ چل رہا۔ دو گئے تھے اور مظلوم کے ساتھ جوان کا درد یہ تھا اے بھی تمہیں کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے لیکن بہر حال، جیسا کہ آئی ہے۔

رام چندر کی ایک کتاب *A treatise on the problems of maxima and minima* ہے۔

اس کتاب ہے رام چندر کے وقار و کرمیت بلند کیا اور ان کی گونج یورپ تک پہنچی۔ اس وقت یہ کتاب شائع ہوئی تھی اس

اصلی کالج کے نامور اداچیوں میں مولوی ذکا اللہ اور ذریعہ احمد اہم ہیں۔ اس کالج کے دوسرے نامور اداچیں میں صدر الدین خاں، مولوی مملوک علی، امام بخش، صہبائی، مسٹر رام چندر، ڈاکٹر ضیاء الدین، بیارے آل اشوب، پنڈت من پھول اور مولوی کریم اللہ وغیرہ اہم ہیں۔ ذیل میں ان کے بارے میں انحصار سے چھ ماہور تاریخ نگاروں۔

ماہنامہ

 $(\rho, \text{H}^1(\mathbb{R}^n) \rightarrow \mathbb{R})$

دہلی کالج کے ممتاز طالب علموں اور اس کے بھروسہ مندوں کی فہرست میں رام چندر یا اسعد رام چندر کا نام شہرئی قروں میں لکھنے کا احتیاط ہے۔ موصوفہ اہل علم، دہلی نیرساہنس جہاں میں گرائفد و خدماے کے لئے مشہور ہے۔ چاہے ان کی پیدائش ایک سو ست و ہندو مگرانے میں ۱۸۲۳ء میں دہلی میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سندر لال دھرتیہواریست اٹھ یا کبھی کے حکمہ دایاات میں ملازم تھے اور نائب تحصیلدار کے تحصیلدار کے چندوں پر فائدہ ہو کر پانی پت میں رہے۔ اس رام چندر کی عمر تو بڑی کی تھی تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ لیکن ان کی والدہ نے نہایت دیر سے ان کی حورشی کی اور ان کی تعلیم کا مناسب انتظام کیا۔ ۱۸۴۳ء میں رام چندر انگلش اسکول میں داخل ہوئے جہاں انہیں کچھ لطف بھی ملا تھا۔ چھ برس تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ انہوں نے اہل ذہانت اور محنت سے اساتذہ کی نگاہ میں ایک مخصوص جگہ بنا لی اور یہ ضمیمہ ابتدا میں میں و سترس جہاں کی اعلیٰ نگاہ اسکول میں انہیں پڑھانے کا، ضابطہ انتظام تھا۔ رام چندر کے ذاتی مطالعے سے ان کی صلاحیت خیر سمجھائی ہوئی اور وہ ریاضی کے ایک اچھے طالب علم سمجھے جانے لگے۔ لیکن ان کی عمر بھی گیارہ برس کی تھی تو خوشحال راستہ دیکھ کر گوئی بہری لڑکی سے ان کی شادی ہو گئی لیکن بچہز میں انہیں :-

"شادی کے پہلے دن ان کے سسرال سے سوتے کی سات صہریہ چاکلی سونے کی بوتلوں

میں نے اس اور بہت سارے دیگر لوگوں کو

باپ کے انتقال اور اس کی محبوبہ یوں فیضِ حیات کی تاساؤ نگاری پر غوطہ کھینچ رہی تھی۔ انہیں رنجیدہ تو کیا ہوگا لیکن کراؤنی قوت نے انہیں شہجالی رکھا اور وہ کسی صورت سے حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔

جس نے اسے رام چندر راوی کا بیٹا میں داخل ہوئے تو انہیں ۲۰ روپے کا اسرار شپ بھی ملا۔ اس وقت پھر وہ (Souras) کو بیٹا کے پرنسپل تھے۔ رام چندر انگریز بی بی کتابیں کے ترجمے سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں وہ بکر

وقت ان کی عمر ۲۹ برس کی تھی۔ واضح ہو کہ دلی میں مسٹر ایچ بیور نے قدیم فارسی خطوط کے انگریزی ترجمے کی ذمہ داری ان کے سپرد کی تھی۔ وہ ۳۱ دسمبر ۱۸۵۵ء کو دلی کا کالج سے انگلہ ہو گئے اور دلی آ گئے۔ یہاں ٹامس سولی انجینئرنگ کالج میں ہجرت مقرر ہوئے۔ ۳۵ برس کی عمر میں خرابی صحت کی وجہ سے دلی سے دہلی آ گئے اور ۱۲ دسمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی میں انتقال فرمایا۔ دہلی کے بعد ۱۸۶۶ء میں راجہ ہندو سنگھ کے تابعی مقرر ہوئے اور اس طرح یہ پندرہ چلے گئے۔ پھر وہیں ۱۸۷۷ء میں سر شے تعلیم کے ڈائریکٹر ہو گئے۔ جب ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے ۱۸۷۸ء میں دہلی کی ایک برہمن خاتون سے شادی کی۔

۱۸۸۳ء میں رام چندر کی کتاب ”پنجاب و دہلی کا تذکرہ“ شائع ہوئی۔ اس کتاب کا پہلا باب ”عربان عجیب و غریب چیزوں کے“ ہے۔ دوسرا ”مضامین چند آگئیں“ اور تیسرا ”مختلف حالات قاضی ہندو“ ہیں۔ ان اوجاب سے اس کتاب کی ایسے از خود سامنے آ جاتی ہے۔ رام چندر کی تجویزاتی فکر اس کتاب سے عیاں ہے۔ ایک کتاب ان کی ”تذکرہ انکالمین“ بھی ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ۹ مضامین ہیں۔ جس میں ۸۸ سوالات ہیں، باقی مضامین پانچ دن دردم از پاکستان اور ہندوستان کے حالات اور علوم و فنون کے حقیقی ہیں۔ اسی دوران رام چندر سائنسی مضامین بھی لکھتے رہے تھے۔ کچھ دوسری دہائی نے ان کی ایک ”بھوت سنگھ“ کا ذکر کیا ہے۔ ان کی ایک اور کتاب ”اصول گورنمنٹ کے“ بھی ہے۔ دراصل یہ کتاب مولوی کے انگریزی لکچرر کا ترجمہ ہے۔ ان کی ایک علمی کتاب ”اصول جبر و متوازنہ“ بھی ہے۔ ان کے علاوہ متعدد کتابیں ہیں مثلاً ”اصول علم حساب جزئیات و کلیات“، ”سراج الفہم علم طبیبی“، ”رسالہ اصول محوس کے باب شمس“، ”اعجاز القرآن“ وغیرہ۔ لیکن میں خاص طریقے سے ان کی دو کتابیں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ایک ہے ”اعجاز القرآن“ جس میں پانچ فصلیں ہیں اور ایک ترجمہ ہے۔ پہلی فصل میں دلی کی کنیت کی گئی ہے دوسری فصل میں حضرت محمد کی تعظیم اور اہل بیت قرآن کے مباحث ہیں۔ تیسری جبرئیل سے متعلق ہے۔ چوتھی دین الہام کے بارے میں ہے۔ پانچویں میں قرآن ایک پتھر کے کی بحث ہے اور آخر میں یہ ہے کہ معانی قرآن اور حدیث کے یہ حقیقہ دھاریوں کا ندامت قرآن ہے ایک پتھر ہے باطل ہے۔ اس کتاب کے جواب میں بھی کتابیں لکھی گئیں۔ انکی ہی کتابوں میں ایک ”اعجاز القرآن“ ہے جس میں رام چندر کے خیالات کی اصلاح کی گئی ہے۔ ”رسالہ جبرئیل قرآن“ بھی ماسٹر رام چندر کی ایک کتاب ہے قرآن کا ہے۔ اس کتاب کے جواب میں مسلمانوں کی طرف سے تقریباً ۲۰۰ جوابات سامنے آئے۔ دیکھو ماسٹر رام چندر نے جماعت مسلمانہ کو جب بھی رقم کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماسٹر رام چندر مسلمان مذہب اختیار کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ مسلمانوں کے ذہنوں پر غلطی اثرات ڈالنے کے لئے کافی تھا اور وہ مخلوک ہوتے چلے گئے۔ قول جو مباحث کا خداوان پر کیا اثر ہے اس مسئلے کا ایک اقتباس دیکھئے۔

”قبول جو مباحث کے بعد رام چندر کی مذہبی مشغولیات اس قدر بڑھ گئیں کہ پھر انہیں ملک

مولوی ہاناظر علی گور محبت ہند کے مضامین میں ملتا تھا اور پتلیا۔ نوایہ ہاناظرینا کا اجراء ۱۸۸۵ء میں ہوا تھا اور ۱۸۹۵ء میں اس محبت ہند کے ساتھ ہی ساتھ بند ہو گیا۔ اس طرح ان کی زندگی کا اہم دور ۳۳ سال کی عمر سے صرف ۳۳ سال کی عمر تک رہا اور جوانی کا بیشتر بخشی کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی دوسری راہ تک گیا۔ نو

کاش کہ وہ مذہبیات کی طرف اس طرح مائل نہ ہوتے تو پھر ان کے ذہن اور دماغ کو حیرت طبع حاصل ہوتا۔ دیکھئے ان کی نگارشات آج بھی اور دکان سراپا ہیں۔ ہاں ان کی تحریریں گو بہر حال شب و صبح گراں نہ لے سکتی ہیں مگر ان کی کوئی اور ہی ذہن کا کام کر رہا ہے۔

رام چندر ایک شگفتہ اسلوب کے مالک قرار دیے جاسکتے ہیں۔ سائنس دان رکھتے کے باوجود وہ اپنی تحریر کو اصطلاحات سے بوجھل نہیں بناتے۔ سادگی اور روانی ان کی نثر کا جوہر ہے۔ عربی اور فارسی الفاظ اسی حد تک استعمال کرتے ہیں جس حد تک ان کی ضرورت ہے۔ ان کی تحریر میں الفاظ سے پہلے کامل نہیں آتا اور نہ ہی وہ فکر و دہرہ از کار رہاتے ہیں۔ سید عارف نے اپنی کتاب ”ماسٹر رام چندر اور دہلی کے ارتقا میں ان کا مصلحت“ میں ان کے چاروں سے زیادہ مضامین پر تبصرہ کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماسٹر رام چندر اپنی علمی اور ادبی زندگی میں کتنے مصروف رہے ہوں گے۔ لیکن اسلوب اختیار کرنا آسان نہیں۔ چنانچہ وقت ممکن ہے جب لکھنے والے کا ذہن سبک ہو اور تنوعیت پر چڑھ کر گرتے ہو۔ یہ صورت رام چندر کی نثر کا ہی عیاں دیکھی جاسکتی ہے۔

رام چندر اکثر دہلی میں رہتے تھے۔ ان کی صحت بھی اچھی نہیں رہتی تھی۔ مصروفیت بلائی تھی۔ اس سے بھی صحت پر اثر پڑا تھا۔ بعض خوشگوار حالات کی باوجود بھی ان کی صحت پر اثر پڑتا رہا تھا۔ جب وہ چالیس برس کے ہونے تو ان کی صحت اتنی خراب ہو گئی کہ فٹن کی درخواست دے دی۔ یا آخر ۵۹ برس کی عمر میں ۱۸۸۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مولوی ذکا اللہ

(۱۸۳۲ء - ۱۹۱۸ء)

مولوی ذکا اللہ ۱۸۳۲ء میں دلی میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام ذکا اللہ تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ بارہ برس کی عمر کے ہونے تو دلی کا کالج میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں محمد حسین آزاد اور قاضی محمد امجد علی موجود تھے۔ مولوی ذکا اللہ نے جلد ہی ان سے تعلقات پیدا کر لئے۔ دلی کالج کے ماسٹر رام چندر یا سنی کے امیر تھوڑے جاتے تھے ظاہر انہیں کی صحبت میں ذکا اللہ کو بھی ریاضی سے دلچسپی ہوئی۔ اب تک ان کی حیثیت ریاضی کے ایک مشہور استاد کی ہو چکی تھی

امام بخش صہبائی

(۱۸۵۷ء -)

امام بخش صہبائی قادری کے عالم تھے۔ ان کی حیثیت مجدد دین کی تھی۔ بلند پایہ ادیب اور اعلیٰ شاعر سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے شمس الدین کی "احسنی ابلاغت" کا ترجمہ کیا اور شعرائے اردو کا ایک انتخاب بھی شائع کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں شہید ہوئے۔ انہوں نے ستر غزلیں کی شریعت لکھی اور اس باب میں تحقیق کا کام سرانجام دیا۔ انہیں کے شاگرد محمد حسین آزاد اور پیارے ال تھے۔ سرمد نے "آثار المعانی" کے سلسلے میں ان سے مدد لی تھی۔ یہ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں کانچ کے تعلق کی جگہ پر شہید کر دیے گئے۔

پیارے لال آشوب

(۱۸۳۸ء - ۱۸۹۳ء)

پیارے لال آشوب، بزم کا آخری بڑا مشرب۔ ان کی شخصیت بھی دلی کالج سے تھا۔ پیدائش ۱۸۳۸ء بٹانی پالی ہے۔ دینی میں بھی پیدا ہوئے۔ ان کے اساتذہ میں دہلوی ڈاکٹر تھے۔ ماسٹر پیارے لال آشوب کے شہرہ نامور اساتذہ تھے۔ وہ اپنے دینی قربت، ماسٹر رام چندر اور صہبائی سے تھی، غائب کے بھی پیچھے تھے۔ کانچ ہی سے فارغ التحصیل ہوئے تھے۔ لیکن غور کے زمانے میں "کرہ" آگئے۔ ایک سال بعد برٹی چلے گئے جہاں انہیں سرکاری ملازمت ملی تھی۔ پھر وہ پنجاب گئے اور لاہور میں تعلیم کے شعبے میں کیونٹر بڑ ہو گئے۔ پھر دلی آئے اور گڑ گاؤں میں "اکرمیہ ماسٹر ہو گئے۔ ۱۸۹۲ء میں انہیں داکے بیمار کا خطاب ملا۔ ۱۸۹۲ء میں انہیں "پادشہ" اور دلی اور آتے جاتے رہے۔

پیارے لال آشوب مسلم اور سہ تھے۔ ان کی محنتیں زیادہ تر مسلمانوں ہی کے ساتھ تھیں۔ خاکسار اور غلام تھے۔ مراد کے آدمی تھے، لیکن ہمارے ڈچوں، ان کی تہذیبیات میں "اروم چند" (مشفع مصر) اور "قصص ہند" اور "جلدیں لامحدود" ہیں۔ ان کے علاوہ چند کتابوں کے ترجمے بھی کئے گئے "تاریخ انگلستان"، "ازہار قصیری" (فارسی کی ایلف کا ترجمہ)، آشوب رسالہ "مالیشی پنجاب" کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ان کا انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا۔

ایک نثر نگار کے لحاظ سے ان کی اہمیت ہے جنہوں نے ہندوستان کے مختلف ثقافتی اور تہذیبی دھاروں پر نظر رکھی۔ داس تہذیب دہلی کی شان بڑھاتے ہیں اور وہ ان کی نثر نگاری کے سلسلے میں معروف ہیں ان میں پیارے ال کی بھی ایک اہم جگہ ہے۔

مولوی کریم اللہ

دلی کالج میں تعلیم پانے والوں میں مولوی کریم اللہ بھی تھے۔ ان کا وطن پانی پتہ تھا لیکن دلی میں ہی آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے یہاں ایک طبخ تہذیب نگار "انکسار ہند" "تعلیم ہند" "مکتب ہند" "تہذیبیات شعرائے ہند" "محدث نازیباں" "تاریخ شعرائے عرب" وغیرہ مرتب کیے۔ انہوں نے "ہفتادہ" کی تاریخ کی متعدد جلدوں کا ترجمہ بھی کیا تھا۔

مولوی محمد الحق دلی کالج کی اہمیت کا احساس اس طرح دلاتے ہیں:-

"ہمارے ملک میں دلی کالج اس کی سب سے پہلی اور کامیاب نظیر ہے جس کے بعد کسی دلیل و حجت اور تجربے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور یہی وہ پہلی درس گاہ تھی جہاں مغرب و مشرق کا سنگم قائم ہوا۔ ایک ہی حجت کے نیچے ایک ہی جماعت میں مشرق و مغرب کا علم و ادب ساتھ ساتھ چڑھا جاتا تھا۔ اس حلاط کے خیالات کے ہر لئے، مصنوعات کے اضافہ کرتے اور دینی کی اصلاح میں جدوجہد کا سہارا کیا، ایک نئی تہذیب اور نئے دور کی بنیاد رکھی اور ایک نئی جماعت ایسی پیدا کی جس میں سے ایسے بڑے روشن خیال اور باطنی نظر انسان اور مصنف نکلے جن کا احسان ہماری زمان اور ہماری موسماں پر پڑ چکا ہے۔ گارڈ دلی کالج نے بہتاتو کیا ماسٹر رام چندر مولانا آزاد، مولانا نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، ماسٹر پیارے لال، جیسے لوگ پیدا ہو سکتے تھے؟..... یہاں کالج اس جدوجہد میں ہماری تہذیب و علم کی ترقی کے سلسلے میں ایک ایسی کڑی ہے جو کبھی جدت نہیں جانتی۔ گو ہم اپنی خطرات اور دشمنی سے اس کا نام بہادر دیں مگر اس کا کام نہیں بھلا سکتے۔ کیوں کہ اتنی مدت کے بعد بھی ہم اسی راستے کی طرف غور کر رہے ہیں جس پر وہ گامزن تھا۔"

یہ بات جماعت اہم ہے کہ جنگ آزادی سے اس کالج پر خاص اثر پڑا۔ کالج کے کئی اساتذہ اور اس سے وابستہ افراد قتل کر دیے گئے۔ خود کالج میں شب سانس بڑا کر رہ گیا۔ پھر جی بھی نہیں آئی اور ایک طرح سے کالج کا از خود خاتمہ ہو گیا۔ ویسا سے ۱۸۶۳ء میں دوبارہ کھل گیا۔ لیکن بعض مصلحتوں کی بنا پر اسے ۱۸۷۷ء میں مستحکم بنا کر دیا گیا۔



انیسویں صدی کے اواخر
اور
بیسویں صدی کے اوائل میں تحقیق و تنقید

ان کی پرورش و پرورش میں معاونت کی۔ شادی صحت ستائش بہت فائدہ دیا۔ انہوں نے عربی و فارسی میں دسترس حاصل کی۔ انگریزی میں بھی خاصی استعداد پکڑ چکے تھے۔ یورپ کے سفر پرستے تو زبان فرانسیسی سیکھی۔

خیال شاعرانہ بھی کرتے تھے۔ ان کے استاد شاد تھے۔ لیکن یہ سلسلہ تاریخ قائم نہ رہا اور یہ نظر نگاری کی طرف مائل ہو گئے۔ انہوں نے ایک رسالہ ”اویب“ بھی نکالا تھا۔ ان کی شادی نواب واجد علی شاہ کے دربار نواب اتکلام الدولہ مرزا احمد علی کی صاحبزادی سے ہوئی۔ شادی کے بعد وہ چلے گئے۔ شہرہ کے اور مستحق تھک رہے تھے۔

آپ کے بہت سے کارناموں میں ایک کا نام اردو خطبہ صدارت ہے جو انہوں نے ۱۹۲۹ء میں آل انڈیا اردو کانفرنس بمبومیں چھ ماہ تک یہ کام طویل خطبہ ہے اور اس کے صفحات پچھتر سو تھے۔ جس کا کچھ حصہ ”واستان اردو“ کے نام سے رسالہ ”انصاف“ کے قلم نمبروں میں شائع ہوا۔ جس کا آخری باب ”عقل اور ارادہ“ ہے۔ ایک روز نواب ”واستان مجم“ بھی ہے جس کی اہمیت تعلیم کی جاتی رہی ہے۔ شاد ولی الرحمن ولی کا کوئی نے اس باب کی تفصیل اس طرح رقم کی ہے۔

”۱۹۲۷ء میں آل انڈیا تعلیمی کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی تو اس کی صدارت بھی آپ ہی نے

فرمائی اور اپنے خطبہ میں اردو زبان کی اہمیت پر زور دیا۔ پھر ۱۹۱۸ء میں کلکتہ میں ریڈیو سٹیشن میں آپ سے بھی شہادت ملی تھی تو اس موقع پر بھی اردو زبان کی اہمیت پر زور دیا۔

نواب صاحب سر دیانت تھے۔ ان کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں نظام احمد آباد کی طرف سے آپ کو یورپ بھیجا گیا۔ آپ نے وہاں کیمبرج یونیورسٹی کی مشہور راجن پونجی میں اردو کے متعلق تقریر کی اور ایک مضمون بھی لکھا جو اردو رسالہ ”نوائے کیمبرج“ میں شائع ہوا۔ یہ دیکھ کر ان کے سے بھی آپ نے ملاجرت کی اور وہاں میں فارسی میں گفتگو ہوئی۔ دوران گفتگو ایمان کا ذکر آگیا تو آپ نے پروفیسر برائون کو دربار دسترایران کی توجہ دلی۔ پروفیسر برائون نے جواب دیا کہ ”یہ شہوم طالعہ ہمارے انگلستان کی سر سے فارغ ہو کر آپ نے فرانس، انجمن، جرمن، اٹلی وغیرہ کی بھی سیر کی اور وہاں کے مشہور مقامات اور تعلیم گاہوں کو ملا دیکھ فرمایا۔ اس کے بعد آپ مصر شریف لے گئے جہاں راجول پاشا سے ملاقات ہوئی۔ پھر انجمن (فرنگی) پہنچے جہاں اتاترک ”عظمیٰ کمال پاشا سے ملاقات حاصل ہوا۔

اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لئے آپ نے نہ صرف مضامین لکھے اور انجمنیں بنائیں بلکہ عملی حصہ بھی لیا۔ اسی طرح سے ۱۹۳۳ء کے اپریل میں دہلی شریف لے گئے۔ واپسی میں دہلی میں انجمن ایڈیٹر محمد کے یہاں قیام کیا۔ دسمبر ۱۹۳۳ء میں تپ علی گڑھ

کو چھپا آپ کے عتب میں درد اٹھا اور یہ درد ایسا ہلکا ثابت ہوا کہ علاج کی بھی اہمیت نہ آئی۔ یہاں تک کہ چھ ہی صفحے کے بعد درج پر واز کر گئی۔ آپ کی لاش کو لوہا صاحب نے پتھر دانہ کر دیا جو ۱۲ روز کبر کو حضرت شاد کے بیٹوں میں سپرد خاک کی گئی۔

واقعہ ہو کہ ”واستان اردو“ کی اب وہ ادبی اہمیت نہیں رہی ہے لیکن اسے وقت میں اس کی اہمیت سمجھی جاتی تھی۔ اور اصل نواب صاحب نے ”عظمیٰ“ ”رواں“ ”نور“ ”عظمیٰ“ کی پہلی مثال قرار دی تھی۔ یہ بات بھی اب سمجھ گھٹا ہے۔ اس طرح سے انجام کے بارے میں جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ درست نہیں ہے۔ انہیں کم بول کا شمار دہلی کیا گیا ہے لیکن اردو شعر کے حوالے سے وہ استاد نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح کی ایسے نکات ہیں جن پر شاد ولی الرحمن ولی کا کوئی نے غرضت کی ہے، جو مصنف مضمون سے خارج ہے۔ پھر بھی ایک صاحب اسلوب مصنف کی حیثیت سے ان کا ایک امتیاز ہے۔ انہیں انتہا پر جائز سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلوب پرچہ میں ان کی پورے نظر آتی ہے۔

حافظ محمود شیرانی

(۱۸۸۰ء۔ ۱۹۶۶ء)

جموں کی تاریخ کی رو سے شیرانی کسی جگہ سے منسوب نہیں بلکہ انہوں کے جڑواں ملک ضلع مہاراشٹر کے ایک چڑچڑے کا نام تھا۔ مولوی مسوں میں ان ہی کے کچھ لوگ راجپوتانہ میں آباد ہو گئے۔ سابق دیانت جو وہ چلے ناگپور میں کھانا زمین کی ایک جگہ سے شیرانی کے اسلاف میں شیخ احمد کھٹوہ میں پیدا ہوئے۔ شیرانی سب سے پہلے اس لقب کھانہ میں سکونت پزیر ہوئے لیکن بعد میں ایک گاؤں شیرانی کے نام سے رہا۔ محمود شیرانی ۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام تو محمود رکھا گیا لیکن شریف محمد علی نکل تھی۔ ان کا ایک اسم فارسی میں ہے نظام الدین اسماعیل محمود میاں۔

مید الدین خاں (موتی) محمود شیرانی کی شادی ۱۶ مارچ ۱۸۹۶ء کو درحالی شیرانی میں عالم خان ولد عراب خاں شیرانی سے ہوئی۔ اسی سال انہوں نے انگریزی پڑھنا شروع کیا اور انہیں جودھ پڑھنے دیا گیا۔ سیکھ سے انہوں نے ۱۸۹۸ء میں بڈل کا امتحان پاس کیا، پھر مدرسہ المعتمدی جہانپور میں سے علوم اسلامیہ کے حصول کے لئے لاہور آ گئے۔ اور پھر کالج لاہور سے انہوں نے علمی علم اور فنی فاضل کے امتحانات امتیازات کے ساتھ پاس کئے۔ اس زمانے میں انہوں نے ایک اہم نظم فیح عالمین لکھی۔ ایسے امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے انیس کے امتحان پاس کیا۔ ۱۹۰۱ء لندن جانا چاہتے تھے، ان کے والد نے انہیں نامزد کیا لیکن انہوں نے اردو میں ۱۹۰۳ء کو لندن پہنچ گئے۔ ان کے والد چاہتے تھے کہ وہ قانون کی تعلیم حاصل کریں لیکن ان کی خواہش قانون کی بجائے ذرا عبت کی تعلیم حاصل کرنے کی تھی۔ لیکن وہ کالجوں کے بعد لندن میں پکارا ہو گئے۔ سخت پاب ہو کر پھر مصروف کار ہوئے ۱۹ مارچ ۱۹۰۵ء میں مصروف نے رائل ایٹن کتب سوسائٹی کی

دیکھتے حاصل کی۔ اس دور ان فنی تربیت بھی حاصل کی۔ ستمبر ۱۹۰۵ء میں ٹونک میں ان کے قرنداد و خاں بیواؤں کے ہوا خیر خیرائی کے نام سے معروف ہوا۔

قیام ملتان کے زمانے میں قیرونی زیادہ تر مہمان گراہی دار کی حیثیت سے رہے تھے۔ لیکن اپنے تعلیمی معاملے میں کسی بھی پریشانی کو خاطر میں نہ لاتے یہاں تک کہ اپنی عداوت کو بھی نہیں۔ وہ جاتے تھے کہ قانون کا امتحان جلد سے جلد پاس کریں۔ ابتدائی امتحان میں وہ کامیاب بھی ہوتے رہے۔ اس دور ان انہوں نے کچھ نظمیں اور مضامین بھی لکھ دیے۔ ۱۹۰۵ء میں ان کی ایک نظم "خلستان" شائع ہوئی۔ اسی سال انہوں نے شاہد اودھ پرنسٹن کی امریکہ میں ایک نامی تصویر بھی لکھا۔ ۱۹۰۶ء جولائی کو ان کے والد کی اختلاج قلب سے تھکا تک رحلت ہو گئی۔ شیرانی فوراً ہندوستان لوٹ آئے۔ اب تک قانون کی آٹھ ٹرمیں انہوں نے مکمل کر لی تھیں۔ صرف چار باقی تھیں۔ اب سوال والد کے بعد ان کے اخراجات کا قرا جوتھان میں پورے ہونے تھے۔ بہر حال ۱۹۰۵ء میں انہوں نے اپنے والد کے بھائی مسعود خاں نے مالی عداوت کا بعد تو کیا لیکن اسے وہ چوری طرح انجام دے سکے۔ کسی طرح تعلیم جاری رہی۔ اسی دوران انہوں نے کاسٹلی ٹیوشن لاہور لیگس سٹری کے امتحان پاس کئے۔ مسعود خاں اب ان کے اخراجات پورے نہیں کر سکتے تھے لہذا ایسے حالات سے شیرانی کو کافی پریشانی ہوئی۔ اس دوران ایک واقعہ پیش آیا کہ لندن کی ایک وکٹن سے انہوں نے ایک سیب سیب خریدی اور وہاں سے پرانے اشیا کا کاروبار کرنے والی فرم ٹونک اینڈ کمپنی کے یہاں پہنچے۔ یہ تو اب اس فرم کے نئی پوائنٹ میں خریدی اور انہیں کافی فائدہ ہوا۔ اب شیرانی پرانی کتابوں کی تلاش میں رہتے گئے۔ انہیں یہاں پر مشغول حاصل ہونے لگی۔ اسی دوران انہوں نے پرنس بیوریم اور ایف اے آفٹن لاہور میں اسلامی تاریخ پر تحقیق کی ابتدا کی۔ انہوں نے چین اسلامک سوسائٹی کے لئے ایک لاہور میں کی بنیاد بھی رکھی۔

شیرانی ۱۹۰۹ء میں قادری کا ایک امتحان دیا اور دل نہ لے۔ جس سے انہیں آدھے سال شپ مل گئی۔ پھر ٹونک اینڈ کمپنی سے ان کے تعلقات استوار ہوتے چلے گئے۔ ایک مرحلے میں اس فرم میں انہیں باخدا بلطلام دیکھ لیا۔ اسی دوران انہوں نے ڈاکٹر تھریسٹ "تھوریسٹ" کو عرب کے ٹونک اینڈ کمپنی سے شائع کروا دیا۔ اس عداوت سے فائدہ اٹھاتے بھی رہے اور دوسرے شپ خانوں سے استفادے کی سوسہ قس بھی نکالنے رہے۔ ان سے پاس بہت پیسے تھے۔ ٹونک کمپنی نے اب ہندوستان کی پرانی اشیا کو فراہم کرنا شروع کیا۔ تو اس کے لئے مناسب شخص محمود شیرانی ہی تھے۔ اس شخص میں محمود شیرانی لکھتے ہیں:-

"۱۹۱۳ء میں ٹونک اینڈ کمپنی نے یہ پروگرام بنایا کہ حافظہ مداسب ان کے خرچ پر ہندوستان

جا جائے اور وہاں سے پرانی چیزیں جمع کرائیں۔ ان کے ہاتھ میں تصویریں، سورتیاں، دیگر وہ ادب

تیار کریں۔ اس وقت ان کی مجموعی رقم (۸۰) لاکھ تھی۔ شپ پانچ کیلکٹوا جاری رہے کی

کئی یہ شخص ہندوستان جا کر ہاتھ سے نکل جائے۔ اس کا علاج انہوں نے یہ سوچا کہ انہیں ایک بنائے نام رقم کے عوض کچھ میں حصہ دار بنایا جائے۔ اس فرض سے حافظہ صاحب نے سات پونڈ خرچ کر دیا۔ جب ان کو ان کے جس کی رسید ستمبر ۱۹۱۳ء کی نوٹس موجود ہے۔ جاری ایک ڈرامہ انہوں نے مشہور دھاس کے نام کے لارڈی سال موسم بہار میں مذکور کچھ لکھے۔ ٹونک کچھ کر دیا۔ اہل اشیا کی فراہمی میں مصروف ہو گئے اور وہ انہیں کرنے لگے۔ مثلاً کارپورائی کولڈن سے کچھ کے ششم حصہ اور مسٹر جے ایچ ڈی نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ان کی روانگی کی ہوتی چیزوں کی رسید اور بعض فراغت کی اطلاع ہے۔ مثلاً دوایان خانہ کے علی لکھنا ایک ورق سات پونڈ میں فروخت ہوا اور شاہناے کا ایک پرانا ٹیبلٹ پونڈ میں ملے۔ لیکن ان چیزوں میں زیادہ نقصان دہ چیزیں تھیں۔

بہر حال کچھ جنگ عظیم کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوا۔ لیکن ایسے کام انہوں نے اپنے طرز پر کرنا نہیں کئے اور ان کی مقامات جیسے انیسویں، چودھویں، پچیسویں اور مسعود خاں کے ہاتھ رہے۔

آخر میں انہوں نے بھوپال میں آپاؤ کے کاروبار کیا تھا۔ بہر حال ۱۹۲۵ء میں وہ اسلام آباد کالج لاہور میں کچھ رہ گئے۔ جب ان کا شوق جوہر و شکر کا تھا اور انہیں پورا ہونے لگا۔

مظہر محمود شیرانی کے مطابق ان کے تحقیقی اور تصدیقی مضامین رسالہ "اقوان" میں شائع ہونے لگے۔ اس کے بعد رسالہ "اردو" میں انہوں نے تحقیقی کالاس نامہ سرمدی اور شاہد مدح اس کے زمانے میں گردنہ مضامین لکھے۔ جب اہل اشیا عالم کی تصدیق شروع کی۔ اور پرنسٹن کالج میگزین میں مضامین لکھنے کا سلسلہ ۱۹۲۵ء میں شروع ہوا۔ ۱۹۲۸ء میں انہیں مشہور لسانی کتاب "مطاب" میں اردو "اسلامیہ کالج" کی انجمن اردو کی جانب سے شائع کروایا۔ ۱۹۲۹ء میں بیجاپ ٹرسٹ ایک کمپنی نے انہیں اس کتاب پر ایک ہزار روپے انعام دیا۔ ۱۹۳۳ء میں سرمدہ رت فنڈ کام کی "مجموعہ خز" کو عرب کر کے شائع کیا۔ ۱۹۳۹ء میں مشرقی "فرداد الحق" پر مضمون لکھا۔ ان کی کتاب "فرداد حق" پر چار مقالے "بیحدہ اہم ثابت ہوئی۔ ان کے موضوعات میں اردو زبان و ادب، لاری ادب، اسلامی تاریخ، مرضی، ارم الخ اور مسکوکات نیز آثار قدیمہ بطور خاص تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۶ء میں مگوری پر تحقیق شروع کی تھی۔ اس زمانے میں ان کا ایک مضمون "رازہ کے بعد چوں کا اردو ادب کی تعمیر میں حصہ" شائع ہوا۔

شیرانی حقیقت کے باوجود پیسے تھے اور پرانی چیزیں جمع کرنے کا ایک خاص شہور پیدا ہو چکا تھا۔ ان کے خزانے میں چند سال کے اندر ہی قادری اور عربی کے ہزاروں نئے نئے جمع ہو چکے تھے۔ وہ اپنے نئے کچھ بھی اکٹھا کرتے تھے، نیز چھوٹا، بڑا، سورتیاں، کتبے اور قرآن جمع کرنے میں بھی انہیں غامض اور رک تھا۔

شیرانی کے بعض کتابوں میں "پرتوی راجا رام" اور "خانی پاری" بھی اہم ہیں۔ محمد حسین آزاد اور دیوان دوش بہان کے مضامین رسالہ "ہندوستان" میں قسط وار چھپ رہے ہیں۔

اب شیرانی تک پہنچے تھے اور صحت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ ۱۹۴۳ء میں دو تین بار بیمار ہوا مگر جیتا ہوئے۔ آخر میں ان پر حسرت و یاس کی کیفیت طاری واقع ہوئی۔ گو یہ اب بیمار ہی نے جڑ بکڑی تھی۔ آخر شریعہ الہیہ ۱۱ رجب ۱۳۶۶ء کی بارہ تاریخ، ہمدرد جمعہ صبح وفات پائی۔ کچھ کر گئے۔

شیرانی کی تصدیق اور تحقیق کا کردار کی عمر ان کے معارف میں سید مہدی نے ایسے ہی رقم کیے ہیں:-

"پروفیسر شیرانی اور دور کے بہت بڑے فاضل اور محقق تھے۔ وہ افغانیہ کی صحت و صداقت پر جان دیتے تھے اور اس معاملے میں کسی غلطی اور غلط بیانی کو معاف نہ کر سکتے تھے۔ بیانی کی تلاش ان کا ایمان تھا جس کی خاطر انہوں نے بڑی بڑی شخصیتوں کی بھی پرانہ کی جانوں سے ڈرنا وہ اب کی بڑی بڑی شخصیتوں کی اصلاح کی اور ایسے ایسے پختہ نظریوں کے فلسفہ کو ڈالا جن کی بڑی علمی دنیا میں بطور ایک حقیقت ثابت کے رائج اور پکی ہو چکی تھی۔ مگر وہ بہت پردہ افکار نہ کرتے تھے بلکہ رایت کو بھی کام میں لاتے تھے۔ اگرچہ شیرانی صاحب کے تعمیری کاموں کی کچھ کی جیسے پھر بھی ادب اور تاریخ کے بہت سے غلط نظریوں اور عقیدوں کو انہوں نے جس شدت و رفقوت کے ساتھ توڑ اس کی بجائے اگر انہیں..... بہت مشکل سمجھا جائے تو حیات ہوگا۔"

حافظ محمود شیرانی اردو کے ایک ممتاز محقق اور منتقد تحقیق کی حیثیت سے معروف ہیں۔ انہوں نے اردو کی ابتدا کے مسئلے میں جو نظریہ قائم کیا ہے وہ مسلسل زیر بحث رہا ہے لیکن ان کی کسی بھی تحریر کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ عملی اور تحقیقی اعتبار سے ان کا دور قاضی عبدالودود سے کم نہیں ہے بلکہ عربی کی تحقیقی اور اسلوب کی روانی کی بنیاد پر ان کی تحریریں زیادہ پڑھی جاتی ہیں۔ مجلس ترقی ادب دلاہور نے "مقالہ حافظ شیرانی" کے عنوان سے ان کے مضامین شائع کروائے ہیں، جن کی تخریب مظہر محمود شیرانی نے کی ہے۔

میں نے سوانحی اور دوسرے امور مظہر محمود شیرانی کی اسی مرتبہ کتاب سے استفادہ کیا ہے، جو جلد اول میں مضامین کی حوالہ دہی کے عنوان سے اس کتاب کی روشنی ہے۔ تفصیل کے لئے یہ کتاب دیکھی جاسکتی ہے۔ میرے پیش نظر اس وقت جلد دوم ہیں۔ پہلی جلد میں شیرانی کے ہمدرد مضامین اور دوسرے میں آٹھ۔ اگر ان مضامین کو ذہن میں رکھا جائے تو محمود شیرانی کی متواتر حیثیت ہماری نگاہ میں ہو۔ جیسے ان کی جگہ ان کی طور پر تاریخ ادب اور ادبی محفوظ ہے۔

فتح الدین بلخی

(۱۸۸۵ء - ۱۹۸۸ء)

مشہور محقق، مورخ اور شاعر ادیب فتح الدین بلخی نہ لہان کی ایک ذی مرتبت شخصیت کا نام ہے۔ موصوف کی پیدائش ۱۸۸۵ء میں عظیم آباد کے پنجو پٹی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم ان کے والد کے ذریعہ سایہ انجام پائی۔ لیکن اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم کے حصول کے لئے مدرسہ میں داخل ہوئے۔ مہاراجن ایڈووکیٹ ہائی اسکول کے طالب علم ہو گئے لیکن ذاتی اکتساب جاری رہا۔ عربی، اردو اور فارسی نے مہارت تمام پہنچائی اور انگریزی پر بھی دلچسپی حاصل کی۔ جب ان کی عمر سترہ سال کی تھی تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور خاندان کا شیرازہ ٹکڑا گیا۔

فتح الدین بلخی کی دو شاہیاں ہوئیں۔ پہلی اہلیہ بلخی تو رفاطہ جلد ہی اس پرچے سے رخصت ہو گئیں۔ پھر ان کی شادی سید محمد اویس بلخی کی صاحبزادی بی بی رسولین سے ہوئی۔ جن ہی سے ان کی اولاد آ رہی ہے۔

ابتداء میں فتح نے تاتھہ ہار ملٹ کے شعبے میں قانون کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی لیکن جلد ہی اس سے سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد ملٹری اسکول میں معلم ہو گئے۔ یہ ملازمت ایک عرصے تک رہی۔ موصوف اس اسکول میں انگریز فوجیوں کی انگریزی کی تعلیم دیتے رہے تھے۔ اس کے بعد وہ پانچ ملٹری اسکول بھیج دئے گئے جہاں سے سبکدوش ہو کر وطن واپس آئے۔ پھر کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج میں معلم ہو گئے۔ لیکن فورٹ ولیم کالج سے راضی نہیں ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۱۳ء کے درمیان بی ندوی اور بزمِ وفائی کے پریم کورس میں ترہان کی حیثیت سے شامل ہو گئے۔ ۱۹۲۳ء - ۱۹۱۳ء کے درمیان بی جید میان فی جی سے ملے اور بہار میں کوپنبروسا کی نواد میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں سے الگ ہوئے تو سیدان میں پھر قانون کو ہو گئے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ان کے حالات بہت بد ہو گئے اور شمر ادب کی طرف بڑی دل دہی سے متوجہ ہو گئے۔ مظفر بلخی کی کرب میں ہے کہ موصوف نے تصنیفی مقالے ۸۹ شخصیت مقالے ۹۱، ہستی مقالے ۱۲۶، علامتاتی مقالے ۸۹، اساتذاتی مقالے ۱۳۱ اور نظریاتی مقالے ۹۵ تصنیف کیے ہیں۔ دراصل یہ تفصیل اختلاف کتاب کے پیش نظر ہے جسے سید محمد حسین نے تصنیف کیا ہے۔ موصوف نے اس کی تصدیق کی ہے کہ فتح الدین بلخی حقیقت میں قاضی عبدالودود جتھہ میں پروفیسر حکیم الدین احمد اور دانش میں پروفیسر سید حسن عسکری کے ہمدرد ہیں لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان تین حضرات کی کچھ نہ کچھ کیفیت ان کے یہاں موجود نہیں۔ انہوں نے جو بھی تحقیق کا کیا ہے وہ مگر افتد ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہاں موقع نہیں۔ ان کی کتاب "تاریخ کدہ" ایک بے مثال دستاویز ہے جس کی تاریخی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ آپت اللہ جہری کی تصویر ان ہی کی تلاش کا نتیجہ ہے۔ دراصل بہار میں جس

طرح لوگ تحقیق کے جذبہ سے سرشار ہوئے اس کے غمگین دوسروں کے علاوہ ملٹی صاحب کی بھی ذات گرائی رہی تھی۔ ان کی کڑب "تذکرہ نوسان بہار" اکی بھی اہم تھی اور راج بھی اہم ہے۔ عاشقیر کی دختر زیب افسانہ کی سطح میں موصوف نے بہت سے ایسے امور کو رد کیا جو اس کی شاعری سے عبارت تھے۔ غنی کے لکھنے اور ہزلیات کو رد کرتے ہوئے انھیں غفل قرار دیا ہے۔ اس طرح بہار چند اہمیت کی شاعری پر چرچات ماسنے لائے اور تحقیق اختیار سے بڑے اہم سمجھے جاتے ہیں۔ دراصل ان کی کتاب "بہار شاعرانہ" بہار "ایک" اہمیت کی حامل ہے جس میں بڑی جانفشانی سے شعر و شعراء کے احوال و کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

صبح الدین ملٹی کی دلچسپی تاریخ اور کتب سے غیر معمولی تھی۔ وہ آثار قدیمہ کے بہت سے پہلوؤں پر نہ صرف نگاہ رکھتے تھے بلکہ نو ادبات کو محفوظ کرنے کا کمر بھی مانتے تھے۔ ان کی مساعی سے بعض کتب محفوظ ہو گئے جن سے بعد میں استفادہ کیا جاتا رہا ہے۔ خوب فضل انام نے موصوف پر مضمون لکھے ہوئے موصوف کی جمع کردہ فارسی اور اردو کی کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے۔ یہ سب کتابیں تحقیقی لحاظ سے پیدا ہونے والی ہیں ان کی کوششوں سے محفوظ ہو گئی ہیں۔ ملٹی چند لاہور میں لاہور کے شیعہ مخطوطات کے ناظم بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی غلامت کے دوران لگ بھگ ساڑھے ۱۳ سو عربی فارسی اور اردو کی مخطوطات منسلک جمع کیں۔ وہ ۱۹۷۸ء میں یہاں سے سکونت ہوئے۔

کویا موصوف کی مساعی سے کتنی ہی گراں قدر مخطوطے محفوظ ہو گئے جن سے مسلسل فیض اٹھایا جا رہا ہے۔ ملٹی کی ایک حقیقت تھا کہ وہ بھی بے انہوں نے عسائہ مذاق اور حقیقت انداز بیان کی نہ صرف مذمت کی بلکہ بعضوں کے دشمنان کی صفحہ بھی کی۔ زبان و ادب کی غلطیوں، ناقص ہشترنگی، جملہ و زوائد کی کیفیت، ردیف کی غلطیاں توں سے نا آشنا اور سرحد وغیرہ پر گہری نظر ادا کی۔ عروسی مسائل کو حل کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ انجانی اہم شعراء بھی ان سے اصلاح لیتے رہے۔ اس ضمن میں حسن نعم کا بھی نام اہم ہے جنہوں نے عروسی رسوز موصوف ہی سے لکھے۔

صبح الدین کی اکثر مشکل موضوعات کو بھی ملاحظہ اور روانی سے پیش کرنے کی ایک انجانی مثال پیش کرتی ہے۔ ان کی تشریح و الی ہر جگہ قائم رہتی ہے اس لئے کوئی بے یل و ہمت نہیں بنتا۔

موصوف کا انتقال ۱۹۸۸ء میں ہوا۔ شائق بحال ناگپوری نے تاریخ و کلمات کہی:

تاد باش مرے مقرر ملٹی
پاشی آج اپنا حق تحقیق
پوری تحقیق میں فصاحت ہے
کہا کس نے کہ ہے ارتقہ تحقیق
آپ کیا ہے ہے صبح الدین

صبح الدین ملٹی پر ۱۹۸۸ء میں ایک تحقیقی کتاب "صبح الدین ملٹی: حیات اور کارنامے" اور مظفر ملٹی شائع ہو چکی ہے۔ تعلیمات کے لئے اس کتاب سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

حامد حسن قادری

(۱۸۸۷ء — ۱۹۶۳ء)

حامد حسن قادری دراصل مولانا حامد حسن قادری کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی ولادت گجرات میں طلحہ مراد آباد میں یکم مارچ ۱۸۸۷ء میں ہوئی اور وفات ۱۹ جون ۱۹۶۳ء کو کرناٹی میں۔

ان کے والد مولوی احمد حسن دہپور میں وکیل تھے۔ ۱۸۵۹ء میں انھیں راجپور میں عدالت عالیہ کا منصب عطا ہوا۔ قادری صاحب نے ایسے ہی اصول میں انھیں سکول میں اور ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی جو بقول خواجہ احمد غازی "مختصر شاعر، عالم اور محدث تھے۔ ان کا گھر محلہ کھنڈ سال بہت میں تھا جو امریتھالی کے گھر سے بہت قریب تھا۔ ۱۸۹۹ء میں امیر کے گھر میں آگ لگی تو بعض کا قدامت عمل عمل کر ان کے گھر پہنچ گئے۔ خود حامد حسن قادری نے آگ لگنے کی تصویریں قلمبند کی ہے۔"

"بعض تذکروں میں آگ لگنے کا سال ۱۸۹۵ء درج ہے مگر ایسا ہے تو ممکن ہے وہ آگ پہلے لگی ہو۔ ۱۸۹۹ء میں آگ لگانا خود مجھے یاد ہے۔ میں راجپور میں حضرت امیر بہانی کے محلے میں ان کے مکان سے قریب ہی رہتا تھا۔ میرا بھائی کا زمانہ تھا۔ آگ ایسے غضب کی تھی کہ اگر چہ مکان آتش زدہ سے میرا فیصلہ پر تھا۔ — بھر بھی وہاں سے چلے ہوئے کاغذ اکثر میرے ہاتھ آئے تھے۔ اس حادثے سے ہم سب پر عجیب ہوت طاری ہوئی تھی۔ امیر صاحب اور علی صاحب کا کچھ ۱۵ گجلی طرح یاد ہے۔ بعض فقرہ ہیں جن میں شریک ہو یاد ہیں۔"

کہا جاتا ہے کہ اس وقت قادری کی عمر ۱۹ برس کی تھی لیکن اس امر کے اشعار اور کئے بیٹھے تھے۔ انہوں نے ابتدا میں ملٹی اختیار احمد خان راز سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ یہ امیر کے شاگرد تھے۔ حامد حسن قادری کے والد مولوی احمد حسن نے "قصر قاضی جوید" فارسی میں بطور مثنوی تخلیق کی تھی اور اسے قادری صاحب کے نام سے چھپوایا تھا۔ اس مثنوی کا تار ملٹی: "م" "نظم نگین" بھی ہے۔ خاندانی اثرات کے تحت انھیں فارسی کوئی سے بڑی رغبت ہو گئی اور نتیجے میں وہ بڑی آسانی سے ہاتھیں نکال لیتے۔ امیر بہانی کی تاریخ و کلمات میں بھی تھی:

"آن قدح کشتہ با آن ماتی لہذا"

تہ کرتے تھے یہ مہذہبانے کی عقلی
 تو کہیں بچے مرے طفیلوں کا آماج؟
 صفائی کی سزا یہ صاف تاریخ
 خس و خاشاکِ ماضی کا نہیں آج

ابوالکلام آزاد

(۱۸۸۸ء - ۱۹۷۸ء)

ابن کا حقیقی نام نجی الدین احمد تھا۔ ابوالکلام آزاد کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے اسلاف ہیں قوٹی کے تھے لیکن اکبر بادشاہ کے زمانے میں مغلوں کا وہاں سلطنت آکر رہا تھا۔ یہ علم و ادب کی ایک مرکز بنی جگہ ہوئی تھی۔ بہت سے علما کیجے ہو گئے تھے۔ بن عیسیٰ سب میں ایک بزرگ شیخ جمال الدین تھے جنہیں علم حدیث پر بڑی قدرت تھی۔ اس زمانے میں اکبر نے اپنے دین الہی کے سلسلے میں اس سے فتویٰ حاصل کرنا چاہا لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ کچھ شیخ جمال عرف پہلوی دہلوی مولانا آزاد کے مورث اعلیٰ تھے۔ اس سلسلے کی مزید تفصیل کے لئے ایک طویل اقتباس درج کرتا ہوں جس کے لئے معذرت خواہی ہوں:-

"قیام دہلی کے زمانے میں مولانا منور الدین نے اپنی بڑی بڑی کی شادی شیخ محمد ہادی سے کر دی۔ شیخ محمد ہادی شیخ محمد حسن کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کا تعلق مولانا شیخ جمال الدین کے خاندان سے تھا۔ شیخ محمد ہادی مولانا آزاد کے دادا تھے۔ ان کا انتقال دہلی میں ۳۵۰ سال کی عمر میں ہوا۔ مولانا آزاد کے والد کی عمر اس وقت تین یا چار برس کی تھی۔ یہ زمانہ مظہر دور کے خاتمہ کا قریب تھا۔ انگریزی حکومت کا تسلط تقریباً ہندوستان کے چاروں طرف سوچا تھا۔ اس کی پرورش و تعلیم و تربیت ان کے دادا مولانا منور الدین کے یہاں ہوئی۔ ان کا تھوڑا وقت قلعہ میں زیادہ تھا۔ اچھی اور بھول مولانا آزاد کی زندگی کے جو حالات وہ بیان کرتے تھے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باوجود وہ بہت سخیل و غفلت کے سبب شہر کو چھوڑ دیا اور محمد موسیٰ کی کیلئے تھے جو چوتھیں۔ انیسویں صدی کے خلا میں مولانا آزاد کے والد خیر الدین کی شاہانہ حیثیت تھی۔ وہ دینی ہی کے درجے والے تھے۔ لیکن وہ یہاں کے ماحول سے مطمئن نہ تھے اس لئے دینی سے ہجرت کر کے قلعہ چلے گئے اور کچھ عرصہ میں حکومت اختیار کر لی۔ یہیں انہوں نے ایک عرصہ خانقاہ سے شاد کر دیا۔ عرصہ خانقاہ میں شیخ محمد بن خاوری کی رہائش تھی۔ جو اس

ہوئے جن میں عین اذکیاں اور دہلی کے تھے۔ مولانا آزاد اپنا چلنا میں سب سے چھوٹے تھے۔ وہ کچھ عرصہ میں ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت والد الہی کی نگرانی میں ہوئی۔ مولانا آزاد کی والدہ کی بادی زبان عربی تھی اور وہ اپنے بچوں سے عربی زبان میں بات چیت کرتی تھیں۔ اردو زبان انہیں چاہتی تھیں۔ البتہ ان کی والدہ کی مرضی کہ بات چیت کر سکیں۔

مولانا کے والد ۱۸۹۸ء میں کٹر مغل میں سخت بیمار پڑے۔ وہاں کے علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ حزیروں اور مریدوں کے معجزوں سے انہیں علاج کے لئے معین کیا گیا۔ یہاں کچھ دن قیام کے بعد انہیں نکلتے لے گئے۔ مولانا خیر الدین کے مریدوں کی تعداد بہت بڑی تھی اور وہ سب مولانا سے عیدالسیف اور رحمت کرتے تھے اس لئے علاج کے بعد ان کے مریدوں نے ان کو دیکھ نہیں جانے دیا اور مولانا مع اپنے خاندان کے نکلتے میں رہے۔ گئے اور اب یہی ان کا وطن ہو گیا۔ مولانا آزاد کو بھی اپنے والد کے ساتھ نکلتے ہی میں اس گئے۔ ۱۹۰۶ء میں مولانا آزاد کے بڑے بھائی ابو نصر نظام الدین کا انتقال ہو گیا اور ۱۹۰۸ء میں مولانا خیر الدین مولانا آزاد کو قبا چھوڑ کر دیا۔ یہاں سے رخصت ہو گئے۔ مولانا خیر الدین کی وفات کے بعد ان کے مرید مولانا آزاد کو ان کا جانشین بنانا چاہتے تھے مگر مولانا نے انکار کر دیا۔

مولانا کی ادبی زندگی کا آغاز کیا وہ بارہ سال کی عمر سے ہوا۔ پہلے شاعری اور بعد میں نثر کی طرف متوجہ ہوئے۔ شاعری کا شوق مولوی عبد اللہ اور احمد خاں سہروردی نے پیدا کیا۔ یہ مولوی احمد فاروقی چرا کوئی کے شاگرد تھے۔ بن کی بہن مولانا کے یہاں مگر کے کام کاج کے لئے ملازم تھیں۔ اس تعلق سے مولوی عبد اللہ و خاں کی آمد و رفت ہوئی۔

عبد اللہ و احمد خاں بن کی رہائش میں انہوں نے اپنا تخلص آزاد رکھا۔ ابتدائی ماحولوں پر نثری امیر احمد سے امتیاز ملی لیکن ان کے باشندے استاد شوق نوری تھے جن کے بارے میں تفصیل کسی دوسرے صفحے پر ملے گی۔ لیکن مولانا کی سماجی زندگی کافی فعال رہی ہے۔ ۱۸۹۹ء میں "نیچر" عالم جاری کیا۔ ۱۹۰۰ء میں "المصباح" (نمبر ۱۹۰۳ء میں "لسان الصدق"۔ انہی رسالے کی وساطت سے مولانا کی ملاقات مولانا شبلی نعمانی سے ہوئی۔

صحافت اور سیاست کا چرنا اس کا ساتھ ہے۔ ۱۹۰۰ء ابوالکلام آزاد بھی عملی سیاست میں داخل ہو گئے۔ واضح ہو کہ ۱۸۹۵ء میں انہیں مجلس کا مگر بنی قائم ہوئی تو سرسید نے اس کی مخالفت کی لیکن مولانا آزاد کا ٹکڑا میں کے حق میں تھے۔ انہوں نے "الہلال" ۱۳۰۳ء جنوری ۱۹۱۲ء میں نکالا۔ چوسا ہی تھی قیام و غرض بنی۔ اس رسالے کے اثرات دور رہی تھے۔ انہوں نے بڑا نام پیدا کیا۔ اس کے بعد مولانا نے ۱۹۱۵ء میں "الہلال" نکالا۔ گویا یہ دونوں ہی رسالے ملیں اور

سیاسی آئینگی کے لئے یہ محدود مفید ثابت ہوئے۔

”خدا جانے کتنے نئے اور بھاری بحرِ کلمات اور نئی ترکیب اور نئی تشبیہیں اور نئے اسلوب پر
پختہ ای ادبی اور علمی کمال سے حاصلِ زحل کرنا پھر ٹھٹھے لگے اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ کتنے ہی
مکملہ راج الوقت، تن گئے۔ حالی، ثعلبی کی سلاست، سادگی، سرفرازی اور ان کے کمالِ بادی اور مردِ باطن
سب ہانپنے لگے کرتے رہ گئے۔“

مولانا کی تمام نگارشات، اگر پیش نظر ہوں تو انہیں ناگزیر دو رنگ کرنا یا ایک لچک بٹ تصور کرنا چاہئے ہوگا۔ ان کے
خطبے، ان کے ٹکڑے، اور فلسفیانہ جانات، ان کی عربی دانی، ان کی شعرِ محلی، اردو دہری، غازی، الفاظِ بلاغی، قدرت، حافظے کا
کمال، بیان کی جرات اور زندگی سے گہرا سنج، اپنے کی ملاحیت، بے مثال لیز و شب، پھر ان کے اپنے حواصی کی تنہائی
پر مری اور خودِ فکر کے لئے، ہمیشہ شمس بھی وقتِ کمال لیتا، یہ سب کچھ ایسے اوصاف ہیں جو کہیں اور نہیں ملیں گے۔ انہوں نے
اپنی نیک بندی کی موت پر چر دل حاصل کر کے آخری رسوم میں شامل ہونے بھی گوارا نہ کیا۔ یہ دیکھنا ایسا چیز جو بظاہر بصر
اہم معلوم نہیں ہوتی لیکن جس شخص پر ایسے مراحل گزرتے ہیں وہی شدتِ کرب کو کچھ سکا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو لکھ:
تو م اور ملت کے علاوہ قافی اور لافانی رہ رہ ہونے کے علاوہ اپنے علمِ کمال کی وجہ سے ہمیشہ یاد کے جائیں گے۔ کاغذِ کس کے
رمانے میں مختلف مصائب پر سرفراز ہونا، پارلیا منٹ یا سیاسی وفد میں باہر جانا یا آزادی کے بعد وزیرِ تعلیم ہونا ان کی
حظیت نہیں بڑھاتا۔ بلکہ جن عہدوں پر موصوف رہے وہ عہد، بے ان کی وجہ سے صرف برا ہو گئے۔
مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال ۳۲ فروری ۱۹۷۱ء کو دہلی میں ہوا اور وہ چار دن کی عمر میں۔



مولانا ابوالکلام آزاد اور مسلمانوں کے بعد سچے رہبر ثابت ہوئے۔ انہوں نے ملکی سے تقسیم کی مخالفت کی۔
مسلمانوں نے عام طور سے ان کا ساتھ نہیں دیا لیکن جب ملک تقسیم ہو گیا تو انہوں نے ملک، قوم اور ملت کے لئے گراں قدر
خبر دست دھجیاں دیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، امتیازِ دستِ دریا، قسمی، اسے مضبوط اور منظم کیا، دشمن ترقی اردو کا بھی تحقیر کیا۔
مولانا کی سیاسی زندگی بڑی بڑھ چلا رہی تھی انہیں متعدد بار گرفتار کیا گیا اور سزائیں دی گئیں۔ اس کی تفصیل عبدالمحلیف اعظمی
نے اس طرح قلمبند کی ہے:-

”راچی کی نظر بندی (۱۹۱۲ء) مدت تقریباً ۳ سال نوادہ دوسری گرفتاری ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء
مدت ایک سال ایک ماہ تیسری گرفتاری ۲۱ اگست ۱۹۳۵ء مدت تقریباً چھ ماہ۔ چوتھی
گرفتاری ۱۲ مارچ ۱۹۳۴ء مدت دو ماہ۔ پانچویں گرفتاری ۳ جنوری ۱۹۳۶ء تقریباً یک ماہ
ماہ چھٹی گرفتاری ۹ اگست ۱۹۳۴ء مدت تین سال چھ مہینے دن۔ یعنی مولانا ابوالکلام آزاد
نوسال سات مہینے چھ مہینے دن جیل میں رہے۔ یہ گرفتاریاں ہمیشہ یا معنی تھیں اس لئے کہ
مولانا آزاد وہ دوستان کو صرف آزادہ کرنا چاہتے تھے بلکہ استبداد کی اگرچہ لاکھ لاکھ بات
سے بہرہ ور کرنا چاہتے تھے۔“

مولانا کی اولیٰ زندگی بھی محدود محترم رہی ہے۔ ان کی متعدد کتابیں ادبِ عالیہ میں شہر
ہوتی ہیں۔ مثلاً ”تذکرہ ترجمان القرآن“، ”غبارِ خاطر و غیرہ“، ”ترجمان القرآن“ کی جلد اول
بقولِ علامہ ادریس قاسمی کے ”حکایتِ شمس قرآن“ بھی اور دوسری قرآن کا حاصل ہے۔ سورہ کا ترجمہ
کی ترجمانی کے ایک سوستر ملے خواہم ابوالکلام کی عقلمانی نظر، اخلاقی جرات اور دینی ارتقا کے اس
دور سے کی خبر دیتے ہیں جو گروہ پیش کے حالات کے ساتھ ساتھ رحمت و بخشش کی جانب
بڑھتا گیا۔“

”تذکرہ“ ”تجدید و اجتہاد اور پھر ان کی صورتیں ملتی ہیں۔ جن پر تفصیلی بحث طو لانی ہے۔ ”ترجمان القرآن“ کی
دو جلدوں کا پہلا مسودہ ہونے میں مرتب ہوا تھا اور شمس میرٹھ جیل میں۔ ان دونوں کے طرزِ بیان میں فرق ہے۔ ”تذکرہ“
میں عربی الفاظ زیادہ ہیں جبکہ ”سورہ“ ”تذکرہ“ میں تفسیری وضاحت کے سبب زبان نسبتاً زیادہ سہل ہے۔ مولانا آزاد کی تحریروں
سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا اسلوب مختلف موضوعات کے لئے مختلف ہوتا ہے۔

”غبارِ خاطر“ کے خطوط میں ادب، فلسفہ، تاریخ، رسوم و عادات، ادب، سبکی ایک خاص انداز سے سامنے آ گئے

ہیں۔ ان کے اسلوب نگارش کے بارے میں عبدالمجید پٹیل کی یہ رائے ملاحظہ ہو:-

انیسویں اور بیسویں صدی کے ممتاز ڈرامہ نگار

امانت لکھنوی

(۱۸۱۵ء - ۱۸۵۸ء)

امانت لکھنوی کا چوراہام آزاد حسن اور نکلس امانت ہے۔ ۱۸۱۵ء میں لکھنوی پیدا ہوئے۔ والد کا نام میرزا کاظمی تھا۔ ذرا سے میں انہوں نے استاد نکلس اپنا باپو شاعری میں امانت۔ لیکن نکلس استاد معروف نہ ہو سکا۔ امانت واقعی شہرت کا باعث ہوا۔ ایک روایت کے مطابق امانت کی زمان میں لکھتے تھے، اس حد تک کہ ٹنگہ دہلے کا احساس ہوتا تھا۔ ۱۸۴۳ء میں انہوں نے حضرت امام حسینؑ کے روضے کی زیارت کی تو زبان نکلی تھی۔

ذرا سے "اندلس" امانت کا شاہکار ہے۔ ان کی ساری شہرت اسی ذرا سے کے حوالے سے سامنے آئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے کامل لحاظ شاعری بھی کی۔ ایک حیثیت ان کی واسطے کوئی بھی ہے۔ کیا جاتا ہے کہ اس فن کے وہ امام ہیں۔

آغا حسن امانت اس وقت پھلے پھولے رہے انہیں وزیر کا نظارہ تھا۔ لکھنویں چاروں حضرات اپنی اپنی اہمیت منوانے لگے تھے۔ اپنے میں امانت نے اپنی ایک الگ راہ اپنی۔ یہ بھی ایک اہم بات ہے۔ درخت نکلس ہے کہ وہ ان دونوں کے مقابلے میں بھج جاتے اور کبھی بھی ٹام نہ جاتا۔

امانت کے صاحبزادے سید حسن کے حوالے سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ انہوں نے "اندلس" "مہتاب" کی فرمائش پر تخلیق کی۔ شاہ سلورہ یہ بھی دیا گیا تھا کہ اس ذرا سے میں مختلف مقصود پار پانچا کیں شاعرانہ و مثنوی گھڑی، بولی و خیرہ اور موسم کی بھی سلی نکلی ہو۔ یہ سب باتیں "اندلس" میں موجود ہیں۔ اس کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ مختلف ایچ بیٹن بار بار پیچھے رہے ہیں اس لئے کبھی کبھی غلط ایچ بیٹن بھی سامنے جاتا ہے۔

امانت کی شعری صلاحیتیں ان کی ذرا سے نگارنی کے سامنے دیکھنی چاہی ہیں اور ان کی غزلوں میں ہزار کائنات تھے انہیں پس پشت ڈال دیا گیا ہے حالانکہ امانت ایک ایچ غزل گو کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ یہ نکلس رعایت نکلس اور لکھنی باز نگاری کے شاعر نہیں بلکہ ایک حساس دل دار ہے۔ تاریخ کے شاعر ہیں۔ ان کا درجہ ان ۱۸۲۰ء میں مرتب ہوا۔ اسی دیوان سے ان کی زندگی کے بعض حالات بھی سامنے آئے۔ مثلاً یہ کہ ان کا کسی سلسلہ سید علی ابن سید محمد آقا ابن سید علی شہیدی سے ملتا ہے۔ ان کے اسلاف میں اوٹ لکھتے تھے جو اس طرح یہ ان کا وطن قرار پایا۔ اس زمانے میں مرثیہ گوئی لکھنوی میں ایک عادت تھیں۔ اس سلسلے کے ایک اہم شاعر تھے کبھی تھے۔

بہر طور "اندلس" نے اپنے شہادت کا وہیہ حاصل کیا اور امانت لکھنوی ایک کامل لحاظ شاعر بن کر سامنے آئے۔ انہوں نے تقریباً ۳۵ ہجری کی اس وقت تخلیق کی، جس کی اپنی اہمیت ہے۔ ان کا انتقال ۱۸۵۸ء میں ہوا۔ سوت کے بعد بھی ان کے کلام کی اشاعت ہوتی رہی۔

مداری لال

مداری لال پر وہ دفعہ میں تھے لیکن مسعود حسن ادیب نے اپنی کتاب "تھکڑا کا دعویٰ اسٹیج" میں ان کے بارے میں کچھ اور درج کر کے انہیں تاریخ ادب اردو کا ایک نمبر بتا دیا۔ اور آج بھی ان کی تصنیفات شہرہ میں اور جرنلوں ان کے متعلق معلوم ہوا ہے وہ ادیب ہی کی ہیں ہے۔

دراصل امانت کی "اندلس" کی "مہرِ لال" سے بعض مصنفین اپنے طور پر اپنے قصے لکھنے کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی اندرسجا میں سانسے آ گئیں۔

مداری لال ایک غیر مردِ فاضل تھے۔ ان کے حالات زندگی مسعود حسن ادیب نے اپنی کتاب "تھکڑا کا دعویٰ اسٹیج" میں مختصر اور جگہ جگہ دیے ہیں کہ ۱۹۲۷ء میں بڑی بگ دو دو کے بعد مداری لال کے مختصر سے حالات انھیں ملے تو اب کے ذریعے سے دستِ یاب ہوئے جو واحد علی شاد کے سرور ادیب علی نقی مختصر خان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مداری لال لقب سوانا کے رہنے والے تھے جو گھوڑے کوئی دس کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ مسعود حسن ادیب نے عشرت دہرائی کے اس بیان کی تردید کی ہے کہ مداری لال کا نام سرداری لال تھا اور یہ کہ انہوں نے درختِ صرف کر کے اسٹیج تیار کیا تھا۔ مداری لال نے لکھنؤ میں رہائش اختیار کی تھی۔ وہ ہادی گڑھی اور چتر کا کاروبار کرتے تھے اور ان کی دکان حسین آباد کے چورنگ کے قریب واقع تھی۔ مداری لال ان پڑھانسان تھے۔ مسعود حسن ادیب کا خیال ہے کہ ان کی آدمیوں نے مل کر مداری لال کی "اندلس" تیار کی تھی مگر اس کا جلد مداری لال نے خیر کیا تھا۔ مسعود حسن ادیب ان کے ایک شاگرد یار اللہ خاں (عالمِ عبادتِ خاں) سے ۱۹۴۳ء میں ملے تھے اس زمانے میں ان کا مشغلہ اولیٰ درجے کی پوش و طوائف کو باجی گانے کی تعلیم دینا تھا۔ لیکن اپنی جوانی کے زمانے میں وہ مداری لال کی "اندلس" میں حصہ لیا کرتے تھے اور ان کی پوری نظر ان "اندلس" میں پڑی کارول ادا کرتی تھی۔

یہاں پر یاد دلانی چاہئے کہ مداری لال کی "اندلس" کے بارے میں یہ بحث بھی ہے کہ یہ امانت کی "اندلس" سے پہلے سامنے آئی۔ مسعود کا خیال ہے کہ امانت ایک مختصر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتداً انھیں موسیقی سے اس طرح وابستہ نہیں رہ سکتے تھے جس طرح مداری لال اور یہ کہ مداری لال کی اندلس کے نمونے پر انہوں نے اندرسجا میں مسودہ کیا پیدا کیا۔

لیکن اسلم قریشی کا بیان ہے کہ مداری لال کے یہاں قصہ و غنا کا عنصر برائے نام نہ ہو سکتا تھا ضرور ہے۔ ان امور کے علاوہ یار اللہ اور نظیر کے بیان کو بھی شہادت کے طور پر قبول کرنے سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ مداری لال کی "اندلس" کو اولیت حاصل ہے۔ لیکن ان تمام امور کو مسعود حسن دھوئی نے رد کر دیا ہے اور امانت کی اندرسجا کی اولیت دلی ہے ان کا بیان ہے کہ:-

میں ہوں اس لحاظ سے بھی گنہگار کہ ۱۲۶۹ء ہو سکتا ہے۔ بہر صورت ہر ماہ تاریخ کے اعتبار سے ۱۲۷۰ء میں قرار پایا ہے۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ ۱۲۷۰ء تھیل و اشاعت کی تیار ہو۔ اجتماع کا سال ہو مگر کتاب ۱۲۷۱ء میں شائع ہوئی ہو۔

صورت واقعہ جو کچھ ہوا اسی بات ثابت ہے کہ "اندلس" امانت کی اپنی اس کا نتیجہ ہے۔ لہذا اس کام و شادی قیصر راج کی چہرہ پر اداری سے شیخ کا نام نہ لایا گھٹن ہے۔ اسے فرانسسی اور ان کا بھی اتنا ہی غلط ہے۔ تاکہ مگر میں ان کا ذکر ہے کہ واقعہ شاد کے بار میں ایک فرانسسی لڑکا موجود تھا۔ اسی کے شعور سے مسودہ امانت لکھنے نے بادشاہ کی اجازت فرانسسی اور اس کے طرز پر "اندلس" لکھی۔ لیکن یہ بیان بھی فاضل ہے اس لیے کہ اس کا فرانسسی اور اسے سطحی تعلق بھی نہیں ہے۔ بہر صورت "اندلس" کی شہرت شہر میں پھیل گئی اور جگہ جگہ کے چرچے ہونے لگے۔ اس کی نقی بھی شروع ہو گئی۔ مداری لال نے بھی اسی انداز کا نام لکھنے کی کوشش کی۔ دوسری اندرسجا میں بھی لکھی جانے لگیں لیکن امانت کی "اندلس" ہر لحاظ سے محترم رہی۔

اس کی کہانی پر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ ہنر پر ہی چرے کا نام پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کے اندر حوصلہ بھی ہے، جوش اور تڑپ بھی۔ لفظام سے اس کی محبت مثالی ہے۔ دراصل ہری اور آدمی زاد کے محبت کا تصور بھی حیرت میں ڈالتے والی چیز ہے۔ لیکن شہزادہ جب دربار میں جانے کی خواہش کرتا ہے تو ہنر پر ہی اس کو خطرات سے آگاہ کرتا ہے لیکن لفظام قید ہو جاتا ہے اور ہری بھی مصیبت کا شکار ہوتی ہے۔ لیکن اس کی فکری دنیا میں بھی رنگ لاتی ہے۔ وہ جو کچھ سننے ہے اور شہزادہ لفظام سے ملنے کا طریقہ بھی دھوڑ لگاتی ہے۔ محبوب کو حوصلہ دلانے کا عمل اس کو فعال بناتا ہے۔ لیکن تاکہ کا بنایا ہوا ہے کہ کیف و کم کا نتیجہ ہے۔ اس تاکہ کے باب میں اشتیاق حسین کی رائے بھی افسانہ کرنے کے قابل ہے جس میں انہوں نے اندرسجا کے اساطیر کی پیروی ایک نگاہ ڈالی ہے:-

"اندلس" ہوا کی کہانی میں نہ کوئی جدت تھا نہ کوئی ندرت۔ ہندو و ملا کے مشہور کردار راجہ اندر کے کردار ایک ہی کہانی کے تانے بانے سے منکوم ذرا متاثر کیا گیا تھا جس پر ہر محسن کی مشابہت "سحر الجہان" کا غیر معمولی اثر نظر آتا ہے۔ لیکن امانت نے اس خطا کو اس طرح پر کر دیا کہ گویا اسی وقت ذرا متاثر ہوا ہوا جاگ اٹھی اور بہت سے دوسرے شاعروں نے امانت کی تقلید میں اندرسجا میں لکھیں جو تقریباً اسی قسم کے ڈھنگ پر ہوا اسی قسم کے ساز و سامان سے پلنگ کے سامنے پھیل گئیں۔ اندرسجا اس کے موضوع کوئی سہلی اہمیت نہ رکھتے تھے۔ اگر ان سے کوئی نتیجہ نکلتا ہے تو یہی کہ مسلمان ہندو و ملا سے صرفہ و اقلیت رکھتے تھے بلکہ اپنے ادبی اور تمدنی مظاہر میں ان سے کام بھی لیتے تھے۔ ان سے اپنی ذہنی تقریب کا سامان فراہم کرتے تھے۔"

”سنے نواب کے بیان کے وہوں بڑ بھتی نہادی الال کی اندر سہا“ امانت کی اندر سہا سے پہلے لکھی گئی اور یہ کہ دودا چٹل شادی کی شادی میں کھلی گئی، کسی خطا جن پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سنے نواب ایک جاٹ شخص اور جاٹوں کے ہم صحبت تھے لہذا ان کے بیان کو اتنی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ پھر یہ کہ دودا چٹل شادی سے نفیس حرات، ذی علم اور خون لیلیک کے ماہر تھے۔ ان کے دہس میں کام کرنے والے اطرا مزہب، تعلیم یافتہ اور دھرم و سرود کے ماہر ہوتے تھے۔ بہت کہہ ادنی لال خوران پڑھتے اور اس کو پیش کرنے والے بھی ادنیٰ درجے کے جلا تھے۔ شاہی تقریب میں اسے کیوں کر پار پائی ہو سکتی ہے۔“

اس کے علاوہ مسعود حسن رضوی نے اس کا اظہار کیا ہے کہ ہادی لال کی ”اندو سہا“ راج اندر کی تمایوں حیثیت نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ قدیم شخصوں میں اس کا نام ”ماد شیر معروف“ ہوا ”اندو سہا“ ہے۔ اصل نام ماد شیر ہی تھا لیکن امانت کی ”اندو سہا“ کی شہرت کی وجہ سے اسے بھی ”اندو سہا“ کہا جانے لگا۔ گو امانت کی اندو سہا پہلے سے موجود ہے۔

بہرحال یہ بات واضح ہے کہ ہادی لال کی ”اندو سہا“ تو آج تک وہ درجہ حاصل نہ ہو سکا جو امانت کی ”اندو سہا“ کو حاصل ہے۔ لیکن اس کے دینے سے کم از کم ہادی لال کی اردو کے ارتقائی ادارے میں ایک جگہ ضرورہ جمل ہو جاتی ہے۔

آغا حشر کاشمیری

(۱۸۷۹ء — ۱۹۴۵ء)

ان کا نام آغا محمد شاہ شہر تھا۔ کشمیری تھے۔ والد کا نام مئی شاہ تھا۔ یہ ۱۸۷۹ء میں ہادی لال کے والد سے اپنے مائیں احسن شاہ عرف بھری کی بیوی کی بیوی سے پیدا ہوئے۔ ان کی چھوٹی صاحبزادی سے ان کا تعلق ہوا۔ مئی شاہ کی دوسری اولاد آغا محمد شاہ حشر تھے۔ حشر چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ ۱۸۷۹ء پیدا ہوئے۔

۱۸۷۹ء میں مولوی محمد مرزا بھار نے قاری میں ان کا داخلہ لائٹ مرطب کیا۔ یہ اطلاع آغا حشر کا شہر میں کی گئی، جن کی کتاب ”اتحاد کلام آغا حشر کاشمیری“ اثر پریس میں لکھنؤ کا دلی نے شائع کی ہے۔

حشر کی ابتدائی تعلیم خط عبدالعزیز کے مدرسے میں ہوئی۔ جہاں انہوں نے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی، حافظہ قرآن ہو چاہتے تھے لیکن نصف سالہ پڑھ لکھ کر اپنے والد سے رجوع ہو گئے۔ وہ شاعری بھی لکھ کر لے گئے تھے۔ جب وہ مدرسے سے فارغ ہوئے تو چھ ماہ ان اسکول میں ان کا والد ہو گیا اور وہ پانچاٹھ اردو میں شہر کھینچے گئے۔ جب انہوں نے شہر چھوڑا اختیار کیا۔ ابتدا میں مرزا محمد حسن خان سے امتحان لیا۔ اسی زمانے میں ”آداب صحبت“ نامی ایک ڈراما لکھا جو ”جو ابر

ایک پھر نہیں“۔ یہاں میں شائع ہوا۔ آغا حشر کو ڈرامے سے خصوصی دلچسپی تھی اور وہ اس کی طرف مائل ہونے لگا اور اس نے نظمیں سلسلہ کے لکھنے پر مڑا۔ اس امر کو دیکھنے پر لکھنے کے شوق میں وہ کہیں آگئے اور ایک دوست عبد کبیر کے یہاں قیام کیا۔ وہاں ایک جگہ شاعر نے میں شرکت کی جہاں ان کا کام بعد نہ نہ کیا گیا۔ پھر ان کی ملاقات کاؤس جی پان کی کھڑے ہو گئی جو پان ہی تھیں لیکن کھلی کے مالک تھے۔ آغا حشر کا شہر میں لکھتے ہیں کہ کاؤس جی پان ہی لکھتا ہے ان سے چھ اشعار کہنے کی فرمائش کی تھی چنانچہ شہر نے ”چائے کا کوپ“ کے عنوان سے فی المہر یہ ایک مختصر نظم کہہ دی۔ لکھنا کو کھوت حیرت ہوئی اور رد آغا حشر کی صلاحیتوں کا قائل ہو گیا۔ نتیجے میں پانچاٹھ اردو نگاری ان کے حصے میں آئی۔ بعد میں ”آغا حشر“ ”پان کی اطریغ تھیر طیکل“ ”تختی“ اور بہت سی دوسری کتابوں کے لئے ڈرامے لکھے جن میں اکثر بچھ کا صاحب ہوئے۔ آغا حشر کے ڈراموں کی تفصیل یہ ہے:

(الف) اردو ڈرامے:

- (۱) ”مرید ترک“ ۱۸۹۹ء، (۲) ”ماتا تیس“ ۱۸۹۹ء، (۳) ”میر حسن“ ۱۹۰۱ء، (۴) ”شہید“ ۱۹۰۲ء، (۵) ”سلید خوں“ ۱۹۰۳ء، (۶) ”میر حسن“ ۱۹۰۴ء، (۷) ”خواب سستی“ ۱۹۰۹ء، (۸) ”غرضورت“ ۱۹۰۹ء، (۹) ”سلورنگ عرف نیک“ ۱۹۱۰ء، (۱۰) ”بیرونی کی لڑکی“ ۱۹۱۱ء، (۱۱) ”شیر کی کرج“ ۱۹۱۸ء، (۱۲) ”لڑکی حور“ ۱۹۲۳ء، (۱۳) ”رستم و سہراب“ ۱۹۲۹ء۔

(ب) ہندی ڈرامے

- (۱) ”بلو سنگھ عرف سور داس“ ۱۹۱۳ء، (۲) ”مہر مرلی“ ۱۹۱۹ء، (۳) ”ہندو ناری عرف بھارت دھرمی“ ۱۹۱۹ء، (۴) ”تھکرت گنگا“ ۱۹۲۰ء، (۵) ”پانچن نوین بھارت عرف ہندوستان“ (شرون تمارا کبریا) ۱۹۲۴ء، (۶) ”مسند پندر برف پینا پوار“ ۱۹۲۴ء، (۷) ”تعلیم پینا“ ۱۹۲۳ء، (۸) ”آٹھ کاٹھ“ ۱۹۲۳ء، (۹) ”پینا پوار“ ۱۹۲۸ء، (۱۰) ”غریب کی دیا عرف بھری پانک“ ۱۹۲۹ء، (۱۱) ”سراج کاٹھ عرف بھارتی پانک“ ۱۹۳۰ء، (۱۲) ”دلی کی پانیا“ ۱۹۳۱ء۔
- آغا حشر نے اردو ادب سے بھاری بھالی میں بھی لکھے۔ ان کے کئی ڈراموں کی نظم بھی چلی گئی۔ مثلاً ”شیرین فرماں“، ”عورت کا پیار اور“ ”بیرونی کی لڑکی“۔

آغا حشر کی دیریدگ کوئی مشہور ہے۔ وہ بہت آسانی سے اور سبزی سے اٹھا کر گلش کر سکتے تھے کہ مفادہ کرنے والوں کو نصرت ہوتی تھی۔ ایسے ہی دودا اچھا آغا حشر نے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں جن کا ذکر دودا نے کیا ہے۔ مگر غیر جملہ اربوں کی طرح آغا حشر بھی اپنی تعلیمات کا کوئی دیکار نہیں رکھتے تھے۔ جلدیہ ہے کہ ان کی انتظامی صلاحیت بھی حدود محدود مشکل تھی اور یہ تمام چیزوں سے بے نیاز رہتا تھا۔ حساب کتاب سے بھی۔ اپنے سرداروں کے سامنے میں بھی اسے غیور نہ تھے کہ کبھی کبھی ان کی بات یافتہ خود ان کے لئے مشکل ہو جاتی۔ حشر لکھتے ہیں کہ:-

”آغا صاحب اپنے ڈراموں اور دیگر تخلیقات کو کبھی احتیاط سے نہیں دیکھتے تھے۔ وہ اپنے بچے

اور نہ قول کے سلسلے میں کوئی باز نہیں کرتے تھے۔ ان کی اس ہشتم پائی اور بے قیادلی کا نتیجہ یہ تھا کہ جب بھی کوئی نئی نوکری پھوڑ کر جاتا تو ذرا سے کا کوئی نہ کوئی مسودہ بھی اپنے ساتھ لے جاتا تھا اور یہاں اس وقت قاش و خاش جب اس مسودے کی تلاش ہوتی تھی۔ چنانچہ قاش و خاش امرت سہری جب آئے صاحب کی کینچی کی ملازمت چھوڑ کر گئے تو ان کی بیاض اپنے ساتھ لے گئے۔ اس بیاض میں قادی اور اردو کلام کے علاوہ مغربی کلام کی دیباچات کا مجموعہ ترجمہ بھی شامل تھا۔ یہ بیاض کی نگہداشت سے آغا صاحب کو انتہائی صدمہ ہوا۔ اس کے بعد انہیں جب بھی انچی کسی پرانی غزل یا نظم کے اشعار یاد آتے تھے وہ کسی نئی نوکھدا دیا کرتے تھے۔ اس طرح رفتہ رفتہ ان کے کلام کا اچھا خاصہ ذخیرہ محفوظ ہو گیا تھا۔ لیکن اس بیاض کے ساتھ بھی بیکار خرویدی "عالم بیاض" آیا جو اس سے قبل بعض ڈراموں اور پہلی بیاض کے ساتھ پیش آچکا تھا۔"

۱۹۳۰ء سے آغا شہر چار رہنے لگے۔ اسی دوران کی فلمی ڈرامے بھی تلمذ کے۔ لاہور میں "حشر کچری" کی بنیاد رکھی۔ لیکن جس وقت "سینکھشم چاند" کی شریک بنی تو وہی تھی ان کی صحت کچھ زیادہ سی خراب رہنے لگی اور ۲۹ مارچ ۱۹۳۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

آغا شہر ایک زندہ دل شخص کی حیثیت سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان کی تخلیقی قوت سے انکار نہیں۔ انہوں نے بعض بے حد پر اثر ڈرامے لکھے۔ ان کی پذیرائی بھی ہوئی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انہیں اردو کا شیکسپیر کہنا درست نہیں۔ وہ شیکسپیر اور دوسرے ڈرامہ نگاروں سے متاثر ضرور تھے بلکہ بعض شیکسپیر کے متاثران کے ڈراموں کے تار و پود بھی پہنے ہیں۔ انہیں کسی لحاظ سے بھی وہ درجہ حاصل نہیں ہو سکا جو مگر جی ڈی اے عالمی ادب میں شیکسپیر کو حاصل ہے۔

آغا شہر اپنے تخلیقی اوصاف کے اعتبار سے اہم کہے جاتے ہیں۔ مثلاً ان کے اندر کا لہر لہاری کی قوت بیش از بیش تھی۔ ایسے مکالموں میں مبالغہ کا انداز ہوتا تھا لیکن ان کے اثر سے انکار نہیں کیا سکتا۔ بعض جیتے جاگتے کردار بھی انہوں نے پیدا کئے لیکن ان کی بھی اوجھل و بیکجھک، رنگ و لیر، جھنجھٹ یا دوسرے گچ کے کرداروں کے ہم پلہ ہو سکا۔ مگر بھی اردو ڈرامہ کو جس طرح انہوں نے ایک معیار تخلیق کی کوشش کی وہ انہیں کا حصہ ہے۔

آغا شہر کو بجا طور پر ایک شاعر بھی سمجھا جاتا ہے۔ ان کے ڈراموں میں ان کی شاعرانہ بلند آہنگی ملتی ہے۔ بعض نظمیں بھی یادگار ہیں۔ میں ذیل میں صرف ایک غزل کے چند اشعار پیش کرتا ہوں تاکہ ان کے یہاں جو شاعرانہ کیف ہے اس کا اندازہ ہو سکے:

کشتا کش زندگی کی اور چاہ جسم و جان تک ہے

یہ سب ہمارے کھنکھاری داستان تک ہے

خبر ہے ہلک ہو جائیں نہ آنسو سوزشِ غم سے
تراغم گل چالماں دجہ ہائے خرچکھاں تک ہے
مناوت دل کو دہل کی لذت ایذا نہ منی دے
کلام کاروانِ شوق دس جنس گراں تک ہے
لبو ہو جائے دل گھٹ گھٹ کے پر آنسو نہ ٹپکے
کرنے کا حیلہ و مجبور حتم طاقت جہاں تک ہے
رکا ہے دم، قریب آرزو سرے نہیں دینا
ہلا دے لب، قرا چار شیریں ایک ہاں تک ہے
یہی آکر لب شاعر پہ شعر گرم مٹا ہے
وہ سوز زندگی جو شعلہ زن دل سے نیاں تک ہے
تبی دست اثر ہے شعر تو جذبانا لکھی ہے
کہ لطف اے حشر مخمل و پاپان داستان تک ہے

عابد حسین

(۱۸۹۶ء - ۱۹۷۰ء)

عابد حسین کی پیدائش ۱۸۹۶ء میں ہوئی۔ ان کی بنیادی حیثیت ڈرامہ نگاری ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پرائیمر رہے تھے۔ انہوں نے مہاتما گاندھی کی روایتیں اردو میں ترجمہ کیں۔ ایک کلام "علاش تھی" اور دوسرے کا نام "اندر و غلغلہ اسلام" متعین کیا۔ یہ دونوں ہی کتابیں اہم سمجھی جاتی ہیں۔

ان کے ذرا سے "پردہ غفلت" نے کافی شہرت حاصل کی۔ یہ ڈرامہ مصوف نے دس وقت لکھا جب غلامت کی تحریک زور پکڑ رہی تھی اور وہ خور و غلغلہ میں تھے۔ یہ ۱۹۲۵ء کی بات ہے۔ دراصل اس ڈرامہ میں ایک خاندان کے احوال رقم کئے گئے ہیں، جس میں مطالعہ افراد کے درمیان جاتی تقسیم کا ہے لیکن ایسے تمام صورت و احوال کی جگہ میں مسلمان معاشرے کے وہ رسوم و روایات ہیں جو خاندان کی بنیادی کا باعث ہیں۔ کچھ کردار تو وہ ہیں جو روایات کے پابند ہیں اور دنیا کی تقسیم کے باب میں جو امور میں اسلام سے جلی آدمی ہیں انہیں تو تم رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن دوسرے

جب پدیس کی بھی مسلم معاشرے کی اصلاح ممکن ہے۔ دراصل یہ مرکزی تصور ہے جو ذرا سے میں دیکھ کر ہی کی طرف سے ایک اور صورت پر ابھرتی ہے وہ آواز کی نواں ہے جس کے عابد حسین بہت بڑے حمایتی نظر آتے ہیں لیکن ان کے جو کئی نصب العین رہے ہوں وہ آج بھی بحث کا موضوع ہیں اور مسلم تاج اپنے موقف سے ہٹا نہیں ہے۔

ان کا ایک اور ڈرامہ "کیا خوب رو کی تھا" ہے۔ اس کی بہت پذیرائی ہوئی ہے۔

عابد حسین ایک دانشور تھے۔ انہوں نے جرمن شاعر میخے کے "لاؤسٹ" کا ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ بعد فقیر

بھی ہوا۔

عابد حسین نے یوں تو اردو ڈرامہ نگاری کے باب میں خاص کام کئے۔ موضوعاتی اعتبار سے تو ان کی پذیرائی کی جاتی ہے لیکن ذرا سے کے فن نے جس طرح ترقی کی ہے اس پر ان کی نگاہ کم جاتی ہے۔

عابد حسین کا اسلوب دران اور نکش ہے۔

ان کا انتقال ۱۹۷۶ء میں ہوا۔

امتیاز علی تاج

(۱۹۰۰ء۔ ۱۹۶۳ء)

سید امتیاز علی تاج کے والد کا نام مولوی ممتاز علی تھا۔ سید امتیاز علی تاج ۱۹۰۰ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان اورنگ زیب کے زمانے میں بخارا سے ہندوستان آیا تھا۔ اسی خاندان کے سید ممتاز علی اور سید ذوالفقار علی تھے۔ ممتاز علی مولوی محمد کاسم خان قادی کے شاگردوں میں تھے۔ ممتاز علی باضابطہ معتمد تھے۔ ان کی مشہور کتاب "الہیان فی التمام القرآن" سات جلدوں میں ہے۔ ان کی بیوی محمد بی بی شمیم بھی تھیں۔ انہیں کے کلین سے مولوی ممتاز علی پیدا ہوئے۔ یہ کو رو پڑی تھے۔ کچھ جائیداد بھی ان کی تھی۔

تاج کی ابتدائی تعلیم کا سرے اسکول لاہور میں ہوئی۔ وہیں ہاڈل اسکول، لاہور سے امتحان پاس کیا۔ بل اسے گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس ہوئے۔ ابتدائی عمر ہی میں ادبی رجحان نمایاں ہونے لگا تھا۔ صرف چودہ سال کی عمر میں اس زمانے کے مشہور رسالے "نگار" "جواگر" سے شائع ہوتا تھا، میں ایک "طوبی شائع کروا دیا۔ ذرا طالب علمی میں ایک کتاب لکھی جس کا نام "موت کا راز" ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لئے ہے۔ انہوں نے "ماہنامہ" "تکبیلان" بھی نکالا۔ لیکن ان کا خیال ہی رہا ان زمانے کی طرف تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے دوران کتب کے کمرے میں بعض ڈراموں میں اداکاری کی۔ انہوں نے ۱۹۲۵ء میں "انارکلی" لکھا اور قاضی کوستا قزوینی کے باوجود اس کی پذیرائی سے باز آئے۔

یہ ڈراموں کی شہرت کا سبب بھی ہے۔ لیکن وہ ایک زمانے تک آل انڈیا ریڈیو سے بھی وابستہ رہے تھے۔

نئے ایسے سارے ڈرامے تین جلدوں میں مرتب کئے۔ لیکن اس کی تمام جلدیں شائع نہیں ہوئیں۔ تاج کی موت اچانک ہوئی تھی۔ اس لئے اس کی اشاعت ملتی ہوئی۔ انہیں حقوق اور بچوں کے ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ انسا نے بھی لکھتے تھے مترجم بھی تھے۔ انہوں نے *Three men in a boat* سے اکٹاب کر کے ایک ڈرامہ کر دیا۔ یہ کیا۔ جو چکا چنن کے نام سے مشہور ہے۔ اس نام سے کتاب بھی شائع ہوئی ہے۔ چکا چنن اردو کے لڑنے والے اردوں میں سے ایک ہیں۔

تاج نے کئی مغربی ڈرامے ترجمہ کئے۔ جیسے پیر کے بعض ڈراموں کا سٹیلس ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ بڑا ڈرامہ کا بھی ایک ڈرامہ اردو میں لکھا۔ انہوں نے "کٹر ایکو" "سکرالڈ" "ایگرالین" پر اور کئی مغربی مصنفوں کی بعض تصانیف ترجمہ کیں۔

امتیاز علی تاج اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ ان کی بیوی بھی ادیبہ تھیں۔ میری مراد عجب ہے۔ یہ پہلے وہ عجب اسٹیل کے نام سے لکھتی تھیں لیکن بعد میں ان کے انسا نے عجب امتیاز علی کے نام سے شائع ہونے لگے۔

تاج انجمن ترقی ادب، لاہور کے ڈائریکٹر بھی رہے تھے۔ انکی دورہ مصروف کاری تھی کہ ۱۸ مارچ کی شب میں دو غلاب پوش انجمن نے میاں بیوی دونوں کو قتل کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۹۳۳ء میں ہوا۔ یہ سوانحی اشارات میں نے مالک نام کی کتاب "ذکرہ معاصرین" سے اخذ کئے ہیں۔

عقربت رحمانی لکھتے ہیں کہ فقیر ذرا دھاروی کے سلسلے میں میں کو اہم مرتبہ حاصل ہے۔ معروف نے ان کے پھرنی ڈراموں کے نام دے دیں جو دوسری زبانوں سے اخذ کرتے کا حاصل ہیں۔ مثلاً "قریب کا کاغذی"، "کوگی جورا"، "روہینا"، "فحش"، "حرم کلب"، "صرف کاٹوں کے لئے"، "شیخ برادران"، "اصفیان کے شہر"، "لوکی زبان"، "مسید صبا"، "امین سکون"، "ان کے آیا" اور "کرو نمبر"۔

لیکن ان تمام امور کے باوجود ان کی شہرت کی بنیاد ہم تاریخ کی زامہ "نہ رنگی" ہے۔ کالوں کے عصاب میں رہنے کے باعث اس سے بھی واقف ہیں۔ ایک کثیر کی محبت میں گرفتار شدہ و سلیم اپنے باپ اکبر سے عصاب رہتا ہے۔ لیکن انجام الیہ ہے۔ یہی سوال اٹھایا جاتا رہا ہے کہ یہ الیہ کس کا ہے، اکبر کا کہ سلیم کا اس میں ایک توجہ یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ کثیر اکبر کی خود اکبر کے دل میں بھی ہوئی تھی۔ لہذا باپ بیٹے کی تاز میں یہ عنصر تعبیراتی ہے۔ لیکن میں اسے درست نہیں تصور کرتا۔ سارا معاملہ مقلد سلطنت کی آن ہن اور شان کا ہے اور اسے ہی امتیاز علی تاج نے فوکس کرنا چاہا ہے۔ ان میں اکبر تکثیف ہارشا جو کہ راہ تھا وہی اسے کرنا چاہتے تھا۔ محبت اور الفت کے اپنے تقاضے ہیں۔ سلیم کی بھینر دی گئی جگہ پر اور کثیر کے خواب اپنی جگہ پر۔ بہر طور یہ الیہ پر اثر ہے اس پر ہم جیسی ہی سطحیت کا لیلیں چسپان کر رہا۔

امتیاز علی تاج کے کارنامے میں پیشہ چھٹے گئے ہیں جن کی توجہ یہ کی کوشش کرتی جاتے۔

محمد مجیب

(۱۹۰۳ء۔ ۱۹۸۵ء)

محمد مجیب عباسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے موروثی اعلیٰ ملک زمین الدین تھے۔ چودھری ریاست ملی کوسوئی اور کیمیا سے بڑی دلچسپی تھی۔ ان کے دو بیٹے تھے محمد یوسف اور محمد نسیم۔ محمد نسیم نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور ۱۸۹۰ء میں وکالت کی سند لی تھی۔ لایڈ وکیٹ جرنل بھی ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں پاکستان چلے گئے۔ ان دنوں کے قیصرے صاحبزادے محمد مجیب چن چن ۳۰ اکتوبر ۱۹۰۲ء میں گھنٹوں میں پیدا ہوئے۔ ان کی شادی ۱۹۲۹ء میں قصبہ سندیلہ کے ایک ممتاز گھرانے میں ہوئی۔ ان کی تعلیم کا نام آصف انسا تھا۔ ان کا اصل وطن بھول گڑھی، ضلع بارہ بکھی ہے۔ محمد مجیب کی تعلیم تہذیب سے آراستہ تھی۔ ان کی ابتدائی تعلیم درایتی انداز سے ہوئی۔ اسکے بعد وہ گھنٹوں کے ایک پرائیویٹ اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں محمد مجیب آکسفورڈ چلے گئے اور تاریخ میں بی اے آئیں کیا اور فرانسیسی اور لاطینی بھی سیکھی۔ پھر ان کا سفر جرمن ہوا۔ یہاں انہوں نے جرمنی سیکھی۔ اس زمانے میں روس انقلاب سے دوچار ہو رہا تھا۔ انہوں نے روسی ادیبوں کا بطور خاص مطالعہ کیا اور روسی زبان بھی سیکھی۔ ان کے مطالعے میں نالٹائی، بونوف، دستوفسکی رہے تھے۔ مجیب صاحب کا جرمن میں قیام تین برس رہا تھا وہاں انہوں نے بہت کچھ سیکھا۔ دیگر تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے جامد ملیا اسلام آباد کی ملٹی ماڈرن اور تہذیبی رہائش گاہ کے بڑھایا۔ اس ضمن میں پروفیسر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:-

”ان کے اس ادارہ سے دانش کی بھونکی مدت کم و بیش بیس سال رہی ہے اور پچھلے چوبیس سال سے خود شیخ علی محمد کی مشیت سے اس کی دیرپی اور قیامت کرتے رہے ہیں۔ جامد سچائی ذاتی بلکہ ملی کے یاد جو جس کا ذکر موصوف نے بار بار اپنی قریبوں میں کیا ہے انہوں نے جس لگن اور لگاؤ کے ساتھ خود کو وقف و جہاد کیا تھا اس کی نظیر نفسی اداروں کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ وہ اس ادارہ کی ان بزرگ اور برگزیدہ شخصیتوں میں رہے ہیں جن کے ذکر کے بغیر جامد کی ہر تاریخ نامکمل اور ہر انشائیہ انتہا و انتہا سے بچکا رہے گا۔“

یعنی مجیب صاحب کی قیادت میں جامد کا جو فروغ ہوا اور اپنی مثال آپ ہے۔

محمد مجیب کی اردو ادب میں کی جھلکیاں ہیں۔ انہیں دانشور کہنا چاہئے۔ ان کی ملی تصانیف کا غلط فہمی نہیں۔ ”لفظیات“ (۱۹۳۶ء) ایک اہم کتاب ہے، جس کی اہمیت آج بھی ہے۔ ۱۹۳۸ء میں موصوف نے ”دنیا کی کہانی“ قلمبند کی، جس میں محدثہ ایم سے دو رد چہ تک کی ارتقائی صورتیں ہر قدم کیس۔ کئی کتابیں انگریزی میں تھیں جن کا تعلق عالمی تاریخ و ہندوستانی مسلمان نیز ہندوستانی سوسائٹی، اسلامک، اثرات سے ہیں۔ انہوں نے کئی کتابیں ترجمہ کیں جن

کی اپنی اہمیت ہے۔ دراصل ان کو دنیا کی کہانی اور عالمی تہذیب و تمدن سے بڑا سروکار نہ تھا بلکہ ان کی کہانوں کو سامنے لانے کی محنت کو پیش کیں۔ اس سلسلے کی ایک کڑی ”تاریخ تمدن“ ہے جس کی اہمیت سے کئی کوا نکال نہیں ہو سکتا۔

محمد مجیب کو دماسوں سے خاص دلچسپی تھی۔ انہوں نے متعدد ڈرامے لکھے۔ مثلاً ”کھیتی“، ”انجام“، ”خاندان بنگلی“، ”عقب خاتون“، ”بیرہن کی عشا“، ”آؤ کاش“، ”آؤ ڈرامہ کریں“۔ یہ سارے ڈرامے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۵۷ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔

ڈراما ”کھیتی“ میں رضاؤں کی حیرت فرشی کا محل چلی کیا گیا ہے۔ لڑکی جوں کیارنگ لاسکے ہے اس پر توجہ کی گئی ہے۔ اس میں کوئی زمانہ دراز نہیں ہے۔ دراصل یہ ایک عوامی ڈراما ہے جس میں قوم و ملت کی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔ ”خاندان بنگلی“ ایک ایسا معاشرتی ڈرامہ ہے جس کا اختتام شیخ سرمد کی سزا کے قتل پر ہوتا ہے اس میں کئی سچے سچے ہیں بظاہر کہ مذہب مستقل اور آزاد و قدر ہے۔ مذہبی تعصب اور جہن انسانی راجی و انتہا کی جز کا قیاس ہے۔ یہ پانچ ایکٹ کا ڈرامہ ہے اور قصداً استیو ہے۔ ”عقب خاتون“ میں نسیم کے کس بھر میں ان کے صوفیانہ افکار کی گہرائی دکھائی دیتی ہے۔ مجیب صاحب انسانیہ کو آزاد و فروغ دینا چاہتے ہیں۔ جب خاتون یعنی مرکزی کردار سے یہ صورت سامنے آتی تھی ہے۔ ”بیرہن کی عشا“ دراصل مجیب صاحب کی اس خواہش کا نتیجہ ہے کہ خاتون میں آرت میں دلچسپی لیں۔ ”دوسری شام“ ڈرامہ کا ڈرامہ ہے، جس میں خانگی زندگی کی بعض صورتیں ہیں۔ انسانی کیف بھی ہے اور انسانی دشمنی کی پرزوں کو کھولنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ”آؤ کاش“ میں دراصل عوام کے غم سے بحث کی گئی ہے اور بعض صورتوں میں حکومت غور و فکر کی دلچسپی تلاش کی گئی ہیں۔ یہ پانچ ایکٹ کا ڈرامہ ہے۔

محمد مجیب نے بہت سے معیاری مضامین لکھے جن کا مضمون مذہب و معاشرت سے ہے۔ اسلام بطور خاص نہ بحث رہا ہے۔ تعلیمی مسائل پر توجہ دی گئی ہے۔

مجیب صاحب نے فن ادب کے بعض مسائل پر بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے۔ مجیب صاحب نے شخصیات پر بھی بڑی گہرائی سے لکھا ہے جن میں تہذیبی، معاشرتی نیز سیاسی معاملات در آتے ہیں۔ مجیب صاحب نے روسی ادب پر خصوصی توجہ دی اور روسی ادب کی درجہ بندی شائع کیں۔

محمد مجیب کی ایک شہریت انشائیہ بھی ہے۔ دراصل ان کے افسانے ان ہی موضوعات کو پیش کرتے ہیں جن ان کے دماسوں کا موضوع رہے ہیں۔ ان کی بعض کہانیاں جیسے ”کیسا گرا“، ”خاندان“، ”پانی“، ”کیسا مکان“، ”پانچابان“ وغیرہ اہم ہیں۔ ”سچ اور رافا“ بھی ایک اچھا انشائیہ ہے۔ ان کا افسانہ ”ہجر“ تھینک کے اعتبار سے نامعلوم ہوتا ہے۔

قرض کی پرویز محمد مجیب ایک نابینا روزگار شخصیت کا نام ہے، جن کی علمی اور عقلی کاوشیں بارگاہِ اردو و کھیتی ہیں۔ گو یہ چند رنگ نے بالکل کھینچ لیا ہے۔

”مجیب صاحب نے اپنے دور کی کاموں کے علاوہ ڈرامے بھی لکھے، کہانیاں بھی لکھیں۔“

طرحِ عجیب صاحب کی شخصیت میں بھی شرق و مغرب کی اعلیٰ اقدار یکجا ہو گئیں اور عظمتِ ہندی اور لبرل ازم کے جوہر نے اُن کا ایک نہایت مستحضر شکل اختیار کر لی۔ عجیب صاحب کی شخصیت میں تاریخی شعور کے ساتھ ساتھ آرتھوڈوکسی کی ایک حقیقی رو بھی برسرِ کار ہے اور کادراؤنر تو اُنی ہے۔ انہوں نے اعلیٰ انسانی اقدار و خوش مذاقی کو ہمیشہ اہمیت دی۔ اپنی سادگی، کوششیں اور اپنا سادہ وقت انسان کی اصلاح اور عقائد و مسخلت کے خلاف اُن کو بچ کر دکھانے میں صرف کیا۔

عمر عجیب کی وفات بھی دہلی کا واقعہ تھی۔ ۲۰ جنوری ۱۹۸۵ء کو ہوئی اور جامعہ اسلامیہ نئی دہلی کی قبرستان (قلمرواں) میں دفن کئے گئے۔

ابراہیم یوسف

(۱۹۳۵ء۔)

ان کا اصل نام محمد ابراہیم خاں ہے۔ اور والد کا نام یوسف خاں۔ ۱۰ مئی ۱۹۳۵ء کو جوڈپال میں پیدا ہوئے۔ پچیس سال سائنس اور اردو میں ایم اے کیا اور لی ایڈ بھی ہوئے۔ ہائر سکول کی اسکول میں مدرس رہے پھر پرنسپل ہو گئے اور سکول سے سیکرٹری بھی ہوئے۔

ابراہیم یوسف اور دودھ رائے کا ایک جماعتِ قدیم ہے۔ انہوں نے متعدد کتابیں ڈرامے لکھے ہیں کی کوئی پرے ملک میں ہوئی۔ ان کا پہلا ڈراموں کا مجموعہ ”سو گئے دو گئے“ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ جب سے ان پر نگاہ پڑنے لگی۔ پھر انہوں نے اُن کی مجموعہ شائع کئے جسے ”خزینہ دارے“ (۱۹۷۳ء) ”دو گئے آگئے“ (۱۹۷۶ء) ”پانچ سو ڈرامے“ (۱۹۷۹ء) ”ارامی سوڈ“ (۱۹۸۳ء) خاص ہیں۔ ان کے علاوہ دودھ رائے کے جہات پر مشتمل کام کرتے رہے ہیں۔ ان کے خیال میں ”مصلحت علم گیری“ اور دو کا قدیم ترین طبع زاد اور اس سے اسے موصوف نے مرثیہ کر کے شائع بھی کیا۔ رومانیہ کے ایک ڈراما نگار کریبل کے ڈرامے کا ترجمہ ”آئینہ خط“ کے نام سے کیا اور شائع کیا۔ ایک اہم کوشش مختلف زمانے کے اردو ڈراما نگاروں کی ترتیب بھی ہے اس باب میں انہوں نے حقدارین اور موصوفین (دو ادیبوں کو مرثیہ کر کے دو کتابوں میں شائع کیا۔ آقا عشر پناک۔ ایک کتاب مرثیہ کی۔ ایک اور تاریخی کام دیہ کی دور سے ۱۹۳۷ء تک کے ہندی ڈراموں کا ارتقا ہے، جس پر موصوف نے نگاہ ڈالی اور شائع کیا۔

ابراہیم یوسف کی ایک اور حقیقی اور تخیلی کاوش ”اندھ سدا اور اندھ سدا“ ہے۔ یہ کتاب سید احمد ہے اور حقیقی و تخیلی کا ایک بھی مثال پیش کرتی ہے۔ انہوں نے ایک ناول بھی لکھا ہے جس کا نام ان ہے ”آج کل روزِ بزم“۔

ابراہیم یوسف نے اردو ڈرامے کے سلسلے میں جو کام کئے ہیں وہ سب کے سب اہم ہیں۔ اس لحاظ سے

اخلاق اثر

(۱۹۳۷ء۔)

ان کا اصل نام سید اخلاق حسین ہے۔ ان کے والد حاجی سید مشتاق حسین تھے۔ اثر ۱۱ اگست ۱۹۳۷ء کو جوڈپال میں پیدا ہوئے۔ ان کے اس بارے میں یہ لکھا گیا ہے کہ ان کی زندگی کی ڈگریں اُن کی اور دوسری باتیں سے وابستہ ہو گئے۔

اخلاق اثر جمادیٰ طور پر ڈرامے سے شغف رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

مثلاً ریڈیو ڈرامے کی تاریخ (۱۹۷۵ء) اور دودھ رائے کا مطالعہ (۱۹۷۷ء) ریڈیو ڈرامے کی اضافہ (۱۹۹۰ء) اور شریات

اور آل انداز ریڈیو (۱۹۸۳ء) ان کے علاوہ اردو کی پہلی کتاب (۱۹۷۶ء) کتاب احتشام (۱۹۷۶ء) ملاقات (۱۹۸۹ء)

اقبال نامے (۱۹۸۱ء) اور اقبال اور مومن (۱۹۸۶ء) لیکن جیسے میں نے کہا کہ اثر کی اصلی جگہ نگاہ ڈراما ہی ہے اور اس

میں بھی ریڈیو ڈرامے سے۔ انہوں نے اس صنف پر بڑی عرق ریزی سے کام کیا اور ان کے خدا و حال متعین کئے۔ ان

کے مطالعات میں ان کتابوں کی بڑی اہمیت ہے۔ ریڈیو ڈرامے کی تاریخ کے ضمن میں ان کی مجموعہ پائی ہوئی روشنی پر نما

تاریت ہوئی رہی ہے اور اس کی وقاحت کا اعتراف ان کو ہے جو ریڈیو ڈراموں سے شغف رکھتے ہیں۔

محسوس ہوتا ہے کہ اخلاق اثر اقبال سے خاصے متاثر ہیں۔ اقبال پر ان کی دو کتابیں ہیں تو مطالعہ اقبال میں بہت

زیادہ اہمیت رکھیں۔ ان کی تاریخی کا مطالعہ روشن کرتی ہیں۔

اثر کا نام تعلیم سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ اس باب میں بھی ان کی کارکردگی نمایاں رہی ہے۔



انیسویں اور بیسویں صدی میں طنز و مزاح

رجب علی بیگ سرور

(۱۸۶۱ء تا ۱۸۷۱ء)

مرزا رجب علی بیگ سرور اردو کے ایک ممتاز شاعر، دانشور، محقق اور شاعر کی شخصیت سے معروف ہیں۔ ان کے والد کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا جو ایک تاجر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سرور خوش نویسی میں حلقہ تھے اور انہیں موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا۔ شاعری میں محمد آغا نواز علی حسینی کے شاگرد تھے۔

رجب علی بیگ کے سال پیدائش کے سلسلے میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے کوئی مستند شہادت ایسی نہیں ہے۔ تاہم بعد کر کے قول کر لیا جائے لیکن میر مسعود نے بعض حوالوں سے ان کا سال ولادت ۱۸۶۱ء مقرر کیا ہے۔ اسی تاریخ کو رشید حسن خاں بھی تسلیم کرتے ہیں ایک اندازے کے مطابق ان کا انتقال اس وقت ہوا جب وہ ۹۵ برس کے تھے۔ عظیم مظهر حسن کوڑوی نے ان کا سال ولادت ۱۸۶۵ء یعنی ۱۸۷۱ء مقرر کیا ہے۔ رجب علی بیگ سرور کے تعلق وطن کے بارے میں بھی اختلاف رائے ہے۔ میر مسعود اور رشید حسن خاں کے علاوہ کئی دوسرے محققین انہیں بھٹنور کا رہنے والے ہیں۔ خود رجب علی بیگ سرور بھی اپنا وطن بھٹنور ہی بتاتے ہیں لیکن عقیق نقوی نے استدلال کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ بھٹنور کے نہیں بلکہ کپور کے تھے اور اس سلسلے میں انہوں نے قلمی مدد کر کے نگاروں کی تحریر سے استفادہ کیا ہے جو اسی زمانے سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی غلام محمد الدین عقیق، جلال میر غنی اور خیراتی لال۔ یہ جگہ - ٹریب ہندو کا دہلی اور گارساں دہا کی ہے۔ اسی ان کا وطن کا جب یہ پڑ پڑا ہے۔ انہوں نے ان کا اظہار کیا ہے کہ ان کو میر مسعود جیسا اور ہے جگر نیر کا کے بیانات سے اجازت تھی۔ لیکن اب یہ ہے کہ انہوں نے گارساں دہا کی کے بیان کو رد کر دیا ہے کہ وہ کپور کے تھے۔ عقیق نقوی نے تینوں مدکرہ نگاروں کے بیانات اور سرور کے اہل خاندان کے کپور کے مستقل قیام کے پیش نظر از سر نو لکھی ضرورت یہ ضرور دیا ہے۔ میر الخیاں ہے کہ نقوی کا استدلال کافی وزنی ہے اور انہوں نے جو کہہ لکھا ہے اس پر اکتفا کرنا چاہیے۔ کرنے کی ضرورت ہے۔ میر ذاتی طور پر ان کی دلیل کو تسلیم کرتے ہوئے سمجھتا ہوں کہ رجب علی بیگ سرور کا وطن بھٹنور نہیں بلکہ کپور ہی تھا۔ میں یہاں نقوی ہی کے حوالے سے آچھو دوسرے اور بھی قلمی ردبابوں جن میں مختلف تہہ بہ تہہ سامنے آئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کپور میں اپنے چالیس برس بعد اسد علی کی ترغیب پر انہوں نے "اقبال کاغذ" تصنیف کی جو ان زمانہ کی عزت و شہرت و تکرار کا باعث ہے۔

مرزا نصیر الدین حیدر کی تخت نشینی کے بعد دوبارہ بھٹنور آئے اور ۱۸۵۶ء تک قیام رہے۔ جب کہ "لمعان کاغذ" ۱۸۶۳ء میں میر حسن رضوی کے مطبع بھٹنور سے شائع ہوئی اس کتاب کی ایسے قرائی تسلیم کی گئی اور ان کے چھپنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی اس حد تک کہ کم وقت میں اس کے چھاپے پڑھنے والے تھے اور اب تک اس کے تیسرے ایڈیشن نکل رہے ہیں جس کا اعزاز با تحفہ لگا بھی ملتا ہے۔

جب وہ اجداد کی شاہدیت کا شخص بنے تو سرور کی مالی حالت بہتر ہو گئی۔ انہیں کی ایمار میںوں نے بھی ایک جتنی کے "شاہد نامہ فردوسی" کے خط سے "اششیر خوالی" کا اردو میں ترجمہ کیا اور نام "سرور سلطان خالی" رکھا۔

سرور کے ایک کم فرما دیکھی اجداد خاں بلوچ تھے، ان کی نگاہ کو کم موصوفہ پر رہتی تھی۔ انہیں کی فرمائش پر سرور نے "عہد چہمیر" کی ایک داستان "نور آسمین ہند" کو اپنے اہماز میں تحریر کیا اور "شکوہ محبت" نام رکھا۔ یہ کتاب ۱۸۵۶ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ ان پر نظر کرم کرنے والوں میں فشی شیو نارائن بلواری بھی تھے۔ ان کی اپنا پر دھب علی ایک سرور نے "الف خللی" کی کتابوں کو تصحیف کیا اور مفتی زبان میں اسے لکھنا شروع کیا لیکن کئی طرح کا قتل پیدا ہوتا رہا اور اس کی تکمیل میں ۲۳ سال کا وقفہ سامنے آیا۔ اس کے بعد ہی اس کی اشاعت ہو سکی۔ لیکن انہوں نے اس کے حق اشاعت کو سواوی محمد یعقوب انصاری کے نام منتقل کر دیا۔ یہ کتاب چار جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس کا نام "شینان سرور" رکھا گیا۔ یہ نام نہ رکھی ہے۔

اب وہ زمانہ تھا جب انگریز پٹنہ اور نے اردو کے لکھام کو اپنے قبضہ قعر میں کر لیا تھا۔ تب سرور عارضی طور پر بنارس میں تھے اور ان کی تصنیف کی بدولت کی خبر سننے رہے۔ اتفاقاً انہیں یہ یاد آگئی کہ وہ انگریزوں سے وہ تمام شادی کیا کہ کس طرح انگریزوں نے اپنی دسترس میں ہر شے کو لے رکھا تھا۔ اجداد کی شاہدیت لکھنے میں نظر بند کئے چہ تھے تھے۔ سرور کی تمنا تھی کہ وہ کسی طرح اجداد کی شاہدیت ملاقات کرتے۔ لیکن فی الحال اس کی کوئی صورت سامنے نہ تھی۔ مگر اب شہر چھوڑ کر شہر نہیں تھوڑا جہاں ولدیا کے سارے سامان موجود تھے۔ اب وہ اچانک اور گھبراہٹ والی جگہ ہو گئی تھی ایسے ہی موقع پر مہر ولیہ انصاری پر سادہ پرائی سکھ نے انہیں جادوئی دیا لیا۔ یہ واقعہ ۱۸۵۹ء کا ہے۔

بنارس میں سرور انجمنی فعال رہے لیکن انہوں نے بڑی عرق ریزی سے محمد یعقوب انصاری کی فرمائش پر "فسانہ عجائب" پر نظر ڈالی کی۔ اس شخص میں نفوذی تھیں۔

"مولوی محمد یعقوب انصاری کے حسب فرمائش اس زمانے میں انہوں نے کم از کم دو بار اردو عرق ریزی کے ساتھ "فسانہ عجائب" پر نظر ڈالی کی اور جہاں جہاں لیکن ہوا اور دیوانہ تیار کی جنگ سے اس کی روایت میں اضافہ کیا۔ اس سلسلے کا ایک ایٹیشن ۱۲ ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ (کم جولائی ۱۸۶۰ء) کو مطبع الفضل الرطالی بمبئی کا تیار سے ۱۸ روپے ۲۷۵۰۰ رمضان ۱۲۸۰ھ (۱۹ مارچ ۱۸۶۳ء) کو مطبع الفضل الرطالی بمبئی کی طرف سے چھپ کر شائع ہوا۔ یہ دوسرا ایڈیشن اس اختیار سے چھپا گیا ہے کہ یہ مصنف کا تصحیح و ترمیم کیا ہوا آخری نسخہ ہے اور فشی شیو نارائن نے سرور سے "فسانہ عجائب" کا حق اشاعت خرید لینے کے بعد ۱۲۸۳ھ-۱۸۶۷ء میں اس کا چھپوا دیا۔ یہ وہ چھپا اور مصور اپنے لکھی شاہدیت کیا تھا وہ اسی نسخے پر مبنی تھا۔

قیام بنارس کے دوران ہی "شینان سرور" اور "فسانہ عجائب" انگریز "گلزار سرور" سامنے آئیں۔ "گلزار سرور" دراصل "حدائق العشاق" کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب قدس میں ہے اور علامہ محمد علی شہر کی کی ہے۔ نفوذی نے نیز مسعود کے اس قول کو نقل کیا ہے کہ "سرور سلطان خالی" میں "ششیر خوالی" کی سرور اور سہل زبان کو مشکل اور دلگیر بنانے کا عمل تھا ہے "گلزار سرور" میں "حدائق العشاق" کی روشنی کو مظاہر سادہ اور صاف اردو میں لکھا ہے۔ لکھنؤ کی کیا نگار "شہر عشاق" بھی ہے جو ایک جھڑ سے تھے پتہ چلا ہے۔ لیکن چند شینان اسے غماض سے بھی کہتے ہیں اور اسے نہ کبھی۔

سرور کو ایک شاعر کی حیثیت بھی حاصل ہے لیکن ان کا بیان اب تک دستیاب نہیں ہوا۔ سکا ہے اور جو بھی اشعار سامنے آئے ہیں وہ "فسانہ عجائب" ہی میں ہیں۔ محمد بشیر نے ان کو کافی نے اس کا احساس دلا یا ہے کہ سرور نے کوئی دیوان مرتب کیا ہی نہیں تھا۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ غلابہ مہر لڑکے حضرت کے پاس ان کا ایک شعر مرتب دیوان موجود تھا۔ ایسے بتائے "طبقات سخن" میں ان کے ۱۲۳ اشعار اور ایک دہائی نقل کی ہے۔ سرور جہاں ان کی شاعری کا حال جو بھی رہا جہاں کی سامری عظمت کا دار و مدار نظر نگاری ہے اور ان کی نگار کی میں "فسانہ عجائب" کی نثر کو ہر لحاظ سے اختیار حاصل ہے۔ ۱۸۶۳ء کا زمانہ وہ جب علی شہر سرور کے لئے خاصہ ہنگامہ لکھنؤ بہت ہوا۔ اس لئے کہ اس سال انہیں چھوڑنا پڑا۔ ایک ہفتہ پہلے ہی پائی جاتی ہے کہ انہیں قادی اللہ علی مہر نے جلاوطن کیا تھا اور دوسری کہ وہ ایک قتل کے قتل سے میں لوٹ گئے تھے۔ لکھنؤ انہوں نے نگار کی کے خوف سے کانپ رہی بنال، لیکن وہاں ان کا وقت اچھا نہ گزرا اور تصنیف عظمت ان کے اصعب پر سوار ہوئی۔ وہ جون وہ مشقت کے بھی شکار ہوئے لیکن عجیب بات ہے کہ انہوں نے ایسے ہی زمانے میں "فسانہ عجائب" لکھی۔

۱۸۶۳ء میں "فسانہ عجائب" کا پہلا نسخہ مرتب ہوا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "فسانہ عجائب" کا قصور سرور کے یہاں کس طرح پیدا ہوا اس باب میں سرور نے خود لکھا ہے:-

"حسب اتفاق ایک روز چند دوست صادق صحبت موافق باہم بیٹھے تھے مگر تیرگی زمانہ انہما اور کچھ دیر کی لکھ سطر پر ۱۸۵۹ء کو لاہور چھٹا شعر سے سب بادل آریں ڈار اور ہجوم اندر دیا میں سے اور کثرت حرمان و افکار سے کہ ہر دم بہ پاس تھے۔ دل گرفتہ بہت دوش اور اس تھے۔ یہ ذکر برتایا آیا کہ شعبہ پانی چرخ چہری نئی قام از نو جس آدم علیہ السلام تاجیں دم یوں ہی جلی آئی ہے۔ اور تفریق پر داری سرخ و گن سے حواں زاد ہوئی ہے۔ یہاں ہی اس حکام کی کہ کوئی اور ہے۔ اب یہی غیبت چاہئے۔ اس کا احسان ملے کہ تم ہم اس دم یا بہت بیٹھے ہیں۔ سامان:

جو ہم تم پاس بیٹھے ہیں اسطر، یہ دم لیمیت ہے
یہ سنتہ بلا رہ جائے تو کیا کم غیبت ہے

دل کیل جاتا ہے اور صحبت غیر جنس میں سخت سلطنت، جتنے تاوت سے بدتر ہو کے کالے نکاح ہے۔ سعدی:

پای در زنجیر عشق دوستان

بہ کہ با یک نگاہ در بوستان

لیکن زمانے کی عادت یہی ہے کہ باوجود کثرت غم و شدت اندوہ و الم: بعض پانیم نہیں دیکھ سکتا۔ مرزا:

پھینکے ہے مہینق چرخ، خاک کے سنگ لغزت

بہ کر ایک دم کہیں، ہویں جو ہم کلام در

جب سلسلہ سخن یہاں تک پہنچا، اس دوسرے میں ایک آفتابے باطرہ بندے کے تھے، انہوں نے فرمایا: اس وقت تو کوئی قصہ یا کہانی یا شیریں زبان کی بیان کر کے دفع کدورت و بھیت پریشانی طبع سے ہو اور فتنے سر بستہ دل پر تسکین و راحت سے منسلک ہے، بہ استہزاء نیم نظم کھل چائے ہر ماں و مارے، مگر اقرا، انکار صاحبہ بچا، چہ کھلے گوش گزار کئے، مگر چہ کر بہ کردن را ہم دل خوشی یاد نگاہیں نظر سے زعفران:

بر چہ از دوست میر مرد، نیکو است

و دہا تمیں آفتاب بہتہ چندا آئی، کہا: اگر یہاں بھی تمام تو اس پر گندہ فقر کو مارا غارتا انجام، قصے کے طواریح زبان اور میں فراہم اور خوب کرے تو نہایت منظور نظر ادب مصریو، لیکن قصص معارف، ہوا لغت سے صاف ہو۔ بندے نے کہا، طبعیت ان کے روزگار و پیش تو متوجہ صیب جوئی اور چرخ پیش ہے۔ ہول انگیز۔

حج کے دیکھنے والے تو بہت ہیں دلگیر

اور یہاں حسن نکاحان ظلم تھوڑے ہیں

ادب و ادب: پشاشت ملہ طالب اجرت کسی سے منظور نہیں افراط جاری خوشی و غم رکھ، جیسا رطب و ایلیم کے گا، ہمیں چند ہے! ہر طرح کے جوہر و مزاج اور مختلف گوارا کی تہہ دار ہے، یہی ہو۔

کام آئے و چائے نظر پر نہیں انگر جلدی نہ کر، بہ وقت فرصت کھول گاہ و قیاس طرہ ہر خاطر شے قبول کیا۔

لیکن صورت حال جو بھی ہو "نسانہ عجائب" کی تصنیف کے وقت سرور کے غشی نظر دوسری کتابوں کے بارود "مہینق توینار" "بہر تافن" "پہ دوست" اور "دستان امیر حمزہ" "طرد حق" "انکم گیان چند کے قول کے مطابق "نسانہ عجائب" کے واقعات میں تبدیلی کا سب کے سوا کوئی ایسا خیال نہیں جو فرمودہ لکھوں سے ممتاز ہو، راز انہر سبیل بخاری تو اسے "بہار دانش" کا ترجمہ کہتے ہیں۔ عزیز احمد بھی اس کا اضافہ "پہ دوست" "پہ دوست" کرتے ہیں۔ لیکن "نسانہ عجائب" اپنے طور پر طریق میں ایک انکی داستان ہے جو تھوڑے روز کے اسالیب کو انکے الگ بچانے میں مدد دیتی ہے، کسی کی کیا اہمیت ہے ابھی اس پر یہ بحث مطلوب نہیں لیکن یہ سچ ہے کہ مادہ اسلوب عجائب رباب خود "نسانہ عجائب" میں دو اسالیب کی کارطرائی نظر آتی ہے ایک تو وہ جوانی و چہرہ کی گراں باری اور اوق الظلا کی کھنٹی کی جیت سے کار نہیں کے سر پر جو جو سن جاتی ہے تو دوسری طرف کچھ سلیس اور محاورہ زبان کا بھی استعمال، تاہم ہر طعنا، جہاں سبیل زبان استعمال کی گئی ہے وہیں قابل ملاحظہ ہو گئی ہے اور تولید اسلوب کی کارطرائی جو ضروریہ کرتی ہے اس کا استناد ہو جاتا ہے۔

ایسا کہیں ہے کہ اس میں دو طرح کے اسالیب پائے جاتے ہیں۔ ایک ہیرو قہارک نظر آتی ہے کہ میرامن نے "بانغ و بہار" میں جو جوت جگتی تھی اور سرور کے ذہن و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ اس سے وہ ٹھکے کی بہ وقت کوشش کرتے لیکن اس کے اثرات کہیں کہیں یہاں کے دائرہ عمل سے نکل کر ایک نظری صورت اختیار کر لیتی ہے۔ میرامن اور "قصہ چہار درہن" "لیلیٰ" "بانغ و بہار" کے بارے میں ان کا یہ بیانیہ خردان کے اثرات کی پہلی نگاہ ہے۔

"جیسا میرامن صاحب نے "قصہ چہار درہن" کا "بانغ و بہار" نام کر کے یاد رکھا ہے کھیلو! چلایا ہے کہ ہم لوگوں کے ذہن جیسے میں یہ زبان آتی ہے۔ مگر بہ نسبت سوانح اول و ملا حسین خاں کے سو جگہ حد کی کوئی ہے۔ لکھا تو یہ ہے کہ ہم رلی کے روزے میں اپنی کاروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں۔ مگر چہاں انکی کچھ یہ کہیں خیال انسان کا خام ہوتا ہے۔ سخت میں ٹیک نام بدنام ہوتا ہے۔ بشر کو کوئی کہہ سزا اور ہے، کاتوں کو یہودہ کوئی سے انکار بلکہ نگہ دہار ہے۔ نہ لکھ آشت کہ غور ہو کہ عطار کو یہ یہ دی محفل شے میں آئی کہ اپنے منہ دھو بائی۔ لیکن تحریر اس کی اظہار پر ہے۔ قصہ یہ دلچسپ ہے بہ نظیر ہے۔"

اب اس سے اندازہ لگاؤ مشکل نہیں ہے کہ سرور میرامن کی "بانغ و بہار" کے روش "نسانہ عجائب" لکھ رہے ہیں اور اس طرح مذاق اڑانے کی کوئی چیز جو میں نہیں ہوتی۔ یہ کام تو وہاں خوشی سے لگی کر سیکھتے تھے۔ انہوں نے ایک قصہ سکس زبان میں لکھنے کا دعویٰ اپنے دوستوں سے کیا تھا۔ لیکن سلاست اور دعائی میں پشت چلی گئی کیونکہ میرامن کی بڑھ سانس

”جس احوال کو کاتب کو سامنے رکھ کر انجم مانیوری نے نکل و نظر کے نگاہی وار کئے اور حرا و نظر اہت کے نکلے لے لکھائے وہ خاص کر دو مستعار و مقامات سے مرکب تھے۔ ایک طرف مغربی تہذیب مشرقی اقدار پر حملہ آور ہو کر مروج کے قوانین کو براہم کر رہی تھی جس سے چند معاشرتی مسائل پیدا ہو رہے تھے دوسری طرف مغربی سیاست کے خلاف قومی تحریک آزادی کے قیام پر ضرر ہے تھے مگر اس تحریک کے جلو میں کچھ ناگوار باتیں بھی ابھر رہی تھیں۔ خاص کر لیڈروں کی بہتات اور ان کے ذاتی کرار کی بستی گیری نگاہ کئے والے وطن پرستوں کو بوجہ اور تکل رہی تھی۔ اس عجیب و غریب تضاد نے جہاں عام لوگوں کو الجھن میں ڈال دیا وہاں لوکاروں، خاص کر جو نگاروں کو متوجہ دیا کہ تصویر کو کھٹکے والی ہر چیز پر توجہ دیا جائے اور سامراجیوں اور قوم پرستوں دونوں کی بدحواسوں سے غفلت بھی لیں اور ان کی بدعلاقہ حیات کو بھیجیں بھی۔ ان فن و شعری کچھوں نے کسی کا کچھ تو نہیں بھلا کر کسی مل جیسے بہرہ پسندوں کے سامنے کر کے اور انہیں محام کی نگاہ میں ہنسی خیز بنادیا۔“

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ لیڈل مشہور جیسے لیڈر و نگار نے انجم مانیوری کو بہار چھپکا معیار کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ طنز و انتہا کی دوسری جلد پر نگاہ ڈالتے ہوئے اس کا اظہار کیا ہے کہ بہت کم ایسے صفحات ہیں جو ایسے پیچھے ہوتے فخر و سے خالی ہوں جنہوں نے میری نظروں کو اٹھائے مطالعہ میں کچھ دیر کے لئے مہمراہ رکھا ہو۔

”کرشمہ دامن دل کی کلف کہ جا ایہا پاس“

میں سید احمد قادری کا پاس گزار ہوں کہ انہوں نے معیار اور دوپ کے طور پر ”انجم مانیوری“ کو نگار سے لیا تک ”بھینسی کتاب مرتب کر دی ہے۔ ایسے ساہتیہ کا دلی ادبی نے بھی ان پر ایک موثر گراف شائع کیا ہے اور سنی پل انجناؤ کی کے مقالات، مہر و قلم کئے گئے ہیں لیکن اب بھی اس کی ضرورت باقی ہے کہ انجم مانیوری کی حقیقی شناخت کے لئے ان پر ایک بھرپور تحقیقی کتاب شائع ہو۔ یہ کام ہونا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ انجم مانیوری کی جگہ دار و بھر و حرا کی ادارت میں چھوٹا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

(۱۸۸۳ء — ۱۹۴۷ء)

اصل : مرزا فرحت اللہ بیگ اور پہلی قلمی نام بھی ہے۔ ان کی پیدائش ۱۸۸۳ء میں دلی کے ایک محل چھڑو والاں میں ہوئی۔ ”بچے“ ”بادشاہ فرحت“ میں خامیہ دہانی نے ان کا سال ولادت ۱۸۸۳ء اور ۱۸۸۴ء دونوں ہی لکھ دیا کہ

ہے۔ ان کے اسلاف شاہ عالم بانی کے عہد میں ترکستان سے ہندوستان آ گئے۔ مرزا نے اپنا تجربہ اپنے مضامین کی جلد چہارم میں درج کر دیا ہے۔

فرحت اللہ بیگ کے والد کا نام مرزا شمس اللہ بیگ تھا اور دامرزا امجد اللہ بیگ والدہ شرف بیگم اور بانی انجمن آراء انجمن یہ خوبیاں مان الدین کی بیٹی تھیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ بھی کس تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی پرورش ان کی بھوپتی حسن جیوں قسم نے کی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی ابتدائی تعلیم گھری پر ہوئی۔ پھر چھپے کے مدرسے میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد وہ کشمیری دورازے والے مدرسے کے طالب علم ہو گئے۔ ۱۹۰۱ء میں انہوں نے بہار کالج میں داخلہ لیا۔ شعروہ شاعری کا ذوق بچپن سے پیدا ہوا۔ ۱۹۰۳ء میں بیسٹہ ملتفتہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۵ء میں بی اے پاس کیا۔ اسی کالج سے موصوف ایم اے بھی کر رہے تھے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے والد بعد الاہلی قسم کے انسان تھے۔ اپنے آپ میں کمن میر و تفرنگ کرتے دانتے۔ ”بادشاہ فرحت“ میں ہے کہ انہوں نے نذر احمد سے ایک بار کچھ دیر کے قرض لینا چاہا لیکن نذر احمد نے کافی سوا طلب کیا۔ تہہ میں یہ کام نہ ہو سکا۔ نتیجے میں مرزا فرحت اللہ کو ملازمت کرنی پڑی اور وہ اس غرض سے حیدر آباد آ گئے اور ساری زندگی یہیں رہے۔ ویسے ان کا آنا جانا دلی میں ہوتا رہا۔ دلی تھری سے دل رہی تھی جس کا انہیں شدید احساس تھا اس حلیہ میں انہوں نے ایک ”مضمون“ لکھی دلی ”رقم کیا جس سے ان کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ حیدر آباد اسکول میں وہ ہیڈ ماسٹر ہو گئے لیکن بعد میں پیشہ بدل گیا اور پمشن رنج کے عہدے تک پہنچے۔ اس حیثیت سے وہ گھر گھر میں رہے۔ یہاں ان کی طبیعت اور حرا میں تبدیلی ہوئی اور ان پر خدا کی برکت چڑھ گیا۔

اپنی عمر کے ۶۳ سال انہوں نے دلی اور حیدر آباد میں گزارے۔ ۶۴ سال دلی اور ۳۰ سال حیدر آباد میں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی تصانیف میں سات مجموعے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور نگارشات بھی ہیں۔ ان کے سارے مجموعے ان کی زندگی ہی میں شائع ہوئے۔ لیکن ان کے انتقال کے تین سال بعد ان کی ایک اور کتاب ”میری داستان“ شائع ہوئی۔ اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیدر آباد میں وہ خوش فہم رہے بلکہ ایک طرح سے قید بہشت کی زندگی گزار رہے تھے۔

بیگ کی مضمون نگاری رسالہ ”قرائش“ کے ساتھ ہوئی جس کا جزا ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ لیکن اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ”قرائش“ سے پہلے ”مہم ہور ہور احسان“ ”رسالہ“ ”قادی“ ”میں“ ۱۹۱۹ء میں شائع ہو تھا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے یوں تو اکثر مضامین ہم سمجھے جاسکتے ہیں لیکن ان کے تین مضامین ان کی شہرت کا سبب ہیں۔ ”نذر احمد کی کیا بی“ ”کچھ میری کچھ ان کی زبانی“ ”دلی کا ایک مشاعرہ“ اور ”پھول و انوں کی میز“۔ یہ تینوں

مضامین اکثر یہ ضرورتوں کے تعاقب میں شامل ہیں۔ لیکن ان کا محرک یا مقصد غریبوں کی مدد ہے۔ جس کی اثبات کے بعد ان کی اہمیت بحیثیت مضمون نگار کافی بڑھ گئی اور ہر طرف سے پذیرائی ہونے لگی۔ اس کی اثبات یقینی طور پر سال "اردو" کے جولائی ۱۹۶۷ء کے شمارے میں ہوئی تھی۔

ایک مزاح نگار کی حیثیت سے مرزا فرحت اللہ بیگ کی ایک خاص اہمیت ہے۔ طرائف کے باب میں ان کا خیال تھا کہ خوش طبعی اور ذہانت کا احساس ایسی تحریر میں ہونا چاہئے جسے طرائف نگاری سے منسوب کیا جائے۔ اس ضمن میں اسلم پرچہ لکھتے ہیں:-

"مرزا فرحت اللہ بیگ کی بہت ہی مختصر سی ایسی ہیں جس میں انہوں نے خوش طبعی اور ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ مثلاً ان کے مضامین غریبوں کی کہانی، نکل کا ٹھوڑا اور ایک نواب صاحب کی ڈاکوئی، پھر دوسری بات انہوں نے یہ لکھی ہے کہ ہماری صاف تین دلچسپ اور محبوب و دلکش طریقے سے جاتے جاتے ہیں اور تیسرے یہ کہ سیاسی اور ملکی اصلاح دلچسپ طریقے سے کی جائے۔ جہاں تک سیاسی، ملکی اور ملکی اصلاح کا تعلق ہے اس معاملے میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے طرائف سے زیادہ کام نہیں لیا۔ انہوں نے یقیناً اصلاحی مضامین بھی لکھے ہیں جیسے "کسم پٹی کی شادی" یا "انجمن اصلاح حال بد مصاٹان"۔ لیکن بیان کے سنجیدہ مضامین ہیں۔"

مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکے بھی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ انہوں نے نذر احمد، حضرت اللہ خاں، وحید اللہ، بی بی سلیم، پرخا کے لکھے ہیں۔ ان خاکوں میں مختلف افراد کے ادنیٰ کارناموں کو گزشتہ میں لینے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ شخصیت کے دوسرے پہلوؤں کو نشان زد کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس عمل میں یہ خاکے بھلا اہم مضمون ہوتے ہیں۔ ان کے بعض خاکے کتب خانہ نویسوں پر بھی ہیں جیسے نالی چند، پیر اور دیگر نگارانِ فرد۔ انہوں نے "عض ایسے مضامین بھی قلمبند کئے جو اصلاحی قسم کے ہیں۔

انہوں نے انہیں مختصر بھی کہا ہے لیکن چونکہ ہے کہ ان کے جہاں حقیق کے اصول و ضوابط کا کوئی پاس نہیں ہے۔ دراصل وہ ماضی کی ادنیٰ شخصیتوں کے کچھ حقائق تلاش کر رہے تھے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں۔ اس ضمن میں ان کے مضامین "غریب انان"، "حکیم آتہ جان بیش"، "اسٹا" اور "ظہیر اکبر آبادی" دیکھے جاسکتے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کا اسلوب کجنگ نہیں۔ وہ اپنی تحریر کو بوجھل نہیں جانتے، وہ خود بخود اپنی ادنیٰ روش اختیار کرتے ہیں جسے عام سے غلطی کہا جائے۔ مجموعی اعتبار سے ان کی تحریروں میں نگارشی پائی جاتی ہے اور ادنیٰ کی نگارشی زبان پر فطری طور پر ان کی قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں سے ان کے وقت کے ادنیٰ کے فہم کا کمال نمایاں ہو جاتا ہے۔

وہ خود اپنے اسلوب کے اظہار کے سلسلے میں دشمن قرار دیے ہیں:-

"مخاطب معلوم ہمارے یہاں کے مولویوں کی یہ کیا ذہانت ہے کہ جب باتیں کریں گے تو ضرورت اور بے ضرورت عربی کے مونے مونے الفاظ کا طعنہ دیں گے۔ کچھ نہیں سمجھتے تو ہماری اردو کو عربی کا دودھا جھڑ پھینک دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ میں بھی کہ کام نکالنے کے لئے کھڑا ہوں۔ اس نام کو بگاڑ دیتے ہیں، چنانچہ مجھے مولوی ملک اعلیٰ صاحب کا نام بگاڑ کر معلوم ہوا اور ان کے صاحبزادے حضرت اعلیٰ صاحب کے نام نے گویا میں کی شکل اختیار کی اور اس نام نے وہ دور پکڑا کہ چھوٹے بڑے دوست احباب کو کراہا رہے ہیں اسے سب ان کو گویا میں تھا کہتے اور یہ عجیب و غریب نام سننے اور دہرائے مانتے۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے جو اسلوب اختیار کیا تھا اس کی وجہ کیا تھی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا انتقال دل کی حرکت بند ہو جانے کے سبب ۲۷ مارچ ۱۹۶۷ء کو ہوا۔

رشید احمد صدیقی

(۱۸۹۳ء - ۱۹۷۷ء)

رشید احمد صدیقی نقب مرزا یحییٰ خان جوہر میں پیدا ہوئے۔ حضرت جوہر زکریا رشید صاحب کے جہد اعلیٰ تھے اور مرتبہ بی بی صدیقی میں تبلیغ دین کی غرض سے ترک سے آئے تھے۔ پہلے پنجاب میں قیام کیا۔ پھر جوہر آ گئے اور مرزا یحییٰ خان سے مستقل سکونت اختیار کی ان کی اولاد میں بیشتر فرقی تھے۔ یہی رشید صاحب کے اسلاف میں تھے۔ ان کے والد کا نام عبدالقادر تھا۔ یہ بھی پولس کے ٹکڑے سے وابستہ تھے اور ایک عرصے تک لایا اور قادیان پر مقرر رہے۔ عبدالقادر کی بیٹی اور یا خدیوہ مشہور تھیں۔ صومہ و صلوات کے پابند رہے تھے اور صلاۃ، نفل الرحمن، حج مراد آبادی کے مرید تھے۔ عبدالقادر کی شادی سید واسطی کی صاحبزادی چنگا لالی سے ہوئی تھی۔ ان سے چار لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ رشید احمد صدیقی چوتھی اور اوڑھے تھے۔ عبدالقادر جب حیدر علی علیا میں تھے تو وہیں رشید احمد صدیقی پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی مدد شریف اور کٹر تھے۔ مختلف احوال کے شکار رہے۔ اسی وجہ سے وقت پر تعلیم نہ ہو سکی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ انہوں نے قادیان کے ملازمین کے بھی چند رسالے پڑھے۔ پھر اردو حساب کی طرف مائل ہوئے۔ اس کے بعد مقامی ہائری اسکول میں داخل کر دئے گئے۔ یہاں سے فراغت کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول جوہر میں داخل کیا۔ یہاں سے انہوں نے ۱۹۱۳ء میں میٹرک پاس کیا۔ اقتصادی طور پر ان کے گھر کے حالات اتنے تھیں کہ وہ اپنے لئے مزید تعلیم کا امکان نہ دیکھ سکے اور

نور کی کاشانی میں رہے۔ ابتدا میں جو پور کی عدالت میں فکرمقرر ہوئے۔ لیکن زیادہ دنوں تک ملازمت نہ کر سکے اور ۱۹۱۵ء میں ٹیکڑھ چلے آئے۔ کھیل کود سے الہاؤ تعلق تھا۔ کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال ان کے پسندیدہ کھیل تھے۔ اسکولی کیرئیر مانے میں گیتان بھی رہے تھے۔ اس زمانے میں علی گڑھ میں کھیلوں پر بڑا زور دیا جا رہا تھا۔ جب وہ کانچ گھبرا آئے تو بعض کھیلوں کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ برج بھی کھیلتے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں انہوں نے بی اے کیا اور ۱۹۲۱ء میں ایم اے۔ انہوں نے الہ آباد جا کر ایم اے کا امتحان دیا تھا۔ اس لئے کہ علی گڑھ کالج الہ آباد جو تدریسی سے علی تعلق تھا۔ بہر حال علی گڑھ میں ان کی خصوصیت تربیت ہوئی۔ یہاں ان کے حلقہ احباب میں اقبال احمد خاں، سہیل بھی تھے۔ وہ غیر معمولی طور پر ذہین سمجھے جاتے تھے۔ سہیل صاحب ہی نے رشید احمد صدیقی کی صلاحیتوں کو متنبہ کیا۔ کانچ کی غالب علی کے زمانے میں انگریزی کے استاد انعام اللہ خاں تھے۔ انہوں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ خاں صاحب کے بعض انگریزی مضامین کا ترجمہ رشید احمد صدیقی نے کیا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں ان کا تقرر جہاز میں ہو گیا۔ ان کے لئے ہوا۔ یہ مہمہ اردو مولوی کہلاتا تھا۔ اردو لکچرر کی جگہ جب نکلی تب یہ بھی امیدوار ہوئے اور یہ جہاز میں لکچرر ہو گئے۔ ۱۹۲۶ء میں مستقل لکچرر کر دیئے گئے اور نو سال بعد ریڈیو لکچرر ۱۹۵۴ء میں پروفیسر۔ ۱۹۵۸ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ پھر انہوں نے ٹیکڑھ میں اپنا ذاتی مکان تعمیر کیا۔ غالب علی کے زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین سے ان کے گہرے تعلق ہو گئے تھے۔ ذاکر صاحب ۱۹۲۳ء میں بھارت چلے گئے۔ اس سے پہلے انہوں نے "شیخ" یا "سہیل" رسالہ لکھنا چاہتے تھے۔ پروفیسر صاحب نے "شیخ" منتخب کیا۔ "سہیل" اور "ممن" اردو کے سہلی مسلم یونیورسٹی کے جملہ کی شکل میں ۱۹۲۶ء میں شروع ہوا۔ لیکن اس کے صرف چھ شمارے شائع ہوئے۔ مالی مشکلات کی وجہ سے رسالہ بند ہو گیا۔ لیکن رشید صاحب نے ۱۹۳۵ء میں اسے جاری کیا۔ لیکن صرف ایک ہی سال لگے۔ ان کی تعینیت و تالیف کے سلیکے میں انہیں پابندی شری کے اعزاز سے ۱۹۲۳ء میں نوازا گیا۔ ۱۹۳۵ء میں ساجیا کاندی کا انعام ملا۔ ۱۹۳۷ء میں بی بی اردو کاندی سے بھی ایک امتیازی انعام ملا۔ رشید احمد صدیقی بیسٹ ٹیبل رہتے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں سہلی سرچرڈولی کا دورہ چلا۔ اس کے بعد ۱۹ جولائی ۱۹۶۷ء میں ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی اور اسی دن نین چبے۔ پھر کو انتقال ہو گیا۔ ۱۶ جنوری ۱۹۶۷ء کو انہیں مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

اولاد میں مرحوم کے آٹھ بچے ہوئے، پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں۔ ان میں سہلی صدیقی کافی مشہور ہیں۔ رشید احمد صدیقی کی کتابوں کی فہرست درج ذیل ہے جو شائع ہوئی ہیں۔

- (۱) "طریقات و مضامین" (۲) "مضامین رشید" (۳) "خدا" (۴) "سہیل کی سرگزشت" (۵) "شیخ ہائے گرامیہ"
- (۶) "ذاکر صاحب" (۷) "ہمارے ذاکر صاحب" (۸) "جدید غزل" (۹) "شیخ یازدی" (۱۰) "آشتی بیالی میری"
- (۱۱) "ہم نغماتِ رات" (۱۲) "مراغی ان غدوہ کے نام" (۱۳) "علی گڑھ کی مسجد قرطبہ" (۱۴) "غالب کی شخصیت اور شاعری"

رشید احمد صدیقی اور ادب اور مذہب علی گڑھ (دو جلدوں) کے لئے جنت نقوش رکھتے ہیں۔ ان سے ایک تہذیب عبارت دی گئی ہے اور وہ تہذیب ان کی تحریروں میں واضح ہے۔ انہیں ممتاز طور پر اور عروج کا سمجھا جاتا ہے۔ انہیں ان کے نگار بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں ایک بہت قدر متحرک ہے کہ وہ ہر لمحے لکری رسالہ علمی میدان میں بھجواتے ہیں۔ جلد ایسے حراج نگار نظر آتے ہیں جن کا تعلق علمی اجدادات سے ہے ان کے ذمے کے لوگ ہیں۔ انہیں کو گوارا کرنا نہیں آتا بلکہ علمی ایک فضا قائم کر کے رکھتی رکھیں اس طرح رکھتے ہیں کہ جھڑپ نہ ہو۔ وہ کھلا جاتا ہے لیکن حراج کا شیریں کپول اس تھلاہٹ کو چھلکا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا حراج علمی نہیں ہے بلکہ محض کے بغیر سے پیدا ہوا ہے۔ عام طور سے ان کے یہاں قولِ محال (paradox) کی صنعت کے استعمال پر بڑی توجہ دی گئی ہے۔ ٹھیک ہے ان کے یہاں قولِ محال (paradox) ہے لیکن اس کے پس منظر میں وہ تمام اثرات ہیں جو سرائیکی میں پایا گیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کی دیگر تہذیب کی تہذیب کا لازمی عنصر ہے۔ اس لئے ان کے چنے بنانے کے تعلق میں وہ گوارا نہیں دیتا۔ ہوتی جو عام طور سے علمی لکھنے والوں کا حراج بنا جاتی ہے۔ اگر ان کے یہاں کوئی نکتہ ہے تو وہ اشارے کتابے کے پس منظر میں جا کر ہوا ہے۔ کہ خارجی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ رشید احمد صدیقی کے اس لکچر کی تمام کجی ہے جو ان کا پنا لکچر ہے۔ اسے علی گڑھ کی تہذیب کا بھی امزہ سکتے ہیں۔ یہ بھی ہے کہ ایک ایک موضوعات پر ان کی تحریروں کے فقر شاہگ ایک ہوتے جاتے ہیں۔ مثلاً "خدا" میں جمالیہ اور طریقہ کار ہے وہ "ہم نغماتِ رات" میں نہیں ہے، لہذا موضوع کے اعتبار سے وہ اپنے اسلوب کو ایک ماضیت دیتے رہتے ہیں۔ اس لئے اس میں ایک عروج کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

رشید احمد صدیقی کے یہاں نفاست اور شانگاہی تو ہے ہی جدید فلسفیانہ مباحث بھی زیر بحث آتے رہتے ہیں۔ اگر صرف اس کی مثال دھوڑلی ہوتوان کے شہرہ مشہور "اردو کا کھیت" اور "سہیل" کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔ اور مدد لکھتے ہیں کہ:-

"خدا" مضامین رشید صدیقی ہائے گرامیہ ہم نغماتِ رات، آشتی بیالی میری ان کی چند ممتاز کتابوں کے نام ہیں..... ہاں رشید صاحب صدیقی کے کل کو تو ذکر سترہاٹ کا نام دیتے ہیں۔ انہوں نے حراج سے احساسِ ذہان پیدا کرنے کا کام لیا ہے۔ ان کا حراج ایک رہی ہوئی تہذیبی شخصیت کا حراج ہے۔"

دراصل انور مدد کا آخری جملہ ہی کام کا ہے اور یہ بات یہ ہے کہ جس تہذیب کی نشاندہی موجود کر رہے ہیں ان کے نگارشات کو خوب مزہ ہے۔ میں ذہنی میں ان کی مختلف کتابوں کے بارے میں مختلف لوگوں کی رائے نقل کرتا ہوں جن سے اس کے فکر و فن کی تقسیم میں مدد ملتی ہے۔ آل احمد روڈ کراچی ہے کہ:-

"رشید احمد صدیقی کبھی اشعار کے برنگل اشعار سے تجویز استعارف کر کے اپنا کام نکال لیتے

عظیم بیک چغتائی

(۱۸۹۵ء — ۱۹۳۶ء)

ان کی پیدائش ۱۸۹۵ء میں جودھ پور میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم سکول پائی۔ لیکن ہی سے موسوف کی صحت خراب رہی تھی لہذا وہ کبھی بھی تندرست نہیں رہے، بچائی بچوں میں کمزور۔ والدین کی طرف سے ان کی دیکھ ریکھ زیادہ دیکھ بھلی تھی۔ جس کا نتیجہ ہوا کہ ان کے اندر کئی طرح کی نفسیاتی گڑبڑیں پڑ گئیں۔ واضح ہو کہ عظیم بیک چغتائی عصمت چغتائی کے حقیقی بیٹا ہی تھے۔ مگر سب سے موسوف ہی پر ایک خاکہ ”دورِ زنی“ کے عنوان سے قلم بند کیا تھا۔ یہ ان کی نفسیاتی کیفیتوں کو سامنے لانے کی ایک ایسی کوشش ہے جس پر مسلسل توجہ کی جاتی رہی ہے۔ ویسے ”دورِ زنی“ عنوان بذات خود ہجرت و استقبال پر مرکوز ہے۔

عظیم بیک چغتائی جسمانی کمزوری کی وجہ سے داخل کام نہیں کر سکتے تھے۔ کھیل کود سے دور رہنا ان کا مقصد رہتا لیکن قدرت بہت دوسری طرح سے جسمانی کمزوری کا ادا پورا کرتی رہی۔ ان کے اندر بٹنے بٹانے کی ایک ایسی کیفیت اور ہیبت کر دہ جو مثال ہے۔ ایسے کمزور شخص کے یہاں جی زندگی کے حوالے سے دور رہے اس کے لئے بٹ بٹانے بھی حیرت انگیز امر ہے لیکن عظیم بیک چغتائی اپنی جسمانی کمی کو اپنی تحریروں سے Compensate کرتے رہے۔

ایک سوال یہ ہے کہ مزاج نگاروں اور طرافت نگاروں میں عظیم بیک چغتائی کی اہمیت کیا ہے؟ جواب یہ کہ بیکھا جاسکتا ہے کہ یہ عظیم بیک چغتائی تھے۔ مگر وہ ہی ان کی تحریر میں کسی قسم کی گہرائی ہے۔ ابھی اور معیاری طرافت بٹنے بٹانے ایک ایسی انصاف طلب کرتی ہے جو نگاری اعتبار سے اہم ہو جاتی ہے۔ یہ صورت عظیم بیک چغتائی کی تحریروں میں محدود رہے لہذا انہیں بڑے پائے پر طرافت نگار کہنا غلط ہو گا۔ ان کی تحریروں میں خوشی اور شہادت ہے۔ بچوں جیسی معصومیت ہے لیکن ساتھ ساتھ صحت مند فیزیکی بھی ہے۔ ان کے سارے کردار بٹنے بٹانے کے عمل سے دوچار رہے ہیں اس سے آگے کی کیفیت بھی نہیں ہے۔ وہ اپنی کسی تحریر کو ایک شکل دے دیتے ہیں اس سے قلمی رنگ قشنگ ہو جاتا ہے۔ اس کی خامیوں اور کوتاہیوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اصلاح نہیں کرتے۔ دیتے ہیں تحریر میں جو شخص ابتدا میں پیدا ہوتا ہے وہ وہی رہتا ہے۔ ان کے طریقے مضامین بھی جتنے پھٹکے ہی ہیں۔ لیکن ان کو کیا ہوا جائے کہ ایسے جتنے مضامین بھی چند کردار پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے کرداروں میں خاتمہ کو کمال اور شہر میں یوں کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ ان کرداروں کی حیثیت مسلم ہوئی ہے اور ان ہی سے چغتائی بچائے جاتے ہیں۔ ان کو مقرر نہیں لکھتے ہیں۔

عظیم بیک چغتائی تھے کہ تاراج اور شورش واقعات سے طرافت سودیتے ہیں۔ کوتاہی

شریروں کی، اندرونی اور خاتم میں، وہ کسی خیالی دنیا میں نہیں رہی، معاشرہ میں رہ کر اس کی

نے واقعات اور اپنی معاشرت سے لئے ہیں اور اس میں خیر نہیں کہ زندگی کے حقائق سے قریب رہ کر انہوں نے افسانوی طرافت کو ایک مغز و قالب میں ڈھالا ہے جس سے بعد میں شوکت چغتائی اور دوسرے مزاج نگاروں نے بھی فائدہ اٹھایا۔ شورش اور بیک چغتائی کا کردار ان کے کوششوں میں طرافت کا رنگ بھرتا ہے۔ خاتم اپنی ذہانت اور طر جہاد سے شوہر پر حاوی رہتی ہے۔ اس نقطہ سے نکلے اور بٹنے و جھڑکھانے کے لئے جب شوہر ہاتھ پاؤں مارتا ہے تو وہ اور بدحواس ہو جاتا ہے۔ اس کی مثالیں خاتم ہی میں نہیں، شورش ہی میں ملتی ہیں۔

عظیم بیک چغتائی نے ”قرآن اور پردہ“ بھی کتاب بھی تصنیف کی ہے، جو ان کی تمام تحریروں سے الگ حیثیت کی حامل ہے اور جس میں تنبیہ کی کی عام خطا ہے۔

عظیم بیک چغتائی وقت کے مرعض رہے تھے۔ ساری عمر اس مرض کے ساتھ رہے آخر میں ۱۹۳۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ملار موزی

(۱۸۹۶ء — ۱۹۵۶ء)

ان کا مکمل نام صدیق ارشد تھا لیکن ملار موزی کے نام سے معروف ہوئے۔ ان کی پیدائش ۱۸۹۶ء میں بھوپال میں ہوئی لیکن ان کا اصل وطن ٹیک تھا۔ دراصل ایک زمانے میں ان کے والد اور بچا کامل سے بھوپال ہجرت کر گئے۔ چونکہ وہاں ہی اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور تھے اس لئے انہیں اعلیٰ ملار موزی ملتی رہی۔ ملار موزی کی اہلیہ اعلیٰ تعلیم ان ہی کی دیکھ ریکھ میں ہوئی۔ اردو، فارسی نیز عربی کی تعلیم حاصل کی۔ کاغذ کے برسرِ سلامت نے ان کی علمی دجاس بچائی۔ جب وہ دس سے دہائیت تھے جب ہی انہیں مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا۔ تب سے زندگی بھر وہ مضامین لکھتے رہے اور دنیا نے ادب میں اپنی ایک خاص جگہ بنائی۔

اردو میں ”گلابی اردو“ کے سرسبز امور ملار موزی ہی سے عبارت ہیں۔ گویا ان کی حیثیت ایسی اردو کے سرچشمہ کی ہے۔ انہوں نے خود گلابی اردو کی وضاحت یوں کی ہے کہ پہلے کی سادگیوں میں دل کی جگہ پہلے اعلیٰ ہو چکا تھا اور تب معلوم ان کا خیال تھا کہ اس طرح عربی سے اردو ترجموں کا انداز پیدا ہو جاتا ہے جو لائق آئیں۔ لیکن ہے کہ ان کی یہ بات درست ہے لیکن میرا خیال ہے کہ گلابی اردو کی ایسی سادگی، بہت جلد نیکو دیتی ہے اور پڑھنے والا دوسرے میں جتا ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس طرز کا موجد انہیں ہونا تھا۔ وہ تھے۔

ملار موزی تحریک آزادی سے کبھی وابہ نہ رہے تھے۔ سیاست سے چونکہ ان کی گہری دلچسپی تھی اس لئے سیاسی

مسائل کو خوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے مضامین حکومت کے خلاف لکھتے شروع کئے۔ یہ مضامین اپنے طور اور انداز کی وجہ سے پسند بھی کئے جاتے تھے۔ ان میں حب الوطنی کا جوش بھرا ہوا تھا اور اپنے وقت کی چیز تھا۔ بین الاقوامی تحریروں سے عام دلچسپی لے رہے تھے۔

ملازمونی کا بے گاہے شعر بھی کہتے تھے، اپنے مقرر بھی تھے، ان کے اندر انتظامی صلاحیتیں بھی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے محدود انجنینئرنگ قائم کیں۔ یہاں کا طرہ امتیاز ہے۔

گوانی اردو کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اسی نام سے انہوں نے ۱۹۲۹ء میں اپنی کتاب بھی شائع کی۔ یہ اس وقت کے لئے ایک نئی چیز تھی۔ عوام نے اسے پسند کیا لیکن وہ ادب اس قسم کی خزن نہیں لکھ سکتے تھے۔ لہذا انہوں نے اپنی ڈگری بدل لی اور سماج کی طرف راجع ہو گئے۔ مقرر و مراجع ان کی شخصیت کا ایک حصہ تھا۔ دلیپ سے عناصر ان کی تحریر میں بار بار پائے گئے ظرافت کا رنگ جن پر چڑھا ہوتا تھا۔ لہذا وہ حراج نگاروں کی صف میں بھی آ گئے۔ نور الدین نقوی خود ملازمی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:-

"خود غور فرماتے ہیں کہ میرے مضامین کی کوئی اہمیت ہے تو صرف اس لئے کہ میں حقیقت کا راس نہیں چھوڑتا۔ حکومت کے مظالم، سماجی نا انصافی اور معاشرتی مصائب انہیں صاف نظر آتے ہیں اور وہ دھڑلے سے ان پر اٹھ اٹھاتے بغیر نہیں رہتے۔ حالات انہیں مجبور کرتے ہیں کہ جو کچھ انہیں قحط کی آڑ میں لکھیں۔ نتیجہ یہ کہ دلچسپی میں اغمازی ہو جاتا ہے۔"

ملازمونی کا انتقال ۱۹۵۲ء میں ہوا۔

پطرس بخاری

(۱۸۹۸ء - ۱۹۵۸ء)

ان کا پورا نام میر سید احمد شاہ بخاری تھا لیکن علمی ذمہ پطرس سے مشہور ہوئے۔ ان کے والد میر سید احمد شاہ بخاری تھے۔ ان کے اسلاف کشمیر سے ہجرت کر کے پٹنہ آئے تھے۔ پطرس یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی پھر بعض مدرسوں میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۱۴ء میں میٹرک اور ۱۹۱۵ء میں انٹر میڈیٹ فیصلوں سے پاس کیا۔ ۱۹۱۷ء میں گورنمنٹ کالج سے بی اے کیا۔ پہلے ویم ایس وی کرنا چاہا لیکن ارادہ ترک کر دیا اور ایم اے کے لئے انگریزی ادب کا انتخاب کیا۔ ایم اے میں فرسٹ کلاس فرسٹ ہو کر سونے کا تمغہ حاصل کیا۔

پطرس نے ۱۹۱۹ء میں گورنمنٹ کالج کی میگزین "نوادنی" کی ادارت کی۔ ان کے استاد Peter wacks نے ایک رسالہ "مولی اینڈ ٹی ٹوٹ" لکھا تھا۔ اس میں دو مضمون بھی لکھتے رہے۔ ۱۹۲۵ء میں انگلینڈ اور کیمبرج میں یورپینی

کے سینئر اسکالرشپ پر بھی۔ ان کے استاد ویم ایس وی کرنا چاہتے تھے۔ زلی اپنے درجہ میں، ایف اے اور بی اے وغیرہ۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو لاہور واپس آئے اور وہیں کے ایک کالج میں لکچرار رہے۔ پھر گورنمنٹ کالج لکھنؤ ہو گئے۔ فلسفہ کے سکریٹری رہے اور کیمپس کی کامیابیوں کی کئی اہم مثالیں دیوڑھی مرتب کیں۔ ۱۹۲۴ء میں آل انڈیا یونیورسٹی میں نائب منظر پر ہو گئے اور تین سال کے بعد منظر وکر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے لیکن جلد ہی وہ گورنمنٹ کالج لاہور سے الگ ہو گئے اور یونان کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہ خدمت ۱۹۳۳ء تک انجام دی۔ جون ۱۹۵۲ء میں ان کو امجد کے قتل کے قیام سے قیامت سے ان کا تقرر ہوا۔ ۱۹۵۳ء تک اسی عہدے پر رہے۔ ۱۹۴۸ء میں چیکو میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کی۔

واقع ہو کہ پطرس کو کثرت الحلقہ سے غایت دلچسپی تھی۔ دلیپ سے مل کر وہاں مسیروں سے۔ ترجمہ بھی کئے اور تنقید کی مضامین بھی لکھے۔ ان کی ایک حیثیت دلیپ تعلیم کی بھی ہے اور نشریات کے باب میں ان کا نمایاں کام ہے۔ انہوں نے فیض احمد فیض کی ادارت میں نکلنے والے "پاکستان ٹائمز" کے چار ادارے لکھے تھے۔ برطانوی ریل کی کتاب جو بکوں کی ابتدائی تعلیم سے تحقیق رکھتی ہے، اس کا ترجمہ ۱۹۳۵ء میں کیا۔ ایف ایل برین کے قریبی سے متعلق ایک بہادر مددگار ہے یہ بھی ترجمہ ہے۔ پطرس کا انتقال ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں لاہور میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ ♦♦

پطرس اپنی کتاب "پطرس کے مضامین" کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ ان کے مضامین کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ اکثر و بیشتر اس پر تنقید و تبصرہ بھی اسی کتاب کے مضامین کے کس منظر میں کیا جاتا رہا ہے۔ اب جب کہ کیا شائع ہو گیا ہے تو ان کی تخلیقات سے دلچسپیوں کا دائرہ خاص وسیع تھا۔ آج بھی "پطرس کے مضامین" ہی بنیادی شناخت کا حوالہ ہو سکتے ہیں۔

در اصل پطرس کی میں حراج بہت چیز تھی۔ وہ بات میں بات پیدا کرنے کا کر جاتے تھے اور واقعات اسی سلسلے سے ابھرتے تھے۔ اس لئے ان کے یہاں بنیادی کلیات بننے جہانے کی ہے لیکن ایسی اہم اور ظرافت میں ایک طرح کا طرز چسپا ہوا ہوتا ہے۔ تو یہ عادت یہ ہوتی ہے کہ کثرت و پہلوؤں کی اس طرح غلطی کے گردت کی جانے کہ جسے جہانے کا موقع بھی فراہم ہوا اور ہوا اور ان کی اطلاع بھی صحیح ہے۔ مزید اعتراض کا یہ کام کرنا ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ پطرس کے یہاں انہیں کمراد کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ کہ خدا اور وطن کے تحت یہ کام کر رہے ہیں۔ ان کے یہاں قحط کی بنیادی حیثیت ہے اور پطرس کی پہلو سے برآمد ہوتا ہے جو چسپا ہوا ہوتا ہے اور یہ کام بندہ اہم ہے۔ وہ جیت میں گم نہ ہو کر پیدا کرنے کے لئے خواہ مخواہ کوئی خارجی معاونت کا سہارا نہیں لیتے لیکن واقعات کی ترتیب اس طرح ہوتی ہے کہ مقررہ پوش ہی کسی کہیں نہ کہیں بھانکا نظر آتا ہے یعنی ان کے خطوط ملاصرت ہوتی ہے جو روزانہ کار نہیں ہوتی بلکہ ستم کے ایک طریق

سے ابھرتی ہے اور یہ سسٹم خود پطرس کا اور نہیں ہوتا ہے۔

پطرس کی شہرت اور عظمت کی متعدد وجوہیں ہیں۔ لیکن انہی لحاظ سے "پطرس کے مضامین" کو شاہکار مزاحیہ (خوبیہ) مضامین کا مجموعہ ہے جو ان کی دائمی شہرت کا باعث ہے۔ پطرس ایک مزاح نگار کی حیثیت سے سب سے اہم ہیں۔ یہ بات کئی قوتوں سے ممکن ہے لیکن کسی طرح دوسرے سے اہم ہیں اسے دلیل کے ساتھ واضح کرنا آسان نہیں۔ لیکن چند باتیں ایسی ہیں جن پر توجہ کی جاسکتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ اکثر مضامین میں واحد شخص (ایک کردار) کی حیثیت سے موجود رہتے ہیں اور مشاہدے کو حقیقی بہت عطا کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح غالب اپنے کونٹا نہ بار کو اجتماعی سنا شدہ کیف و کم کوشاں زرد کرتا ہے۔ لیکن اس فن میں پطرس بھر مشاق نظر آتے ہیں اس کے لئے واقعات و حادثات کو سامنے لانے کے لئے بجز سنج اور حرافت ہنڈ کرنے کے لئے وہ الفاظ کا اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ ان میں اثر سرنو جان آ جاتی ہے اور قیاسی (کمی کمی اس کی آزمائی) پیدا ہو جاتی ہے۔ خاص ذہن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ "سویرے جو کل آنکھ کھلی" میں تو جوان طالب علم کو اس کی ہدایت پر ہی سویرے سے سویرے اٹھانے کے رد میں تو جوان کا تسامع جو ممکن صورت پیدا کرتا ہے وہ یہ دیکھتا ہے۔ پھر تو جوان طالب علم کا بھاراک کہ سویرے ہی اٹھتا تو دانا جان کا مشکور نظر نہ ہوتا۔ "زمین کو کیاں سے کیاں پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح" "کتنے" "میں کتنے کا خوف بھراس کی اپنی عارضی اور خائف نفس کا رنگ میں رہتا پھر کتنے کیاد سے پہلے" "میں آتھں زلف جاناں کی اگر لیتے تو ہم۔۔۔" مصرعے کا مکمل رد چنانچہ صورت پیدا کرتا ہے۔ گویا پطرس آئینہ دیکھ کر پھینچا کر نے میں لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور شاعروں بھی قلمی قوت کا مظاہرہ کرتے ہیں اس میدان میں دو تہا اور یکا تسلیم کے جاسکتے ہیں۔ کم از کم میں سبکی سمجھتا ہوں۔ ان کے دوسرے مضامین میں "باہل میں چڑھتا" "میں ایک میاں ہوں" "میرے پود کا پود" "مروج میں یاد میں" "ستیم کا عشق" "اردو کی آخری کتاب" (میر دلی) "میر کا جھڑا تھ" (خیر دلی) پطرس کی دکھات اچانک تھکیں کھیل کھیل کا انداز، شاعرانہ اور قلمی واقعات کو سادگیت میں بدل دینے کی قوت، آزمائی پیدا کرنے کی جلدت و جامعیت اور اختصار نظر اور تہمیز برائی کا اس میں ان تمام مضامین سے ہوتا ہے۔ مجھے یحیٰی الدین احمد کی اس دلت سے اختلاف ہے کہ رشید احمد مدظلی کے یہاں مغربی پہاڑ ہے اور پطرس کے یہاں اکار تک مرحلہ دیکھتے ہیں۔

"پطرس میں دو بے ساختگی، دو آہ، دو جوش نہیں ہے جو رشید صاحب میں موجود ہے۔

پطرس کی افتاد بھی نسبتاً مشکل، محدود انسانی معلوم ہوتی ہے۔ رشید صاحب کی یہ ایک ممتاز

خصوصیت ہے کہ ان کی تحریر میں ایک انہی شان ہوتی ہے۔"

یہ رائے انتہائی مقابلے کی ہے۔ یہ ایسی ہی تنقید ہے جو یحیٰی صاحب، عسکری صاحب کے سلیب میں کرتے رہے ہیں۔ دراصل بات بالکل انہی کی تھی ہے۔ پطرس کا وہاں تاخیر جگہ پطرس معلوم ہوتا ہے۔ کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ "اربر

کو کہتے" کا انکار کہ ذہن پطرس کے کسی مضامین میں موجود نہیں۔ حالانکہ پطرس علمی اعتبار سے زیادہ قلمی مسرت کے حامل تھے۔

پطرس کے مزاح میں طرز کا عنصر انتہائی کم ہے کہ صرف چند دہائیوں میں ہی اسے محسوس کر سکتا ہے اور یہ قابل تعریف بات ہے۔

پطرس کے طرز سے مراد یہ ہے تنقیدی مضامین، ادب لطیف سے مشق مضامین وغیرہ کی تفصیلی مطالعہ جاسکتے ہیں جس کا یہاں موقع نہیں۔

پطرس کی جگہ اردو ادب میں محفوظ ہے۔

شوکت قحانوی

(۱۹۰۵ء۔۔۔ ۱۹۶۳ء)

شوکت قحانوی ۲۳ جنوری ۱۹۰۵ء کو پندرہویں ضلع قحرا (آزاد کش) میں پیدا ہوئے۔ لیکن ان کا آبائی وطن ضلع مظفر نگر، قوت بدھون تھا۔ اسی سبب سے وہ اپنے نام کے ساتھ قحانوی لکھتے تھے۔ ان کا تاریخی نام احمد علی تھا لیکن مالک رام سے تاثیر احمد لکھا ہے۔ ان کے والد مدنی احمد کو انتقال ۱۲ مارچ ۱۹۲۸ء میں ہو گیا تھا اس وقت ان کی عمر چودہ برس کی تھی۔ ان کی شادی کم عمری ہی میں ہو گئی تھی۔ ان کی بیگم کا نام سعیدہ بنت جبار حسین تھا۔

شوکت قحانوی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی لیکن انگریزی تعلیم کے حصول کے لئے بھوپال، بکھو، علی گڑھ میں رہے۔ انہوں نے علی گڑھ اسکول میں جب داخلہ لیا تب ہی ان کے والد کا انتقال ہوا تھا لیکن سب سے کم کی تعلیم مکمل نہ ہو سکی۔ بوقت سنبھالنے ہی انہوں نے صحافتی زندگی کو اپنا لیا اور متعدد رسالوں میں لکھنے لگے۔ مثلاً "جشن ادب"، "سہم"، "اطلاق"، "مروج"، "کا کا کا"، "اردو شہد"، "خیر و باطل رسالوں کے یہ بانی و مدیر بھی تھے اور بعضوں کی ہدایت اور کفالت میں شامل تھے۔ مجبوراً آل انڈیا ریلوے پاکستان سے وابستہ ہو گئے۔ لاہور کی ایک فلم کمپنی سے بھی ان کی وابستگی رہی۔

شوکت قحانوی ۱۹۵۷ء میں مرچ ہو گئے اور ان کی موت تو روزانہ "جنگ" "کراچی" کے مدیر بن گئے۔ ۱۹۶۰ء میں ان کا پہلا مزاحیہ افسانہ شائع ہوا اور ۱۹۶۳ء میں پہلا مجموعہ "مروج جسم" کے نام سے شاعت پذیر ہوا۔

شوکت قحانوی کی تحریر سے لکھا کرتے تھے اور خوب سمجھتے بھی تھے اس لئے ان کی "طبوعات کی تعداد کافی ہے۔ بعضوں کی تصانیف و اکثر فرمان قحانوی نے کی ہے جن کے دلالے سے میں نے ان کی زندگی کا خاکہ مرتب کیا ہے۔ فرمان قحانوی نے "مروج جسم"، "بحر جسم"، "دل بھیک"، "خام خاں"، "سو بنا جاؤ"، "کرکٹ"، "میر خاتون"، "شیطان کی ڈائری"، "نورتن"، "مضامین شوکت"، "چھ یادیں کچھ باتیں"، "شکر انیس"، "برقی جسم"، "پنے خزانہ"، "کاٹون"، "مروج کی پیر"، "کئی کئی"، "بار خاطر"، "نیلوفر"، "بکواس"، "سہراں"، "قاضی جی"، "جوز توڑ"، "سوانحی

ریل "مولانا" غالب کے بارے "سناج کو آج" "ہزار" "خدا خرامت" "کتیا" "ماہ دولت" "انشاء اللہ" "بیوی" "بھانجی" "گور" "قادر" "بے جا" "کھڑا کر کیا ہے" اس فہرست میں چند اہل گئی ہیں۔

شوکت قناد کی کاپیہ اچھا افسانہ "سودیش ریل" ہے۔ اس سے پہلے بھی طالب علمی کے زمانے میں مضامین لکھتے رہے تھے۔ شوکت قناد کی سنی اپنی شہرت "ہندو" میں لکھے جانے والے حواشیہ کالموں سے حاصل کی۔ ان کے کالم کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ نتیجے میں وہ مستقل مزاج نگاری کی طرف مائل ہو گئے۔ افسانہ "سودیش ریل" نے انہیں مزید شہرت بخشی۔ یہ حواشیہ افسانہ ۱۹۳۸ء کے "نیرنگ خیال" میں شائع ہوا تھا۔ وہ خود لکھتے ہیں:-

"رسالہ نیرنگ خیال لاہور کے سالانہ ۱۹۳۸ء کے لئے ہم نے ایک حواشیہ افسانہ سودیش ریل کے نام سے لکھا۔ شائع ہونے کے بعد اب مجھے دیکھنے دی ہی ہم کو بھلا گھبراہٹ ہے۔ بہت سے مقامی حضرات، ملتے آئے، متعدد رسالوں اور اخباروں نے اس کو نقل کیا۔ ہندی، انگریزی، بنگالی اور مراٹھی اخباروں میں اس کے ترجمے شائع ہوئے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر قاضی صاحب کوئی بزرگ ہیں انہوں نے اس کا انگریزی ترجمہ دلائیے کے "گلوب" نام کے کسی اخبار میں چھپا دیا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اسی افسانے نے ہم کو مزاح نگاروں میں باضابطہ طریقہ پر شامل کر دیا۔ پھر اس دور کے بعض تذکرہ نویسوں نے حال صاف لکھ دیا ہے کہ شوکت قناد کی کی مقبولیت کا سبب بنیاد ان کا افسانہ سودیش ریل ہے۔"

اردو کے طرشت نگاروں میں شوکت قناد کی اپنی ایک جگہ ہے۔ ان کے مضامین میں وہ گہرائی نہیں ملتی جو رشید احمد صدیقی یا پطرس یا کنہیا لال کپور کے یہاں ہے۔ موصوف زیادہ گہرائی میں نہیں اترتے اور بالائی سطحوں پر رہتے ہیں۔ کبھی کبھی قافیہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کس جہان کی ہی کوشش کر رہے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن اپنے اس عمل میں وہ جانے انجانے نامور ادیبوں کو اس طرح پہنچتے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ کون کہاں ہے۔ ان کے طرشتی افسانے ایسا مضمین کے جوہر میں ایسے نیا پارے نکالنے کے جانتے ہیں جنہیں چند معیاری کہا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ کام ابھی تک نہیں ہوا ہے بہت تیز اور بہت زیادہ لکھنے والوں کا یہ مقدمہ ہوتا ہے کہ ان کی معیاری تھیں ہی تھیں انہوں میں کم ہو جاتی ہیں۔ سودیش کیفیت شوکت قناد کی یہاں بھی نمایاں ہے۔ کنہیا لال کپور اپنی قریوں سے ایک نئی پراخت کر رہے ہیں اور ان کی بازیافت میں تحقیق کی سطح بلند ہو جاتی ہے۔ رشید احمد صدیقی کے یہاں جو ڈاکس بہت کام کرتے ہیں اور وہ اپنے علمی پس منظر سے اپنی قریوں میں کافی گہرائی پیدا کر رہے ہیں۔ پطرس کے انداز میں ان کے علم کے ساتھ ان کے مشاہیر کی بخیر ہر جگہ کبھی جاسکتی ہے۔ شوکت قناد کی اپنے کلام کے یا جو اس سطح کے طرشت نگار نہیں ہیں اور اسے یہ رائے میری قناعت ہے۔ "سودیش ریل" انہیں انہوں نے بہت حد تک دو معیار حاصل کر لیا تھا جو مزاح کے بہترین لکھنے والوں کے یہاں موجود

ہے لیکن انہوں نے یہ صورت نگار قائم نہ کی۔ حالانکہ "سودیش ریل" میں ان کا سیاسی شعور بہت جڑا ہوا ہوتا ہے۔ شوکت قناد کی قلمی افلاقیہم سے کہا جاسکتا ہے۔ یہ اپنے دریاں دریاں اسلوب میں ہنسنے ہنسنے کے عمل کو بہت تیز کر دیتے ہیں اور یہی ان کی پہچان بھی ہے۔ ان کا انتقال ۱۳ دسمبر ۱۹۶۳ء کو ہوا۔ سرطانِ اہل میں ہوا اور میاں صاحب لاہور میں دفن ہوئے۔ لیکن انور سید ان کے وفات کی تاریخ ۱۹۶۷ء درج کرتے ہیں۔

کنہیا لال کپور

(۱۹۱۰ء - ۱۹۸۰ء)

کنہیا لال کپور ذات کے گھری تھے۔ ان کا آبائی پیشہ کارکاری تھا۔ انہوں نے اس کا اٹھارہ کیا ہے کہ ایک درایت کے مطابق ان کی پیدائش ۲۶ جون ۱۹۱۰ء میں ہوئی اور دوسری روایت کے مطابق کپور ۱۹۱۰ء کو۔ ان کے والد لالہ جی رام کپور ضلع لائل پور کے گاؤں "چنگ" ۲۹۸ میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ پاکستانی شہر کرلیا سے بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں کی اکثر آبادی بطورج کی تھی۔ اس کے بارے میں کنہیا لال کپور کا خیال ہے کہ وہ لوگ نہایت خدا ترن اور انسان دوست تھے۔

کنہیا لال کپور کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے ہائری اسکول میں ہوئی۔ ان کے ایک استاد مولوی محمد علی تھے۔ جن کی نادری اور اردو کی صلاحیت غیر معمولی تھی۔ موصوف نے انہیں گلستاں اور پوجاں جیسی اہم کتابیں پڑھائیں۔ کبھی کبھی قرآن کی آیات کا آسان ترجمہ بھی کر کے ان کی اہمیت واضح کرتے۔

کپور نے ۱۹۲۸ء میں گورنمنٹ اسکول کراچی سے میٹرک پاس کیا اور پورے پنجاب میں دوسری پوزیشن پر رہے۔ انٹر میڈیٹ ڈی ایم کالج لاہور سے پاس کیا اور لی اے کی ڈگری اسی کالج لاہور سے حاصل کی۔ اس اطمینان میں وہ انگریزی اور مسکرت کے مضامین میں اہل رہے۔ انہوں نے انگریزی کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا جہاں ان کے ایک استاد سید احمد شاد پطرس بخاری بھی تھے۔ بخاری کے اثرات ان پر دور رس رہے ہیں۔ جن کا ذکر انہوں نے کئی موقعوں پر کیا ہے۔ یہ کہ بخاری خود مزاح نگار تھے۔ اس لئے کنہیا لال کپور کو بھی انہوں نے اس کی طرف راغب کیا۔ کپور نے مزاح کے حلقے میں بخاری کی ایک رائے یوں نقل کی ہے:-

"جب کوئی چیز یا انسان زاویہ ناظر کی بجائے زاویہ مفرجہ یا زاویہ عادی کی شکل اختیار کر لیتا

ہے تو وہ مزاح کا مضمون بن جاتا ہے۔ نیز یہ کہ اردو مزاح کا ابھی پچھلا ہے اسے لکھنے کی

مزل تک پہنچنے کے لئے کم از کم بیس سال کا عمر مددگار ہے۔"

گویا بخاری کی تحریک پر کپور مزاح نگاری کی طرف مائل ہوئے اور یہی ان کا اہل مرحلہ و متنازعہ رہا۔ جب ۱۹۶۳ء

میں یہ تہذیب اکثر میں تھے تو ان کی شادی پشادتی سے ہوئی۔ ان کی اہلیہ ایک تہذیب گھرانے کی خاتون تھیں جو قصہ گو، مومن، ضلع سرگودھا سے تعلق رکھتی تھیں۔

ایم اے کرنے کے بعد کھیا لال کپور کی پڑھائی میں مدد گئیں۔ ملازمت کے حصول میں انھیں دشواری ہوئی۔ آخر ڈی ڈی اے کی کالج میں کچھ ریٹن کے استاد ہوئے لیکن ڈیڑھ سال کے بعد انھیں کالج سے الگ کر دیا گیا۔ جب وہ ٹیوشن کرنے لگے اور ایک سستے بورڈنگ ہاؤس میں اپنے رہنے کا انتظام کیا۔ اس دوران ان کی خاواکات کرشن چندر سے ہو گئی۔ چھریوں ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔ کپور کو اس تھا کہ بخاری کے بعد کرشن چندر کی دوا دے یہاں جنہوں نے انھیں لکھنے کی ترغیب دی۔

کھیا لال کپور کا پہلا طریہ مضمون کرشن چندر کے الماسے ”مہمان“ کی جی ڈی اے ہے۔ جس کا عنوان موصوف نے ”تھقان“ رکھا تھا لیکن یہ مضمون تک ہو گیا۔ کپور کہتے ہیں کہ کرشن چندر پر اس میں بہت چھٹی چوٹیں تھیں اس کے بعد وہ ڈی اے کی کالج لاہور میں پھر ملازم ہو گئے۔ تب انہوں نے دوسرا مضمون ”اخبار برقی“ قلمبند کیا جو تہ روزہ ”شیراز“ میں شائع ہوا۔ تیسرا مضمون ”پہلی شاعری“ ”رمالہ“ ”ادب لطیف“ کے سالانہ ۱۹۳۸ء میں اشاعت پڑا ہوا۔ لیکن کپور کی شہرت ان مضامین کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ ۱۹۳۲ء میں ”ادب لطیف“ میں جب ان کا مضمون ”غلاب ترقی“ پندرہ شعرا کی مجلس میں ”شائع ہوا تو اس زمانے کے ادبا اور شعراء ان کی طرف سے کئے گئے اس مضمون کا بڑا شہرہ ہوا۔ اشاعت سے پہلے ”عالم ادب“ ڈی ڈی اے کی ایک نشست میں یہ پڑھا جا چکا تھا۔ کپور اس مضمون کو اپنی ادبی زندگی کا آغاز قرار دیتے ہیں اور یہ کچھ غلامی نہیں۔ پھر مکتبہ جدید لاہور سے ان کی ”کئی تعقیف“ ”تنگ دشت“ ”شائع ہوئی۔ چھپنے ہی یہ تعقیف اہم لوگوں کی نگاہ میں آ گئی۔ اشتیاق حسین عبادت بریلوی، نظام السیدین نے اسے خاص طریقے پر پسند کیا۔ کرشن چندر نے انگریزی میں اس پر تبصرہ کیا اور انھیں لکھو کا لقب عطا کیا۔ پھر تو ان کی مسلسل تعقیفات سامنے آتی رہی۔ ”شیراز“ (۱۹۳۳ء)، ”چنگ و زب“ (۱۹۳۶ء)، ”توکب شمس“ (۱۹۳۹ء)، ”پال دوپ“ (۱۹۵۲ء)، ”نرم گرم“ (۱۹۵۵ء) اور ”گورکاراں“ (۱۹۶۰ء) شائع ہوئے۔

کھیا لال کپور کے بعض مضامین پر خاصی ہنگامہ اٹائی ہوئی۔ ان کا ایک مضمون ”اصل زبان“ ”ادب لطیف“ میں شائع ہوا تو جیسے جیسے کے زجر میں آگ لگ گئی۔ جنہیں زبان دانی کا دعویٰ تھا وہ کبیرہ خاطر ہوئے اور کپور کے خلاف سخت قسم کا احتجاج شروع ہوا اور تو یہ ہوئی کہ شاہد احمد دہلوی نے کفر کا فتویٰ بھی صادر کر دیا۔ لیکن کپور کب بارے ہائے تھے تاہم انہوں نے ایک دوسرا مضمون ”تے چوٹے نے گئے“ لکھ دیا تو ان کے خلاف ایک طرح کی تحریک شروع ہوئی اور انھیں طرح طرح کی (صلواتیں) دی جانے لگیں۔ ایک مضمون انہوں نے قیام پاکستان کے مطالبے کی مخالفت میں بھی لکھا تھا۔ اس پر تو حرج بگڑا ہوا اور انھیں تل کر دینے کی دھمکی بھی دی جانے لگی۔ لیکن کپور نے معافی مانگ لی اور معاملہ رفع

رفع ہو گیا اور انہوں نے مضمون کو کتب کر دینے کا وعدہ بھی کیا۔

تقسیم کے بعد کھیا لال کپور خیر و خیر ہوئے اور ڈی ڈی اے کالج لاہور میں پکڑے ہو گئے۔ ان کے لئے یہ جگہ بے حد پریشان کن تھی۔ ایک طرح سے یہ نیم رگجانی قصبہ تھا۔ لاہور کی یادیں انھیں خرابی دیتی تھیں لہذا سولہ سال تک وہ یہاں ملازمت کرتے رہے اور بھول خود جنت سے ہجرت کرنے کے بعد ہی باہم کو چاٹا مسکن بنایا۔

طرح و حراں میں کھیا لال کپور کی بڑی انفرادی اور ممتاز جگہ ہے۔ مجھے تو اپنے کلاسیک لکھنے والوں میں ڈگری دو حراں نگاروں کا انتخاب کرنا پڑا تو میری نظر سب سے پہلے کھیا لال کپور پر پڑے گی۔ اس کے بعد بطرس پر۔ پھر دوسرے لوگ آئیں گے۔ میرے خیال میں ان سے پھر جی ڈی اے لکھنے والے کوئی دوسرا سامنے نہیں آیا۔ دراصل انگریزی میں اٹھارہویں صدی کا جزو حیدر اور طریہ ادب ہے وہی دلا کا پیرا ان کی نگاہ میں رہا تھا۔ انگریزی اور اردو زبانوں کے مگرے مطالعے نے انھیں یہ ترسکا دیا تھا کہ اس طرح فطری طور پر مزاج پیدا کیا جا سکتا ہے۔ سماج کی تباہ کاریوں پر تو طر نگاروں اور مزاح نگاروں کی نظر رہتی ہے لیکن دھکتی دمگوں پر کس طرح انگلی دگی جا سکتی ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو طر و مزاح کے فن کو اس کے اصل قد و خالی میں دیکھ سکے۔ فن کوئی خوب پر رو پیش رکھتا ہے آتا ہے وہی اعلیٰ ادب ہے اگر سکتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ کھیا لال کپور ان لکھنے کو چاہے تھے۔ لہذا ان کے یہاں ہنسنا ہنسا بیعت میں لگنا لگانا نہیں ہے بلکہ وہ ایک رمزیہ آرت ہے جسے لفظوں کے موافق برتاؤ سے حاصل کر لے یہ انھیں تہ روزہ حاصل ہے اور وہ اپنے مضامین و کردار و وضع کرتے ہیں جو سماج کی تباہ کاریوں کو بے نقاب کرنے کی علامت بن جاتے ہیں۔ ان کا آرت لفظوں کے کھیل کا آرت نہیں بلکہ واقعات کو فطری ماحول عطا کر کے طر و مزاح کے کیف حاصل کرنے کا آرت ہے اور یہ صورت انھیں پر ختم ہوتی ہے۔

کھیا لال کپور کی زبان صاف ستھری اور شفاف ہے۔ وہ اپنی تحریر کو گنگ نہیں دیتے بلکہ تزلزل کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا مزاج نہ حائل بھی جتنی آشیا نظر آتا ہے۔ کھیا لال کپور کا انتقال ۱۹۸۰ء میں ہوا۔

رضا نقوی و ادبی

(۱۹۱۳ء - ۲۰۰۲ء)

رضا نقوی ادبی کی طر و مزاج شاعری ایک وسیع منظر نامہ پیش کرتی ہے جس میں آج کے محقق، نقاد و تبصرہ نگار، شاعر، اعلیٰ نثر، جز و صاحب، غلامیہ طر، پلڈر، لہذر، بابرفن، ایساں مشاعرہ، مکتو، ادب کا تب و اقتباس، ادبی ادب، کتب، ادبی ادب، مولوی، کامریڈ و غیرہ شدہ کیفیت میں ظاہر کئے گئے ہیں۔ جن مشہور شعرا و شہوؤں کا میں نے تذکرہ کیا ہے، ان میں اکثر شاعرانہ اعتبار سے جدا اہم ہیں۔ ادبی کی شاعری میں ان کا عصری تعصب مضبوط ہے تو صرف شاعری کی بنیاد پر ان کی نظر ادبیت مسلم معلوم ہوتی ہے۔ ان کی مثلاً ”نظم“ ”محقق“ اس امر پر دال ہے کہ ان کی رائے سے اتفاق کرنا اس

لئے مشکل ہے کہ اس میں ایسے محقق کی تصویر نمایاں ہوئی ہے، جو شاید اردو کا سب سے بڑا محقق ہے وہ محقق جرنیل رہا۔ لیکن یہ نظم اپنے شعری محاسن کی وجہ سے یاد رکھی جائے گی۔ چند اشعار دیکھئے:

یہ جو دکھ حضرت نے اپنے آتے ہیں گورستان سے

یہ نہ سمجھیں آپ جیسا ہزار اپنی جان سے

آپ کو قبروں سے الفت، عشق ویرانے سے ہے

آپ گھبراتے ہیں جیتے جاگتے انسان سے

جس پر ہم خود محقق آپ ہندوستان کے

آپ نے نقطے کئے ہیں صبر کے دیوان کے

ذکر تحقیق آپ کے رہتے ہیں یہ سب مسئلے

کس قدر جو ہے پنے تھے گھر میں مومن خان کے

پانچ بج کر پانچ پر یا پانچ بج کر سات پر

دارغ نے تارا تھا دم زانو پہ مٹی چان کے

وہن ہے یہ ثابت کریں دلی قاضی کا بیٹن

اور سودا کے چچا بوجھ تھے انگشتان کے

آپ کو ہے والہانہ مطلق مخلوقات سے

جیسے خانے کو الفت ہو اندھیری رات سے

کرم خوردہ اور بوسیدہ کتبوں کے ورق

ذہنیز کرتے ہیں آپ اس شہر اس ریاست سے

گر کسی نے لکھ دیا ہے صبر کے دو ہاتھ تھے

آپ اس کو دو کریں گے اپنی حقیقات سے

آپ کی تحقیق ہے ہوگی کہ لولہا تھا غریب

اور اسے ثابت کریں گے اس کی کلیات سے

مطالعہ حاصل ہوتا ہے اس کا احساس کیا جا سکتا ہے۔ کامیاب مزاج نگار واقعات کی غرض کی منزل تک بھی لے جا سکتا ہے۔ یہ کام آسان نہیں۔ مگر نگار نے ایک ایک لفظ میں ڈنگ بھردے ہیں۔ ظاہر ہے نگار نے چرچا نہیں کر سکتا اور نہ کھٹکے اور نہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ محقق کی راز و چھپی ایک طرف اس کی صحت ثبات ایک طرف، لیکن غلط نظر نگار ایک طرف کی صورت میں ابھرتا ہے اور محسوس سے داد وصول کر لیتا ہے۔ اس طرح نگار کو زمرہ مزاج میں رکھنا، اسے مجرم کہنا، شعر و ادب کے لئے معصیت گردانا اور اشتعال خیز کرنے والا فرض کرنا ممکن ہے کسی نقاد کی اہمیت کو کد کر دے کہ وہ اپنی معصیت ٹھہرا ہوتا ہے، اگر کسی پر تنقید بھردہ نہ کرے تو خائف کو، بھٹن اور شکایت اور اگر یہ کام سرانجام دے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دے، بڑھ بھی شکایت۔ غلطی نقاد کو تسخیر نظر انداز کر دی تو اور بات ہے وہ اس سے کچھ گھبراتا نہ چاہیں تو یہ بڑی بات ہے لیکن اس کیلئے معصیت یہ ہے کہ وہ کسی کردار بھٹن سے آرام نہیں کر سکتا۔ پھر بھی وہ اسی کی نظم ”نگار“ خود نگاروں کو بہت پسند آئے گی کہ کہیں نہ رہا لب قلم اور کہیں قلم نگار نے کی دفاع قائم کرتی ہے، چہرہ شعر سے لطف اٹھائے:

ان سے ملے آپ ہیں جو ہر شاہی نقد فن

کا بچتی ہے دہریے سے آپ کے دوح سخن

جب کہ قسمت دہریہ تھی عالم ارواح میں

آپ کو رکھا گیا تھا ذمہ مزاج میں

ہمت غلوار نے اک حشر برپا کر دیا

جو بھی زور میں آگیا اس کا مقابلہ کر دیا

جس سے بکڑے اس کی مٹی آپ نے گردی بنید

ہو گئے خوش جس سے دے دی اس کو شہرت کی کلید

آپ نے داغ سخن کو لیل بکھن کہا

آپ نے تک بند شاعر کو امام فن کہا

آئے جب علم بیاں کی سعیدی تفصیل میں

صنعت ایہام کی دم داندہ دی تحلیل میں

استعداد کو جڑے سے سنا یہ لکھ کئے

دش میں تنہا کی ظلمت کو سایہ لکھ کئے

ایک اور پہلو پر نگاہ کیجئے یہاں نمایاں نظر آتا ہے وہ ان کی اپنی ذات ہے۔ اور اپنی ذات کو معاف نہیں کرتے اور اپنے حوالے سے دوسروں تک نہ پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس عمل سے ان کے یہاں ایک طرز خاص پیدا ہو گیا ہے جو اپنے آپ پر بیٹے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دوسروں کو کیسے معاف کر سکتا ہے۔ اپنی ان کی غور احتسابی مزاج کا احتساب بن جاتی ہے۔ اس معاملے میں وہ دل سے قریب ہو جاتے ہیں اور یا ایک بڑی اہم دہشت جہاں انہوں نے خیر و برائی سمجھنے میں۔

خود اپنی ذات اور اپنی رفعت حیات کو نظر انداز کرنا انہوں نے ایسے ایسے خیر و شر چلائے ہیں جن سے ہماری بد نظمیوں اور دھڑکنے کی بے اعتدالیوں سے ہماری جان بچ رہی ہے۔

فکر تو نسوی کے ہضم مضامین میں چند کے نام ملاحظہ فرمایا ہوں:

”یہودیوں کی شرع پر تنقید“، ”ار کے لئے کتبہ کی ضرورت“، ”مظہر سحر سحر“، ”بہار و گرفتاری“، ”مجھے ابرار و زکا“، ”قبر سے دعا ہے“، ”سیر اچھڑ پنم“، ”محوالا“ (خاکہ کو ضرور وغیرہ۔

فکر تو نسوی کا انتقال ۱۹۸۷ء میں ہوا۔

حسین عظیم آبادی

(۱۹۲۷ء۔)

ان کا اصل نام سیّد محمد حسین ہے۔ ان کے والد کا نام سیّد محمد رشید تھا۔ پیدائش ۱۹۲۷ء میں چند میں ہوئی۔ یہیں تعلیم بھی حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آئی اے اے اے اور ایم اے کے امتحانات چند میں خود بخود پاس کئے۔ لیکن بہار میں خود بخود ریاضی مظہر پر سے ۱۹۵۶ء میں بی اے کی ڈگری لی۔ اب تک صوبہ بہار کی کسی یونیورسٹی سے کسی کو بھی بی اے کی ڈگری تفویض نہیں ہوئی تھی۔ حسین صاحب کا یہ اقتدار ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے یہ ڈگری لی۔ تعلیم کے حصول کے بعد ورنہ دہلی سے واپس آئے۔ مگر پھر یونیورسٹی میں ریڈیو اور اس کے بعد صدر شعبہ کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ ان کی شخصیات و تعلیمات میں کی کتابیں ہیں۔ مثلاً ”بہار کے نو چراغ“، ”الموجہ سستی“، ”الشیخ طہ طہ“، ”مختلف انسانیا اور چند انشائیں“۔

! اگر حسین یوں تو مختلف موضوعات پر لکھتے رہے لیکن ان کا اصل میدان انشائیہ تھا۔ اس فن پر ان کی مزید کتاب بہت مشہور ہے اور ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں داخلہ نصاب میں بھی ہے۔ دراصل حسین ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے انشائیہ کے اہتمام و تعلیم کی کوششیں کیں اور اس کے حدود وسیع کر کے چاہے۔ وہ یہ آقا اور دوسرے لوگوں نے اس سلسلہ میں اہم کام کئے ہیں لیکن حسین کی کاوشیں تاریخی اعتبار سے مقدم ہے۔ اسلئے یہ ایک ایسی مختلف ہے جو آج بھی بحث طلب ہے۔ دوسرے امور کے علاوہ مظہر و مزاج سے اس کا کیا رشتہ ہے، مجید و مضامین سے اس کا کیا

تعلق ہے، دوسری صفحوں سے آگے اس کے اشعار کا کیا ہیں اور اس پر حسنین نے اچھی بحث کی ہے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے اس صنف کی تہوں میں اتارنے کی کوشش کی جا رہی ہیں اور اس کی ستوں کا نئے مطالبات کے تحت تعمیر کیا جا رہا ہے۔ لیکن جس انداز سے محمد حسنین نے اس صنف کو اختیار کر دیا وہ اپنے میں پہلی کی وہ تاریخی واقعہ ہے جس کی پڑائی ہوتی رہے گی۔

موصوف نے خود بھی انشائیہ لکھے ہیں اور ایک مجموعہ بھی طبع ہوا۔ لیکن ملاحظہ فرمائیے کہ انشائیہ کا چارہ ابھی تک نہیں لیا جا سکا ہے۔ شمس الدین ان کا کہہ سکتا ہوں کہ انشائیہ نگار کی حیثیت سے موصوف کی کوئی خاص جگہ نہیں۔ اسی لئے کہ بعض دیگر جو مظہر و مزاج سے وابستہ ہیں انہوں نے اس فن کو بڑی جلا نشی ہے۔

حسین کے خاکے بھی اور کچھ ہیں۔ عظیم آباد کے جیسے معروف (اور غیر معروف) بھی لوگوں کے خانے دلچسپ ہیں اور آج بھی قلم حیدر ہیں اس لئے ”بہار کے نو چراغ“ ایک اچھی کتاب ہے۔

سیّد محمد حسنین نے قدوسی پر تحقیق کی تھی۔ یہ سندھی مکتبہ شائع ہو چکا ہے اور کی اعتبار سے اہم ہے۔

حسین صاحب نے چند افسانے بھی لکھے تھے۔ یہ مکتبہ ان کی ابتدائی دلچسپی میں رہی تھی لیکن ان کے لسانے زیادہ تر روایتی ہیں جن میں اسلامی احوال کو ناک و ناگہ مار نہیں پاتے۔

سیّد محمد حسنین کے اسلوب کے حلیے میں کچھ لکھتے ہوئے نگہ کیا جاٹ محسوس ہوتی ہے۔ انہیں اپنے طور پر غفلتوں کو ایک خاص جہت سے استعمال کرنے میں شاید خاصا مبالغہ آفاقا لیکن ایسی ترکیبیں بھی سامنے آئیں کہ محسوس فخری کی نوعیت تک پہنچ جائیں۔ ویسے تو ان کا کام آزادی نثر ان کی نگاہ میں رہتی تھی لیکن یہ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ آزاد کا تتبع کر رہے تھے۔ دراصل ان کا تخیلی ذہن غفلتوں کی حرمت کو مسلسل غلبہ لگا رہا تھا۔ پھر بھی انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس آفاق ہے کہ اس پر نگاہ رکھی جائے۔

موصوف کی وفات اسلام آباد میں ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۹ء میں ہوئی۔ دراصل وہ اپنی صاحبزادی کو دیکھنے کے لئے وہاں گئے ہوئے تھے لیکن قلب کے مریض تھے چنانچہ اس کا حمل ہو اور جان نہ ہو سکے۔ ہندوستان آ کر انصاف نہیں ہو اور وہیں دفن ہوئے۔ مظہر و قلمی برق نے قلم سے تاریخ کہا:

سویلا تھیں احوال کی تاریخ
ولا ہاتف کہ برق ہم اہم
جا کے نے موش ہوا ہم سے دور
”خوبی نقرہ سچ حسین“ آد

تفصیل 'ہندوستان کے مصنفین اور شعرا' مرتبہ گوپی چند نارنگ اور عبد اللطیف اعظمی کے مقررہ ۵۹۳ سے ماخوذ ہے۔

یوسف تاہم ایک ایسے مؤلف ہیں جن کی تمام نگارشات اعلیٰ نظر سے دوا حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی عمر ۸۰ برس ہو چکی ہے۔ وہ گزشتہ ساٹھ برسوں سے مطبوعات مزاح کے میدان میں ہیں لیکن اب تک ان کی تحریروں کی تازگی برقرار ہے۔

یوسف تاہم اپنی شرافت و مصونیت اور سبکی کے لئے معروف ہیں۔ حکومت کے اعلیٰ عہدے پر رہے لیکن ان کے یہ اوصاف ذہنی نہ ہو سکے اور ان کی فطری مصونیت انہیں لوگوں سے تریب کرتی رہی۔ سنجیدگی ان کی تمام تحریروں کا خاصہ ہے۔ جہاں طنز و تضحیک رکھتے ہیں، وہاں بھی جامعیت و سنجیدگی برقرار رہتی ہے۔ ان کی تحریروں کے اندر کثرت کی تنہیم کے لئے ان کی سنجیدگی کے پرے اظہار ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ جارحانہ اور نہیں کرتے بالخصوص انھوں میں سماجی ناہمواریوں کی سطح کی کرتے ہیں اور اس جرم بندی سے کہ اس کا خاکہ لپٹا کر معلوم نہیں ہوتا۔ مطبوعات مزاح کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں غور و فکر ہوتا ہے، نگار نگاری ہو بلکہ اس کے حسن میں یہ ہے کہ کثرت نے پائے وہاں آج تک اسے اس طرح محسوس کرے کہ اس کی تکلف بازی باقی رہے۔ غایت جارحیت بہت پر اثر نہیں ہوتی لیکن اسی طے کو آدھت جا کر پیش کیا جائے تو اس کا کیف الگ ہی ہوتا ہے۔ یوسف تاہم اس روئے آجھو ہیں اور اپنی تحریروں کو ایسے ہی نصف سے نصف کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں جہاد واقعات ملتے ہیں، ان کا بیان بھی ڈائریکٹ نہیں ہوتا بلکہ لفظوں کی ترمیم و تہذیب سے واقعات نمودار ہوتے ہیں، جن میں طنز و مزاح کا عنصر زیریں اور ان کی طرح ہوتا ہے جن سے ایک خوشگوار انصاف مرتب ہوتی ہے۔ انھوں کی تہذیب و تریب کی بات آگئی ہے تو یوسف تاہم کے معاملے میں اور ڈائریکٹری کے بلاغت کے نظام سے واقفیت ضروری ہے۔ دراصل وہ دیگر آف ان کیج کے استعمال کے بغیر اسے بھرے بھرے حسن گنہرے ہیں۔ اس معاملے میں ان کے یہاں قول و حال کی جو فصاحت ہے اس کا احساس کیا جا سکتا ہے۔

یوسف تاہم جب خاکے لکھتے ہیں تب بھی ان کا طریقہ کار سیکر رہتا ہے۔ یہ خاکے کہ ان کے یہاں واقعات معلومات کا کوئی نواز نہیں معلوم ہوتے لیکن کردار کی تفہیم میں بعض واقعات کی تخیلی ذہن انہیں قاضی مطالعہ ہوتی ہے۔ یوسف تاہم بناوٹ کے مطبوعات مزاح کے چند اہم ادیبوں میں ایک ہیں جن کی جگہ ادب و تاریخ میں محفوظ ہے۔

مشتاق احمد یوسفی

مجھے انیسویں صدی کے سب سے معروف اور منفرد طنز و مزاح نگار والے مشتاق احمد یوسفی کی زندگی کا تفصیل حاصل نہیں ہوئی لیکن پروفیسر محمد حسن اپنے ایک مضمون "سب سے بڑے لکھنؤ کا تاجدار" مشتاق احمد یوسفی میں چند نئی اس طرح لکھتے ہیں۔

"پیداؤں ہندوستان کی، ریاست داراجستھان کے علاقہ اردواڑ کی ہے جو قول خود ان کے

ادب پر مشتمل اور صدی تیسری کے لئے مشہور ہے۔ یہاں بھی کوئی ۶۳-۶۵ء کا ہوگا جس سے

تفصیل ان کا سال پیدائش نکال سکتے ہیں (کہ ایک اپنی خود نوشت سوانح عمری اور گزشتہ لکھتے

کے باوجود اپنے حالات زندگی کی تدوین میں کسی قسم کا تعاون کرنے سے بچنے کے ساتھ گریز ان میں اعلیٰ گزشتہ مسلم یونین میں ذکر تعلیم رہے اور اس کے باوجود جس حراج بچا کے لئے آئے (انہوں نے اس کا کالج کی بات دوسری تھی جس نے رشید احمد صدیقی کو پیدا کیا تھا) پاکستان بنا تو پہلے وہاں پھر لندن میں بقول ان کے کوچہ سوڈان میں تھیں جینک کی ملازمت میں عمر بسر کی۔ ان کے آپ بیتی کے بعد اب پھر ایک ایک کر کے ان کے پڑاؤ کا مریں لکھنا سے سبکدوشی حاصل کر کے پاکستان آگئے تھے ہیں۔ چار کتابیں کے مصنف ہیں جو چاروں کھوش شہریت اور مقبولیت حاصل کر چکی ہیں پھر دیکھئے 'نظام بدعین' اور 'گزشتہ' اور ایک کوئی اور اب تازہ تصنیف 'آب گل'۔

لیکن ایک انداز میں انہوں نے اثرات قبول کرنے کے بارے میں کئی اشارے کئے ہیں۔ تھیں فرنی کے ایک سوال کے جواب میں کہ آپ نے جن مزاح نگاروں کا بھی ذکر کیا تھا آپ ان میں سے کون لوگوں سے کافی قربت محسوس کرتے ہیں۔ یہ نئی لے چاہا دوسری باتوں کے علاوہ وضاحت کی کہ:-

"یہ جتنے نام میں نے آپ کو گواہی، جنرل مشتاق الرحمن، کرکھی محمد خان، عمیر قحطری، امین خان، محمد طاہر اختر، سید حسین اور یوسف تاہم اور دوسرے اور پطرس اور رشید احمد صدیقی اور طاہر ہے کہ سب پرست ہیں تو یہ ایک بڑی خوش نصیبی ہے کہ ہم ایسے درمیان میں پیدا ہوئے کہ جس میں یہ لکھنے پر غور و فکر کا کام دیا گیا ہے حضرت ان کے ہوتے ہم جو لکھ رہے ہیں وہ اس لئے لکھ رہے ہیں کہ یہ حضرت ہم سے پہلے یا پھر سے لکھ رہے تھے جہاں تک پسندیدگی کا تعلق تو وہ سب پرست ہیں لیکن پطرس آج بھی ایسا ہے کہ کبھی گاڑی انکے جاتی ہے تو اس کا ایک منہ کھولتے ہیں تو ذہن کی بہت سی گریں نکل جاتی ہیں اور اہم رواں ہو جاتا ہے۔ یہ پطرس میں بات ہے لیکن ایک بات میں عرض کروں کہ یہ سوال محسوس پھر کرتا ہے جہاں تک میرے لفظ کا تعلق ہے وہ انگریزی مصنفین ہیں۔

سوال: اچھا مثلاً کون سے مصنف آپ کو پسند ہیں؟

یوسفی: مثلاً مارک توکین جو باوا آدم ہیں مزاح نگاری کے۔ سوئٹ وہاں سے Humanist نہیں سمجھتے کہ Sairist ہیں۔ انھیں لی کا کہ پھر جارح کش اور ادھر مصنفین میں جبر جو اس اور پھر اتھو لی بر جس ان سے میں اگر یہ لفظ ہی استعمال کیا جائے تو اس سے Influenced ہوا ہوں۔ اگر یہ چھاپ جائے کہ کس سے Influenced ہوا تو ان کا نام ملے گا۔ ایک زمانے میں

شبیہ نگاہوں سے بھی ڈٹی ہوئی۔"

"طلب اور طوائف ہمارے پاس بد قسمتی سے لازم المردم ہیں۔"

"سوڑے گاؤں جگر کی پوئلگش اور بندہ مسلم فساد میں اشتعال کی جاتی ہے۔"

"ایسا ٹھکانا ہوا، اتنا چھٹا اور اتنا خراب شعر کوئی استاد ہی کہہ سکتا ہے۔"

دراصل بلاغی ایک نئے طرز کے شعور و مزاج نگار ہیں۔ یہ نسل حراج میں اپنے اہل اہل سے بچے رہے ہیں۔ اپنے آپ پر قس سکتے ہیں۔ اس طرح دوسروں کو جتنے ڈرانے کے ساتھ خود احتسابی پر بائیل کر سکتے ہیں۔ یوں تو وہ حراج نگاروں کو قوطی کہتے ہیں لیکن لازماً اس قوطیت کے پیچھے سماجی قیودیت ابھرتی ہے۔ "آپ تم" اور ان کی دوسری کتابیں ایسے تمام انجیادارے کا پتہ دیتی ہیں۔ مزاح نگاری میں جو کیفیت انہوں نے پیدا کی نہ وہ نظریں کے یہاں ہے نہ رشید احمد صدیقی کے یہاں۔ کبھی کبھی چند جملے میں اتنے کام کی بات کہہ جاتے ہیں کہ اس کی اضافت کے لئے پوری ایک کتاب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آل احمد سرور نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ۔

"بلاغی کی حراج نگاری میں زندگی کے گونا گوں تجربہ بات اور مشاہدات کے علاوہ ہمارا ادب اور

عالمی ادب کے مطالعے کے ذریعہ غور و خوض ملتا ہے۔ یہاں سر بلھرے سگی، ماضی میں گم، بلاغی

کمال میں صحت پر طرح کے انسان ملتے ہیں۔ بلاغی ان سب سے جھڑپیں پیرا کر دیتے ہیں

ان کی جھلک ان کی سیر نظر آتی ہے۔ ان کی کالی ان کا ریز، یہاں ٹیکسچر بھی ہے۔ کھلنگ بھی

کتیو، شمس بھی اور مہتابا جیہ بھی۔ ہاں ان کا کام آزاد بھی جوش فح آبدی بھی۔ غلام محمد بھی اور

ایوب جال بھی۔ بلاغی تو اسے اشعار میں تصرف کر کے ان کے لطف میں سے سیلو پیدا کر دیتے

ہیں۔ انہیں زبان پر بڑی قدرت ہے اور زبان کے رکھ رکھاؤ کا خیال بھی۔ انہوں نے جہاں

بلاغی، پشتو، سندھی، پنجابی کے الفاظ کا اردو میں اضافہ کیا ہے وہاں گنگا جمنی اردو کے ایسے

مجادرات کا بھی جواب سننے میں نہیں آتے۔ حسن کو انہوں نے ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ سراپا

نگاری میں وہ ہمارے بعض مشہور شعوی گویوں کو مات دے سکتے ہیں۔"

مشتاقی بلاغی کا ادبی سفر ابھی چل رہا ہے۔

دلاور فقار

(۱۹۲۸ء۔ ۱۹۹۸ء)

ان کا اصل نام دلاور حسین تھا لیکن دلاور فقار کے نئی نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی پیدائش ۲۸ جولائی ۱۹۲۸ء

کوہاڑوں میں ہوئی اور اوقات ۲۲ جنوری ۱۹۹۸ء کو کراچی پاکستان میں۔

دلاور فقار نے ۱۹۵۹ء میں اعلیٰ نگر سے انجمن اسلامیہ کی کالج میں داخلہ لیا۔

دلاور فقار دلاور کے نامور نگار و شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ "خاندان" کے نام سے

۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ لیکن یہ طرز یہ شاعری کا مجموعہ نہیں تھا شاید وہ اب تک اپنی راہ چھن چکے ہوں گے۔

شاعری انہیں سماج کی ناہار دیوں اور اس کے دکھ درد کی طرف لے گئی اور بخیر و مزاجی ان کے طرف نکل ہو گئے۔

ان کے کئی مجموعے شائع ہوئے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی حد تک زندگی کے بچ و بدم کی طرف متوجہ رہے۔

طبیعت، تہذیب، تمدن ان کے یہاں مکمل کیلئے کا انداز نہیں ہے۔ شعری ادھاف سے باخبر ہیں اس لئے غور و خوض کرتے ہیں کہ

ان کا کلام رطب و ریشا سے پاک رہے۔ ان کے مجموعے "سہم غریباں" (۱۹۶۳ء) سے اب ان کی افادہ طبع کا اندازہ

ہوئے گا۔ فقار ان کے کام پر توجہ کی جانے لگی تھی۔ دوسرے مجموعے "شامت اعمال" (۱۹۶۹ء) اور "آداب عرض"

سے ان کی عظمت کا پھر ہر احساس ہوا اور نقادوں نے بھی ان کی طرف توجہ کرنی شروع کی۔ ان کے بعد وہ جھنجھکیں۔ ان

کے کئی مجموعے زیر طبع سے راستہ ہوئے مثلاً "مطلع عرض ہے" "خدا جھوٹ نہ لہرائے" اور "انجلیاں نگارانی"۔

دراصل دلاور فقار اس راہ کو اپنا نام ہے۔ دلاور فقار بھی انگریزی الفاظ ایک خاص طور سے استعمال کرتے ہیں اور انہیں نیا

اور ماضی بخشنے کی پالیسی کا شوق ہے۔ ان کے مضامین اور ہیں اور انگریز آبادی کے اور لیکن دونوں کا فرق

حالات اور وقت کا فرق ہے۔ پھر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ دلاور نے انگریز آبادی کا سلب حاصل کر لیا تھا۔ دراصل وہ

اپنے توجہ کے خاتمہ پر ان تک پہنچا شاید کمال ہے۔ انور سدیدان کے فنی نکالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"دلاور فقار نے اس قسم کے زمانے کو دیکھا اور پرتا تھا جب بھول خواہد رہی حیدر، دلاور لوگ جو

بڑے عہدوں پر ماسور تھا یا کسی اور راہ سے صاحبان آسائش میں شمار ہونے لگے ہیں خود کو

صفت اول کے آدمیوں میں اکٹھے کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ لیکن دلاور فقار نہ بڑے ہنرمند

تھے نہ صاحب دولت و ہر تھے لیکن ان کے پاس شاعری کی حیثیت ہی میں متعارف ہونے

اپنی اس حیثیت میں ہی صفت اول کے حراج نگاروں میں شمار ہونے اور دلچسپ بات یہ ہے

کہ معاشرے کی جس حقیقت کو پیشتر بڑے شعرا صوبہ شاعری میں نمونے سے کر رہے تھے

تھے، دلاور فقار نے اس حقیقت کا گریبان چاک کیا اور اپنی جھنجھکی بدلت سے اس حقیقت کو نہ

صرف نئے زاویوں سے منکشف کر دیا بلکہ اس حقیقت کی تاح و ساری سے چرخہ کشاں بھی

روشن کر دیا۔ خواہد رہی حیدر نے ایک جگہ لکھا ہے: "اس جگہ میں مزید حاد علی، سلیم احمد دلاور

فقار نے اپنی کتابوں کی تقریب رونمائی میں کوئی دلچسپی نہیں کی۔ وہ بیوقوف، مفت پرانے سچے

"ان کی شاعری میں ان کی زندگی کا ہر واقعہ صاف بھٹکتا ہے۔ ان کی طبیعت اور تہذیب اور تعلقات سے ہر بھگتی ہے۔ وہ منکسر الخواج اور دوستوں اور واقع ہوتے ہیں۔ لیکن وجہ ہے کہ ان کے کام میں اپنے ہر شعر شعرا کی ہر ہر کیفیت کے بغیر جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ ان کی بھی وہ مشاعروں میں سے ہوتے اشعار خوب ملایا کرتے ہیں۔ ان کی سادگی اور وسعت اور ان کی بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس وقت اسے معروف و مقبول ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے ایک گناہ دوست سے اپنے بارے میں کچھ لکھنے کے بارے میں کہا ہے۔ ان کا حافظہ بہت اچھا ہے۔ انہیں عروض سے واقفیت ہے، زبان پر قند سے حاصل ہے اور طبعاً شاعر ہیں۔ آج اردو نظم میں انگریزی الفاظ کے بے رحم استعمال، بے رحم کاری اور تصراف میں ایک معیار رکھتے ہیں۔ لہذا ان کی بات میں ایک بات کہہ جاتے ہیں بلکہ یہاں وقت کی بات ہے۔ اب ان کے بعض الفاظ پر ملاحظی اور تنقید جڑ جڑ سے ہوا نظر آتا ہے۔ اس میں سے کچھ خرابیاں بھی ہے۔ زندگی کے مسطح پہلو اجاگر کیا کرتے ہیں لیکن ایک نئی اور باطنی نظری کے ساتھ۔ ان کے شعر میں تہذیبی لائق ہے جو یہ بھی ہے اور پروردہ بھی۔"

کرل محمد خاں

(۱۹۴۰ء -)

ان کا تعلق ضلع بہمن کے سنگار کوستان علاقے سے ہے۔ ان کے دادا امجد ازراحت پیشہ تھے۔ ساتھ ساتھ یہ گری بھی۔ یہ خان لوگ، مجدد ستر دست و توانا تھے۔ محمد خاں اپنے ہی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ساجد اور دانش کو انگریزوں نے نظر رکھا جائے تو ان خاندان کا کوئی شخص ادیب نہ تھا اس لئے ان کی حیثیت سے وہ جو کچھ بھی ہوئے وہ قلمی کی رہیں۔ یہ میر تقی میر کی نظر میں ہیں کہ:-

"ایک تو دہلی میں اور تھوڑا دھڑ خاں اکھنڈی دم و دم از اہلے کافرانہ تر دہلی آؤ مان!..... کہیں میں جلتے جاتے تو چٹانوں سے جوئے شیر نہ کھینچ لائے ہلو اور لٹائے تو لہکوں کے نصیبین تہہ بالا کر کے رکھے۔ دھن کا مان، ملت کی آئندہ!

دوسرا محمد خاں وہ ہے کہ اس سادہ سادہ زبان سے ان کے ذہن کی نگہ کی شاندار اپنی اور باریک کا انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ادیب اور انکا ہندازہ خاں ہے۔ ہر دم گفتگو، گرم دم سخن و چمن مشرق، بھار بھار تو خوں دل و گرم اشتیاق، سادہ و روشن جبین!

تاکہ اس نظر پرانی فضا سے بہت کچھ بھی ایک مثال قائم ہو سکے۔ وہ اپنی ذات میں ہم ہو کر صرف اپنے اندر کے شاعر کی آواز سنتے تھے اور اپنی ذات کے ساتھ ہم کلامی میں اپنے خوب جاتے تھے کہ وہ "سنگار" کو "سوان" ہاؤس انسان نظر آتے۔ حالانکہ جس وقت نظری سے اردو دنیا کو دیکھتے تھے اس نظر سے دنیا دار لوگ کمر خروم تھے۔

انچسپ بات یہ ہے کہ عام زندگی میں دلاور نگار بڑی بڑی باتوں کو گھسی کرنے کے بارے میں نظر انداز کر دیتے تھے لیکن ایک پھول سی بات انہیں چھو جاتی تو اس کو غیر معمولی اثر دیتے تھے۔"

یہاں میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دلاور نگار سائنس کی چیزوں سے بڑی باتیں پیدا کرتے ہیں اور انسانی حالت سے۔ یہ ان کا طبع تھا۔ وہ چیزوں کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سکڑا ہوا موضوع پھیل جاتا ہے اور اس میں نئی گہرائی معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ آج کرکٹ کے کھیل کی بڑی دھوم ہے اور مشاعروں کی بھی۔ اب دونوں کی صورتوں کا ادغام دیکھئے اور اس انضمام سے جو نئی صورت پیدا ہو رہی ہے اس کا اندازہ لگائے:

دہاں ہے اہل بی ڈیل، یہاں یہ پتھر ہے
کہ عندلیب سوخت ہے یا ذکر ہے
یہاں کچھ ایسے بھی کہتاں پائے جاتے ہیں
جو دن پائے نہیں، ہٹ لگائے جاتے ہیں
دہاں ریاض مسلسل سے کام چلتا ہے
یہاں گلے کے سہارے گام چلتا ہے
وہاں جو لوگ اناڑی ہیں، وقت کاٹتے ہیں
یہاں بھی کچھ شاعر داغ چاہتے ہیں
وہاں ہے ایک ہی پختان ہر دم کی جان
یہاں ہر ایک پیئر بجائے خود پختان
سرے خیال کو اہل نظر کریں، مے کچھ
کہ شاعری بھی ہے اک طرح کا ہی کرکٹ بیچ

"آپ عرض" کے دیا ہے میں عبداللہ دی بلی کا دہلی ان کی شاعری کے سلسلے سے اس طرح دیکھتا رہا ہوں

کہ ان کا فن sum up ہے۔ میں اسی فن میں کچھ لکھ کر رہا ہوں:-

حزے کی بات ہے کہ دونوں محمد خاں ایک دوسرے کی قلمی نہیں، تانید کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو کلب پہنچاتے ہیں کیونکہ دونوں کی جڑیں ایک ہی ملی ہیں، بیوست ہیں۔ محمد خاں سپاہی ہوں، کا شکار ہوں، اویب ہوں، دوست، دشمنی اور ہمدردی میں دلوں یکساں گزرتی ہیں۔ اخلاص و محمل میں فرا اور انکسار کا تو یہ عالم کہ — دوسروں کے پیچھے نہ دھرمائے!*

دوسری جنگ عظیم کے وقت موصوف علاقہ دھمن میں نیم لیفٹیننٹ تھے۔ لیکن باضابطہ طور پر اب فوج میں آگئے۔ اس خدمت کے تحت، بھرہ، بغداد، شام، موصل، تاجرہ، حلب، رخ وغیرہ میں فوجی خدمات انجام دیتے رہے۔ جب دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی، بھولی سید میر جعفری محمد خاں کے جسم پر میدان جنگ کے قتلوں کی تعداد تھی، بولی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ایک ادیب محمد خاں بھی، بیدار ہو کر بالغ ہو چکا تھا۔ موصوف نے لکھا ہے کہ "اویب محمد خاں اٹھ لاکھ کی لکیریں اور مصرعے باز اردن اور شام کیا اور کے صحراؤں سے ایک بھر پر دہانوں سلون انجینی زندگی کے سوتی رول لاپا تھا۔ خواب درنگ، روشنیاں، ستارے اور سکر انہیں۔"

کرل محمد خاں کی ساری شہرت کاہ اور ان کی کتاب "جنگ آمد" پر ہے۔ یہ کتاب جب اشاعت پذیر ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ لگی گئی۔ موصوف نے اس کتاب کے بارے میں خود لکھا ہے۔

"یہ کتاب ایک لیفٹیننٹ کی جنگ فوجی ہے۔ اس میں موصوف، افد، یلم الکلام پر بد و دانست کوئی بھٹ نہیں کی گئی۔ اس میں صرف ان باتوں کا ذکر ہے جو سیکڑ لفظوں کو اپنی زندگی خصوصاً جنگی زندگی میں پیش آتی ہیں۔ سیکڑ لیفٹیننٹ اکثر جوان ہوتے ہیں اور جوانوں کے پہلو میں دلی ہوتا ہے، وہی دل جو کئی بزرگوں کے پہلو میں بچنے کر سنگ و خشت، ان جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ نوجوانوں کی زندگی کے کئی زاویے بزرگوں کو چھپتے ہیں، حالانکہ خوران بزرگوں نے بھی جوانی میں انہیں زاویوں پر فہم کھایا ہوتا ہے۔ بہر حال، ان محرمین کی خدمت میں جنگی گزارش ہے کہ اس کتاب میں جہاں جنگ و جدل کا قصہ ہے وہاں پیش و سرور کی باتیں بھی ہیں، جہاں زبردستی کا ذکر ہے وہاں ڈانٹ و تشدد کے قصے بھی ہیں، جہاں رنگ و بو کا بیان ہے وہاں قصے بہرہ و دی داستان بھی ہے اور جہاں مردان اسکل کے کارنامے ہیں وہاں زنان جمل کے سرنامے بھی ہیں۔"

یہاں اس بات کو اظہار ضروری ہے "جنگ آمد" میں حالی جنگ کے واقعات پیش از پیش بیان ہوئے ہیں۔ ایسے واقعات کے میں شاید ظاہر ہے کرل محمد خاں ہی ہیں۔ قوت اظہار نے ان واقعات کے اثرات دور رس کر دئے ہیں۔

جن میں شہرہ مزاج کی چاقنی الگ لکھ رہی ہے۔ انداز بیان انچھ کشش اور دل فریب ہے کہ پڑھنے والا انہیں بوجھ محسوس نہیں کرتا۔ ان کی دوسری کتابیں "پہلے مسرت ہوئی" ہر چند کہ سفر نامہ ہے اور "جہم قہر نیان" "مصلحہ فخر واقعات" سے بڑے ہیں، لیکن یہ واقعات انفرادی حیرت اظہار کی وجہ سے سجدہ لطیف ہو گئے ہیں۔ کرل محمد خاں بیٹ میں گورگدی نہیں لگے دیتے بلکہ شدتہ زیر لہی کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ لگی شوقی ان کی نگارشات کو تو آباد رہتی ہے اور ایک طرح سے ان کے یہاں اسکی تہذیبی تائید رہتی ہے جو غالب کا طرہ امتیاز ہے۔ "جنگ آمد" کے سلسلے میں خالد اختر لکھتے ہیں:-

"یہ ایک جنگ کی کتاب (دارک) نہیں ہے۔ یہ نیم لفظوں محمد خاں کی اپنی پرکشش داستان ہے اور فوجیوں کی بااثر فنکاروں کی طرح میں بھی اس کی باجمیں مٹلی رہتی ہیں۔ میری نظر بھی کوئی بھی اسکا دارک نہیں گزری جس میں اسے ناقابل فراموش Human واقعاتی نگارے ہوں

اور ناقابل طبعانہ حراج۔ یہ نگارے اس کتاب میں جاتا ہے کھرے پڑے ہیں، کیڈٹ ارشن، نگار اور اس کا کرل شراب میں دھت ایک دوسرے کے گلے میں ڈالیں حال کے تاپتے ہوئے، راجند گلہ تال، کھی اپنی آرمی کا دار کھی جنگ میں شامہ کیمپ سے بھرنا کھرے دیکھنے کے لئے جاتا ہوں (اس نے قہر جہم گلے پانچ سولہ کی میں گورٹ کے سامنے یہ بیان دیا کہ دار جنگ پر چار ہا تھا اور کھر سے پر غلطی سے جاتا تھا کیونکہ اس کے قلب لہا میں خرابی تھی)۔ اسکا سپاہی رم لڑا جانے کے بعد دھوکا ہر چمے کی تال پر تیری لوگ داپہا نکاراستے ہائیاں نے فی ڈک لئے مجھے جوئے مہولوم کی طرف تپائی کے دوران چند من چلے دھالی حڑے سے چائے کی کپٹلی رکھے، مایا ۱۱ اپنے ہوئے، جیسے کوئی جنگ نہ ہو اور وہ اپنے گاؤں کی چو پال میں بیٹھے ہوں، مائی Funny اور جہم اور پڑو گہا میں اس کتاب میں بہت سی ہیں۔ آہلی کس کا ذکر کرے اور کس کو چھوڑے۔"

کرل محمد خاں کی اردو تاریخ میں جگہ ٹھکانی جانتی ہے۔

شفیقہ فرحت

(۱۹۳۱ء -)

بیکرانی نام بھی ہے۔ ان کے والد کا نام محمد رستم خاں ہے۔ شفیقہ ۳۴ مارچ ۱۹۳۱ء میں، پکڑ میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے ایم اے اردو اور فارسی میں کیا۔ جہلم میں ایلو لکھا، اس کے بعد اردو میں بی اے لکھی کی ڈگری حاصل کی۔

شہریت اور یہ کہ کالج بھالی سے وابستہ ہو گئیں اور اردو کی پروانچ اور دھڑلے بھی ہو گئیں۔

بشیت ادیبان کا نام معروف ہے۔ طرز حراں میں ان کا ایک خاص رنگ ہے جس کی وجہ سے ان کی شناخت ہوتی ہے۔ طرز حراں یہ مضامین کا ایک مجموعہ "نوائی ہم" بھی ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا اس کے بعد "رائٹ نمبر" بھی سامنے آیا۔ یہ دونوں کتابیں کامیاب ثابت ہو گئیں۔

تحقیق ایک خاص فنکار ہیں۔ سماج کی باتوں پر یاں مختلف قسم کا اتصال و فیروان کے موضوعات رہے ہیں۔ زندگی کی بہت سی ایسی کیفیتیں جن سے توجہ آلودگی کا ایک نظر نامہ سامنے ہوتا ہے وہ اسے انکبیز کرنے میں تخلیقی مرحلے سے گذرتی ہیں اس طرح کہ حراں بھی گھر جاتا ہے اور طنز کا کیف بھی۔

انسانی دوستانہ کے مضمون کے مطابق گفتگو کا بھی پتہ دیتے ہیں۔ اس لئے کہ پشتے بناتے اور کھتی روگوں پر انگلیاں رکھ دیتی ہیں۔ گویا ان کے یہاں فن ایسی صورت اختیار کرتا ہے جس میں زندگی کی جھلکی اپنی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ جا کر ہوتی ہیں۔

شہیت زبان پر خاص دسترس رکھتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر کہیں بھی پوجھل نہیں ہوتی اور پڑھنے والے پر ایک خاص اثر چھوڑتی ہے۔

احمد جمال پاشا

(۱۹۳۶ء - ۱۹۸۶ء)

احمد جمال پاشا ۱۹۳۶ء میں ضلعا آباد (الہ آباد) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بزرگوار تھے۔ اس عہد سے بھگدوش ہوئے تو کھیتوں میں پور پاش اختیار کرتی۔ دیکھتے ہی ان کا تعلق عظیم تبار سے تھا۔ ان کے اسلاف سکین سے تعلق رکھتے تھے۔ احمد جمال پاشا کی شادی سیوان میں ہوئی تو سکین کے گھر اور اسلام آباد کالج سیوان سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں وہی دہ دہش کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انہوں نے بیگم مسلمہ کی نور علی سے نکاح کیا تھا اور نکستہ سے بی بی اے کیا تھا۔ پیدائش تو "اور" کی ہوئی مگر مدت کے مضمون پر تحقیق متاثر کھاروڑی لٹ کی ڈگری کی ایک مرتبہ تک "نوائی ہم" کے شعبہ ادارت سے منسلک رہے۔ احمد جمال پاشا کا انتقال ۲۶ ستمبر ۱۹۸۶ء میں چند میں ہوا۔ دل کا دورہ پڑا تھا۔ کاش سیوان اور ان کی جہاں دفن ہوئے۔

احمد جمال پاشا طرز حراں کی دنیا میں معروف ہیں۔ جاہد سکیل کی جاسے ہے کہ احمد جمال پاشا کا مشاہدہ قومی اور سزا قہار اس سے نہیں زیادہ قوی اور سزا کی وہ صلاحیتیں تھیں جو مشاہدے کو طرز حراں میں بدل دیتی ہیں۔ پاشا کا حراں صرف ادب تک محدود نہیں۔ وہ کبھی کبھی اسے علم کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں۔ جاہد سکیل نے اپنے کتاب میں جو اثر پر دلائل اور دوا کی گفتگو ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے دس مضامین کا اجتماع کیا ہے۔ سب سے مشہور مضمون "ادب میں

مارشل بلا" ہے۔ جس کی وجہ سے احمد جمال پاشا ستر کے ایک ممتاز مزاج نگار کی حیثیت سے ابھرے۔ دوسرے مضامین میں "نوائی ہم" "ستم ایوان" "کرکٹ اور میں" "تھار" "نور ۱۹۵۷ء کے اسباب" "بچوں ایک تحقیقی اور تخلیقی مطالعہ" "کتنے کا خط پطرس کے نام" "شریعت کی تلاش میں" "سیزیاں بے زبان" "نقل طیف کوئی" اور "تعلیم صاحب" ہیں۔ یہ سارے مضامین اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں سامنے آچکی ہیں۔ ان میں ایک "بچوں پر چھڑکاؤ" بھی ہے۔ اس کا مقدمہ صادق انحراف نے ہی قلمبند کیا ہے۔ اس کے چند نکات ذیل میں درج کر رہا ہوں۔

"احمد جمال پاشا اجتماعی مزاج نگار ہیں، لیکن ان کا احتجاج کلی نہیں ہے۔ اشارے اور کتابے کے ساتھ ساتھ واقعات و حادثات کے تحریریں کپسول میں چھپا ہوتا ہے۔ احمد جمال پاشا اپنے احتجاج کوئی کی سطح پر لے جاتے ہیں اور وہ دھکیں اجتماعی ادیب ہونے کا ثبوت بن جاتے۔ سماج کے اندر دھکیں ہوتی پراگندگی کا احساس کئے نہیں ہے۔ مگر ان کی کورانی پراگندگی کرنا، عجب تو عجب ہے۔ اتصال کے ہند ہے؟ لیکن ہم اپنی ذات کے خولی میں کم ہیں، ہمارے پاس آنکھیں ہیں لیکن بے نور، ہم معاشرے کی تمام تر گندگیوں کے ساتھ جی لینے کے عادی ہو چکے ہیں اور ادیب خصوصاً طرز حراں سے وابستہ ادیب ایسا نہیں کر سکتا۔ آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ واقعہ ہمارے میں انہیں لئے ایسے معاشرے میں ٹھونکنا ہوتا ہے۔ اس پر بھی آپ کی آنکھیں بند ہیں اور تو نگار کیا کر سکتا ہے۔

احمد جمال پاشا جو چہرے ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں، حق کی جس کیفیت سے ہمیں آگاہ کرنا چاہتے ہیں، ہم ان سے آگاہ اور آشنا ہو جاتے ہیں، ان کے اس نگار دہش سے کسی کارل بھی نہیں دیکھتا، پاشا اور کی دوسرے طرز و ہر رفت سے وابستہ ادیبوں میں حدفاصل بھی نکلتا ہے۔ پاشا چاہتے ہیں کہ ہم چہرے دکھائیں یا کسی واسطے کی سلا کا نہ صورت سامنے آئیں، قاری جتنے جتنے ہی سب کچھ دیکھ لیتا ہے، اب وہ ایسے معاملات سے جب بھی اپنے آپ کو الگ رکھے اور احکامات پر کرے۔ تو اس میں خالق کا کیا قصور۔

Ronald Knox نے طرز نگار کا ایسے بچے سے مسائل قرار دیا ہے جس کے ہاتھوں میں ہائی بھری بیٹھتی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اس کا نتائج اگر ٹھیک بھی بیٹھتے تو ذہنی کا کیا ہوگا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے ہاتھوں میں جو ہر قول ہے وہ انتہائی گرم ہائی سے بھری ہوتی ہے اور جس پر نشانہ لگا دیا جاتا ہے وہ جھٹی جی جاتا ہے۔ یہی اور بات ہے کہ اسکے ذہنی چہرے تو ہم اپنی جگہ انکسوں سے نہیں دیکھ سکتے لیکن کتنے بھروج ہونا تھا وہ بھروج ہو چکا ہے۔ پاشا کی Delicacy کا بھی یہی حال ہے، وہ جتنے جتنے ذہنی کرتے ہیں، ذہنی ہونے والا بھی بنتا ہے لیکن اس کا جسم بھروج

ہو چکا ہوتا ہے۔ ایسے ہی خریفہ کارکنان Art lies in concealing art کے کہتے ہیں۔ گویا احمد جہاں پاشا جہاں مہذب سوسائٹی کے جڑی فوار ہیں، سماج کی آلودگیوں سے خیر و آرزو ہیں، زندگی کے اعتقاد و تصورات کے خلاف مصلح آ رہے ہیں، معاشرے سے ان کے تمام محبوب و ناگوار چاہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ احمد جہاں پاشا ایسے خواب دیکھتے ہیں، جن کی تعبیر ان کی نگاہ و ضمیر میں تخلیقات ہیں، جن میں ہمارا سماج دکھایا ہے، ایسے نئے سماج سے ہم ہمدردی نہیں کر سکتے، اگر ذرا انہیں کر سکتے تو ہم انہیں اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ پاشا کی غایت بھی یہی ہے اور ان کی فکر کا محور بھی یہی اور نہ کچھ شے بنانے کا کام تو چنگلوں سے بھی انجام پا جاتا ہے۔ لیکن احمد جہاں پاشا کی فکر کی کلید بننے بنانے میں نہیں بلکہ معاشرے کے کردار و پہلوؤں کی نشاندہی میں ہے۔۔۔۔۔۔ معیاری طریقہ و مزاج تحریر میں سنجیدگی سے آراستہ ہوتی ہیں، ان میں محصول و فقر چھپائیں ہوتا، لیکن اردو کے کئی حرائق و کھنڈر اس سے بچ جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی نگارشات کا وزن اور وقار دوسرے سے متعدد ہو جاتا ہے، پاشا اس نکتے کو خوب سمجھتے ہیں۔ ان کے مزاج میں کڑم جڑ اور وہ چھپا ہوتا ہے، سب ڈک کے اثر کو کوئی نہیں کرے تو اور بات ہوئی، اسے ہر طور پر چھلایا جائے۔ پاشا کی ہلکی زبرد میں سمجھا دیا میرے جو پیش کشانے پر ملتا ہے۔"

مجتبیٰ حسین

(۱۹۳۶ء۔)

مجتبیٰ حسین کے اسلاف کا پیشہ شہ نری تھا۔ ان کے ایک بزرگ محمد حسین نے وہ جو دھڑکی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ مجتبیٰ حسین ان ہی بزرگ کی اولاد ہیں۔ ویسے ان کے والد مولوی احمد حسین تھے۔ مختار روزگار میں حیدر آباد آ گئے اور سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ عثمان آباد میں پیش کار کے عہدے پر رہے، پھر ان کا تادم لکچر گر ہو گیا۔

مجتبیٰ حسین کی ولادت حیدر آباد میں ۱۵ جولائی ۱۹۳۶ء کو ہوئی، ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کنڈا (آندھرا پردیش) سے میٹرک اور گلبرگ سے انٹر کیا۔ ۱۹۵۶ء میں مڈلے پونیورسٹی سے بی اے ہوئے۔ سینک ایڈیشن میں ڈپٹی ماحاصل کیا اور صحافت سے وابستہ ہو گئے۔ روزنامہ "سیاست" سے گویا ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا لیکن ۱۹۶۲ء میں آندھرا پردیش کے نگر اطلاعیات اور تعلقات عامہ میں ملازمت کی۔ ۱۹۶۴ء میں میجرال سینی کی شہرہ ریسرق سے رخصتی آکر وہ است ہو گئے۔ لیکن ۱۹۶۴ء سے ان ہی آئی آئی میں منتقل ہو گئے۔ ان کا عہد وہاں کا ورنس کے جلی کیشن ڈویژن میں اردو شعبہ کے ایڈیٹر کا تھا۔

مجتبیٰ حسین ابتدا ہی سے بہت فعال رہے۔ مختلف اداروں و شخصوں کے مختلف اہم عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ ۱۹۷۸ء میں وہ زندہ دلاں حیدر آباد کے سرکاری بھی ہوئے۔ ایسا نام "شکوہ" "آج کل" "پن" وغیرہ سے وابستہ رہے۔ کانٹیل برائے شروع شروع کے ایک دن بھی ہوئے اور انکی دوسرے اداروں سے وابستہ ہو کر کئی خدمات انجام دیں۔ مجتبیٰ حسین کی شادی ۱۹۵۶ء میں اپنی چچا زاد بہن ناصروہ ریکس سے ہوئی۔ ۱۹۸۰ء میں موصوف جاپان گئے۔ ۱۹۸۳ء میں لندن اور پھر کینا، نیو یارک، واشنگٹن، فلوریڈا، کولوراڈو، میٹروپولیٹن کے کئی علاقے سفر کیا، سرقد، بخارا اور ماسکو نیز انڈیستان کی سیاحت کی، سعودی عرب کے مقدس مقامات کی بھی زیارت کی۔ ۱۹۸۹ء میں پاکستان گئے۔ ۱۹۹۱ء میں وہ ان ہی آئی آئی کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ لیکن مختلف رسائل میں کالم لکھنے کرتے رہے۔ ان کی ادبی نگارشات کی تفصیل یہ ہے:

تکلف بر طرف (۱۹۶۸ء) قطع کاظم (۱۹۶۹ء) قصہ مختصر (۱۹۷۲ء) بہر حال (۱۹۷۳ء) آدمی نامہ (۱۹۸۱ء) بلا آفر (۱۹۸۲ء) جاپان چلے جاپان چلو (۱۹۸۳ء) انٹرویو (۱۹۸۷ء) سو وہ بھی آدمی (۱۹۸۷ء) چہرہ و چہرہ (۱۹۹۳ء) سرنوشت لخت (۱۹۹۵ء) آفر کا در (۱۹۹۷ء) ہوئے ہم دوست (۱۹۹۹ء) میرا کالم (۱۹۹۹ء) مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں (جلد اول) (۲۰۰۱ء) مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں (جلد دوم) (۲۰۰۲ء) مجتبیٰ حسین کے سفر نامے (۲۰۰۳ء) جاپان (۱۹۸۰ء) پنج پ (۱۹۸۳ء) مسقط (۱۹۹۵ء) سعودی عرب (۱۹۹۶ء) روانی (۱۹۹۷ء) امریکہ (۲۰۰۰ء) مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم (۲۰۰۳ء) شیشہ و شیشہ و شاہ صدر کی کے کالوں کا انتخاب (۱۹۶۳ء) مہذب شدہ نظمیں (۱۹۷۵ء)۔

اس کے علاوہ مجتبیٰ حسین کی کتابوں کا ترجمہ انگریزی، اردو، جاپانی اور ہندوستان کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ حیدر آباد کے مشہور "شکوہ" نے ۳۹۸ صفحات پر مشتمل "مجتبیٰ حسین قلم" شائع کر کے اس ممتاز نثر نگار کو فراج حسین پیش کیا۔ پروفیسر قلیل الرحمن نے "مجتبیٰ حسین کا فن" نام سے کتاب شائع کی۔ مطبوعہ رسالہ "الفاظ" علی گڑھ نے بھی خصوصی گوشے شائع کیے۔

نگارشات کی تفصیل سے یاد دلانا مشکل نہیں کہ مجتبیٰ حسین نے مختلف موضوعات پر حادہ نرسائی کی۔ لیکن تمام تحریریں میں ان کا وہ اور جو مصاف بھٹکا ہوا محسوس ہوتا ہے کہ واقعتاً طور و عرافت ہی کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ دراصل مجتبیٰ حسین کے تجربے اور مشاہدے میں زندگی کی نامواریاں ہمیشہ مرکزی حیثیت رکھتی ہیں لہذا جب بھی وہ قلم اٹھاتے ہیں زندگی کے کتنے ہی نامواریاں کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں لیکن وہ ہر اہمیت سے کام نہیں لیتے بلکہ مختصر و معراج میں ایک خاص قسم کی فکری پیدا کرتے ہیں سادگی، قناعت، بھی ایک انداز رکھتے ہیں جو حس چھنے والوں پر فورا مپاں ہو جاتی ہے۔ مجتبیٰ حسین بھی نامواریاں کو نشان زد کرتے ہیں جہاں ان کی اصلاح و قانون کے مد نظر ہے ہی لیکن وہ نہ تہیہہ لیتے ہیں نہ قناعت بلکہ ایک حس دل کے رنگ کا جو شعرا و ہر جگہ سے کہتا چا سکتی ہے کہ ان کی قلمی صورت کی نشاندہی ہر طور قلم و دھم ہے اور شاید وہ ہے کہ لیکن یہ بات بہت صاف طریقے سے کہا جاسکتی ہے کہ ان کی قلمی صورت کی نشاندہی ہر طور

